خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

# سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

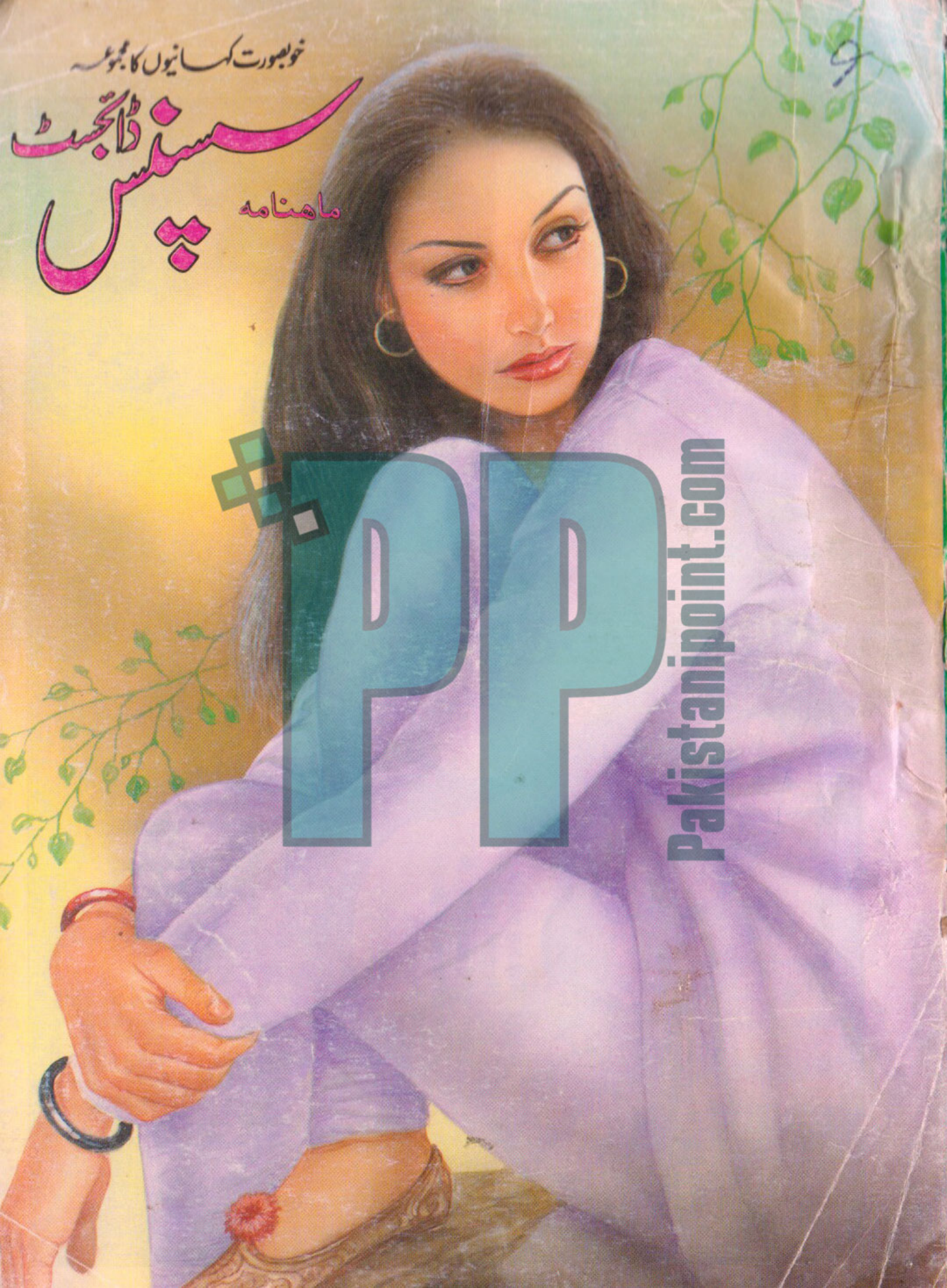

PP
Pakistanipoint.com

# سسپنس ڈائجسٹ


**دیوتا** — فرہاد علی تیمور — 76

**انشائیہ** — حیون ایلیا — 11
ایک فنون کار کی خود نوشت ایک عالم جس کے خون کا پیاسا تھا، سسپنس کا مقبول عام سلسلہ جو ۲۸ سال سے جاری ہے

**اچھی بُری گھڑی** — ش صغیر ادیب — 117
نشان کی گفتگو، اب خوابوں کو حقیقت بن جانا چاہیئے، ریے امیدی کے مزے کب تک جاری رہیں گے

**آپ کے خط** — مدیر اعلیٰ — 12
دو انا پرست عورتوں کی داستان انھیں کسی بھی معاملے میں سبک سر ہونا گوارا نہیں تھا

**راجی** — فرشہباز محمد ابراہیم جمالی — 125
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تنقید برائے تنقید کو گلے لگانے کے لیے ہمہ وقت جو انجمن آرائی میں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں

**اسلامی مرکز کا نائی تنہ** — الیاس سیتاپوری — 18
اُن ناموں کی کہانی جو ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت پر آمادہ تھے، سندھی ادب سے انتخاب

**اُلٹی تدبیر** — مرزا امجد بیگ — 136
ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے ایسے واقعات جو جیتا جاگتا کی بنائی کے لیے کتابوں میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں

**شورا** — محمد زبیر سلیمانی — 71
انسانی خواہشات کے سرسبز جنگل میں اُگنے والے ایک کانٹے کی داستان جس نے بستیوں کی بستیاں برباد کر دی

**بلائے جان** — جعفر رضا — 169
زندہ ماں باپ کے یتیم بچے کی داستانِ دل گداز جو اپنی ماں کے قرب کا طلب گار تھا

ایک معصوم مسافر کے اپنے چالاک ہم سفر کے ہاتھوں کھلونا بننے کا دلچسپ فسانہ

**محفل شعر و سخن** — قارئین — 179
مشہور مزاحیہ شاعروں کے شاہکار سے منتخب کیے ہوئے ہمارے قارئین کی بھیجی ایک انجمن ہنگ مگن آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

**فسانۂ غم** — انتون چیخوف / ارشاد احمد صدیقی — 265
نفسانفسی کے اس دور میں کسی غم گسار کی تلاش میں بھٹکنے والے کوچوان کا قصۂ غم، روسی ادب سے انتخاب

**موت کے سوداگر** — اقلیم علیم — 182
مشہور ناول کے مرکزی کردار کی زندگی کا ایک گمنام گوشہ جو ناولوں کے بعد بارہ برس میں بنی سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ

**جنریشن گیپ** — نجمہ مودی — 269
پرانے ماضی کو سینے سے لگائے ایک حال مست بوڑھے کا فسانہ، نسلوں کے درمیان موجود تفاوت کی حقیقی تصویر

**شہر کی کشش** — محمود احمد مودی — 227
گزرے وقت کو پانے کی خواہش رکھنے والی ماضی کی اداکارہ کا قصہ، ظلمی دنیا کے پریم روپ مجرمانہ کشمکش کا احوال

**فیصلہ** — طاہر جاوید مغل — 278
اس فیصلے کی داستان جو کسی کو خاطر میں لائے بغیر مردہ دلوں میں زندگی کی شمع روشن کرنے کے لیے کیا گیا

**گونگا گواہ** — ڈاکٹر سلجد امجد — 237
ایک پیشہ ور دروغ گو گواہ کی داستانِ حیات، وہ چاہنے کے باوجود سچ نہ بول سکا تھا

**کتہ نہیں** — قارئین و ادارہ — *
دُنیا بھر سے اِدھر اُدھر سے لطیفے چٹکلے، اقتباسات، گدگدیاں، سرگوشیاں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

**حضرت زکریاؑ** — ضیا تسنیم بلگرامی — 251
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی خبر دینے والے برگزیدہ نبی کے حالات و واقعات



پبلشر: عتیق الرسول • پرنٹر، جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی
یکے از مطبوعات: حسن سومرو ایسوسی ایٹ پبلی کیشنز • مقام اشاعت: C-63 فیز ٹو، ایکس ٹینشن، کنٹونمنٹ بورڈ، سین کوریگی روڈ، کراچی



ISPR

آئی ایس پی آر پاکستان آرمی کا ترجمان ادارہ

مدیر اعلیٰ — معراج رسول



Phone: (021) 5802552 Fax: (021) 5802551 E-mail address: jasoosi@attglobal.net • خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی
جلد: 29 • شمارہ: 9 • ستمبر 2000 • قیمت فی پرچہ 30 روپے • زرِ سالانہ 400 روپے • قیمت سعودی عرب و گلف ریاستیں 12 ریال یا اس اوی

انشائیہ

# ورنہ... ظاہر ہے

جون ایلیا

اب تو میں نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ پاکستان کو وجود میں آئے باون برس ہوئے یا باون دقیقے۔ گزشتہ سال ہا سال پہلے کے پاکستان کے اطوار کیا تھے اور اب اس سال گرہ کے موقع پر اس کا حال احوال کیا ہے؟ "پاکستان کی سالگرہ" یوم آزادی یا جشن آزادی" کے کیا معنی ہیں، یعنی آخر کیا؟

کیا ان لفظوں کے کوئی معنی ہیں؟ کیا ان لفظوں کے کوئی معنی ہونا چاہئیں؟

اُمِ فروہ کی شمیمِ زیرِ بغل کی قسم، ان لفظوں کے اب کوئی معنی نہیں ہیں۔ کبھی ان لفظوں کے کچھ معنی تھے۔ ایک زمانے میں پاکستان کی سالگرہ کا جشن بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اسے واقعی ایک قومی تہوار کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔

پاکستان کے بارے میں قائداعظمؒ کی وفات کے بعد دو طرح سوچا جانا شروع ہوا۔ کچھ لوگ وہ تھے جن کا خیال تھا کہ پاکستان خلافتِ راشدہ کا دوسرا دور ہے جو چودہ سو برس بعد کارفرما ہوا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ پاکستان کے بڑے رہنماؤں کی اکثریت کا رہن سہن، ان کا طرزِ رفتار و گفتار، ان کا حلیہ اور ان کا ہنجار یکسر فرنگی ہے۔ وہ رنگ دار انگریز ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ ان کرسٹانوں کوٹ پتلون پہننے والے داڑھی منڈوں سے یہ امید کیسے رکھتے تھے کہ وہ مقدس خلافتِ راشدہ کے دور کا احیاء کریں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ اگر تاریخ کی بے مثال بھول نہیں تو سادہ دلی اور سادہ لوحی ضرور ہے۔

اب رہے دوسری طرح کے لوگ، ان کا خیال تھا اور ہے کہ پاکستان ایک خوش حال اور روشن خیال ریاست ہے۔ وہ اس جدید عہد کی ایسی ریاست ہے جس کے اعلیٰ حکمران مسلمان ہوا کریں گے اور یہ کہ پاکستان اس لیے بنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت ننگی بھوکی تھی۔ المناک حد تک پسماندہ اور درماندہ تھی۔ پاکستان کا حصار انہیں کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے بغیر ایک جمہوری، ترقی یافتہ، مہذب اور معاشی طور پر ایک پُرمایہ قوم بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ پہلے گروہ کی امیدیں پوری ہوئیں اور نہ دوسرے گروہ کی۔ یہ دوسرا گروہ جو سوچ رکھتا تھا، وہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پاکستان میں زمیں داری، جاگیرداری اور قبائلیت کو باقی رہنا ہے۔ سو ایک جاگیردار اور قبائلی ملک میں عوام کی بات کرنا، جمہوریت کی بات کرنا، خوش حالی کی بات کرنا اور عام لازمی تعلیم کی بات کرنا، ایک پاگل پن کی بڑ نہیں؟

مشکل یہ ہے کہ عوام اللہ کی گائے ہوتے ہیں۔ وہ ہر کسی بڑبولے کی سنتے اور مانتے ہیں۔ یہاں کے حکمران بڑے باتونی گزرے ہیں۔ بڑبولے پن اور بڑہانکنے میں ان کا کوئی جواب نہیں پیش کیا جا سکتا۔ ان کی ہر بات سننے والوں کے درمیان کرسی نشین ہو جاتی تھی۔ یہ لوگ، یہ عالم پناہ لوگ باتوں کا جھاڑ باندھ دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کی باتیں دل میں اتر جاتی تھیں۔ عوام ہر بار نا امید ہوتے تھے مگر جب کوئی دوسرا بدبنا اور بڑبولا آتا تھا تو ان کی شنوائی، اس کی ہرزہ سرائی کی دل سے بیعت کر لیتی تھی۔ اور نئے خواب و خیال کا بے جا اور بیہودہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اب تک جو ہوا وہ یہ تھا۔ اب پھر ایک امید پرور اور امید پرور ہی نہیں بلکہ "منتظمِ اعلیٰ" آئے ہیں۔ منتظمِ اعلیٰ کے معنی شش پہلو ہیں۔ ہماری ان سے درخواست ہے کہ وہ کوئی امید نہ دلائیں۔ یہ میری سچی درخواست ہے۔ بے امیدی کے بھی اپنے مزے ہوتے ہیں۔ اور اگر انہیں بھی امید دلانا ہے تو وہ امید پوری ہونا چاہیے۔ آخر عوام کے ساتھ مذاق کرنے کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اب امید دلانا ہی نہیں ہے، اسے پورا بھی کرنا ہے۔ ہمیں یقینی طور پر پوری ہونے والی امید درکار ہے اور بس۔ ورنہ... ورنہ ظاہر ہے۔

# اسلامی ترکش کا ترکمانی تیر

الیاس سیتاپوری

سلطان رکن الدین بیبرس ملک الظاہر کے تمام سابقہ فتوحات کی تکمیر کے بعد سولہ کا رخ کیا اور وہاں بسنے والے لوگوں کے عقائد کی اصلاح کرتا رہا۔ سولہ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے اساتذہ کو بھیجتا رہا جن سے وہ آداب سیکھ کر اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ اور انہیں یہ بھی سمجھاتا رہا کہ اسلام ہی ان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ خود بخود اسلام کی طرف راغب ہوتے چلے جائیں گے۔

انہوں نے بھی ان مقامی لوگوں کے سمجھوتا کر لیا تھا اور انہیں ان کے عقائد پر اسلامی معیار زندگی اور تاج محمد شریف کو قبول عام حاصل نہ تھا۔ سولہ ان کی تعلیم اور اصلاح کے بعد وہ تاجر پہنچا اور اپنی زندگی کے بقیہ سات سال تعمیرات میں مصروف کر نا شروع کر دیئے۔ اس دوران میں بیبرس نے اپنے کم سن بیٹے کو ولی عہد قرار دیا اور اس کے اس فعل سے بہتوں نے اختلاف کیا ہو گا مگر سامنے کوئی نہیں آیا۔ فاتحین جو سلطان کے اس فیصلے سے بالکل متفق نہیں تھا، وہ بھی بیبرس سے منافقت کے ساتھ اتفاق کرتا رہا۔ تاہم ایک قلندر ولی عہد کو بہت شرمندہ کیا۔ بیبرس کو قلندر کے رویے اور ولی عہد کی بچکانہ ضد سے تکلیف پہنچیں۔ انہی فکروں میں مگن اسے کا یاد آتا رہا جس کی تسخیر اب وہ بہت ضروری سمجھتا تھا اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ اگر جزیرہ قبرص پر قبضہ کر لیا جائے تو صلیبی جنگجوؤں کے سیلاب کو یورپ سے بھی آگے تک پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک طاقتور بحریہ تیار کی، مگر قدرت اور قسمت نے اس بحریہ کو طوفان سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور بحری طوفان نے اس کی بحریہ کو منتشر کر دیا۔ بیبرس کی پوری زندگی کا جائزہ لینے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ وہ اسلامی ترکش کا ایک ایسا تیر تھا جس کو منگولوں کا رخ موڑنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اسے حشاشین کی زمینوں سے دمشق اور دمشق سے قاہرہ پہنچایا اور پھر یہاں سے اس حشاشی تیر نے سترکش منگولوں کا رخ موڑ دیا اور اسلام افتریدہ کے صحرائے اعظم میں گم سوئے ہوئے ہوئے گیا۔

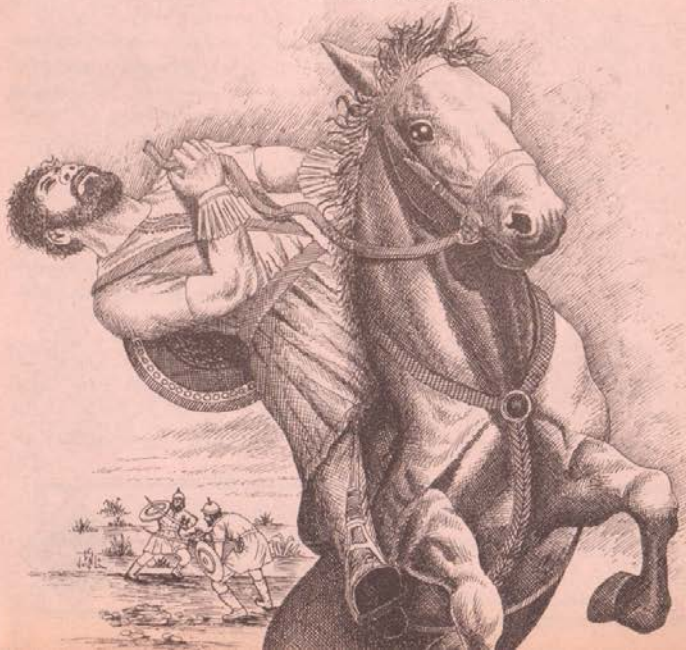

اب بیبرس کو اس کے مخبر مسلسل یہ خبریں دے رہے تھے کہ منگول عیسائیوں سے روابط پیدا کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ کبھی پاپائے اعظم سے بات کرتے ہیں، کبھی سسلی کے چارلس آنجو سے اور کبھی عکا کے نائٹوں سے۔

اسے اندیشہ تھا کہ اگر یہ اتحاد ہو گیا تو مسلمانوں کو نئے مسائل کا مقابلہ کرنا پڑے گا لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس وقت کی مسیحی دنیا اتنی اعلیٰ سوچ نہیں رکھتی کہ وہ منگول عیسائی اتحاد کے مضمرات کو سمجھ سکے۔ اسے منگولوں کی بے بسی پر بھی ہنسی آرہی تھی کہ جو کل تک تمام عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے خوف و دہشت کی علامت بنے ہوئے تھے، آج وہ یہاں اتحادیوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے مگر کوئی ان سے دوستی کرنے کے حق میں بھی نہیں تھا۔

اب بیبرس میں پیری کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تھیں اور وہ کبھی کبھی کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے بارے میں غور کیا کرتا تھا۔ اس میں اب بھی جوش و خروش کی کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ اپنے وجود میں کوئی کمی ضرور محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے جو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، انہیں مورخین تاریخی کتابوں میں محفوظ کریں گے اور آنے والا وقت انسانی نسلوں کو کتابوں کے ذریعے بیبرس کے کارناموں سے آگاہ کرے گا لیکن دنیا کے جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہوں گے، انہیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ بیبرس نے اپنی زندگی کی غلامی سے لے کر سلطانی تک کیسی کوششیں کیں اور کس طرح کامیابیاں حاصل کیں۔ اسے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ تاریخ کے نامور لوگوں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے گا لیکن ابھی تک اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، جو آنے والی جاہل اور اَن پڑھ نسل انسانی کو یہ بتائے کہ یہ دیکھو یہ سلطان رکن الدین بیبرس ملک الظاہر کا بست سے کارناموں میں سے ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اس نے فلاؤن کو اس مہم میں بھی اپنے ساتھ ساتھ رکھا تھا اور وہ فلاؤن کو بست سی ایسی کام کی باتیں بتاتا رہتا تھا جن سے بعد میں فلاؤن کو بہت فائدہ پہنچا۔

فلاؤن کو اب تک بیبرس سے جو کچھ حاصل ہوا تھا، اس میں ایک بات سب سے نمایاں اور واضح تھی۔ عمل، مسلسل عمل، ٹھہراؤ بالکل نہیں، فراغت سے محرومی اور جدوجہد مسلسل میں مشغول وہ ایک چھلاوا تھا۔ جس کو کسی ایک جگہ قرار نہیں تھا۔ اس جدوجہد مسلسل کے حامل کردار میں بے چینی اور اضطراب مسلسل پایا جاتا تھا اور دشمن اس کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے سے قاصر رہتا تھا۔

بیبرس کہیں غائب ہو چکا تھا اور اس کی سپاہ اس لیے مشغول تھی کہ اسے ہر وقت یہی شبہ عمل میں مشغول رکھتا تھا کہ سلطان ان کے آس پاس کسی دوسری شکل میں موجود ضرور ہوگا۔

قلعے کے بالائی حصوں سے عیسائی، بیبرس کے لشکر کی کارکردگی دیکھتے دیکھتے خوف کے شکار ہو گئے، وہ اپنا یہ خوف کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ کہ حصن الاکراد ناقابل تسخیر ہے۔ اس عقیدے میں بھی وہ ضعف کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کے کئی برجوں میں اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب وہ چاہتے تھے کہ سلطان سے درخواست کی جائے کہ وہ منجنیقوں کی سنگ باری روک دے اور بتائے کہ حصن الاکراد کے لوگوں سے کن شرائط پر صلح کرے گا اور عیسائیوں کو کن شرطوں کے پورے ہونے کے بعد امن و امان سے رہنے کی اجازت مل جائے گی۔

لیکن ایسے خیالات رکھنے والے گنتی کے چند لوگ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھی ان سے اتفاق نہیں کریں گے۔

قلعے کا گرینڈ ماسٹر پاگلوں کی طرح بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اور وہ سلطانی لشکر کی مسلسل حرکتوں سے تنگ آگیا تھا کیونکہ مسلمان منجنیقوں کو مسلسل حرکت میں رکھے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے قلعے کے عیسائی سکون سے بیٹھ کر کوئی منصوبہ بندی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

گرینڈ ماسٹر نے جب پھاٹک کے بالائی برج سے اسلامی لشکر پر ایک نگاہ ڈالی تو کہا "یہ اتنے لوگ ہیں یا پاگلوں کی طرح جانا؟ قلعے کے لوگ تو سو بھی نہیں سکتے کیونکہ مسلمانوں کا قلعے پر تینوں طرف سے دباؤ جاری ہے۔"

اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور کہا "آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان سات دن سے ہماری فصیلیں اور قلعہ توڑنے میں مشغول ہیں جب کہ ان کی مستعدی سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمان مہینوں اسی طرح مشغول رہیں تب بھی وہ منفعل اور پریشان نہیں ہوں گے اور آخر کار ہماری فصیلیں اور قلعہ کا پھاٹک ٹوٹ کر رہیں گے۔ ہم اپنا بچاؤ کس طرح کریں؟ اور مسلمانوں سے پیچھا کس طرح چھڑائیں؟ اگر میرے ان دونوں سوالوں کے جواب کسی کے پاس ہوں تو وہ مجھے آگاہ کرے۔"

کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے پاس ان سوالوں کا کوئی



جواب نہیں۔

گرینڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ وہ جس منفی انداز میں سوچ رہا ہے، دوسروں کو اس سے اختلاف ہوگا مگر اسے حیرت اس وقت ہوئی جب کئی نائٹوں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور کہا۔

"اگر اسی طرح شب و روز سنگ باری جاری رہی تو قلعے کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور دراڑوں کو توڑ کر قلعے میں داخل ہو جانا ممکن ہو جائے گا۔"

کسی نائٹ نے بتایا "وہ نالی جو باہر سے قلعے میں داخل ہوتی ہے، سنا ہے بیبرس اور اس کے سپاہی اس نالی کے ذریعے قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے ان کی خوف ناک سنگ باری کے علاوہ ہمیں اس تنگ نالی کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

ایک نائٹ نے مشورہ دیا "منگول ہماری مدد کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ ہمیں اس نازک موقع پر ان کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔"

گرینڈ ماسٹر کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی "مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم ان سے رابطہ کس طرح قائم کریں؟"

نائٹ نے مشورہ دیا "ہمارے چند آدمی اس ذمے داری کو قبول کر لیں تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

گرینڈ ماسٹر اس کا مفہوم نہیں سمجھا۔ اس نے کہا "تم چند آدمیوں کی بات کر رہے ہو، میں اس کام کے لیے سو آدمی دینے کو تیار ہوں مگر یہ سو آدمی مسلمانوں کے حصار کو توڑیں گے کس طرح؟"

گرینڈ ماسٹر نے نائٹ کو بالکل ناتجربے کار اور احمق سمجھ کر سو آدمیوں کی پیش کش کر دی تھی مگر نائٹ نے بہت مفید اور قابل عمل مشورہ دیا "ہمیں دو دو کی تعداد میں قلعے سے نکل کر مختلف راستوں سے منگولوں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان میں دو ایک تو پہنچنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گے۔ بس ذرا ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

گرینڈ ماسٹر نے کہا "صرف حوصلے اور ہمت سے کام نہیں چلے گا۔ حوصلے اور ہمت کے علاوہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اگر ذرا سی غلطی یا نادانی سے کام لیا گیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔"

نائٹ نے اس کی بات کی تائید کی مگر حوصلہ مند لہجے میں کہا "آپ اس پر غور و خوض کر کے کوئی فیصلہ کریں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہر ممکن تدبیر سے اس پر عمل کر سکیں۔"

گرینڈ ماسٹر کچھ دیر اس تجویز پر غور کرتا رہا اور پھر آہستہ سے کہا "تجویز معقول ہے اس لیے تو ہی اس پر عمل کرنے کی منصوبہ بندی کر۔"

نائٹ نے کہا "آپ صرف آٹھ آدمی مجھے دے دیں۔ میں دو دو کی ٹکڑیوں کو سمجھا کر قلعے کے باہر کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے دو آدمی منگولوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ اب آپ منگولوں کے نام تجاویز اور پیغام تیار کر لیں۔"

اس مفید مشورے کے بعد نائٹوں میں سے آٹھ نائٹ علیحدہ کر لیے گئے۔

گرینڈ ماسٹر نے تخلیے میں جا کے منگولوں کے نام ایک مختصر نامہ لکھا "مجھے یقین نہیں کہ مجھے یہ معاملہ کس سے کرنا چاہیے اور مجھے کس کو مخاطب کرنا چاہیے لیکن میں تمہارے تعاون کا طلب گار ہوں۔ جیسا کہ تم لوگوں کا خیال ہے کہ یروشلم تمہاری مدد کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا تو ہم اس سے سو فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ ہم حصن الاکراد کے نائٹ اور گرینڈ ماسٹر تمہارے تعاون کے طلب گار ہیں۔ سنا ہے کہ تم لوگ پاپائے اعظم کے پاس بھی گئے تھے مگر اس نے تمہارا تعاون حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ تم لوگ ہماری مدد کرو۔ سلطان بیبرس کا لشکر ہمارے قلعے کے سامنے منجنیقوں سے سنگ باری کر رہا ہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اتنی جلدی نہیں۔ ہاں اگر انہوں نے سنگ باری کے ذریعے کوششیں جاری رکھیں تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں وہ قلعے میں دراڑیں ڈال دیں گے۔ اس لیے ہماری خواہش ہے کہ اگر تم لوگ ایمانداری اور خلوص سے ہم عیسائیوں کا ساتھ دینا چاہتے ہو تو ہم اسے نظرِ آتش کر دو گے اور جو اس مشن میں کامیاب ہو جائے گا، خداوند مسیح اسے اس کی آخرت کی زندگی میں جنت عطا فرمائیں گے۔"

ان چاروں کو اس خط کی نقلیں دے دی گئیں اور یہ قلعے سے نکلنے کا وقت اور موقع کی جستجو کرنے لگے۔ بالآخر طے پایا کہ رات کے اندھیرے میں قلعے کی اندرونی دیواروں کے بالائی حصے سے رسیوں سے اتر کر منگولوں کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر مسلمان پکڑ لیں تو بیماری کا بہانہ کرنا چاہیے۔ گویا وہ کسی طبیب کی تلاش میں کہیں جا رہے ہوں۔"

ایک نائٹ نے پوچھا "جناب! آپ یہ فرض کر لیں کہ ہم چاروں خط کو لے جانے میں کامیاب نہ ہوئے اور خط کو

ضائع کردیا گیا مگر ہم میں سے کوئی ایک منگولوں کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو کیا ہم آپ کا یہ پیغام زبانی پہنچا کے اور ان سے تعاون کی درخواست کریں تو۔۔۔"

گرینڈ ماسٹر نے اجازت دے دی "ہاں تم اس طرح بھی بات کرسکتے ہو اور اگر منگولوں نے ہمارا ساتھ دے دیا تو ہم کامیاب ہوجائیں گے۔"

اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے وہ سب طریقہ کار کی منصوبہ بندی میں مشغول ہوگئے اور یہ طے پایا کہ دو قلعے کی دائیں بائیں کی دیواروں سے باہر نکلیں اور دو قلعے کے چھوٹے پھاٹک سے رات کے اندھیرے میں باہر نکل جائیں۔

دو راتیں ان لوگوں نے تجزیے میں گزار دیں۔ رات کو بھی سنگ باری جاری تھی اور مسلمانوں نے باہر مشعلیں روشن کر رکھی تھیں۔ پتھروں کی بارش میں قلعے سے نکلنا بڑے حوصلے کا کام تھا لیکن دو ٹکڑیوں نے اس جگہ سے قلعے کو خیرباد کہا' جہاں قلعہ بالکل سمندر کے کنارے اور پہاڑی کے نگر پر واقع تھا۔ یہاں سے ایک بہت بڑی رسی کے ذریعے پانی کے نیچے ایک کھوہ تک پہنچنے کا منصوبہ بنایا۔ انہیں اس کھوہ کا علم تھا اور خیال تھا کہ وہاں سے نیچے پہنچنے کی کوشش کی جائے گی تو کامیابی یقینی ہوگی۔

دوسری طرف نگرپر نکلنے کے بعد دونوں نے آہستہ آہستہ لیٹ کر کھسکنا شروع کردیا۔

کھوہ میں اترنے والے دونوں نائٹ اپنی کامیابی پر خوش تو بہت ہوئے مگر اس کھوہ سے نیچے سمندر تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد صبح تک دونوں میں سے ایک نیچے پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور اس شخص نے اپنے ساتھی کا دو ساعتیں انتظار کرنے کے بعد منگولوں کے پاس تنہا پہنچنے کا ارادہ کرلیا۔

بقیہ دو ٹکڑیاں پکڑی گئیں اور ان میں سے ایک کے پاس سے گرینڈ ماسٹر کا منگولوں کے نام خط بھی برآمد ہوگیا۔

اسی دوران میں گرینڈ ماسٹر نے سلطان سے صلح کی بات چیت شروع کردی۔ اس بات چیت سے اس کا مقصد تھا کہ وہ مسلمانوں کو باتوں میں لگائے رکھے اور اسی عرصے میں منگول اس کی مدد کو پہنچ جائیں۔

لیکن بیبرس نے چونکہ ان کے دو آدمی پکڑ لیے تھے اور ان کے پاس سے منگولوں کے نام لکھا خط بھی مل گیا تھا اس لیے وہ گرینڈ ماسٹر سے باتیں کرکے اپنا وقت نہیں برباد کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے گرینڈ ماسٹر کو یہ خبر بھی نہیں ہونے دی کہ اس کے چار آدمی پکڑے جاچکے ہیں اور وہ گرینڈ ماسٹر کے منصوبے سے آگاہ ہوچکا ہے۔

تیر کے ذریعے گرینڈ ماسٹر کو بیبرس نے جواب بھیج دیا۔ تیر کی نوک سے بندھے ہوئے سفید ریشمی کپڑے پر سلطان نے لکھا تھا "قلعے کا پھاٹک کھول دو اور ہمیں بہ امن و امان اندر آنے دو۔ اس کے بعد تم سب اپنے اموال اور اہل وعیال سمیت کسی تشدد یا ظلم سے محفوظ رہو گے لیکن اگر یہ قلعہ ہم نے طاقت سے سر کرلیا تو ہم کسی چیز کی بھی ضمانت نہیں دیں گے۔"

گرینڈ ماسٹر کو داہنی جانب کی نگر سے گر جانے والوں کا علم ہوگیا تھا لیکن جو چار دائیں بائیں کی فصیلوں کی دیواروں سے اتر کر پکڑے گئے تھے' ان کا گرینڈ ماسٹر کو علم نہیں تھا اور چونکہ بیبرس نے اپنے مختصر پیغام میں بھی ان کا ذکر نہیں کیا تھا اس لیے گرینڈ ماسٹر کو یہ خوش فہمی رہی کہ غالباً چھ نکل جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

جس طرح بیبرس نے تیر کے ذریعے اپنا پیغام بھیجا تھا اسی طرح گرینڈ ماسٹر نے اپنا جواب تیر کے ذریعے ہوا کے دوش پر روانہ کردیا۔

بیبرس نے اسے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا "آپ پہلے منجنیقوں کی سنگ باری کو روکیں۔ اس کے بعد قلعے کا پھاٹک کھلنے کی امید کریں۔ ہم ایک عرصے سے امن و صلح کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ قلعے کا پھاٹک کھول دیا جائے گا۔ آپ قلعے میں شوق سے داخل ہوجائیں۔ ہمیں خوش آمدید کہتا پائیں گے۔"

بیبرس نے جواب میں لکھا "میں سامنے کی سنگ باری روک دوں گا مگر قلعے کے دائیں بائیں سے سنگ باری جاری رہے گی۔ تم جتنی جلدی اپنے پھاٹک کا در کھول دو گے' اسی قدر تم اور تمہاری قوم فائدے میں رہے گی۔"

ایک دن اس قسم کی خط و کتابت اور مراسلت میں ضائع ہوگیا لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ اٹل تھے۔ کسی میں بھی لچک پیدا نہیں ہورہی تھی۔

دوسری طرف ایک نائٹ منگولوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

منگولوں نے اسے اپنے سردار کے پاس پہنچادیا۔ اس نے مختصر باتوں کے بعد پوچھا "اب تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

نائٹ نے پوری تفصیل بیان کردی اور کہا "اگر آپ ہم عیسائیوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کے عقب سے سلطانی لشکر پر حملہ کردیں۔ جب وہ تم سے لڑ رہے ہوں گے تو اسی وقت قلعے سے نکل کر عیسائی بھی بیبرس کی فوج پر حملہ آور ہوجائیں گے اور اسی طرح مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس جائیں گے۔"



منگولوں کے سردار نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ نائٹ کو اجنبی نظروں سے دیکھتا رہا۔

نائٹ کچھ دیر اپنے جواب کا انتظار کرتا رہا اور جب اس نے کچھ نہیں بولا تو پوچھا "آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

منگولوں کے سردار نے پوچھا "مجھ سے یہ مدد کون مانگ رہا ہے؟"

نائٹ نے جواب دیا "حسن الاکراد کا گرینڈ ماسٹر۔"

منگول نے پوچھا "یہ گرینڈ ماسٹر کیا ہوتا ہے؟"

نائٹ اسے کچھ دیر گرینڈ ماسٹر کے بارے میں بتاتا رہا اور منگول سردار کسی سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا "اس کا پاپائے اعظم سے کیا تعلق ہوتا ہے؟"

نائٹ نے کہا "ہم سب پاپائے اعظم کے تابع ہیں۔"

منگول سردار نے کہا "لیکن تمہارے پاپائے اعظم نے ہم سے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کردیا پھر اب تم گرینڈ ماسٹر کی طرف سے ہم سے مدد چاہتے ہو۔ اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

نائٹ نے کہا "اگر ہم تم لوگوں کے تعاون سے سلطان کو شکست دینے میں کامیاب ہوجائیں گے تو پاپائے اعظم بھی آپ سے معاملہ کرنے پر رضامند ہوجائیں گے۔"

منگول سردار نے پوچھا "اب تو ہمیں یہ بتا کہ غرض مند ہم ہیں یا تو؟"

نائٹ نے جواب دیا "اس وقت تو غرض مند ہم ہیں۔"

منگول سردار نے کہا "تب پھر تو واپس جاکیونکہ جب ہم غرض مند تھے تو پاپائے اعظم نے ہمیں واپس کردیا تھا اور اب تو غرض مند ہے تو ہم تجھے واپس کررہے ہیں۔"

نائٹ دیر تک خوشامدیں کرتا رہا مگر منگول سردار ذرا بھی نہیں پسیجا اور آخر کار نائٹ کو مایوس و ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

[illegible] آخری بار پوچھا "کیا مجھ سے پہلے بھی اسی غرض سے کوئی عیسائی یہاں آیا تھا؟"

اسے نفی میں جواب دیا گیا۔

اب واپسی میں اس نائٹ کو پھر یہ زحمت پیش آئی کہ وہ قلعے میں کس طرح داخل ہو۔

اس وقت تک دیواروں میں شگاف پڑ چکے تھے اور قلعے کے اندر عیسائیوں کی حالت نازک تھی۔

سلطان نے ایک بار پھر گرینڈ ماسٹر کو پیغام بھیجا "تجھے معلوم ہے کہ تیرے قلعے کی فصیل جواب دے چکی ہے اور میں کسی دن بھی قلعے میں داخل ہوجاؤں گا اس لیے اس وقت بھی میری وہی پیش کش ہے کہ تو قلعے کا پھاٹک کھول دے۔ تم سب کو امان دی جائے گی۔"

گرینڈ ماسٹر کو اس وقت ملال صرف اس بات پر تھا کہ اس قلعے کو ماضی میں صلاح الدین ایوبی بھی سر نہیں کرسکا تھا اور آج اس کی موجودگی میں سلطان بیبرس اسے قطعی فتح کرلے گا اور اس کی قومی تاریخ میں یہ شکست گرینڈ ماسٹر سے منسوب کی جائے گی۔

سلطان کی یہ آخری پیش کش بھی مشیروں اور نائٹوں کے سامنے رکھ دی گئی اور سب ہی نے یہ رائے دی کہ اب قلعے کا پھاٹک کھول دیا جائے اور سلطان کو اس وقت تک قبضہ نہ کرنے دیا جائے۔ جب تک ہمارا ایک بھی سپاہی زندہ موجود ہے۔

گرینڈ ماسٹر بہت فکر مند تھا۔ وہ سب کی رائے سے ذرا بھی متفق نہیں تھا۔ اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا "اگر میں تم لوگوں کو سلطانی لشکر کے سامنے پسپائیوں تو میرا خیال ہے کہ ایک بھی زندہ نہیں بچے گا اور سلطان اور اس کی فوج فاتحانہ شان سے اندر داخل ہوجائے گی۔"

سب ہی کو اس کا یقین تھا۔ آخر کار سب ہی نے یہ معاملہ گرینڈ ماسٹر کی صوابدید پر چھوڑ دیا اور تیر کی نوک سے باندھ کر سلطان کو گرینڈ ماسٹر کی طرف سے یہ پیغام بھیج دیا گیا کہ گرینڈ ماسٹر' سلطان سے مل کر قلعہ مسلمانوں کے حوالے کردے گا۔

سلطان نے منجنیقوں پر تعینات سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ فی الحال سنگ باری روک دیں کیونکہ قلعے دار پھاٹک سے نکل کر صلح کی بات کرنے آرہا ہے۔

قلعے کے پھاٹک کے سامنے منجنیقوں نے اپنا کام کرنا بند کردیا اور سلطان نے اپنے خیمے کے در پر کھڑے ہوکر کچھ دیر گرینڈ ماسٹر کا انتظار کیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد چھ عیسائیوں کے ساتھ گرینڈ ماسٹر سلطان کے خیمے کی طرف بڑھا اور سلطان نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ یہاں دونوں نے کچھ وقت مزاج پرسی میں لگایا اور کچھ وقت شکوے اور شکایت میں گزر گیا۔ آخر میں سلطان نے گرینڈ ماسٹر سے پوچھا "میں حیران ہوں کہ تم لوگ کس امید پر قلعے کا پھاٹک نہیں کھولتے۔ تم حسن الاکراد کو ناقابل تسخیر سمجھتے ہو اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس دنیا میں ناقابل تسخیر کوئی قلعہ' کوئی شہر' کوئی در نہیں۔ تم لوگ دو چار دن میں اس قلعے کو جگہ جگہ سے شکستہ اور پھر کھنڈر میں منتقل ہوتا ہوا دیکھ لو گے۔ تمہارا بادشاہ لوئی بڑی توقعات لے کر ٹیونس پہنچا تھا مگر اس ناقابل تسخیر شخص کی فوج کو لڑے بغیر ہی عبرت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ قلعے کی مضبوطی' قلعے کی حفاظت کرنے والوں کے حوصلوں کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ میں اس قلعے کو دو چار دن میں فتح کرلوں گا۔ تم نے بلاوجہ منگولوں کو زحمت دی۔"

گرینڈ ماسٹر نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ "میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔ ہم نے منگولوں سے کوئی مدد نہیں چاہی پھر آپ مجھ پر الزام کیوں لگا رہے ہیں؟"

سلطان نے کہا "یوں تو جھوٹ بولنا کسی کے لیے بھی مناسب نہیں مگر تجھ جیسا معتبر آدمی جھوٹ کا سہارا لے تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔"

گرینڈ ماسٹر نے تعجب سے کہا "میں اب بھی آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

سلطان نے نرمی سے کہا "میری باتوں کا مطلب کچھ دیر بعد سمجھ میں آجائے گا اور اب تو ہمیں یہ بتا کہ تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

گرینڈ ماسٹر نے جواب دیا "آپ اپنی منجنیقوں سے سنگ باری بند کرادیں۔ میں قلعے کا پھاٹک کھلوا دوں گا۔"

سلطان نے کہا "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ شکستہ دیواریں کسی وقت بھی گر جائیں گی اور ہم سب کئی راستوں سے اندر داخل ہو جائیں گے۔"

گرینڈ ماسٹر نے کہا "آپ مجھے مایوس نہ کریں۔"

سلطان نے جواب دیا "میں تجھے مایوس نہیں کر رہا ہوں بلکہ امر واقعہ بیان کر رہا ہوں۔"

گرینڈ ماسٹر نے کہا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب اس قلعے کو فوج کشی سے سر کر لیا جائے گا اور یہاں قتل عام ہوگا۔ مکانات لٹ جائیں گے، عمارتوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا اور بہتوں کو غلام بنا کے انسانی منڈیوں میں فروخت کر دیا جائے گا۔"

سلطان نے کہا "ہاں ہونا تو یہی چاہیے۔ یہاں وقت کی بڑی اہمیت، بڑی قیمت ہوتی ہے۔ صحیح وقت پر صحیح کام، اسی سے انسان کامیابیاں حاصل کرتا ہے لیکن تو غلط وقت پر صحیح کام کرنا چاہتا ہے۔"

گرینڈ ماسٹر نے آنسو بہانے شروع کر دیے اور کہا "میرے یہ آنسو میری بے بسی یا شکست خوردگی کے نہیں بلکہ مجھے اپنی قوم پر رونا آرہا ہے جس کے بہت سے لوگ قتل کر دیے جائیں گے اور بہت سے غلام بنا کے بیچ دیے جائیں گے۔"

سلطان نے کچھ دیر خاموشی اختیار کیے رکھی۔

جو نائٹ گرینڈ ماسٹر کے ساتھ آئے تھے، وہ بھی افسردہ ہو گئے تھے۔

یکایک سلطان اٹھا اور دوسرے خیمے میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی گرینڈ ماسٹر نے نائٹوں سے پوچھا "بتاؤ اب ہم کیا کریں؟"

ایک نائٹ نے غصے میں کہا "جناب! دس ہزار جنگ جو قلعے میں موجود ہیں۔ اب ہمیں یوں آسانی سے قلعہ خالی نہیں کرنا چاہیے اور میں تو ہر وقت جان دینے کے لیے تیار ہوں۔"

گرینڈ ماسٹر نے اسے جھڑک دیا۔ "بے مقصد جان دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمارے دس ہزار جنگ جو سلطانی فوج کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

اچانک سلطان واپس آگیا اور کہا "مبارک ہو مشیروں نے تیرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ تو پھاٹک کھلوا دے اور یہ اعلان کروا دے کہ اس قلعے پر سلطان بیبرس کا قبضہ ہونے والا ہے اس لیے جو لوگ یہاں سے نکل جانا چاہیں انہیں نہ تو کوئی گزند پہنچے گا اور نہ کوئی روکے گا۔ وہ اپنے ساتھ سامان بھی لے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

گرینڈ ماسٹر نے بات کاٹ دی "بس بس، ہمارے لیے بہت کافی ہے۔ اب میں واپس جا کے یہ سارے اعلانات قلعے والوں کے سامنے کروں گا۔ جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو آپ اس قلعے سے کیا سلوک کریں گے؟"

مگر سلطان نے مزید سوال و جواب اور بکواس سے منع کیا۔

جب گرینڈ ماسٹر اپنے نائٹوں کے ساتھ سلطان سے مل کر اپنے قلعے میں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے اس وفد کے چار عیسائی نائٹ موجود تھے جنہیں منگولوں کے سردار کے پاس بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

گرینڈ ماسٹر نے حیرت سے پوچھا "کیا تم چاروں منگولوں سے بات کر آئے؟ کیا ہوا؟ وہ کب یہاں تک پہنچیں گے؟"

ایک نائٹ نے سب کی ناکامی کو تفصیل بیان کر دیا اور کہا "ہم چاروں تو اسی دن سے سلطان کی قید میں ہیں۔ منگولوں کے سردار کے پاس جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

اب گرینڈ ماسٹر کو معلوم ہوا کہ سلطان اس سے کون سا جھوٹ منسوب کر رہا تھا۔

اس روز پھاٹک نہیں کھلا لیکن سلطان نے منجنیقوں کو سنگ باری کرنے سے روک دیا کیونکہ سلطان کو گرینڈ ماسٹر کی باتوں پر یقین آگیا تھا کہ وہ پھاٹک کھلوا دے گا۔

فلاؤن نے رات کو مشعلوں کی روشنی میں قلعے کے سامنے سے گزر کر دیکھا۔ وہ اس وقت بھی بند تھا۔ فلاؤن فصیلوں کے ان حصوں کو قریب سے دیکھتا رہا جب بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔

رات کے اندھیرے میں مشعلوں کی روشنی بہت زیادہ کام نہیں دے رہی تھی مگر اس کے باوجود دیواروں میں جہاں جہاں شگاف پڑ گئے تھے، وہ دور ہی سے صاف نظر آرہے تھے۔

فلاؤن نے قلعے اور فصیلوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے



بعد بیبرس کو بتایا "ہم کسی معاہدے کے بغیر قلعے میں داخل ہو سکتے ہیں اس لیے قلعے والوں سے کوئی معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بیبرس نے فلاؤن کو سمجھایا "تجھے نہیں معلوم کہ یہ قلعے والے منگولوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ منگول خود بھی عیسائیوں سے معاہدہ کر کے یروشلم چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں منگولوں اور عیسائیوں کے اتحاد کے پیش نظر اپنی فوجی قوت محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ قلعے میں دس ہزار عیسائی جنگ جو موجود ہیں۔ اگر انہیں ہمارے مقابلے پر آنا پڑ گیا تو بہت سے سپاہی قتل ہوں گے اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ باتوں اور ڈراموں سے مل جانے والا قلعہ تلوار سے حاصل کروں۔"

فلاؤن نے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ گرینڈ ماسٹر لڑے بغیر اپنا قلعہ ہمارے حوالے کر دے گا؟"

بیبرس نے بڑے اطمینان اور وثوق سے کہا "میں نے گرینڈ ماسٹر کو بے حد غرض مند محسوس کیا ہے۔ وہ ہم سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے خود اندازہ لگا لیا ہے کہ ہماری منجنیقوں نے فصیلوں میں شگاف ڈال دیے ہیں اور وہ گئے منگول تو وہ گرینڈ ماسٹر سے پاپائے اعظم کی مرضی کے خلاف کوئی معاہدہ نہیں کر سکتے۔"

فلاؤن نے مایوسی سے کہا "میں نے تو ہی سمجھے قلعے کے تینوں اطراف گھوم پھر کے دیکھا اور ہم کہیں سے بھی بہ آسانی اندر داخل ہو سکتے ہیں۔"

بیبرس نے جواب دیا "میں تیری رائے یا خیال کو غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہم نے گرینڈ ماسٹر سے جو بات کر لی ہے، ہمیں اس کی پابندی کرنی چاہیے۔"

فلاؤن نے بیبرس سے اتفاق نہیں کیا، کہنے لگا "جناب! صاف گوئی کی معافی، مگر میں یہود و نصاریٰ پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے معاملے میں بے اصول اور تنگ نظر ہیں۔"

بیبرس نے فلاؤن سے زیادہ بحث کرنا فضول سمجھا اور کہا "فی الحال تم فجر کی نماز کے بعد فوج کو قلعے میں داخل ہونے کے لیے تیار رکھو۔"

فلاؤن چلا گیا اور جو لوگ بیدار تھے، انہیں بتا دیا کہ فجر کے بعد قلعے میں داخلے کے لیے خود تیار رہیں اور جو سو چکے ہیں، انہیں فجر کے وقت اس منصوبے کے بارے میں بتا دیا جائے۔

وہ رات بڑی بے چینی میں گزری اور صبح فجر کی نماز کے بعد یہ فوج قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے حصن الاکراد کے سامنے پہنچ گئی۔

لیکن حیرت یہ تھی کہ خود بیبرس غائب تھا۔

فلاؤن نے سوچا کہ اگر وہ اپنی فوج کو لے کر بیبرس کے بغیر قلعے کے سامنے پہنچا تو گرینڈ ماسٹر اسے داخلے کی اجازت نہیں دے گا اس لیے اس وقت بیبرس کی موجودگی بہت ضروری ہے۔

لوگوں نے بیبرس کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

کسی نے بتایا کہ فجر سے پہلے سلطان کہیں چلا گیا اس لیے اس کی پروا کیے بغیر ہمیں قلعے میں داخل ہو جانا چاہیے۔

فلاؤن آگے آگے چلتا ہوا قلعے کے سامنے پہنچ گیا اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے پھاٹک پر زور زور سے دستک دی اور حکم دیا "حسب معاہدہ پھاٹک کھول دو۔"

پھاٹک تو نہیں کھلا مگر پھاٹک کے چھوٹے دروازے سے کس نے سر نکال کے پوچھا "کیا بات ہے؟ پھاٹک کو کیوں اور کس کے لیے کھول دیا جائے؟"

ابھی اس کا یہ فقرہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ پھاٹک کھول دیا گیا اور فلاؤن کا مارے خوشی کے بُرا حال ہو گیا۔ اسے اس وقت یہ اعزاز حاصل ہو گیا تھا کہ وہ بیبرس سے پہلے فاتح کی حیثیت سے قلعے میں داخل ہو رہا ہے۔

لیکن اندر داخل ہوتے ہی اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں بیبرس، گرینڈ ماسٹر کے ساتھ کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس وقت پیدل تھا۔ گھوڑے کو معلوم نہیں کہاں کھڑا کر دیا گیا تھا۔

فلاؤن کو دیکھتے ہی بیبرس نے پوچھا "اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

فلاؤن نے جواب دیا "میں تو یہاں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تھا مگر یہ پھاٹک کھولنے میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔"

بیبرس نے کہا "میں تو تم سے بہت پہلے کا آیا ہوا ہوں اور میری ایک دستک پر قلعے کا پھاٹک کھل گیا تھا۔"

فلاؤن نے پیچھے مڑ کر اپنی فوج کو اشاروں میں حکم دیا کہ وہ قلعے میں داخل ہو جائے۔

فوج کو قلعے میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک گھنٹا لگا اور اس ایک گھنٹے میں سورج کچھ بلندی پر آگیا تھا۔

فوج کو قلعے کے اندر ایک طرف میدان میں جمع ہو جانے کا حکم دیا گیا اور یہ فوجی قلعے کے وسیع و عریض میدان میں قطار در قطار کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر بعد گرینڈ ماسٹر فلاؤن سے ملا اور دریافت کیا۔ "آپ کی پوری فوج قلعے میں داخل ہو گئی؟"

فلاؤن نے جواب دیا "نہیں، بیشتر فوج ابھی اپنے ٹھکانوں پر ہے۔ جتنی فوج میری ماتحتی میں تھی، وہ ساری قلعے

میں داخل ہو چکی ہے۔"

فلاؤن' بیبرس کو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا وہ پھر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

فلاؤن اپنی فوج کے ساتھ کھڑا ہوا بیبرس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو اس سے دریافت کیا جائے کہ اس قلعے میں ایک جگہ کھڑے ہو کے تو کام انجام نہیں دیا جا سکتا اور اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

لیکن اسی وقت اس کی نظر قلعے کے اس راستے پر پڑی جو اندر دور تک کہیں چلا گیا تھا۔

اندر سے عیسائی پانچ چھ قطاروں میں اس طرح اس کی طرف چلے آ رہے تھے کہ کسی کے گدھے پر بہت سا سامان لدا ہوا تھا اور اس کے ساتھ کوئی پیدل آدمی چل رہا تھا۔ بہت سے لوگ گھوڑوں پر سوار تھے اور اس کے پیچھے پیچھے سامان سے لدی ہوئی گاڑیاں چلی آ رہی تھیں اور اس ماحول کو دیکھتے ہی پہلی نظر میں آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ قلعے کے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں۔

ان کے بہت پیچھے سے بیبرس بھی مسافر کی طرح نمودار ہوا۔ وہ ان نقل مکانی کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ بیبرس نے قلعے کے مکینوں کو اجازت دے دی تھی کہ اب یہ قلعہ مسلمانوں کی تحویل میں چلا جائے گا اس لیے جو عیسائی مسلمانوں میں خود کو غیر محفوظ سمجھیں' وہ قلعے کو خالی کر کے کہیں اور چلے جائیں۔"

دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بیبرس کی فوج اندر اور باہر کھڑی ان نقل مکانی کرنے والوں کو دیکھتی رہی۔

ان جانے والوں میں بیشتر مغموم اور آبدیدہ تھے اور قلعے سے نکلنے کے بعد پلٹ پلٹ کر قلعے کو دیکھ رہے تھے۔ بعض سسکیاں لے رہے تھے۔ گرینڈ ماسٹر بھی قلعے کے باہر کھڑا جانے والوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی کوئی گرینڈ ماسٹر کو برا بھلا کہہ کے آگے بڑھ جاتا تھا۔

تاتوں نے اپنے گھوڑوں پر اس طرح سفری روش اختیار کی کہ ان کے جسم پر ایک ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ان کو نہتا کر دیا گیا ہو۔

سہ پہر تک قلعے کی آبادی کا انخلا ہو گیا اور اب فلاؤن نے اپنے طور پر قلعے میں گھوم پھر کے یہ دیکھنا شروع کیا کہ سب کے چلے جانے کے بعد یہاں باقی کیا بچا؟

وہاں قلعے کے پس ماندہ غریب لوگ باقی رہ گئے تھے کیونکہ ان کے پاس جو معمولی سامان تھا' انہیں اس کے لیے بار برداری کے جانور میسر نہ تھے۔

بیبرس نقل مکانی کرنے والوں کے ساتھ قلعے کے باہر نکل گیا اور وہ ان سب کو طرابلس کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جہاں انطاکیہ کا سابق حکمران بوہمنڈ سلطان سے خوف زدہ گوشہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔ سلطان نے دو پادریوں کو بوہمنڈ کے نام پیغام دیا کہ کاؤنٹ بوہمنڈ سے کہہ دینا کہ اب میں اس کے پڑوس میں آ گیا ہوں' اگر وہ گوشہ نشینی ترک کر دے تو ملاقات ہو سکتی ہے۔

طرابلس کے باہر جو علاقہ اب بھی بوہمنڈ کے قبضے میں تھا' وہاں اس وقت بھی فصیلیں تیار کھڑی تھیں۔

سلطان بیبرس شام تک نقل مکانی کرنے والوں کو دیکھتا رہا کیونکہ الاکراد سے نکلنے والے عیسائیوں نے قلعے کے باہر میدان میں وقتی طور پر قیام کر لیا تھا اور یہاں سودا سلف روی سے سفر کر رہے تھے۔

سلطان بیبرس نے ان پر رحم کھا کے اعلان کیا "تم میں سے جو اب بھی قلعے میں واپس جانا چاہے' واپس جا سکتا ہے۔"

شاید کچھ لوگ قلعے میں واپس چلے جاتے مگر پادریوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہرگز قلعے میں واپس نہ جائیں۔ پادریوں نے ان کو سمجھایا "یاد رکھو' اگر تم قلعے میں واپس گئے تو چند دنوں کے بعد سلطان تمہیں بزورِ شمشیر مسلمان کر لے گا۔"

کئی عیسائیوں نے ان پادریوں کو احساس دلایا "مقدس باپ! آپ ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے جو اس وقت بھی قلعے میں موجود ہیں۔"

ایک پادری نے کہا "وہ ہمارے ساتھ آنے کے لیے تیار تھے مگر ان کے پاس بار برداری کے لیے مویشی نہیں ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی قلعہ چھوڑ دیں گے۔"

سلطان نے ان ورغلانے والے پادریوں سے کہا "تم لوگوں نے صلیبی جنگیں شروع کروائیں اور اپنی قوم کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ تم انہیں آزادی سے فیصلہ کرنے دو۔ میں مذہب کے معاملے میں تلوار اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے دفاع کے لیے تلوار اٹھائی ہے۔ تم لوگوں نے کسی مسلمان کو عیسائیوں میں تبلیغ کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہو گا پھر تم اپنے آدمیوں کو یہ کہہ کر کیوں ورغلاتے ہو کہ ہم مسلمان انہیں تلوار کے زور سے مسلمان کر لیں گے۔"

پادریوں نے سلطان کے اس اعتراض کو خاموشی سے برداشت کر لیا۔

گرینڈ ماسٹر ابھی تک موجود تھا۔

سلطان نے گرینڈ ماسٹر کو مخاطب کیا "تم انہیں سمجھاؤ کہ یہ ہم مسلمانوں کے خلاف ورغلانا بند کر دیں۔"

گرینڈ ماسٹر نے معذوری ظاہر کی "میں اگر انہیں منع بھی



کروں گا تب بھی یہ باز نہیں آئیں گے۔"

شام کے وقت سلطان قلعے میں واپس آیا اور قلعے کی فتح کی خوشی میں متعلق ایک پتھر تیار کروایا۔ جسے قلعے کے در پر بالائی حصے میں نصب کروا دیا گیا۔

رات کو مشعلوں کی روشنی میں قلعے کی شکستہ دیواروں کی مرمت کا کام شروع کروا دیا گیا۔ سلطان کو بڑی جلدی تھی۔ وہ اپنے اس کام بہت جلدی جلدی نمٹا دینا چاہتا تھا کیونکہ اسے مکاؤ میں انگلستان کے شہزادے ایڈورڈ کی موجودگی کا علم تھا اور وہ چونکہ کسی منصوبے کے بغیر مکاؤ میں قیام پذیر تھا اس سے سلطان کو یہ شبہ گزرا کہ شاید ایڈورڈ صلیبیوں کی کسی فوج کا انتظار کر رہا ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو سلطان کے لیے حصن الاکراد پر قبضہ برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

قلعے کی شکستہ فصیلوں پر کئی دن تک کام ہوتا رہا اور اس کام کی نگرانی سلطان بیبرس نے خود کی۔

فلاؤن نے سلطان کے ہر کام کو بہت غور سے دیکھا اور اسے سمجھنے کی بھی کوشش کی۔

اسی دوران میں اسے بتایا گیا کہ بیبس کہیں اس قلعے میں یا چٹانوں کا ایک سردار ہبرو آف ریول بھی رہتا ہے۔ سلطان نے ایک نقل مکانی کرنے والے عیسائیوں کے ذریعے اس کو ایک پیغام بھیجا "ہبرو آف ریول کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ناتوں کے تمام قابل تسخیر قلعے حصن الاکراد کو فتح کر لیا ہے۔ اس کے بیشتر مکین نقل مکانی کر گئے۔ اب مجھے تم سے بھی بہت جلد ملاقات کرنی ہے۔"

دوسرا خط طرابلس کے بوہمنڈ کو لکھا "کاؤنٹ بوہمنڈ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ حصن الاکراد میرے قبضے میں ہے اور اب میں تمہارا پڑوسی بھی ہوں لیکن افسوس کہ تم نے میری خبر تک نہیں لی حالانکہ یہاں کے تم میزبان ہو اور میں تمہارا مہمان۔ تمہاری سرد مہری کے پیش نظر میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے نیشکر کے کھیتوں سے اپنے لیے نیشکر لے لوں اور جن باغات میں پھل پائے جاتے ہیں' انہیں بھی تمہاری اجازت کے بغیر اپنی فوج کے لیے لے لیا جائے۔"

واقعی سلطان نے نیشکر اور پھل اپنی فوج کے لیے حاصل کر لیے جب کہ بوہمنڈ سلطان کی اس حرکت کو معاہدے کے خلاف سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان نے ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ جس کی رو سے وہ بوہمنڈ کے علاقوں سے اپنی مرضی کے مطابق نیشکر اور پھل لے جائے۔

بوہمنڈ نے سلطان کو لکھا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم دونوں میں آج تک ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا جس کی رو سے سلطان کو نیشکر اور پھل حاصل کرنے کا حق مل گیا ہو۔"

سلطان نے جو کچھ کیا' وہ ایک طرح سے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔"

جو عیسائی وفد بوہمنڈ کا یہ خط لے کر سلطان سے ملا تھا' سلطان اس سے بہت اچھی طرح پیش آیا اور اس سے بوہمنڈ کے بارے میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔

سلطان کو بوہمنڈ کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ اسے شکار کھیلنے کا بہت شوق ہے مگر اطاکیہ سے نکل جانے کی بعد اس پر سلطان کی ایسی دہشت بیٹھی کہ وہ اپنے محل سے نکلتے ہوئے ڈر محسوس کرتا رہا اور اپنے شکاری مشغلے سے باز آ گیا۔

سلطان نے بوہمنڈ کے وفد سے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ بوہمنڈ کو شکار کا بہت شوق ہے؟"

وفد نے جواب دیا "بہت زیادہ مگر ادھر کئی سالوں سے وہ طرابلس سے باہر نکلنا تو بہت دور کی بات ہے' اپنے محل سے بھی باہر نہیں نکلا۔"

بیبرس نے پوچھا "اس کی وجہ؟"

وفد کے ارکان نے جواب دیا "وجہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اچھی طرح واقف ہیں۔"

بیبرس نے کہا "میں بوہمنڈ کے لیے ایک باز کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس سے کہنا کہ شکار کا سلسلہ جاری رکھے۔ کچھ نہیں تو وہ اس باز کا شکار کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فصلوں اور باغوں کے بارے بوہمنڈ کو بتا دینا کہ پہلے تو میرا خیال تھا کہ ایک بار نیشکر اور پھل حاصل کر کے باز رہا جائے لیکن اب بوہمنڈ نے مجھ سے جواب طلب کر کے مجھے گویا اجازت دے دی ہے لہٰذا اب میں ہر سال ان چیزوں کی وصولیابی کے لیے آیا کروں گا۔"

بوہمنڈ کا وفد واپس چلا گیا اور بوہمنڈ نے سلطان کے پیغام سے بڑی کوفت محسوس کی۔ اسے لوگوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قرطاجنہ میں لوئی ناکام ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہے اور انگلستان کا شہزادہ ایڈورڈ صلیبی جنگ کے لیے مکاؤ میں مقیم چالیس آنجو کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا بوہمنڈ کے لیے یہ بہت اچھی خبریں تھیں۔

اس نے درپردہ نہایت ہوشیاری سے ایڈورڈ کو پیغام بھیجا اور درخواست کی کہ وہ سلطان بیبرس نامی مصیبت کو صلیبی مجاہدین کے ذریعے یہاں سے دفع کروا دے اور یروشلم پر قبضہ کر لے۔

سلطان کے آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے تھے چنانچہ اسے بوہمنڈ کے خط کا بھی علم ہو گیا اور وہ اب ایڈورڈ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے آدمی عکا بھی پہنچ گئے اور ایڈورڈ کے بارے میں غیر معمولی معلومات لے آئے۔

سلطان نے بالواسطہ ایڈورڈ کو پیغام بھیجا کہ وہ انگلستان واپس چلا جائے کیونکہ یہاں ٹھہر کے وہ مسلمانوں کو یروشلم سے نکال نہیں سکتا۔ "تم لوگوں نے مسلسل ناکامیوں کے باوجود یروشلم کا خیال خام دل سے نہیں نکالا۔ انگلستان واپس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوئی کی طرح تمہیں بھی اپنا وطن دیکھنا نصیب نہ ہو۔"

ایڈورڈ کو اس بالواسطہ پیغام نے بہت زیادہ مشتعل کردیا۔ وہ نوجوان ہونے کے ساتھ ہی حد درجہ مذہبی بھی تھا اور اسے خوابوں میں یہ بشارت دی جارہی تھی کہ یروشلم کو ایڈورڈ ہی مسلمانوں کے قبضے سے نجات دلوائے گا۔

ایڈورڈ کو غیر ارادی طور پر چارلس آنجو کا انتظار تھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایڈورڈ کی بیوی ایلینار اس کے ساتھ تھی اور اس نے مشرق میں آکے جو کچھ دیکھا تھا' اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہاں بڑی بڑی سلطنتیں مسلمانوں کے مقابلے سے قاصر تھیں پھر تھوڑی سی فوج رکھنے والا ایڈورڈ یروشلم کو کس طرح فتح کرلے گا۔

اس نے ایڈورڈ کو کئی بار سمجھایا کہ وہ لوئی کے بعد یہاں اپنا وقت نہ ضائع کرے۔

ایلینار شوہر کو بہت زیادہ چاہتی تھی اسی لیے وہ یہاں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی تھی اور شوہر پر مسلسل دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ بھی یہاں اپنا وقت نہ ضائع کرے۔

لیکن ایڈورڈ معلوم نہیں کس نشے میں تھا کہ واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا اور وہ مسلمانوں کو بہت حقیر اور معمولی سمجھ رہا تھا۔

اسی دوران میں فدائیوں نے بھی پر پرزے نکالے' وہ اپنے پُراسرار طریقوں سے اپنے دشمنوں کا صفایا کرتے پھر رہے تھے۔

ایڈورڈ بھی پیچش میں مبتلا ہوگیا اور شاہی طبیبوں نے مشورہ دیا کہ شہزادے کو انگلستان واپس جاکے علاج کروانا چاہیے لیکن ایڈورڈ اس پر تیار نہیں ہوا۔

اسے مشرق میں آنے کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مسلمان بہت جری ہوتے ہیں اور علم و تمدن میں مسلمان سب سے آگے ہیں۔

وہ عکا کے قلعے میں یہاں کے قدیم رہنے والوں سے مسلمانوں کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا اور جب کوئی نائٹ ایڈورڈ کو بتاتا کہ مسلمانوں سے یروشلم چھیننا ناممکن ہے تو ایڈورڈ کو غصہ آجاتا۔ وہ یروشلم اور خداوند مسیح کی قسم کھاکر کہتا "میں یروشلم مسلمانوں سے چھین کے دکھادوں گا۔"

عکا کے قلعے میں جو نائٹ تھے' وہ کچھ دن ایڈورڈ کی شیخیاں برداشت کرتے رہے مگر جب یہاں سلطان بالواسطہ پیغام پہنچا تو نائٹوں نے کہا "آپ کے اور ہم سب کے لیے بہتر یہی ہے کہ آپ فوراً انگلستان واپس چلے جائیں۔"

ایڈورڈ نے اپنے خدمت گار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے پرجوش لہجے میں کہا "اگر میری فوج بھی میرا ساتھ چھوڑ دے تو میں اپنے اس خدمت گار کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کروں گا کیونکہ پیچھے ہٹنا اور مسلمانوں سے خوف زدہ ہونا میرے لیے سب سے زیادہ بے عزتی کی بات ہے۔"

ایک نائٹ نے طنز کیا "جناب! اس قسم کی باتیں میں پہلے بھی سنتا رہا ہوں لیکن کسی کو بھی میں نے مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب ہوتے نہیں دیکھا۔"

ایڈورڈ کو جنون کی حد تک غصہ چڑھ رہا تھا کہا "لیکن میں ان سب سے مختلف ہوں' اگر مقابلے کا موقع ملا تو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے سچ ثابت کردکھاؤں گا۔"

نائٹ نے منگولوں کا ذکر کیا "شہزادے! آپ نے منگولوں کا ذکر تو سنا ہوگا۔ آج دنیا میں ان کی فوجی قوت کا کوئی جواب نہیں اور ابھی کچھ دنوں پہلے تک ان کے لیے یہ قول مشہور تھا کہ منگول ناقابلِ شکست ہیں لیکن انہی منگولوں کو بیبرس نے ایسی شکست فاش دی کہ ان کا بھرم خاک میں مل گیا اور اب منگول کم از کم مسلمانوں کے لیے ناقابلِ شکست نہیں رہے۔ جس سلطان نے منگولوں کو شکست دے دی' عیسائی اس کے لیے کچھ بھی نہیں۔ انگلستان واپس جائیں اور بڑی تیاری کرکے واپس آئیں تو شاید کچھ بات بن جائے۔"

ایڈورڈ نے نائٹوں کی کم ہمتی پر افسوس کیا "تم لوگ تو نائٹ ہو۔ تمہیں ایسی بزدلی کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

نائٹ نے جواب دیا "آپ جن باتوں کو بزدلی کی باتیں قرار دے رہے ہیں' وہ باتیں نہیں واقعہ ہے۔ سلطان بیبرس ناقابلِ تسخیر ہے۔"

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ ایڈورڈ کو بتایا گیا "جناب! چند منگول آپ سے اتحاد اور تعاون کی بات کرنے آئے ہیں۔"

ایڈورڈ نے فوراً انہیں بلوالیا۔ یہ منگول تبریز سے یہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے ایڈورڈ کو بتایا۔ "تم لوگ سالہا سال سے یروشلم کی تسخیر کا خواب دیکھ رہے ہو مگر ناکام ہو پھر تم لوگ ہم سے معاہدہ کیوں نہیں کرتے؟ ہم تمہیں یروشلم دلوادیں گے۔"

ایڈورڈ نے پوچھا "معاہدے کی شرائط کیا ہوں گی؟ اور



اس معاہدے سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ اور ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟"

ایڈورڈ نے منگولوں کے سامنے یہ سوال رکھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور کچھ دیر بعد جواب دیا "ہم یروشلم فتح کرکے تم کو دے دیں گے لیکن یہاں کے بقیہ جو بھی شہر فتح کیے جائیں گے' انہیں تمہارے حوالے نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ ہمارے مقبوضات کہلائیں گے۔"

ایڈورڈ نے کچھ دیر غور و فکر سے کام لیا اور کہا "نہیں' جب ہماری فوجیں تمہاری فوجوں کے ساتھ لڑیں گی تو دونوں کو برابری فائدہ پہنچنا چاہیے۔"

منگول نمائندے نے پوچھا "تم ہمیں کتنی فوج فراہم کرو گے؟"

ایڈورڈ نے کہا "یہاں تو میرے پاس زیادہ فوج نہیں ہے۔ پہلے میں انگلستان جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر آگاہ کروں گا کہ میں کتنے سپاہیوں کی مدد فراہم کرسکتا ہوں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک نائٹ نے یہاں بیٹھے ہوئے نائٹوں سے باری باری ان کے کان میں کچھ کہا اور یہ سب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

منگولوں نے پوچھا "یہ باہر کیوں چلے گئے؟"

ایڈورڈ نے جواب دیا "یہ ان کے راز کی کوئی بات ہوگی اور وہی اس سوال کا مختصر جواب دے سکتے ہیں۔"

منگولوں نے شہزادے سے کہا "جب معاملات صاف ہوجائیں اور تم انگلستان پہنچ کے فوج جمع کرلو تو ہمیں آگاہ کردینا۔ ہم آناً فاناً مطلوبہ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔"

اسی وقت دو نائٹ اندر داخل ہوئے اور ایڈورڈ اور منگولوں کو بتایا "یہ کتنے اتفاق کی بات ہے کہ آپ لوگ یہاں آپس میں معاہدے اور تعاون کی بات کررہے ہیں تو اسی وقت سلطان کے آدمی بھی تم دونوں سے باتیں کرنے کے لیے آگئے ہیں۔ وہ بھی اسی نازک مسئلے پر بات کریں گے۔"

اب منگول اور ایڈورڈ دونوں ہی مستعد اور چاق و چوبند نظر آنے لگے۔

سلطانی نمائندے دونوں سے مخاطب ہوئے "ہم سلطان کی طرف سے تم دونوں کے لیے یہ تنبیہ لے کر آئے ہیں کہ تم دونوں کو مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا اتحاد نہیں کرنا چاہیے۔ اگر منگولوں نے عیسائیوں سے ہمارے خلاف معاہدہ کیا تو ہم اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ سمجھیں گے اور پھر ہم شہزادہ ایڈورڈ کو بھی میدان جنگ میں کھینچ لیں گے اس لیے تم دونوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے سے کوئی معاہدہ نہ کرو۔"

ایک منگول نے غصے میں کہا "تم اپنے سلطان سے کہو کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں رہے' کیونکہ سلطان کی نظر میں ہم وحشیوں کا بظاہر کوئی خاص مقام نہیں جب کہ انہی وحشیوں نے خلافت عباسیہ کو خاک میں ملادیا اور یہی منگول وحشی تھے جنہوں نے خوارزم شاہی سلطنت خاتمہ کردیا۔ قطبوغا کو اتفاقیہ شکست ہوگئی ورنہ منگول آج بھی ناقابلِ شکست ہیں۔"

مسلمان نمائندے چیخی سے گریز کررہے تھے۔ جواب دیا۔ "تم منگول ہماری بات ابھی سمجھ نہیں رہے ہو۔ ہمیں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتے کہ یہ دوستی اور معاہدہ جو مسلمانوں کے خلاف کیا جارہا ہے' اس سے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

شہزادہ ایڈورڈ اپنی اندرونی کیفیت چھپانا چاہتا تھا مگر وہ چہرے سے عیاں تھی۔ اس وقت وہ سلطانی نمائندے سے خوف محسوس کررہا تھا کیونکہ اس کے لیے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ تین مسلمان بیک وقت ایڈورڈ اور منگولوں کو دھمکی دے رہے تھے۔

منگولوں نے سلطان کو پیغام دیا "قراقرم کے خاقان نے سلطان کو پیغام بھیجا ہے کہ اب اس کی حکومت کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ عن قریب تبریز کو قراقرم کی مدد پہنچ جائے گی اس لیے اب سلطان کو زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے سے گریز کرنا چاہیے۔ مصر منگولوں کی ہٹ والی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔"

ایک مسلم نمائندے نے کہا "تم قراقرم کو پیغام بھیج دو کہ خاقان جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' وہ بصد شوق کرے اور ادھر ہماری اسلامی سلطنت خود بھی منگولوں کو تبریز سے نکالنے کی فکر میں ہے۔"

ایڈورڈ کو خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں مسلم نمائندوں کا رخ اس کی طرف نہ ہوجائے۔ ایسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بھی لوئی کی طرح یہیں پیوند خاک ہوجانا پڑے گا۔

منگول وفد بھی سلطان کے وفد سے پریشان ہو کر یہاں سے گیا تھا اسے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اب ان علاقوں میں جنگ کئی محاذوں پر چھڑ سکتی ہے۔

لیکن ایڈورڈ کی بیوی اب مسلسل دباؤ ڈال رہی تھی کہ انگلستان واپس چلنا چاہیے۔

منگول تبریز چلے گئے اور سلطان کا سہ رکنی وفد حصن الاکراد واپس گیا۔

تبریز کے منگول حکمران کو افسوس ہوا کہ اسے سلطان کی طرف سے دھمکی دی گئی تھی اور ایڈورڈ کھلے دل سے واضح انداز میں تعاون کرنے سے عاری تھا اور عیسائیوں کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے وہ یہاں تنہا ہوگئے تھے۔

سلطان کو جب ایڈورڈ اور منگولوں کے درمیان مشکوک مشتبہ اور متذبذب معاہدے کا حال معلوم ہوا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کی طاقت اور حیثیت اپنا کام کر گئی اور ایڈورڈ کبھی بھی منگولوں سے معاہدہ نہیں کرے گا۔

اسی دوران میں آخری شیخ الجبال کا ایک نمائندہ سلطان سے ملا۔

حالانکہ شیخ الجبال کو ہلاکو خان نے ختم کر دیا تھا لیکن وہ باطنی مذہب کو نہیں ختم کر سکا تھا۔ یہ لوگ اب بھی چوری چھپے اپنے کام میں مشغول تھے۔ ان کے فدائی نظر نہ آنے والے شیخ کے احکام کی دل و جان سے تعمیل کر رہے تھے۔ اسی نظر نہ آنے والے شیخ الجبال کے نمائندے نے سلطان سے ملاقات کی اور اس نے منگولوں کے ذکر کے بعد ایڈورڈ کا ذکر کیا اور کہا "یہ ناصری جس کا پروشلم کے عکا میں قیام ہے، مسلمانوں کے خلاف تبریز کے منگولوں سے معاہدہ کر رہا ہے، وہ سلطان کو تنہا کر دینا چاہتا ہے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ منگول عیسائیوں کے تعاون سے رہی سہی باطنی قیادت کو بھی خاک میں ملا دے اس لیے ان دونوں کا سدباب کر دینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔"

سلطان بیبرس نے اس سے اتفاق کیا اور کہا "ہاں، میں حصن الاکراد جیسے ساحلی قلعوں کی تسخیر میں مصروف ہوں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں یہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتا اور مجھے مصر واپس جانا پڑے گا۔ تم اپنے طور پر اگر کچھ ایسا کر سکو تو کرو، میں تمہاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

شیخ الجبال کے نمائندے نے کہا "ہمارے شیخ کو آپ کی ٹیونس والی چال بہت پسند آئی۔ وہ بھی اسی طرح کی ترکیب سے کام لے کر صلیبیوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔"

بیبرس نے شیخ الجبال کے نمائندے کو نصیحت کی "اپنے شیخ سے کہو کہ اس نے یا اس کے بزرگوں نے عالم اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے، اب اسے اپنی کوششوں کا رخ صلیبیوں کی طرف کر دینا چاہیے کیونکہ تمہارے شیخ کا جو طریقہ واردات ہے، اس سے منگولوں کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا کیونکہ تمہارے خدوخال اور منگولوں کے خدوخال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے شیخ کے آدمی مسلمان امرا اور حکمرانوں کے قریب اس لیے پہنچ جاتے ہیں کہ تم لوگ بھی اپنے چہرے مہرے اور لباس سے انہی جیسے ہو اور وہ کسی باطنی کو ظاہری علامتوں سے نہیں پہچان سکتے۔ اسی لیے ہمارے بڑے بڑے قیمتی آدمی تمہارے فدائیوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے مگر تمہارے یہ فدائی منگولوں تک اس لیے نہیں پہنچ سکتے کہ وہ منگولوں جیسے نہیں ہیں اور منگولوں نے تمہارے آخری شیخ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور تمہارے قلعے الموت کو تباہ و برباد کر دیا اس لیے کہ تم تنہا تھے اور مسلم حکومتیں تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اب تم صلیبیوں کو نقصان پہنچا سکتے ہو تو اپنے طور پر پہنچاؤ۔"

شیخ الجبال کا یہ نمائندہ واپس چلا گیا۔

سلطان کو حصن الاکراد میں کئی ماہ رہنا پڑا۔ کیونکہ اس کی شکستہ دیواروں کی از سر نو تعمیر اور استحکام پر اس نے اپنی پوری توجہ صرف کی تھی۔

قلاؤن اس کا شریک کار تھا اور وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بیبرس کی نیابت اسی کو کرنی ہے اور بیبرس کے حصے کا بقیہ کام اسی کو انجام دینا ہے۔

وہ اکثر و بیشتر بیبرس کی صحبت میں پیش پیش رہتا تھا۔

حصن الاکراد میں بھی بیبرس کو عکا کا خیال بار بار آتا تھا لیکن وہ اس کی تسخیر کی طرف اس لیے مائل نہ ہوا کہ وہاں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ تجارتی نقطہ نگاہ سے بھی بہت اہم شہر تھا۔ یہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے اور یہاں کا قلعہ بھی ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

عکا کے سلسلے میں اس کی قلاؤن سے کئی بار باتیں ہوئیں اور جب سلطان کو یہ معلوم ہوا کہ منگول ایڈورڈ سے رابطہ قائم کر چکے ہیں تو اسے ان دونوں کو دھمکی دینا پڑی اور سلطان نے قلاؤن سے کہا "مجھے اس انگلستانی شہزادے کے تیور اچھے نہیں لگتے۔"

قلاؤن نے کہا "اگر یہ بات ہے تو ہمیں فوراً ہی عکا کے خلاف کارروائی کرنا چاہیے۔"

سلطان نے کہا "ہاں، مگر مجھے فی الحال آرمینیا کی خبر لینا ہے کیونکہ وہاں منگولوں کے اتحاد سے خطرناک صورت حال پیدا ہوتی جا رہی ہے۔"

قلاؤن نے کہا "تب پھر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں عکا کے خلاف کارروائی کروں۔"

سلطان نے کہا "ہاں، یہ بھی ممکن ہے لیکن خیال رکھو کہ اگر ہم نے عکا کے خلاف بھرپور کارروائی نہ کی تو کسی قسم کی کوتاہی یا ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچے گا اور عیسائیوں میں جان پڑ جائے گی۔"

"یہ باتیں قلاؤن کی سمجھ میں بھی آ رہی تھیں اسی لیے وہ چپ ہو گیا لیکن سلطان کی مصروفیات اور منصوبوں کو دیکھتے ہوئے اس کو یہ اندازہ ضرور ہو چکا تھا کہ فی الحال عکا کی تسخیر ممکن نہیں اور سلطان اپنی عمر کے جس حصے میں داخل ہو چکا ہے، وہاں بڑھاپے کا ضعف اسے روز بہ روز کمزور کرتا چلا جائے گا اور بڑھاپے میں جوش اور ولولوں میں بھی کمی واقع

ہوجاتی ہے اس لیے اب آئندہ کے دو چار سال بیبرس کے لیے پیری کے تھے اور ایامِ پیری میں عکا کی تسخیر ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔

فلاؤن کو عکا کی تسخیر بہت ضروری محسوس ہو رہی تھی۔ بیبرس نے فلاؤن کو سوچتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا "تو کیا سوچنے لگا؟"

فلاؤن نے جواب دیا "کچھ نہیں مگر یہ کہ عکا کو ہمارے قبضے میں ہونا چاہیے۔ عیسائیوں نے ابھی تک اس شہر اور اس کے قلعے سے بہت فائدے اٹھائے ہیں۔"

بیبرس نے فلاؤن کو سمجھایا "اے فلاؤن! میری بھی یہی خواہش ہے کہ اب عکا کو عیسائیوں کے قبضے میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اس شہر میں دنیا بھر کے عیسائی موجود ہیں اور اس کا قلعہ ناٹنوں اور عام عیسائیوں کی پناہ گاہ ہے۔ ہمیں اپنے کئی نامی گرامی دشمنوں کو اگر تلاش کرنا پڑے تو وہ عکا کے قلعے سے مل جائیں گے لیکن اس وقت میں عکا پر کوئی توجہ نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے سوڈان کے معاملات کو بھی دیکھنا ہے۔"

ان دونوں نے گفتگو کے بعد گویا اس پر اتفاق کرلیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے عکا کی تسخیر بہت ضروری ہے۔

سلطان بیبرس کو منگول وفد کی آمد ورفت سے ملاقات بھی بہت گراں گزری تھی اس لیے اس نے اپنے سرکاری وفد کے ارکان کو تبدیل کردیا تھا۔

حسن الاکراد کی طرح یہ قلعہ بھی اسے کئی بار پریشان کرچکا تھا اس لیے سلطان نے اس بار یہ قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ اسے فتح کرنے کے بعد تباہ و برباد کردے گا۔

اس نے بال فورٹ کے سامنے پہنچتے ہی اس کا محاصرہ کرلیا اور ایک بار پھر منجنیقوں سے کام لینا شروع کردیا۔ یہ کئی دن تک محاصرے میں رہا اور منجنیقیں اس پر سنگ باری کرتی رہیں۔

اس قلعے والوں کو بھی یہ خوش گمانی تھی کہ یہ قلعہ مسلمان فتح نہیں کرسکتے۔

قلعے والوں کو یہ امید بھی تھی کہ انہیں کہیں نہ کہیں سے مدد ضرور مل جائے گی۔

لیکن جب اس محاصرے کو دس دن ہوگئے اور کہیں سے امداد ملنے کی امید بھی نہیں رہی تو انہیں مایوسی کے عالم میں سلطان سے صلح کی بات کرنے کی سوجھی۔ ان کا ایک دو رکنی وفد سلطان سے ملا اور بال فورٹ کے قلعے دار گرینڈ ماسٹر کی صلح کی درخواست پہنچادی۔

سلطان نے ان دونوں کو دیکھ کر طنزیہ سوال کیا "کیا تمہیں کہیں سے امداد ملنے کی توقع نہیں رہی؟"

وفد کے دونوں ارکان نے ایک ہی بات کہی "سلطان محترم! یہ بات نہیں ہے کہ ہمیں عیسائی سلطنتیں مدد نہیں دے رہی ہیں۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ ہم نے ان سے کسی قسم کی مدد مانگی ہی نہیں۔ ہم قلعہ بال فورٹ کے مکین یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئے ہیں ان مذہبی جنگوں سے عیسائیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

سلطان کو عیسائیوں کے جھوٹ پر غصہ آرہا تھا۔ جواب دیا "ایک طرف تو تم یہ کہتے ہو کہ عیسائی ان مذہبی جنگوں سے عاجز آچکے ہیں اور دوسری طرف تم ہم مسلمانوں کے خلاف منگولوں سے معاہدے کرتے ہو اور انگلستان کا شہزادہ ایڈورڈ عکا میں صلیبی جنگ کی خاطر ٹھہر جاتا ہے۔"

دونوں قاصد دیر تک سلطان کو راضی کرنے میں مشغول رہے مگر سلطان نے ان کی ایک نہ مانی اور کہا "یہ جو کچھ میں کررہا ہوں صرف اس خیال سے کہ اگر میں نے یہ مہم ادھوری چھوڑ دی تو میرے بعد عیسائی میرے جانشینوں کو بہت تنگ کریں گے۔"

ایک قاصد نے کہا "سلطان محترم! آپ مفروضوں پر عیسائیوں کے خلاف اقدامات نہ کریں اور ہمارے اس قول پر اعتبار کریں کہ اب عیسائی دنیا مذہبی جنگوں پر ایمان نہیں رکھتی۔"

سلطان نے کہا "اگر تم سچے ہو اور مذہبی جنگوں سے تائب ہوچکے ہو تو اب تمہیں ان خطرناک قلعوں کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی اس لیے میرا یہ حکم ہے کہ تم اس قلعے کو مسمار کردو۔"

دونوں قاصد اس سلطانی حکم سے پریشان ہوگئے اور کہا۔ "قلعے کو گرادینے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ قلعہ نہ صرف ہمیں مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ یہ قلعہ ہمیں ارضی اور سماوی آفات سے بھی بچاتا رہا ہے۔ سخت آندھیاں اور طوفانی ہوائیں ہمیں نقصان نہیں پہنچاسکتیں اس لیے ان سعادات کے پیش نظر ہم اس قلعے کو نہیں گروا سکتے۔"

سلطان نے دونوں سے پوچھا "قلعے کو نہ گروانے سے متعلق جو دلیلیں تم دونوں نے دیں، وہ اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا پوری عیسائی آبادی انہی قلعوں جیسی پناہ گاہوں میں رہتی ہے؟"

قاصد نے جواب دیا "نہیں کیونکہ انہیں اس قلعے جیسی پناہ گاہیں میسر ہی نہیں لیکن جہاں جہاں یہ پناہ گاہیں ہیں، انہیں توڑنا بھی مناسب نہیں۔"

سلطان نے کہا "مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے صلح کی اور مفاہمت کی درخواست بھی کررہے ہو اور ہماری کوئی بات ماننے کے لیے تیار بھی نہیں۔"

قاصدوں نے پوچھا "تو اب ہم کیا سمجھیں؟ آپ ہمیں اپنے محاصرے سے آزاد کریں گے یا یہ محاصرہ جاری رہے گا؟"

سلطان نے سخت لہجے میں کہا "میں تم دونوں کو حکم دیتا ہوں کہ جاؤ اور اپنے گرینڈ ماسٹر سے کہو کہ اگر وہ جنگ نہیں کرنا چاہتا اور مستقل صلح کا خواہش مند ہے تو اس قلعے کو زمیں بوس کردے ورنہ یہ کام ہمیں کرنا پڑے گا اور صلح نہیں ہوگی۔"

دونوں قاصدوں نے اتفاق رائے پیدا کرکے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے، اگر آپ جنگ کے اتنے ہی دلدادہ ہیں تو اپنے محاصرے کو جاری رکھیں۔ اب یہ فیصلہ جنگ ہی کے ذریعے ہوگا کہ یہ قلعہ بدستور ہم عیسائیوں کے قبضے میں رہے یا اس پر مسلمانوں کا تسلط ہونا چاہیے۔"

سلطان نے کہا "تم دونوں اپنے گرینڈ ماسٹر کو بتادینا کہ ان کا ولی بادشاہ لوئی ٹیونس کے معرکے میں قرطاجنہ کے ساحل پر ہلاک ہوگیا۔ فرانسیسیوں کی مذہبی جنگی قوت ختم ہوگئی کیونکہ ان کا مذہبی جنگی جذبہ لوئی کی موت کے بعد ٹھنڈا پڑچکا کردیتا۔

دس دن کے محاصرے نے آرمینیا کے کوہستانی قلعے کو شکستہ کردیا۔ منجنیقوں نے اسے جگہ جگہ سے توڑ دیا تھا اور اب فصیلوں پر بیٹھی آرمینیا کی فوج مایوس ہونے کے بعد راہِ فرار اختیار کررہی تھی مگر سلطانی فوج نے فرار کی ساری راہیں روک رکھی تھیں۔ لیکن آرمینیا کا بادشاہ نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد میں گرفتار ہونے والے آرمینیا کے قیدیوں نے بتایا کہ ان کا بادشاہ تو سلطان کے محاصرے سے پہلے ہی فرار ہوگیا تھا۔

سلطان نے آرمینیا کے جوانوں اور ادھیڑ عمر مردوں کو قید کرکے قاہرہ کی غلام منڈی خان خلیل کی سرائے روانہ کردیا اور قلعے کو ایک آرمنی سردار کے حوالے اس شرط پر کردیا کہ وہ اب منگولوں سے روابط نہیں رکھے گا۔ اس کے علاوہ وہ ہر سال حکومت قاہرہ کو خراج ادا کرتا رہے گا۔

اس نے آرمینیا میں ایک ہفتہ قیام کیا اور اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ آرمینیا کے باہر بارہ ہزار منگول اس سے جنگ کرنے کے لیے آچکے تھے۔

سلطان نے ان منگولوں کو للکارا کیا اب ان کے مقابل آنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ آرمینیا کی حکومت ہتھیار ڈال چکی ہے۔

لیکن منگولوں کے سردار نے کہا "ہم اپنے دوست کا ساتھ دینے آئے ہیں اس لیے سلطان اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ آرمینیا خالی کرکے قاہرہ واپس چلے جائیں۔"

سلطان کو منگول سردار کا یہ تحکمانہ لہجہ ناگوار گزرا اور اس نے آرمینیا سے نکل کر ان منگولوں کو تباہ و برباد کردینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

سلطان نے منگول سردار کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے سے انکار کردیا۔ حالانکہ منگول سردار گفت و شنید میں طول دے کر وقت حاصل کرنے کی فکر میں تھا کہ اسی دوران میں ممکن ہے عیسائیوں کی طرف سے اسے کوئی مدد حاصل ہوجائے۔

لیکن عیسائی کہیں دور دور بھی نظر نہیں آرہے تھے اور سلطان نے اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے منگولوں کے بارہ ہزار کے لشکر پر نہایت خوف ناک حملہ کردیا۔ منگول گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیے گئے لیکن سردار جان بچا کر بھاگنے والے منگولوں میں سب سے آگے تھا۔

بہت سے منگول گرفتار بھی کیے گئے۔

اب سلطان بیبرس کا آرمینیا میں رکنا بیکار تھا۔ وہ

ہے اور پاپائے اعظم کے بارہا صلیبی جنگوں کے نعروں نے بھی عیسائی دنیا کو مجبور اور ہلکان کردیا ہے۔ ان پاپائے اعظموں نے مذہبی جنگوں کے نام پر عیسائیوں سے اکثر و بیشتر اتحاد کی جانی اور مالی مدد حاصل کی ہے کہ ان کے قصبوں، گاؤں اور شہروں کی آبادیاں کم ہو گئیں اور لوگ کنگال ہو گئے اور پاپائے اعظموں نے ان مذہبی جنگوں کے نام پر جو مال اور نقد رقم حاصل کی، وہ کلیسا کے کام آئی یا کلیسا کے خزانوں میں جمع ہوتی رہی۔ اپنے گرینڈ ماسٹر سے کہنا کہ اب یہ مذہبی جنگوں کا ڈھونگ ختم ہو جانا چاہیے۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ ہم جملہ مسلمان ان دفاعی جنگوں سے عاجز آ چکے ہیں۔"

دونوں قاصدوں نے مایوس اور دل شکستہ حالتوں میں قلعے میں واپس جا کے گرینڈ ماسٹر سلطان کے جواب سے آگاہ کردیا۔

منجنیقوں نے زور و شور سے اپنا کام شروع کردیا تھا اور مسلسل سنگ باری نے قلعے کی دیواروں کو کمزور کرتے کرتے اس حال کو پہنچا دیا کہ اگر فصیلوں سے مسلمانوں پر حملہ نہ کیے جاتے تو مسلمان دیواروں تک پہنچ کے کدالوں سے شگاف حصوں کو توڑ کر قلعے میں داخل ہو جاتے لیکن قلعے کے اوپر سے بھی سنگ باری جاری تھی۔

پھر سلطان کے حکم سے فصیلوں پر بھی سنگ باری شروع کردی گئی۔ جس سے کئی کئی سپاہی ایک ساتھ کام آنے لگے۔

آخر کار گرینڈ ماسٹر نے قلعے کا پھاٹک کھلوا دیا اور سلطان کو لشکر سمیت داخلے کی اجازت دے دی۔

سلطان نے اپنی فوج کو حکم دے دیا "جب تک تم پر حملہ نہ کیا جائے، قلعے والوں سے جنگ نہ کرنا۔"

سلطان نے پورے قلعے کی آبادی کو نہتا کردیا۔ ان کے ہتھیار قبضے میں لے لیے گئے۔

گرینڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ اب سلطان اس قلعے کو زمیں بوس کروا دے گا لیکن اس نے خلاف توقع کسی قسم کی بھی توڑ پھوڑ نہیں کی۔ بس صرف بہت سے نائٹوں اور عام عیسائیوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ قلعے کے خزانوں کو خالی کردیا گیا۔

تین دن کے قیام کے دوران میں گرینڈ ماسٹر نے سلطان سے پوچھا "آپ نے ہمیں یہ حکم دیا تھا کہ ہم صلح کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس قلعے کو مسمار کردیں ورنہ آپ خود زمیں بوس کردیں گے مگر اب آپ ایسا کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ آخر اس کی کوئی خاص وجہ؟"

سلطان نے جواب دیا "تیرے دونوں ساتھیوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ قلعہ اور اس کی مضبوط فصیلیں اندر رہنے والے عیسائیوں کو ارضی و سماوی آفات سے بچاتی ہیں اور آندھیاں اور طوفان قلعے والوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بس اسی خیال سے میں نے یہ سوچا کہ اس قلعے کو باقی رہنا چاہیے۔"

گرینڈ ماسٹر اور نائٹوں نے سلطان کی باتیں سنیں، انہیں سلطان کے ہمدردانہ سلوک کا شکر گزار ہونا پڑا۔

سلطان نے گرینڈ ماسٹر کو تائید کی "دیکھو، تم یہ وعدہ پہلے ہی کر چکے ہو کہ اب تم مذہبی جنگوں سے دور رہنا چاہتے ہو، آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ اور ایک بار پھر میرے سامنے تم سب وعدہ کرو کہ اب تم لوگ کسی مذہبی جنگ میں حصہ نہیں لو گے۔"

گرینڈ ماسٹر نے مجھے مجھے دل سے سلطان سے وعدہ کیا۔

"اب ہم کسی بھی عیسائی اور مسلم جنگ میں کبھی بھی حصہ نہیں لیں گے اور اس سلسلے میں ہم خداوند مسیح اور ان کی انجیل کو گواہ بناتے ہیں۔"

یہی کلمات دوسرے نائٹوں نے بھی استعمال کیے اور سب ہی نے سلطان کے داہنے ہاتھ پر باری باری اپنے سیدھے ہاتھ رکھے کہ وہ سلطان سے یا کسی بھی مسلمان حکمران سے کوئی جنگ نہیں کریں گے۔

یہیں قلعے میں سلطان کو کسی عیسائی نے بتایا "انگلستان کا شہزادہ ایڈورڈ سات ہزار صلیبیوں کی مدد سے کسی قریبی شہر پر حملہ آور ہونے والا ہے۔"

اس سلسلے میں سلطان نے بہتوں سے پوچھ گچھ کی۔ وہ اس شہر کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا، جس پر شہزادہ ایڈورڈ حملہ کرنا چاہتا تھا مگر شہر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں وہ سب یا تو ایک تھے یا پھر انہیں اس شہر کا نام ہی معلوم نہ تھا۔ اسی لیے سب ہی نے چپ سادھ لی تھی۔

سلطان نے یہاں کے بھی بہت سے لوگوں کو غلام بنا لیا اور یہ غلام بھی سرائے خلیل قاہرہ روانہ کردیے گئے۔

راستے میں اس نے فلاؤن سے پوچھا "کیا تو کسی بھیس میں عکا جا سکتا ہے؟"

فلاؤن نے کہا "آپ مجھے جو بھی حکم دیں گے، مجھ کو اس سے فائدہ ہی پہنچے گا۔ آپ عکا کی بات کر رہے ہیں، میں انگلستان جانے کو تیار ہوں۔"

سلطان نے کہا "فی الحال تو عکا جا اور وہاں کی جملہ معلومات ہمیں روانہ کردے۔"

فلاؤن نے عکا جانے کی تیاریاں کیں اور اپنے ساتھ صرف تین آدمی لیے۔

سلطان نے اب یہاں رکنا زیادہ مناسب نہیں سمجھا کیونکہ ایسے سوڈان سے بھی کچھ شکایتیں ہو گئیں تھیں اور وہ سوڈانی قصبے سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا۔

○☆○

سلطان بیبرس تو مصر واپس چلا گیا اور فلاؤن نے عکا کی



راہ لی۔ اب وہ ایک سیاح کی صورت میں پورے عکا کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ یہاں اسے ایک مسجد میں قیام کرنا پڑا۔ مسجد کے پیش امام نے فلاؤن کو ایک سیاح کی حیثیت سے ٹھہرا تو دیا مگر اس نے فلاؤن سے صاف صاف کہہ دیا "جب سے یہاں انگلستانی شہزادہ ایڈورڈ آیا ہے۔ عیسائیوں میں کچھ زیادہ جوش و خروش پیدا ہو گیا ہے اور شہزادہ بھی چوری چوری ایک فوج تیار کر رہا ہے۔ یہ فوج کس کے خلاف کارروائی کرے گی کسی کو کچھ علم نہیں۔"

فلاؤن نے پیش امام کو بتایا کہ وہ ماورالنہر سے آیا ہے اور مصر جا رہا ہے لیکن اس سفر کے دوران میں اس نے کئی ملکوں اور شہروں کو دیکھا جس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ پورا خطہ جنگ و جدل کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور یہاں دو بڑی قوتیں برسرپیکار ہیں۔ منگول جو فی الحال صرف مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ عیسائی جو بلاوجہ مسلمانوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور بلاوجہ مسلمانوں سے عناد رکھتے ہیں اور پوری دنیا سے مسلمانوں کو نیست و نابود کردینا چاہتے ہیں۔"

پیش امام نے کہا "بھائی سیاح! تمہیں تو باہر ہی باہر قاہرہ چلا جانا چاہیے تھا۔ یہ عکا تو تمہارے لیے بالکل فضول جگہ ہے اور یہاں مسلمانوں کی جان و مال ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔"

فلاؤن نے کہا "جناب پیش امام! میں نے بھی عکا کے بارے میں یہی سب کچھ سنا تھا اور یہاں کے حالات سے واقف ہونے ہی کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

پیش امام خاموش ہو گیا لیکن جب فلاؤن شہر جانے لگا تو پیش امام نے اسے روکا "دیکھو، میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا ہے کہ یہاں کی فضا مسلمانوں کے لیے بالکل سازگار نہیں اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ ورنہ یہاں تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

اسی مسجد میں جافا کے ایک مسلمان نے بھی قیام کیا تھا اور اس نے پیش امام کو بتایا "میں جافا کے حکمران کی طرف سے انگلستان کے شہزادے ایڈورڈ کے لیے ایک خط بھی لایا ہوں۔"

فلاؤن نے اس سے جافا کے بارے میں بہت سی باتیں کیں کیونکہ فلاؤن، جافا اور اس کے حاکم کے بارے میں بڑی معلومات رکھتا تھا لیکن اس جافا کے نمائندے نے فلاؤن کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

جافا کے نمائندے نے ان دونوں سے کہا "تم دونوں مجھے بہت بڑے دین دار لگتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دین میں اتنا مبالغہ کیوں کرتے ہو؟"

فلاؤن نے حیرت سے پوچھا "ہم تو صرف نمازیں پڑھتے ہیں اور نماز پڑھنے میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔"

پیش امام نے بھی فلاؤن کی تائید کی اور جافا کے نمائندے سے پوچھا "تیرا کیا دین ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں بھی مسلمان ہوں لیکن حاکم کے فرستادے کا کام انجام دے رہا ہوں اور اپنی زندگی کا زیادہ وقت کسی ایک جگہ نہیں گزارتا۔ اپنا حاکم ہمیں جہاں بھیج دیتا ہے، میں وہیں چلا جاتا ہوں اور میری زیادہ نمازیں قصر کی نذر ہو جاتی ہیں۔"

فلاؤن نے پوچھا "کیا میں حالتِ قصر میں نہیں ہوں؟ لیکن میں نے تو اپنی پوری نمازیں پڑھی ہیں۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ انہیں شرف قبولیابی بخش دے۔"

جافا کے نمائندے نے ان دونوں کو بتایا "اس وقت ایڈورڈ کی حالت بہت نازک ہے۔ ڈاکٹر علاج میں مشغول ہیں اور بار بار یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ شہزادے کو انگلستان واپس چلا جانا چاہیے لیکن شہزادہ ایڈورڈ یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ بار بار انگلستان سے یروشلم نہیں آسکتا۔ اس لیے وہ یہاں رہ کے کوئی کارنامہ انجام دے کر واپس جائے گا۔"

پیش امام کو حاکم جافا کے نمائندے پر کچھ شبہ ہوا اور اس نے معذرت کرلی کہ اسے وہ مسجد میں نہیں ٹھہرا سکتا۔

جافا کے نمائندہ انگلستان کے شہزادے ایڈورڈ سے ملنے چلا گیا۔

ادھر پیش امام نے فلاؤن کو مشورہ دیا کہ وہ بھی مسجد میں اس لیے نہ ٹھہرے کہ عکا میں عیسائیوں کی اکثریت شہزادہ ایڈورڈ کی حامی ہو چکی ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ عیسائی کیا کرنے والے ہیں لیکن ان کی عسکری تعداد میں اضافہ صاف صاف یہ بتا رہا ہے کہ عیسائی جنگ کے خواہاں ہیں اور یہ جنگ وہ کس سے کریں گے، کچھ پتا نہیں مگر یہ بات واضح ہے کہ ایڈورڈ سلطان بیبرس سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

فلاؤن مسجد سے نکل کر ایک تاجر کے گھر چلا گیا اور اسے تاجر کو دیکھتے ہی احساس ہوا کہ وہ اس کو قاہرہ میں بھی کئی بار دیکھ چکا ہے۔ تو اب اسے یہ خطرہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں یہ تاجر اسے پہچان نہ لے۔

تاجر نے ایک مسلمان مسافر کی حیثیت سے فلاؤن کو اپنے ساتھ رکھ لیا مگر مشورہ یہی دیا کہ وہ یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو چلا جائے کیونکہ عکا کی فضا بہت مخدوش ہے اور ایڈورڈ کے ارادے اچھے نظر نہیں آتے۔

فلاؤن نے خود بھی بازار میں ہتھیار بند عیسائیوں کے دستے دیکھے۔ جن کا رخ قلعے کی طرف تھا۔ یہ کہاں سے آرہے تھے، فلاؤن یہ تو نہیں جان سکا لیکن سب کہاں جا رہے ہیں اس سے وہ آگاہ ہو گیا۔ یہ سب عکا کے قلعے میں جمع ہو رہے

تھے۔

فلاؤن نے عیسائیوں سے بھی باتیں کرنے کی کوشش کی مگر عیسائی اس سے چند باتیں کرنے کے بعد لاتعلق ہوجاتے تھے۔ ان عیسائیوں میں عکا کا ایک قدیم رہائشی عیسائی بھی فلاؤن کو مل گیا۔ وہ کئی پشتوں سے یہیں آباد تھا اور یہ نسلاً یہودی تھا مگر اس کے خاندان کے کچھ لوگ عیسائی ہوگئے تھے۔ ان چند عیسائی ہوجانے والوں میں یہ یوشع بھی شامل تھا۔ یوشع مسلمانوں کے خلاف جنگ کا قائل نہیں تھا کیونکہ عیسائیوں کی بے درپے شکستوں کے بعد یوشع نے یہ سمجھ لیا تھا کہ عیسائی ان جنگوں میں اپنا جانی ومالی نقصان بلاوجہ کررہے ہیں۔ جب یوشع کی ملاقات ایک آوارہ گرد مسلم سیاح کی حیثیت سے فلاؤن سے ہوئی تو یوشع بہت خوش ہوا اور اسے اپنا مہمان بنا کے اپنے گھر لے گیا۔

یہاں یوشع نے فلاؤن کو عیسائیوں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ جب سے شہزادہ ایڈورڈ عکا میں آیا ہے ناصرہ کوچ کرنے کی فکر میں ہے۔ ناصرہ چھوٹا سا عیسائی مذہب کا مقدس شہر ہے اور اس کا تعلق حضرت مسیح سے ہے جس کی وجہ سے عیسائی ناصری کہلاتے ہیں۔"

فلاؤن نے اپنے میزبان یوشع سے پوچھا "شہزادہ ایڈورڈ کو یہ نہیں معلوم کہ اگر اس نے ناصرہ پر حملہ کیا تو مصر کا سلطان بیبرس اسے دوبارہ واپس لے لے گا اور شہزادہ ایڈورڈ کی شامت آجائے گی۔"

یوشع نے برا سا منہ بنایا "مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو اتنا احمق شہزادہ ہے کہ سات ہزار کی فوج سے سلطان سے ٹکر لینا چاہتا ہے۔ توبہ توبہ۔ نہ جانے اس کا کیا انجام ہوگا۔"

ابھی فلاؤن کو یہاں یوشع کی میزبانی کے مزے اٹھاتے صرف دو ہفتے گزرے تھے کہ اچانک اس نے عکا کی شاہراہوں پر ایڈورڈ کی سپہ سالاری میں عیسائیوں کی فوج کو گزرتے دیکھا اور کئی دنوں بعد جب یہ فوج واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ایڈورڈ نے ناصرہ کو مسلمانوں سے چھین لیا ہے اور ناصرہ کے مسلمانوں کا قتل عام کردیا گیا ہے۔

ان فاتحین نے عکا میں داخل ہونے کے بعد بڑے نعرے لگائے اور ان کے نعروں سے پورا شہر گونج گیا۔

عکا والوں کی نظر میں ایڈورڈ عصرِ حاضر کا بہت بڑا فاتح قرار پایا۔

فلاؤن نے یہ سب کچھ عکا میں رہ کے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ جان کر اسے بہت دکھ پہنچا کہ ایڈورڈ اور اس کی فوج نے ناصرہ کے سارے مسلمانوں کو تہ تیغ کردیا تھا۔

جافا کا نمائندہ ابھی تک عکا ہی میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ جافا کے حاکم نے کوئی خاص پیغام شہزادہ ایڈورڈ کو بھیجا ہے جو اسی کو دیا جائے گا۔

شہزادہ ایڈورڈ پہلے ہی بیمار تھا مگر ناصرہ کی جنگ نے اس کو زیادہ بیمار کردیا۔ اسی علالت کے دوران میں اسے بتایا گیا کہ جافا کے حاکم کا نامہ بر کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے اور وہ خط شہزادہ ایڈورڈ کو بالمشافہ دینا چاہتا ہے۔

شہزادہ نے کہا "اسے شاہی مہمان کی طرح رکھا جائے۔ ذرا طبیعت سنبھل جائے تو اولین لمحوں میں بلوالوں گا۔"

جافا کے حاکم کا یہ نمائندہ بہت باتونی اور مسخرہ تھا۔ چنانچہ وہ مہمانی کے دوران میں عیسائیوں میں گھل مل گیا۔ اسے شہزادہ ایڈورڈ کی ناصرہ میں فتح سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ ایڈورڈ کی بہادری سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا اور وہ عیسائیوں سے کہتا پھر رہا تھا "تمہیں ایسا ہی فاتح اور حوصلہ مند قائد درکار ہے۔ اللہ شہزادے کی عمر دراز کرے۔ یہی تم لوگوں کو سرخرو کرے گا۔"

عیسائیوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا مسلمان ہے جو مسلمانوں کی شکست سے خوش ہورہا ہے اور عیسائیوں کی حوصلہ افزائی کررہا ہے۔

ایک عیسائی نے اس سے پوچھ ہی لیا "کیا بات ہے تجھے اپنے بھائیوں کی شکست سے خوشی ہورہی ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ناصرہ کے تمام مسلمان قتل کردیے گئے ہیں؟"

جافا کے نامہ بر نے جواب دیا "ہاں' میں شہزادہ ایڈورڈ کی کامیابی سے بہت خوش ہوں گو کہ میں مسلمان ہوں مگر میری طبیعت عیسائیت کی طرف مائل ہے۔ میرا آقا بھی عیسوی مذہب کو بہت پسند کرتا ہے۔"

اب تو عیسائی اسے ہر وقت چاروں طرف سے گھیرے رہتے اور جب عیسائیوں کو اشاروں کنایوں میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ جافا کا مسلمان حاکم بھی شہزادہ ایڈورڈ کے ہاتھوں پر عیسائی ہونے کے لیے تیار ہے تو انہیں بہت زیادہ خوشی ہوئی اور یہ خبر شہزادہ ایڈورڈ کو بھی پہنچادی گئی۔

شہزادہ ایڈورڈ خود کو بہت اقبال مند اور لائق سمجھنے لگا کیونکہ جافا کا حاکم اس کے ہاتھوں پر مسلمان ہونا چاہتا تھا۔

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو شہزادے نے اجازت دی کہ جافا کے نامہ بر کو حاضر کیا جائے۔

اسے شہزادے کے ان آدمیوں کے پاس پہنچادیا گیا جو شہزادے کے محافظ بھی تھے اور معتمد بھی۔

شہزادے کے معتمد نے تھوڑی دیر کے لیے جافا کے نامہ بر کو اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا "جافا کے حاکم کا خط کہاں ہے؟ وہ میرے حوالے کیا جائے۔"

نامہ بر کو ہنسی آگئی کہنے لگا "واہ جناب! اگر ہمیں یہ خط تم لوگوں کو ہی دینا ہوتا تو میں اتنے دن تک یہاں کیوں پڑا رہتا۔ اس خط میں کچھ خاص باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ جنہیں شہزادے کو ہی پڑھنا چاہیے اور یہی مجھے ہدایت کی گئی ہے اس لیے میں یہ خط کسی اور کو نہیں دے سکتا۔"

شہزادہ ایڈورڈ کے معتمد سے اس نامہ بر کی کچھ دیر بحث جاری رہی اور آخر اس نے شہزادے کو آگاہ کیا "نامہ بر کسی اور کو خط دینے کے لیے تیار نہیں ہے اس لیے اب کیا کیا جائے؟"

شہزادہ ایڈورڈ کے لیے یہ مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر جافا کے حاکم نے اپنے اس خط میں کوئی ایسی ہی اہم راز کی بات لکھی ہے جو کسی اور کے علم میں نہیں آنا چاہیے تو ظاہر ہے کہ یہ خط عربی زبان میں لکھا گیا ہوگا اور اس کے لیے شہزادہ ایڈورڈ کو کسی اور کی مدد حاصل کرنا پڑے گی جو عربی میں لکھے گئے خط کا مفہوم شہزادے کو سمجھائے۔

ایڈورڈ نے اپنے معتمد سے کہا "تم اسے بتاؤ کہ اس کا یہ خط کسی ترجمان کے ذریعے سمجھنا پڑے گا۔ اس لیے مجھ کو براہِ راست دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

معتمد نے کہا "میں نے اس خردماغ نامہ بر کو یہ بھی سمجھایا تھا مگر وہ یہی کہتا ہے کہ اپنا یہ خط وہ آپ ہی کو براہِ راست دے گا اور رہ گیا ترجمان کا مسئلہ تو اس کا کہنا ہے کہ ترجمانی کا فریضہ کسی ایسے شخص کے ذمے کیا جائے' جس کا تعلق ان علاقوں سے نہ ہو اور وہ شہزادے کے ساتھ ہی واپس جانے والوں میں سے ہو۔"

شہزادہ ایڈورڈ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "ہاں' میرے ساتھ آنے والے تاتوں میں کچھ ایسے ہیں جو ماضی میں یہاں سالوں رہ چکے ہیں اور انہیں عربی زبان بھی آتی ہے۔"

کچھ دیر غور کرنے کے بعد شہزادہ ایڈورڈ نے کہا "یہ جافا کا نامہ بر کچھ عجیب آدمی نہیں لگتا؟"

معتمد نے جواب دیا "ہاں' لگتا تو ہے مگر بہت دلچسپ اور مسخرہ بھی ہے۔ باتیں بہت کرتا ہے۔ آپ کی ناصرہ کی فتح پانی سے بہت خوش ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ جافا کا مسلمان حاکم بھی عیسائی ہوجانا چاہتا ہے۔ شاید اسی بات کو وہ راز میں رکھنا چاہتا ہے۔"

ایڈورڈ نے کہا "تم اسے بتاؤ کہ اس کا یہ خط کسی اور کے ذریعے ہی مجھے سمجھنا پڑے گا تو کیا وہ اسے پسند کرے گا؟"

معتمد' شہزادے کی تجویز لے کر نامہ بر کے پاس آگیا تو نامہ بر نے کہا "اگر تمہارے آقا کے پاس کوئی ایسا انگلستانی تاتاری ہے جو عربی زبان سے واقف ہے تو مجھے اس کے ترجمان بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ترجمانی کا کام کسی مقامی عیسائی سے نہ لیا جائے۔"

معتمد نے شہزادے کو نامہ بر کی خواہش سے آگاہ کردیا۔

شہزادہ ایڈورڈ کچھ دیر خاموشی سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا اور پھر کہا "تو اب اسے اپنا یہ خط تمہارے حوالے کردینا چاہیے۔"

معتمد نے کہا "جناب! وہ بہت ضدی معلوم ہوتا ہے۔ وہ خط آپ ہی کو دے گا۔ کہتا ہے مجھے شہزادے سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں۔ غالباً وہ آپ کی ناصرہ شہر کی فتح یابی سے بہت خوش ہے۔"

ایڈورڈ نے اپنے کسی نائٹ کا نام لیا اور کہا "پہلے اسے تلاش کرو۔ جب وہ مل جائے تو اس کے ساتھ ہی جافا کے نامہ بر کو بھی میرے پاس بھیجا جائے۔"

معتمد نے جافا کے نامہ بر کو کچھ دیر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود نائٹ کی تلاش میں باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو شہزادے کا ہم وطن نائٹ اس کے ساتھ تھا۔

معتمد نے پہلے ترجمان نائٹ کو شہزادے کے پاس پہنچایا' اس کے بعد جافا کے نامہ بر سے ملا "اب تم بھی اندر چلو۔"

اور یہ نامہ بر بھی اندر شہزادہ ایڈورڈ کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے بیمار شہزادے سے مصافحہ کرنا چاہا تو شہزادے کو اٹھنا پڑ گیا۔

مصافحے کے بعد نامہ بر نے شہزادے کی تعریفیں کرنا شروع کردیں اور ترجمان نے نامہ بر کی تعریفیں شہزادے کی اپنی زبان میں منتقل کردی۔

ایڈورڈ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا "تیرے آقا کا خط کہاں ہے؟ اسے دے' مجھے اس خط کے مفہوم کو سمجھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

جافا کے نامہ بر نے شہزادے کے ترجمان نائٹ سے کہا۔ "دیکھو' یہ خط تم پڑھو گے اور اس کا مفہوم اپنے آقا کو سمجھاؤ گے لیکن اس سے پہلے خداوند مسیح کی قسم کھا کر مجھے یقین دلاؤ کہ اس خط کے مندرجات کا باہر کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔"

ترجمان نائٹ نے سیدھے سادے طریقے سے قسم کھا کر نامہ بر کو یقین دلایا کہ خط کے مندرجات اس کے سینے میں ہمیشہ کے لیے دفن ہوجائیں گے۔

اب اس نے ترجمان نائٹ کو اجازت دے دی کہ وہ یہ خط پڑھ کے اس کا مفہوم شہزادے کو سمجھا دے اور خط شہزادے کے حوالے کردیا۔

ترجمان نائٹ نے یہ خط پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا اور اب وہ بے حد خوش نظر آرہا تھا۔

ترجمان نے شہزادے کو اس کی زبان میں خط کا مفہوم

سمجھایا۔

"شہزادہ ایڈورڈ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں جافا کا حکمران مسلمان ہونے کے باوجود حضرت مسیح سے بے حد متاثر ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے آپ اپنی نگرانی میں پاپائے اعظم کے پاس پہنچادیں تاکہ میں ان کے مقدس ہاتھوں پر حضرت مسیح کا خادم بن جاؤں۔ جافا کی حکومت کسی گرینڈ ماسٹر کے حوالے کردی جائے۔ اگر آپ خود جافا کی حکمرانی چاہتے ہوں تو میں اسے آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگ کچھ صبر سے کام لیں۔ میرے اپنے آدمی سلطان بیبرس کے آس پاس موجود ہیں جو کسی وقت بھی اچانک اس کا کام تمام کردیں گے اور مسیحی اس کے شیطانی وجود سے نجات پاجائیں گے۔ میرا نامہ بر بھی میرے ساتھ عیسائی ہوجانے کے لیے تیار ہے۔"

خط کے مضمون نے شہزادے کو بھی باغ باغ کردیا اور اس نے نامہ بر سے جافا کے بارے میں باتیں شروع کردیں پوچھا۔ "میں نے عکا اور ناصرہ کے علاوہ یہاں کے کسی بھی شہر کو نہیں دیکھا۔ ذرا مجھے جافا کے بارے میں بتاکہ یہ کیسی جگہ ہے؟"

نامہ بر نے اسے بتایا "جناب! یہ یہاں کا ایک بہترین تجارتی مرکز ہے۔ گو کہ قصبہ چھوٹا ہے لیکن ساحلی ہونے کی وجہ سے یہ قصبہ شہر بنتا جارہا ہے۔ یہاں بندرگاہ میں سمندر کے اندر لوہے کے دروازے ہیں۔ ایک مضبوط فصیل بھی اسے اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے اور لوہے کا ایک بہت بڑا پھاٹک بھی ہے۔ کسی کو اجازت کے بغیر اندر نہیں آنے دیا جاتا۔"

ایڈورڈ نے پوچھا "یہ مسلمانوں کے قبضے میں کب سے ہے؟"

نامہ بر نے جواب دیا "جناب! مسلمانوں کے سن کے اعتبار سے 583ھ اور آپ کے سن کے اعتبار سے 1187ء میں صلاح الدین ایوبی نے اسے فتح کرلیا تھا لیکن چار سال بعد اس پر دوبارہ عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا اور نو سال بعد صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک العادل نے اسے عیسائیوں سے چھین لیا۔ جناب! یہ بہت ہی مفید اور حسین شہر ہے۔ یہاں کی منڈیوں میں تاجروں کی آمدورفت رہتی ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اگر عیسائیوں نے اس پر لڑے بغیر قبضہ کرلیا تو سلطان بیبرس کے حوصلے پست ہوجائیں گے اور یہ میرا دعوٰی ہے کہ سلطان بیبرس کو ہمارے اپنے آدمی جافا تک نہیں آنے دیں گے اور اس کا کام تمام کردیں گے۔"

یہ ساری باتیں ترجمان دلچسپی سے سنتا رہا۔

نامہ بر نے اچانک موضوع بدل دیا اور ایڈورڈ کی بیماری کے بارے میں باتیں کرنے لگا، پوچھا "آخر آپ کو بیماری...."

ایڈورڈ نے ترجمان کے ذریعے جواب دیا "یہاں کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئی۔ انگلستان پہنچتے ہی چند دنوں میں صحت یاب ہوجاؤں گا۔"

نامہ بر نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کو یہاں سے اتنی جلدی جانے کون دے گا؟ جافا ہے 'الرملہ' ہے اور ایسے کئی دوسرے ساحلی شہر ہیں۔ یہ سب آپ کے قبضے میں آجائیں گے۔ بس اب آپ اپنی مدد کے لیے بیس پچیس ہزار صلیبی اکٹھا کرلیں۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن تاریخ میں فاتح یروشلم آپ ہی کہلائیں گے۔"

شہزادہ ایڈورڈ نے کہا "میری تمنا تو یہی ہے کہ میں یروشلم کو آزاد کراؤں۔ شاید خداوند مسیح نے مجھے اسی کام کے لیے یہاں پہنچایا ہے۔"

نامہ بر نے ایڈورڈ کو احساس دلایا "جناب! کیا آپ کے ملک میں مہمانوں کی خاطر تواضع نہیں کی جاتی؟ مجھے تو پیاس شدت کی لگ رہی ہے۔ العطش العطش۔"

ایڈورڈ نے ترجمان کو حکم دیا "باہر جاؤ اور اس کے لیے میوے جات اور ٹھنڈا پانی فوراً لاؤ۔"

ترجمان جیسے ہی باہر گیا تو نامہ بر نے جھانک کر اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر شہزادہ ایڈورڈ کے قریب جاکے عربی زبان میں کہا "اولمعون! میں تجھے سبق سکھانے آیا ہوں۔ اب تو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوجائے گا۔"

شہزادہ ایڈورڈ اس کی کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکا مگر نامہ بر کے چہرے کی خشونت سے یہ اندازہ ضرور لگالیا کہ نامہ بر اچانک کسی بات پر مشتعل ہوگیا ہے۔

لیکن اس اندازے سے پہلے ہی جافا کے نامہ بر نے سینے کے پاس اندر چھپے ہوئے مسموم خنجر کو نکالا اور اس کی پسلیوں میں پیوست کردیا۔

شہزادے کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً کھڑے ہوکر جدوجہد کی اور قاتل کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اور اپنے سرہانے رکھے ہوئے خنجر سے نامہ بر پر حملہ کردیا۔

شہزادہ ایڈورڈ کی چیخ سن کر ایک بھگدڑ مچ گئی اور لوگ دوڑتے بھاگتے اندر داخل ہوئے۔ یہاں دو جسموں سے خون جاری تھا۔

شہزادہ ایڈورڈ کی بیوی ایلینار بھی بھاگتے ہوئے یہاں پہنچی اور اس نے اپنے شوہر کو قاتل سے گتھم گتھا دیکھا۔

ایڈورڈ کے آدمیوں نے زخمی نامہ بر کو ایک طرف لے جاکے پوچھا "یہ تو نے کیا کیا؟"

نامہ بر نے جواب دیا "بدمعاش! مسلمانوں کو فتح کرنے آیا تھا۔ ناصرہ میں اسے بچوں اور عورتوں تک پر رحم نہیں آیا پھر میں اس پر رحم کیوں کرتا۔"



لوگوں نے شہزادہ ایڈورڈ پر زیادہ توجہ دی۔ معالجین کو ایڈورڈ کی دیکھ بھال کے لیے جمع کرلیا گیا۔ انہوں نے زخم کے چاروں طرف کے گوشت کو کاٹ کر پھینک دیا اور عیسائی مورخین کے بقول ایلینار نے شہزادے کے زخم کے زہر کو چوس لیا۔

ایڈورڈ بے ہوش ہوچکا تھا۔

ایڈورڈ کے معتمد نے ترجمان سے پوچھا "تم تو اندر تھے پھر یہ قاتل اپنے مقصد میں کس طرح کامیاب ہوگیا؟"

ترجمان نے ساری تفصیل معتمد کے ساتھ ہی سب ہی کو بتادی اور کہا "مجھے یا شہزادے کو اس کی دلچسپ باتوں سے شبہ تک نہیں ہوا کہ یہ شخص شہزادے کو قتل کرنے آیا ہے۔"

ایلینار نے آنسو بہاتے ہوئے ترجمان سے پوچھا "یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟"

ایک مقامی عیسائی نے کہا "یہ کام توشیخ الجبال کے فدائی کرتے ہیں۔"

معتمد نے کہا "کیا یہ کام سلطان بیبرس نہیں کرسکتا؟"

ایک پادری نے کہا "نہیں، سلطان اس معمولی شہزادے کو اس طرح قتل کروا کے خوش نہیں ہوگا۔ وہ تو بہت طاقت ور منگولوں کو شکست دینے والا سپہ سالار ہے۔"

ایلینار نے کہا "لیکن قاتل کو تو جافا کے مسلمان حاکم نے بھیجا تھا؟"

پادری نے کہا "اب تو مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ جافا کے مسلمان حاکم کا نامہ بر تھا بھی یا نہیں۔"

معتمد نے کہا "دیکھو، اگر وہ زندہ ہے تو شاید اپنے بارے میں سچ سچ بتادے۔"

اور جب اس قاتل کی لوگوں کو جستجو ہوئی تو معلوم ہوا کہ مسلمان حاکم نے نہیں بھیجا تھا اور یہ سلطان بیبرس کا بھی آدمی نہیں تھا اور آخر کار اسے شیخ الجبال کے طریقہ واردات کے مشابہ ہونے کی وجہ سے فدائی قرار دے دیا گیا۔

○☆○

فدائی نے شہزادہ ایڈورڈ کو بے حد خوف زدہ کردیا تھا۔ اب وہ کسی اجنبی سے تخلیے میں ملتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف سخت پہرا بٹھادیا۔

اس کا علاج نہایت توجہ اور محنت سے جاری رہا۔ ایلینار نے شب و روز ایک کردیے اور کئی ہفتے وہ پوری نیند سو بھی نہیں سکی۔

اسی دوران میں انگلستان سے ایڈورڈ کو باپ کا ایک خط موصول ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کی بڑی خوشامد کی تھی کہ وہ فوراً انگلستان واپس آجائے کیونکہ اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اور اگر وہ باپ کی زندگی میں انگلستان نہ پہنچ سکا تو حکومت کسی اور کے قبضے میں چلی جائے گی۔

اب ایڈورڈ کو کچھ افاقہ ہوچلا تھا اور وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا تھا۔ اسے اس کے باپ کے خط سے آگاہ نہیں کیا گیا کیونکہ ابھی ایڈورڈ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ انگلستان تک کا سفر کرتا۔

قاہرہ میں سلطان کو اس واقعے کی خبر کی گئی تو اس نے فوراً کہہ دیا "یہ واردات کسی فدائی کی معلوم ہوتی ہے۔"

لیکن اب سلطان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ عکا کے قریب پہنچ کے ایڈورڈ کی بلاواسطہ عیادت کرتا مگر اس نے اپنا ایک قاصد شہزادہ ایڈورڈ کے پاس بھیجا۔ جس نے سلطان کی طرف سے فدائی کی واردات کی مذمت کی اور شہزادے کی ناصرہ کی مسلم کشی پر تنبیہہ کی "تو تو ناصرہ کو عیسائیوں کے حوالے کرکے انگلستان چلا جائے گا مگر یہاں کے عیسائیوں کو مصیبت میں ڈال جائے گا۔"

اب سلطان سوڈان کی خبر لینا چاہتا تھا کیونکہ سوڈان کا حکمران سلطان کے خلاف باتیں کررہا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کے پاس تک سلطان کا پہنچنا بہت مشکل مرحلہ ہے کیونکہ سوڈان کے دریاؤں اور قاہرہ کے درمیان بڑی دشوار گزار راہیں تھیں اور سب سے زیادہ مصیبت وہ صحرا تھا جسے عبور کرنے کے لیے تقریباً پندرہ دن درکار ہوتے تھے۔

سلطان نے سوڈان کے راستوں کے واقف کاروں کو بلوایا اور ان سے راستے کی کیفیات پوچھیں تو ان سے کچھ عجیب و غریب خبریں ملیں۔ ان رہنماؤں نے سلطان کو بتایا۔ "وہاں کئی ایسے علاقے ہیں جہاں ریت کے ٹیلے راستے اور ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ مسافر ان بدلتے ریت کے تودوں کی وجہ سے راستہ بھول جاتے ہیں اور جب انہیں بھٹکتے بھٹکتے پانی نہیں ملتا تو وہ مرجاتے ہیں۔"

سلطان ان سب کی باتیں سنتا رہا مگر اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ ایک رہنما سے پوچھا "ذرا حساب لگا کے سچ سچ بتا کہ ہمیں سوڈان کے لیے کتنے راہ نما فوراً مل سکتے ہیں۔"

یہ راہ نما سوڈانی تھا اور اپنے ملک کو سلطان کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہتا تھا۔ سلطان کے استفسار پر جواب دیا۔ "آپ کو رہنما تو بہت مل جائیں گے لیکن سلطان ایک مسلم ملک کے خلاف جنگی کارروائی کیوں کریں گے؟"

سلطان نے بتایا "بے شک، سوڈان ایک مسلم ملک ہے اور میری فوج میں بھی بہت سے سوڈانی موجود ہیں مگر اب مجھے وہاں کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سچے مسلمان نہیں ہیں۔ وہ ہیں تو مسلمان ہی مگر ان کے عقیدے اور رہن سہن

ہم سے بالکل مختلف ہیں اور میں انہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پکے اور سچے مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور انہیں اپنی اصلاح کہاں کہاں کر لینی چاہیے۔"

سوڈانی رہنما نے سلطان کو بتایا "جناب! وہ واقعی عجیب وغریب ملک ہے۔ وہاں ایک ایسا علاقہ بھی ہے جہاں نمک کی اتنی افراط ہے کہ وہاں نمک کی دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں اور نمک کے مکان بنتے ہیں مگر وہاں سے کسی قدر فاصلے پر نمک اتنا کمیاب ہے کہ سکوں کی جگہ نمک چلتا ہے اور اس سے چیزیں خریدی جاتی ہیں۔"

سلطان یہ ساری دلچسپ باتیں غور سے سنتا رہا۔ اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو سوڈان کے کئی علاقوں کے بارے میں کچھ عجیب وغریب خبریں دی گئی تھیں جن سے سوڈانیوں کے اسلام پر بھی سلطان کو شبہ ہونے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سوڈانیوں کی اصلاح نہ کی گئی اور انہیں پکا مسلمان نہ بنایا گیا تو وہاں عیسائیوں کا غلبہ ہو سکتا ہے اور عیسائیوں کی مذہبی تنظیمیں وہاں پہنچ کے اسلام کو خارج البلد کر دیں گی۔"

وہ کئی دن سے آئینے میں اپنی شکل صورت بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور وہ خود کو چراغ سحری سمجھنے لگا تھا۔ اس دردمند مسلمان کو یہ سوچ سوچ کر اذیت محسوس ہو رہی تھی کہ کہیں سوڈان اسلام سے محروم نہ ہو جائے اور وہاں تثلیث حاوی آجائے۔

سلطان نے راہ نما کو حکم دیا "تو جلد از جلد سوڈانی رہنما اکٹھے کر۔ میں بہت جلد سوڈان پہنچنا چاہتا ہوں۔"

رہنما اکٹھے کر لیے گئے اور بیبرس نے سامانِ رسد وافر مقدار میں لے کر سوڈان کی طرف سفر شروع کر دیا۔

راستے میں فوج کو واقعی بڑی دشواریاں پیش آئیں کیونکہ انہیں صحرا عبور کرنے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تو بیبرس کی تدابیر کام آتی رہیں ورنہ یہ فوج پانی کی کمی یا نایابی میں پھنس کر برباد ہو جاتی۔ رہنماؤں نے بھی سلطان کی بہت مدد کی۔ کہیں کہیں ریت کے ٹیلوں کی جگہ بدل جانے کی وجہ سے انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں گھوڑوں کا سفر کرنا مشکل ہو گیا اور اونٹ مہیا کیے گئے۔

کئی رہنما شرمندہ بھی ہوئے کیونکہ وہ جن راہوں سے واقف تھے اب وہاں صحرا کی تند و تیز ہواؤں نے ریت کے پہاڑ کھڑے کر دیے تھے مگر ان رہنماؤں میں ایک یک چشم ایسا رہنما بھی تھا جسے متبادل راستوں کا بھی علم تھا اور وہ سلطان کو ان متبادل راستوں سے ایولاتن نامی جگہ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں لشکر نے قیام کیا اور سلطان کو یہاں کے لوگوں سے ملنے کے بعد عجیب وغریب باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اپنی علاقائی رسموں کی وجہ سے مسلمان کم اور افریقی حبشی علاقائی زیادہ لگتے تھے۔ یہاں کا حاکم ڈرا سہما سلطان سے ملا اور بتایا کہ وہ سوڈان کے بادشاہ کی طرف سے ایولاتن میں فربا ہے۔ ترجمان نے سلطان کو بتایا "یہاں کی مقامی زبان میں فربا سلطان کے نائب کو کہتے ہیں۔"

بیبرس نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور سلطان اس نائب کے گھر کا ماحول دیکھنے پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے مکان کے دالان میں فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے سپاہی اس کے سامنے اور دائیں بائیں نیزے اور کمانیں ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سلطان نے حکم دیا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائے اور اپنے سامنے اور دائیں بائیں پہریداروں کو کھڑا کر دے تاکہ وہ دیکھے کہ اس سے اس نائب کی شان میں کیسا اضافہ ہو جاتا ہے۔

نائب نے بڑی کراہیت آمیز شکل بنا کے فرش پر بیٹھ کر محافظوں کو اپنی زبان میں کوئی حکم دیا۔

ترجمان نے سلطان کو بتایا "نائب اپنے محافظوں کو اپنی اپنی جگہ پر مستعد کھڑے ہو جانے کا حکم دے رہا ہے۔"

سلطان نے ترجمان سے پوچھا "اس نائب کے چہرے پر کرختگی پائی جاتی ہے۔ کیا یہ میرے آنے سے خوش نہیں ہوا؟ حالانکہ میں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کی۔"

ترجمان نے جواب میں ٹال مٹول سے کام لینے لگا۔

سلطان نے درشت لہجہ اختیار کیا "میں تجھ سے کیا پوچھ رہا ہوں؟ تو جواب کیوں نہیں دیتا؟"

ترجمان نے کہا "جناب والا! میں جواب میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا۔ آپ اس سے خوش نہیں ہوں گے بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نائب جو ابھی تک آپ کے مراہم خسروانہ کا مرکز ہے۔ میرے جواب سے آپ کا معتوب قرار پا جائے گا اور معلوم نہیں آپ ایسے کیسی سزا دے بیٹھیں۔"

سلطان نے جواب دیا "میں سزا اسے دوں گا' جو میرے مقابلے پر آئے۔ یہ تو اس لائق بھی نہیں کہ اس سے درشت اور تند و تیز لہجے میں بات ہی کی جائے۔"

ترجمان سلطان کو جو کچھ سمجھا رہا تھا' نائب اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے ترجمان سے پوچھا "سلطان تجھ سے کیا پوچھ رہا ہے؟"

ترجمان نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

نائب نے پوچھا "تو نے کیا جواب دیا؟"

ترجمان نے جواب دیا "میں نے ابھی تک کوئی جواب

نہیں دیا حالانکہ سلطان ہند ہے کہ اسے صحیح صحیح بتایا جائے کہ نائب کے چہرے پر خوش اخلاقی کے بجائے کرختگی کے آثار کیوں پائے جاتے ہیں۔"

نائب نے خوشامدانہ لہجہ میں ترجمان سے درخواست کی۔ "دیکھ، میں زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتا ہوں مگر تو میرے چہرے کی کرختگی کا اصل سبب نہیں بتائے گا کیونکہ سلطان خود سرخ سفید رنگ کا حامل ہے۔"

سلطان کو ان دونوں کی گفتگو پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے ترجمان کو ڈانٹا "دیکھ، خبردار جو تو نے مجھے بہلانے کی کوشش کی کیونکہ میرے لشکر میں کئی اور ترجمان بھی موجود ہیں۔ میں تجھے ہٹا کے انہیں ترجمان بنالوں گا۔"

اب ترجمان بے بس ہو چکا تھا۔ اس نے نائب کو بتایا۔ "سلطان، مجھے سچ بولنے پر مجبور کررہا ہے اور اس نے دھمکی دی ہے کہ اب وہ کسی دوسرے سے ترجمانی کا کام لے لے گا۔"

نائب نے خوف زدہ لہجے میں کہا "اچھا، تب پھر تو سلطان سے عہد لے لے کہ وہ تیرے جواب پر تجھ سے مجھ سے اور میری قوم سے بدسلوکی نہیں کرے گا۔"

ترجمان نے سلطان سے درخواست کی "حضور والا! میرے سچے جواب سے آپ کو بہت تکلیف پہنچے گی اس لیے میں آپ سے قبل از وقت رحم کی درخواست کرتا ہوں کہ آپ درگزر اور عفو و کرم سے کام لے کر مجھے، اس نائب اور اس کی قوم کو معاف فرمادیں گے۔"

سلطان نے جواب دیا "میں نے کہہ تو دیا کہ میں کمزوروں کو کسی سزا کے لائق نہیں سمجھتا اس لیے تجھے، اس نائب کو اور اس کی قوم کو مجھ سے نہیں ڈرنا چاہیے۔"

ترجمان نے جواب دیا "حضور والا! یہ سب سیاہ رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے گوری رنگت والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کے دربار میں گوری رنگت والے تاجر کو بھی آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ خود کو برتر اور گوری رنگت والے کو کمتر سمجھتے ہیں۔ آپ کا اور آپ کے بیشتر سپاہیوں کا رنگ سرخ و سفید ہے اس لیے یہ نائب آپ لوگوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا اور اس کے چہرے پر کرختگی کے آثار پیدا ہو گئے۔"

سلطان کو ہنسی آگئی۔ اس نے ترجمان سے کہا "اس سے پوچھو، کیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا خطبہ حجتہ الوداع نہیں پڑھا جس میں یہ واضح اعلان موجود ہے کہ رنگ و نسل اور حسب نسب، اسلام میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہاں تقویٰ اور پرہیزگاری سے انسان کو فضیلت اور بزرگی مل سکتی ہے۔"

ترجمان نے سلطان کے جواب سے نائب کو آگاہ کردیا اور نائب نے سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے نائب کو ایک بڑی ذہنی کشمکش اور اذیت سے نجات دلوادی۔

سلطان نے اپنے لشکر کے ایک قاضی کو حکم دیا کہ وہ آبادی میں مسلمانوں کے گھروں میں جا کے جائزہ لے کہ وہ یہاں کس طرح رہتے ہیں اور یہاں کوئی فقیہ یا قاضی بھی ہے جو یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کررہا ہو اور یہاں کوئی مسجد بھی ہے، جہاں یہاں کے لوگ پنج وقتہ نمازیں پڑھتے ہوں۔"

قاضی کے حوالے ایک ترجمان کردیا گیا جو قاضی کو آبادی کے ایک قاضی کے گھر لے گیا۔ یہاں کا یہ قاضی بھی قاہرہ سے تعلق رکھتا تھا اور تقریباً دس سال سے یہاں رہ رہا تھا۔

قاضی کے مکان پر دستک دی گئی تو دربان ... ان دونوں کو کسی روک ٹوک کے بغیر اندر لے چلا گیا۔

اس وقت قاضی کے پاس ایک خوب صورت نوجوان عورت بیٹھی باتیں کررہی تھی۔

سلطان کا قاضی اور ترجمان دونوں منہ پھیر کے واپس ہوئے اور دربان سے کہا "احمق انسان! تو نے قاضی کو ہماری آمد کی خبر تک نہیں دی اور ہم دونوں کو زنان خانے میں لے چلا گیا۔"

دربان نے جواب دیا "جناب! یہ زنان خانہ نہیں ہے۔ قاضی اسی جگہ آنے والوں سے ملاقاتیں کرتا ہے۔"

نوجوان عورت ان دونوں کے واپس جانے پر مسکرا رہی تھی اور قاضی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

سلطان کے قاضی نے دربان سے پوچھا "یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ قاضی کے پاس اس کی بیوی بیٹھی ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ یہ زنان خانہ نہیں ہے۔"

اب وہ قاضی خود براہِ راست سلطانی قاضی سے مخاطب ہوا "جناب! آپ مت شرمائیں اور کسی تکلف اور لحاظ کے بغیر میرے پاس آجائیں۔"

یہ دونوں قاضی کی اجازت پر اس کے پاس پہنچے اور سرسری نظروں سے عورت کو دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ آپ کی اہلیہ نہیں ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا "نہیں جناب اور یہ میری ملاقاتی نشست گاہ ہے۔ میری زوجہ اندر موجود ہے۔"



سلطانی قاضی نے پوچھا "پھر یہ عورت آپ کی کیا لگتی ہے؟"

قاضی نے بے تکلفی سے جواب دیا "یہ میری دوست ہے اور یہاں اس قسم کی دوستی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔"

سلطانی قاضی کو اس جواب سے بڑی حیرت ہوئی، پوچھا "کیا یہاں اس قسم کی دوستیاں عام ہیں؟"

"مقامی قاضی نے جواب دیا "جی ہاں۔"

عورت ان دونوں کی باتیں نہیں سمجھ سکی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مقامی قاضی کو دیکھ رہی تھی۔

آخر اس نے پوچھا "یہ شخص کیا پوچھ رہا ہے؟"

مقامی قاضی نے ہنس ہنس کے ساری بات بتادی تو عورت بھی ہنسنے لگی۔

سلطانی قاضی نے مقامی قاضی سے درخواست کی "اگر اس قسم کی دوستیاں یہاں عام ہیں تو مجھے اس کا مشاہدہ کروایا جائے کیونکہ میں یہ ساری باتیں سلطان کے علم میں لاؤں گا۔"

قاضی نے کہا "بسم اللہ، بہت شوق سے۔ میں آپ کو یہاں کے معاشرے سے مکمل آگاہی بخشوں گا۔"

قاضی نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورت کو رخصت کیا اور اٹھ کر سلطانی قاضی کے ساتھ وہاں کے فقیہ کے گھر روانہ ہو گیا۔

راستے میں سلطانی قاضی نے مقامی قاضی سے کہا "تم تو قاہرہ سے یہاں آئے ہو اور قاہرہ میں عورتیں مردوں سے اس طرح دوستی نہیں کرتیں۔ تمہیں تو یہاں کے رسم و رواج کی پابندی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

مقامی قاضی نے جواب دیا "جناب! یہاں تو اس قسم کی دوستیاں معاشرے کا اہم حصہ ہیں۔ اب اگر میں اس معاشرے کے رسم و رواج کے خلاف گزر بسر کرنا چاہوں تو ان کے لیے اجنبی بن جاؤں گا اس لیے مجھے بھی انہیں جیسا بن جانا پڑا۔"

سلطانی قاضی نے پوچھا "کیا فقیہ بھی تمہاری طرح کہیں اور سے یہاں آیا ہے یا مقامی ہے؟"

مقامی قاضی نے جواب دیا "یہ بھی مکّے سے یہاں آیا ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے فقیہ کے گھر پہنچ گئے۔ دستک دی تو دربان نے دروازہ کھولا اور مقامی قاضی کے ساتھ دو اجنبیوں کو دیکھ کر واپس جانے لگا تو مقامی قاضی نے پوچھا "جناب فقیہ تشریف رکھتے ہیں، ان کا بتاؤ کہ سلطان معظم کا قاضی ان سے ملاقات کرنے آیا ہے۔"

دربان نے بتایا "جناب فقیہ تو تشریف نہیں رکھتے ہاں ان کی زوجہ محترمہ موجود ہیں۔ آپ لوگ اندر تشریف لے چلیں۔"

مقامی قاضی نے ان دونوں مہمانوں سے کہا "جناب فقیہ تو اندر موجود نہیں ہیں۔ کہیں تشریف لے گئے ہیں مگر ان کی زوجہ محترمہ موجود ہیں اور دربان کہہ رہا ہے کہ آپ لوگ تشریف لائیں۔"

سلطانی قاضی نے کہا "جب فقیہ اندر موجود نہیں ہیں تو ہم ان کی بیوی کے پاس کس طرح بیٹھیں گے۔"

ان دونوں میں یہ گفتگو جاری تھی کہ فقیہ کی بیوی خود دروازے پر آگئی اور مسکراتے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور مقامی قاضی سے اپنی زبان میں کہا "آپ لوگ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر تشریف لائیں۔ میرا شوہر آنے ہی والا ہے۔"

سلطانی قاضی کو اندر جانے میں تامل تھا مگر مقامی قاضی دونوں کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ فقیہ کی بیوی آگے آگے چل رہی تھی اور یہ تینوں اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھر کی نشست گاہ تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک نوجوان بھی موجود تھا۔

سلطانی قاضی اس نوجوان کو بغور دیکھنے لگا۔

فقیہ کی بیوی اس نوجوان کے پاس بیٹھ گئی اور سلطانی قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے مقامی قاضی سے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ مصر کا سلطان آیا ہوا ہے۔ اس کے لشکر کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ سلطان کے یہ دونوں آدمی میرے شوہر کو گرفتار کرنے تو نہیں آئے ہیں۔"

مقامی قاضی نے ہنستے ہوئے بتایا "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ سلطان مصر مسلمان ہے اور وہ ہم مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

فقیہ کی بیوی نے پوچھا "پھر وہ اتنی بڑی فوج لے کر یہاں کیوں آیا ہے؟"

مقامی قاضی نے یہ سوال سلطانی قاضی سے کردیا اور پوچھا "میں اس عورت کو اس کا کیا جواب دوں؟"

ابھی اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ فقیہ بھی گھر میں داخل ہوا اور مقامی قاضی کے ساتھ دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا یہ دونوں مصر سے آئے ہیں؟"

مقامی قاضی نے جواب دیا "ہاں اور قاضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سلطانی لشکر کے قاضی ہیں اور ہم دونوں سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔"

فقیہ نے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مزاج پرسی کی۔

سلطانی قاضی نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوجوان کس کا رشتے دار ہے؟ تمہارا یا تمہاری بیوی کا؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "یہ ہمارا رشتے دار نہیں ہے بلکہ یہ میری بیوی کا دوست ہے۔"

اس کے بعد اس نے ان تینوں کو ایک الگ جگہ لے جا کے بیٹھا دیا۔

سلطانی قاضی کو حیرت ہوئی کہ فقیہ کو اپنی بیوی کے دوست پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ شوہر کی موجودگی میں بھی اس کی بیوی کے پاس بے تکلفی سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

سلطانی قاضی نے کہا "جناب فقیہ! تم تو مکے سے تعلق رکھتے ہو۔ کیا تمہیں یہ بات بری نہیں لگتی کہ تمہاری بیوی تمہاری عدم موجودگی میں کسی غیر مرد کو دوست بنا کے اپنے گھر میں بلائے اور بے تکلفی سے باتیں کرتی رہے اور پھر تمہارے آنے کے بعد بھی دونوں تمہاری پروا کیے بغیر باتوں میں مشغول رہیں اور تمہیں ان پر کوئی اعتراض نہ ہو۔"

اس نے جواب دیا "جناب قاضی محترم! جب بارہ تیرہ سال پہلے میں یہاں آیا تھا تو مجھے یہ سارے مناظر بہت برے لگتے تھے مگر آہستہ آہستہ میں اس ماحول اور معاشرے کا عادی ہوتا چلا گیا پھر میں نے چند سال بعد یہیں شادی کر لی۔ اب اگر میں اپنے ماحول اور معاشرے کے مطابق رہنا چاہوں تو نہیں رہ سکتا کیونکہ یہاں کے مرد اور عورتیں ہم بیرونی دنیا والوں سے یہی کہتے ہیں کہ ہماری عورتیں تم لوگوں کی عورتیں جیسی نہیں ہیں۔"

سلطانی قاضی نے مقامی قاضی اور فقیہ سے کہا "مجھے تو تم دونوں پر حیرت ہے کہ تم نے ان کی اصلاح نہیں کی اور خود انہی کے رنگ میں رنگ گئے۔"

اتنے میں ایک اور شخص بغیر اجازت لیے اندر داخل ہو گیا۔

فقیہ نے اس شخص کا سلطانی قاضی سے تعارف کروایا۔ "جناب! یہ شخص یہاں کا مشہور تاجر ہے اور یہ کئی بار قاہرہ جا چکا ہے اور وہاں کا دھاری دار کپڑا یہی تاجر پورے علاقے کو فراہم کرتا ہے۔"

سلطانی قاضی کو تاجر کی شکل جانی پہچانی لگی۔ وہ اس تاجر کو قاہرہ کے کپڑا بازار میں دیکھ چکا تھا اور تاجر نے بھی سلطانی قاضی کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور پوچھا "آپ غالباً سلطان کے ساتھ یہاں آئے ہیں؟"

سلطانی قاضی نے جواب دیا "ہاں، میں بھی سلطانی لشکر کا ایک فرد ہوں اور یہ میرا ساتھی اس علاقے میں میرا ترجمان ہے۔"

تاجر ان سرسری باتوں کے بعد اندر جانے لگا تو سلطانی قاضی نے اسے روک لیا "اندر کہاں چلے؟ صاحب خانہ تو یہاں ہم میں موجود ہیں۔"

تاجر نے جواب دیا "آپ لوگ ان سے باتیں کریں۔ میں اتنی دیر میں ان کی اہلیہ سے باتیں کر لوں گا۔"

سلطانی قاضی نے کہا "اس کے پاس تو پہلے سے ایک نوجوان دوست موجود ہے۔ تم ان دونوں کی خلوت میں کیوں مداخلت کرو گے؟"

تاجر نے جواب دیا "ہاں، اگر وہاں کوئی پہلے سے موجود بھی ہے تو وہ مجھے دیکھ کر اٹھ جائے گا۔"

مقامی قاضی نے کہا "سلطان کو سوڈان کے بارے میں کچھ ایسی ہی ناشائستہ باتوں کا علم ہوا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سوڈانی بغاوت پر آمادہ ہیں اس لیے سلطان کو یہاں آنے کی زحمت کرنا پڑی۔"

تاجر کو سلطانی قاضی کی باتیں بری لگیں اور کہا۔ "جناب! سلطان کو ہمارے معاشرتی داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ رہ گیا یہ الزام کہ سوڈانی مصر کے خلاف بغاوت کر رہا ہے تو سلطان کو یہاں آنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

سلطانی قاضی نے کہا "تم جسے اپنی معاشرتی اور داخلی زندگی میں ہماری مداخلت کہہ رہے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ اگر تم لوگ مسلمان ہو تو تمہارا معاشرہ بھی اسلامی ہونا چاہیے۔"

تاجر نے کہا "کیا آپ کو یہاں کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہماری عورتیں غیر سوڈانیوں جیسی نہیں ہیں۔ ہم لوگ تو پھر بھی بہت معقول معاشرتی زندگی اور ماحول رکھتے ہیں۔ جب سلطان سوڈان کے دارالحکومت تشریف لے جائیں گے تو انہیں وہاں جو کچھ نظر آئے گا، اسے دیکھ کر ہم لوگ معقول اور شریف ٹھہریں گے۔"

سلطانی قاضی نے مقامی قاضی اور فقیہ کو سمجھایا "تم لوگ اس معاشرے کی اصلاح کرو۔ تمہارا ان کے رنگ میں رنگ جانا، ہم سب کے لیے بڑی شرمناک بات ہے۔"

فقیہ نے سلطانی قاضی کو بتایا "آپ لوگ جو کچھ فرما رہے ہیں بالکل بجا لیکن یہاں مالے کے سلطان کا فرما (نائب) حکومت کرتا ہے اور وہ اسی ماحول اور معاشرے کا حاکم ہے



پھر ہم اسے کس طرح قائل کریں گے۔"

سلطانی قاضی نے کہا "ہم سلطان کے ذریعے اس کو حکم دے جائیں گے کہ وہ اسلامی ماحول اور معاشرہ اختیار کرے ورنہ اسے سزا دی جائے گی۔"

مقامی قاضی نے کہا "ہمارا تو یہ خیال ہے کہ سلطان یہاں کے فرما کو جو حکم دیں گے، وہ اسے مان لے گا اور سلطان کے سامنے اس پر خود بھی عمل کرے گا اور لوگوں کو بھی عمل کا پابند کر دے گا لیکن سلطان کے جاتے ہی وہ خود اور یہاں کا پورا معاشرہ اپنی پرانی روش اختیار کر لے گا اور سلطان یہاں کے دشوار گزار راستوں سے بار بار آنے سے رہا۔"

سلطانی قاضی نے کہا "میں تو تم دونوں سے یہ کہتا ہوں کہ یہاں کی اچھائی برائی کے ذمے دار تم دونوں ہو اور یہ کہنا کہ دونوں یہاں کے فرما کے سامنے بے بس ہو، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب بھی ہمت کی کمر باندھ لو تو یہاں کا ماحول اور معاشرہ اسلامی ہو جائے گا ورنہ تم لوگ ان کے رنگ میں اتنے رنگ جاؤ گے کہ تمہارے دلوں سے اسلامی معاشرہ دھوئیں کی طرح اڑ جائے گا۔"

مقامی قاضی نے محسوس کر لیا کہ اگر یہ بحث جاری رہی تو سلطانی قاضی کو ضد ہو جائے گی اور وہ سلطان کو سب کچھ بتا دے گا اور اس کے بعد سلطان یہاں والوں کے خلاف جو سخت قدم اٹھائے گا تو پتا نہیں یہ آبادی بچے بھی یا نیست و نابود کر دی جائے گی۔"

مقامی قاضی نے وعدہ کر لیا کہ وہ اب کوشش کرے گا کہ یہاں کا معاشرہ اسلامی ہو جائے۔

ان میں اس موضوع کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہوئیں اور انہی دونوں سے سلطانی قاضی کو مالے کے بادشاہ کے بارے میں اشارتاً ایسی باتیں معلوم ہو گئیں کہ سلطانی قاضی کو غیر معمولی جستجو ہوئی کہ وہ مالے پہنچ کے دیکھے کہ وہاں کے بادشاہ کے رسم و رواج میں آخر ایسی کون سی ناگفتہ باتیں پائی جاتی ہیں جنہیں مقامی قاضی اور فقیہ اشاروں کنایوں میں کچھ بتا تو رہے ہیں مگر صاف صاف بتاتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔

مقامی قاضی اور فقیہ بھی سلطانی قاضی کے ساتھ سلطان کی خدمت میں پہنچے۔

سلطان ان دونوں سے بہت اچھی طرح پیش آیا اور اپنے قاضی سے پوچھا "سچ سچ بتاؤ تو نے یہاں اسلام کو کس حال میں پایا؟"

سلطانی قاضی نے جواب دیا "یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں مگر یہاں اب تک کوئی تبلیغی جماعت نہیں پہنچی جو یہاں کے مقامی لوگوں کی اصلاح کرتی اور صحیح اسلام ترویج پاتا۔"

سلطان نے پوچھا "صحیح اسلام کی ترویج سے تیری کیا مراد ہے؟"

قاضی نے جواب دیا "یہاں کا معاشرہ ضرورت سے زیادہ آزاد ہے۔ بس اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ میں نے یہاں کی مسجد دیکھی ہے، جو اپنی بناوٹ اور فن تعمیر کے لحاظ سے نہایت معمولی نمونہ ہے مگر جب مسجد میں نمازیوں کی تعداد پر غور کرتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس بات کی کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے مگر ان کا معاشرہ اور ان کا ماحول ان کے نمازیوں جیسا نہیں ہے۔"

سلطان نے سخت لہجے میں کہا "تم لوگ پتا نہیں کس قسم کی باتیں کر رہے ہو کہ میں انہیں بالکل نہیں سمجھ سکتا۔"

سلطان نے مقامی قاضی سے پوچھا "اب میں اپنے آدمی سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ تم دونوں مجھے بتاؤ کہ میرا قاضی کچھ تفصیل بتاتے ہوئے کیوں گھبرا رہا ہے۔ اب تم میں سے کوئی مجھے یہ بتائے کہ میرا قاضی کون سی باتیں مجھ سے چھپا رہا ہے۔"

فقیہ شہر نے بتایا "سلطان معظم! جو باتیں آپ کا قاضی بتاتے ہوئے ڈر رہا ہے، وہ آپ کو کسی نہ کسی دن کسی ذریعے سے معلوم ہو جائے گی اس لیے ابھی میں نے سوچا کہ وہ باتیں خود مجھے بتا دینی چاہییں۔"

سلطان کو فقیہ کی گفتگو پسند آئی اور اس نے فقیہ کو اپنے پاس بٹھا لیا، پوچھا "تیرا تعلق کس شہر سے ہے؟"

اس نے بتایا "میں عربی ہوں اور میرا وطن مکہ ہے مگر تقریباً گیارہ سال سے میں یہاں رہ رہا ہوں۔"

سلطان نے فقیہ کی پیٹھ تھپ تھپائی "بہت خوب، مکے کے لوگ ذرا خشک اور سخت مزاج ضرور ہوتے ہیں اور ان میں شاید برداشت کی زیادہ قوت بھی نہیں ہوتی مگر میں تجھ میں برداشت کی قوت بھی دیکھ رہا ہوں اور تجھے نطق اعرابی بھی ملی ہے۔ ہاں تو اب بتا کہ ہمیں یہاں کی کون سی خاص بات بتانا چاہتا ہے؟"

فقیہ نے کہا "حضور والا! یہاں کا معاشرہ اسلامی نہیں اور لوگ اپنے گھروں میں اتنے زیادہ آزاد ہیں کہ آپ سنیں گے تو بہت زیادہ مشتعل ہو سکتے ہیں مگر میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ تحمل سے سنیں اور تحمل سے تامل کریں اور تحمل سے ہمیں نصیحت کریں۔"

بیبرس نے درشت لہجہ اختیار کیا "تو مجھے تحمل اور تامل اختیار کرنے کی نصیحتیں مت کر اور جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں صرف اس کا جواب دے۔"

فقیہ نے جواب دیا "یہاں کی عورتیں غیر مردوں سے دوستی بنا لیتی ہیں اور ان کے مردوں کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔"

بیبرس نے یہ مختصر جواب نہایت حیرت سے سنا "یعنی غیر مرد، دوسروں کی عورتوں سے دوستی کر لیتے ہیں اور عورتوں کے عزیزوں اور شوہروں کو اس تعلق پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔"

فقیہ نے جواب دیا "ہاں، کیونکہ یہاں کے مردوں کا ایمان ہے کہ اس قسم کے تعلقات میں کوئی خرابی اس لیے پیدا نہیں ہو سکتی کہ یہاں کی عورتیں غیر سوڈانی عورتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔"

بیبرس نے غصے میں کہا "کیسا بے ہودہ ایمان ہے یہاں کے مردوں کا! تم فقیہ شہر ہو اس لیے اس رسم و رواج کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں آئندہ ایسی لغویت نہ دیکھوں اور نہ سنوں۔"

سلطان نے مقامی قاضی اور فقیہ شہر کو رخصت کر دیا اور اپنے قاضی سے یہاں والوں کے اطوار اور رواج پر کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔

یہاں کے فریا نے سلطان کی دعوت کرنا چاہی تو سلطان نے اسے منع کر دیا اور کہا "تو اگر پورے لشکر کی دعوت کر سکتا تو مناسب ہوتا مگر صرف میری دعوت کرنے سے میں اس لیے خوش نہیں ہوں گا کہ اس سے میری فوج کو تکلیف پہنچے گی۔"

چند دن یہاں رہنے کے بعد سلطان مالے روانہ ہو گیا۔

مالے کے بادشاہ کو سلطان کے پہنچنے کی خبریں پہنچا دی گئیں تو وہ اپنے درباری امرا کے ساتھ سلطان کے استقبال کے لیے چار فرسخ چل کر سلطان کا انتظار کرنے لگا اور جب گرد و غبار نمودار ہوا تو مالے کے بادشاہ نے سلطان کے گھوڑے کے آگے لیٹ کے سلطان کا استقبال کیا۔

استقبال کا یہ طریقہ سلطان کے لیے عجیب و غریب تھا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور مالے کے بادشاہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور پوچھا "یہ تو میرے گھوڑے کے سامنے لیٹ کیوں گیا تھا؟"

مالے کے بادشاہ نے جواب دیا "مجھ میں آپ کا مقابلہ کرنے کی نہ تو ہمت ہے، نہ استطاعت۔ اس لیے میں نے آپ کے گھوڑے کے سامنے لیٹ کر یہ واضح کر دیا کہ آپ اپنے گھوڑے سے مجھے روند کر میرے ملک پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

سلطان نے کہا "میں شرمندہ ہوں کہ میں یہاں فوج لے کر کیوں آیا۔ مجھے تو قاہرہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ سوڈان کا بادشاہ باغی ہو گیا ہے اور میرے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہے۔"

مالے کے بادشاہ کے ساتھ جو امرا آئے تھے، وہ سب سلطان کے گھوڑے کے سامنے سربسجود تھے۔ سب کو اٹھنے کا حکم دیا گیا اور سلطان نے اسی میدان میں اپنے خیمے نصب کروا دیے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور مالے کے بادشاہ سمیت سب روزے سے تھے۔

سلطانی مجسمہ نصب ہو گیا تو اس میں مالے کے بادشاہ اور اس کے امرا کو بٹھایا گیا اور اسے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ مالے کا بادشاہ اور اس کے امرا سب ہی حافظ قرآن تھے اور نمازیں بڑی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

سہ پہر کو ان سب کو سلطان نے رخصت کر دیا تو بادشاہ نے اپنی اور اپنے امرا کی طرف سے سلطان کو بتایا "افطاری کا سامان میرے خدام اور امرا کے خدام افطار سے پہلے پہنچا دیں گے اس لیے آپ افطاری کا بندوبست مت کیجیے گا۔"

سلطان نے بادشاہ سے بھی وہی بات کہی جو اس کے فریا سے کہہ آیا تھا "تو میری پوری فوج کی افطاری کا بندوبست نہیں کر سکتا اور میں یہ بات پسند نہیں کروں گا کہ میں تو تیری بھیجی ہوئی چیزوں سے افطار کروں اور میرے فوج اپنے وسائل سے افطار کرے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "جناب والا! میں آپ کی پوری فوج کے لیے افطار کا سامان بھیجوں گا مگر آپ کے لیے افطار کی جو چیزیں بھیجی جائیں گی، انہیں میری اور امرا کی کنیزیں لے کر آئیں گی اس وقت آپ سے صرف یہی کہنا ہے کہ آپ میری بھیجی ہوئی چیزوں سے افطار کریں تاکہ اس کا ثواب مجھے حاصل ہو جائے۔"

بادشاہ تو اپنے امرا کے ساتھ اپنے محل میں واپس چلا گیا اور سلطان اور اس کے امرا مالے کے بادشاہ کے بارے میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

قریب ہی سلطان کو ایک بڑی مسجد نظر آئی تو سلطان اپنے امرا کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے مسجد میں پہنچ گیا۔ مسجد دیکھتے ہی دیکھتے نمازیوں سے بھر گئی۔ یہاں کئی بڑے بڑے مصلے بچھے ہوئے تھے مگر ان پر صرف ایک ایک نمازی بیٹھا



ہوا تھا۔ سلطان کو حیرت ہو رہی تھی کہ ان خالی بڑے بڑے مصلوں پر صرف ایک ایک آدمی کیوں بیٹھا ہے اور دوسروں کو ان پر بیٹھنے بھی نہیں دیتا۔"

سلطان نے اپنے قاضی سے کہا "ان خالی مصلوں پر بیٹھنے والوں سے پوچھو کہ وہ ان پر کسی کو بیٹھنے کیوں نہیں دیتے؟"

قاضی نے جب یہ سوال مصلوں پر بیٹھے ہوئے افراد سے کیا تو انہوں نے جواب دیا "یہ مصلے یہاں کے امرا کے ہیں اور ہم ان کے غلام ہیں۔ وہ ہمیں نماز سے پہلے ان مصلوں کے ساتھ مسجد میں بھیج دیتے ہیں تاکہ ہم ان امرا کے پہنچنے سے پہلے ان کے لیے ان مصلوں کو بچھا دیں۔ ہم ان پر بیٹھے ہوئے اپنے مالکوں اور ان کے فرزندوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سلطان نے کہا "لیکن تم لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر تمہارے آقا نماز سے کچھ پہلے یہاں آ جائیں تو اس سے ان کی صحت پر کون سا برا اثر پڑے گا اور کیا ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے مصلے قبل از وقت مسجد میں نہ بچھا دیے گئے تو وہ اپنے لیے مسجد میں جگہ نہیں پائیں گے اور مسجد میں اتنے زیادہ نمازی آ جائیں گے کہ امرا کو اپنے مصلے مسجد کے باہر بچھانا پڑیں گے۔"

سلطان کو بتایا گیا کہ یہاں کی مسجدیں ہمیشہ نمازیوں سے اتنی بھر جاتی ہیں کہ بہت سے بعد میں آنے والوں کو مسجد میں جگہ نہیں ملتی اور انہیں مسجد کے باہر بچھائی گئی صفوں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

سلطان نے محسوس کیا کہ مسجد کا امام سلطان سے بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے اور نماز کی امامت سے پہلے سلطان کی اجازت کا خواہش مند ہے۔

سلطان نے دیکھا کہ خالی مصلوں پر ان کے امرا اور فرزندوں نے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے خالی مصلے بھر گئے اور ان کے غلاموں کو مسجد کے باہر بچھائی گئی صفوں میں کھڑا ہونا پڑا۔

نماز کے بعد امام نے سلطان سے خواہش کی کہ سلطان مسجد سے ملحقہ مدرسے کا معائنہ کرے۔

سلطان امام کے ساتھ اس کے مدرسے میں پہنچا تو اسے اس مدرسے میں کئی ایسے لڑکے نظر آئے جن کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔

سلطان نے امام سے پوچھا "کیا زنجیروں میں جکڑے ہوئے بچوں نے کوئی جرم کیا ہے کہ ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئیں کہ وہ بھاگ نہ سکیں۔"

امام نے بتایا "یہ وہ بچے ہیں جو قرآن پاک کے حفظ کرنے سے انکاری ہوتے ہیں اس لیے یہ زنجیریں ان کے پاؤں میں ڈال دی گئی ہیں کہ جب تک یہ قرآن حفظ نہیں کر لیں گے اس وقت تک ان کے پاؤں کی زنجیریں دور نہیں کی جائیں گی۔"

سلطان نے پوچھا "ان لڑکوں کے ماں باپ تجھے منع نہیں کرتے کہ ان کے بیٹوں پر ظلم نہ کیا جائے۔"

امام نے ایک بچے کو ان بچوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور والا! یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ کھیل کود میں اتنا مشغول ہوا کہ قرآن پاک کے حفظ کرنے میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تو میں نے خود اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اب دوسرے بچوں کے ماں باپ اپنے بیٹوں کے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر پریشان نہیں ہوں گے۔"

امام نے کسی کونے سے ایک دوسرے لڑکے کو لا کر سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے دونوں پاؤں میں بھی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔

امام نے سلطان کو بتایا "جناب والا! یہ یہاں کے بادشاہ کا بدذوق بیٹا ہے۔ اسے بھی قرآن پاک حفظ کرنا ہے چنانچہ اس نے جیسے ہی حفظ کرنے سے انکار کیا، میرے موکلوں نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ بادشاہ نے بھی اجازت دے دی کہ میں اس وقت تک اس پر سختی کرتا رہوں، جب تک یہ قرآن پاک حفظ نہ کر لے۔"

سلطان کچھ دیر یہاں رک کر اپنے خیمے میں واپس چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد خیمے کے باہر سے ایسی آوازیں سننے میں آئیں جیسے باہر کسی کا کسی سے جھگڑا ہو رہا ہے۔

سلطان نے نالی بجا کے دو خدمت گاروں کو اندر بلا لیا اور حکم دیا "ان جھگڑا کرنے والوں کو قید کر دیا جائے کیونکہ افطار کے وقت ان کے فضول جھگڑے کی آوازوں سے روزے داروں کو تکلیف پہنچے گی۔"

ان خدمت گاروں نے سلطانی حکم کو باہر تک پہنچانے میں تاخیر کی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔

سلطان نے ان کے مستقل کھڑے رہنے پر غصے سے کہا "تم نے میرا حکم نہیں سنا۔"

ایک خدمت گار نے عرض کیا "سلطان محترم! یہاں کے بادشاہ اور اس کے امرا نے افطار کا سامان جس طرح بھیجا ہے، اس سے ہمارے امرا کے روزے مکروہ ہو رہے ہیں۔"

سلطان نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

ایک خدمت گار نے جواب دیا "سلطان کو زحمت تو ہوگی۔ ہم کیا بتائیں۔ باہر نکل کر خود دیکھ لیں۔"

سلطان نے باہر نکل کے دیکھا۔ وہاں بہت سی برہنہ لڑکیاں اور عورتیں اظہاری کا سامان لیے کھڑی ہوئی تھیں اور سلطانی امرا حیران پریشان ان سے اظہاری کا سامان وصول کرنے کے بجائے انہیں دیکھنے میں مشغول تھے۔

ان نوجوان برہنہ لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ بادشاہ کا ایک آدمی بھی آیا تھا۔ اس نے سلطان کو دیکھتے ہی ادب سے عرض کیا "سلطان معظم! اپنے آدمیوں کو حکم دیں کہ وہ اظہاری کا سامان ان سے وصول کرلیں اور شاہی کنیزوں کو واپس جانے کا حکم دیا جائے۔"

سلطان خود بھی ہکا بکا اس منظر سے شرمسار ہوگیا۔ بادشاہ نے خدمت گار سے پوچھا "یہ کیسی بے ہودہ عورتیں ہیں جو برہنہ غیر مردوں میں آگئیں؟"

بادشاہ کے آدمی نے جواب دیا "حضور والا! اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہاں کنیزیں اور خواتین لباس نہیں استعمال کرتیں۔ یہ بادشاہ کے محل میں بھی اسی طرح رہتی ہیں۔ امرا کی کنیزیں بھی کپڑے نہیں پہنتیں۔"

سلطان نے پوچھا "تم لوگ مسلمان بھی ہو یا تمہارا کوئی اور مذہب ہے؟"

شاہی خدمت گار نے جواب دیا "کیا آپ نے ہمیں مسجد میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا؟"

سلطان کو اچانک یہ شکل جانی پہچانی لگی اور یاد آیا کہ یہ شخص بھی مسجد کی صفوں میں موجود تھا۔

افطار کا وقت قریب تھا۔ برہنہ لڑکیوں اور عورتوں سے افطاری لے کر واپس بھیج دیا گیا۔ جب افطار کا وقت آیا اور سب نے افطاری کرلی تو سلطان نے شاہی خدمت گار کو حکم دیا "اپنے بادشاہ سے کہنا کہ وہ کل اس طرح افطاری نہ بھیجے۔ ہم لوگ افطاری کا سامان خود تیار کرلیں گے۔"

خدمت گار نے سلطان سے درخواست کی "حضور والا! آج عشا کی نماز آپ شاہی محل کی چھوٹی سی مسجد میں ادا فرمائیں۔"

سلطان نے پوچھا "کیا شاہی محل کی چھوٹی سی مسجد میں بھی بادشاہ کی کنیزیں ہمارے درمیان برہنہ حالت میں نماز پڑھیں گی؟"

خدمت گار نے جواب دیا "نہیں، انہیں مسجدوں میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔"

سلطان نے شاہی خدمت گار سے کہا "جاؤ، اپنے بادشاہ کو بتادو کہ آج عشا کی نماز میں شاہی محل کی مسجد میں ادا کروں گا اور اس نماز میں بادشاہ کے امرا کو بھی موجود ہونا چاہیے۔"

خدمت گار سلطان کا یہ حکم لے کر واپس چلا گیا۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد سلطان نے ایک چھوٹے سے قافلے کو شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا مگر یہ قافلہ سلطانی لشکر کو دیکھ کر ڈر گیا اور پسپا ہوتے ہوتے لشکر کے سامنے سے آہستہ آہستہ گزرا۔ کئی آدمی مشعلیں ہاتھوں میں لیے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان مشعلوں کی روشنی میں سلطان اور اس کے امرا نے قافلے کو غور سے دیکھا تو قافلے کے جملہ افراد گوری رنگت کے نظر آئے۔

سلطان نے ان سب کو روک لیا اور ان کے ذمے دار آدمیوں کو طلب کرلیا۔ یہ سب کل بارہ آدمی تھے اور جب یہ سلطان کے سامنے پیش کیے گئے تو یہ سب خوف سے کانپ رہے تھے۔

سلطان نے ان سے عربی میں بات کی تو معلوم ہوا کہ ان کا تعلق شہر فاس سے ہے اور وہ یہاں اس لیے آئے ہیں کہ دو ماہ پہلے ان کا ایک بزرگ تجارت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ اس کے پاس بہت سا قیمتی سامان اور سونا بھی تھا پھر کسی وجہ سے ناگہانی اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا سارا سامان اور سونا مالے کے بادشاہ نے امانتاً اپنے محل میں رکھوا دیا اور مرنے والوں کے عزیزوں کو تاجروں کے ذریعے خبر بھیج دی کہ وہ اپنے عزیز کی موت کے بعد اس کا سامان اور سونا بادشاہ سے لے جائیں۔

سلطان کو بڑی حیرت ہوئی "کیا بادشاہ اتنا ایمان دار ہے کہ گوری رنگت کے تاجر کی موت کے بعد اس کا سارا سامان اور سونا مرنے والوں کے ورثہ کو دے دیا جائے گا؟"

قافلے والوں نے دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا "یہاں کا کالا بادشاہ نہایت ایمان دار اور انصاف پرور ہے۔ تاجر کو مرے ہوئے گو کہ دو مہینے گزر گئے لیکن دو سال بھی گزر جاتے تو اس کا چھوڑا ہوا سامان اور سونا اس کے عزیزوں کو تلاش کرکے ان کے حوالے کردیا جاتا۔"

سلطان نے اس بارہ رکنی وفد کو اجازت دے دی کہ وہ بادشاہ کے پاس جائیں۔ سلطان خود بھی وہاں پہنچے گا۔

عشا سے پہلے سلطانی سواری شاہی محل کی طرف حرکت میں آگئی اور بادشاہ خود بھی بے چینی سے اپنے محل کے بالائی حصے میں ٹہلتا رہا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ محل کے بیرونی حصے میں کہیں فاس کے مرحوم تاجر کے ورثا ٹھہرے ہوئے ہوں



گے۔

سلطان اپنے رفیقوں کے ساتھ شاہی محل پہنچ گیا۔ شاہی محل کے باہر بادشاہ کے مقربین اور امرا نے سلطان کا استقبال کیا۔ وہ سلطان کو شاہی محل میں لے جانا چاہتے تھے مگر سلطان نے انہیں بتایا کہ وہ بادشاہ سے حسب قرار مسجد میں ملاقات کرے گا۔

بادشاہ نے شاہی محل کی بالائی منزلوں سے بیرونی محل کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ سلطانی فوج نے پورے محل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے۔ محل کے چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔

بادشاہ نے جب یہ سنا کہ سلطان شاہی محل میں داخل ہوچکا ہے تو وہ بھی گھبرایا پریشان حال اپنے مقربین کے ساتھ مسجد پہنچا اور سلطان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے انتہائی شرمندگی ہے کہ میں آپ کے استقبال کے لیے محل کے باہر نہیں پہنچ سکا۔"

سلطان نے اس کی معذرت کا کوئی جواب نہیں دیا اور صرف یہ پوچھا "فاس کے مرحوم تاجر کے ورثا آئے تھے، وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا "کچھ دیر بعد وہ بھی یہیں آنے والے ہیں کیونکہ وہ بھی ہمارے ساتھ عشا کی نماز پڑھیں گے۔"

اور واقعی تھوڑی ہی دیر میں فاس سے آئے ہوئے بارہ افراد بھی مسجد میں داخل ہوئے۔

سلطان نے انہیں اپنے پاس بٹھا کے دریافت کیا "کیا ہوا تمہارا مسئلہ حل ہوا؟ یا کچھ باقی ہے؟"

بادشاہ نے فاس والوں کے بولنے سے پہلے ہی بتایا "آپ ہمارے کسی بھی معاملے میں معترض ہوسکتے ہیں مگر جہاں تک عدل وانصاف کا تقاضا ہے، اس میں آپ ہمیں پیچھے نہیں پائیں گے۔"

فاس کے وفد کے ارکان نے بھی سلطان کو بتایا "جناب والا! آپ عدل وانصاف کے معاملے میں اس بادشاہ کو کبھی بھی..."

سلطان نے وفد کے ارکان کو منع کیا "تم لوگ اپنی اس رائے کا اظہار بادشاہ کی عدم موجودگی میں کرنا کیونکہ بادشاہ کے روبرو تم لوگ اس کی مخالفت میں زبان نہیں کھول سکتے۔"

بادشاہ نے شکایتی لہجے میں سلطان سے کہا "آپ میری دیانت اور عدالت پر شبہ نہ کریں۔ آپ کو آزادی دینے کی بات کرنا، آپ کی اہانت اور بے عزتی کرنے کے مترادف ہوگا ورنہ میں آپ کو مشورہ دیتا کہ میری دیانت اور عدالت کے بارے میں آپ یہاں کسی بھی شخص سے بات کرسکتے ہیں۔ ہر شخص یہی گواہی دے گا کہ میں انصاف، دیانت اور عدل میں..."

سلطان نے موضوع بدل دیا اور برہنہ عورتوں کے بارے میں بات چیت شروع کردی اور پوچھا "تیرے ملک میں یہ کیسا بے ہودہ دستور ہے کہ یہاں عورتیں لباس نہیں پہنتیں اور تو خود کو مسلمان بھی سمجھتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "سلطان کا اعتراض بجا ہے لیکن عورتوں کے معاملے میں یہاں صدیوں سے یہی رائج ہے کہ وہ لباس نہیں پہنتیں اور میں کسی کے خلاف جبر سے کام نہیں لے سکتا۔"

سلطان نے غصے میں کہا "احمق انسان! ایک طرف تو تُو مسلمان ہونے کا دعویدار ہے اور دوسری طرف یہاں کی جہالت کی رسموں پر کاربند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں تجھے کیا سمجھوں۔"

بادشاہ نے جواب دیا "آپ نے ہمیں رمضان میں روزے رکھتے دیکھ لیا مسجد میں نماز پابندی سے پڑھتے ہوئے بھی دیکھ لیں گے۔ میرے عدل وانصاف کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ یہ ساری باتیں، میرے بارے میں گواہی دے رہی ہیں کہ میں کٹر مسلمان ہوں۔"

سلطان نے جواب دیا "یہ سب کچھ درست مگر عورتوں کا لباس نہ پہننا اور تیری اس بارے میں خاموشی بلکہ تائید بڑی شرمناک ہے۔ اسلام نے شرم وحیا کی بڑی تاکید کی ہے اور تیرے یہاں اس چیز کی کمی ہے تو میں اس سے اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تو نام نہاد مسلمان ہے۔"

بادشاہ نے وعدہ کیا "اچھا اب میں بتدریج اس مسئلے پر قابو بھی پانے کی کوشش کروں گا۔"

سلطان نے سختی سے کہا "کوشش کرنا کیا معنی؟ تجھے تو اس سلسلے میں سختی اور زبردستی سے کام لینا ہوگا۔"

بادشاہ نے وعدہ کرلیا "ٹھیک ہے، میں سختی اور زبردستی سے کام لے کر عورتوں کو راہِ راست پر لے آؤں گا۔"

سلطان نے بادشاہ کو بتایا "کیا تو جانتا ہے کہ میں سوڈان کیوں آیا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "آپ اسلامی دنیا کے بہت بڑے سلطان ہیں لیکن جہانگیری اور ملک گیری آپ کے مزاج اور طبیعت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ اب

آپ سوڈان پر تسلط جما کے یہاں بھی اپنا نمائندہ بٹھادیں گے اور مجھے معزول کرکے قاہرہ لے جائیں گے۔"

سلطان نے ہنستے ہوئے کہا "میرا ارادہ تو یہی تھا لیکن تجھے مسلمان دیکھ کر اور تیری عدالت اور دیانت کے شہرے سے متاثر ہوکر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

بادشاہ نے شکایت کی "جنابِ والا! میں آپ کی باتوں پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرسکتا مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس سے تو میں یہی سمجھا ہوں کہ آپ غیر جانب داری کا اعلان کرتے رہیں گے اور میری گرفتاری کا جواز بھی ڈھونڈتے رہیں گے اور جب جواز مل جائے گا تو آپ اسی کو بہانہ بنا کر مجھے کوئی عبرت ناک سزا دے دیں گے۔"

سلطان کو اپنے حریف کی بے عزتی سے خوشی حاصل ہورہی تھی چنانچہ بادشاہ نے شکایتاً کہا "جنابِ والا! مجھے محل کی بالائی منزل سے یہ دیکھ کر دکھ پہنچا کہ محل کے چاروں طرف آپ کی فوج موجود ہے اس سے میں کیا سمجھوں کہ آپ اس فوج سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

سلطان نے کہا "سچ سچ بتاؤں۔"

بادشاہ نے جواب دیا "کیا آپ جھوٹ بھی بول سکتے ہیں؟"

سلطان کو بادشاہ کے اس جواب سے ایسی تکلیف پہنچی گویا اسے نشتر لگادیا گیا ہو۔

سلطان نے جواب دیا "میں تیرے محل کی اس مسجد میں اپنے چند مقربین کے ساتھ بے پس وپیش چلا آیا تو مجھے گرفتار بھی کرسکتا تھا یا مجھے قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہاں آنے سے پہلے ہی اپنی فوج کو محل کے چاروں طرف لگادیا اور اسے یہ حکم دے کر چلا آیا کہ وہ جیسے ہی میری چیخ کی آواز سنیں تو فوراً محل میں داخل ہوجائیں۔"

بادشاہ نے کہا "کیا میں اتنا طاقت ور ہوں کہ سلطان کا ہم سر بننے کی کوشش کروں جنابِ والا! میں یہاں کا چھوٹا سا حکمران ہوں اس لیے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنے کمزور اور طاقت ور ہم عصوں سے واقف نہ ہوں۔ میں سلطان کو گرفتار کروں گا۔ توبہ توبہ۔ آپ مجھے۔"

سلطان نے افسوس کرتے ہوئے کہا "مجھے میرے مخبروں نے یہاں کے بارے میں بڑی ناقص خبریں دی تھیں۔ ان پر میں نے یہاں آکے عملی قدم اٹھایا ہے تو یہ قدم بڑا ہی شرمناک کہا جائے گا لیکن خیر چھوڑ ان باتوں کو تجھے تو بس یہ بتا کہ میں سوڈان میں کب تک رہوں؟ اور کیا مجھے قاہرہ میں سوڈان کی نفری مدد ملتی رہے گی؟"

سلطان نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا مگر جواب نہ ملنے پر سلطان نے نرمی سے دھمکی دی "مجھے زیادہ سے زیادہ سوڈانی کمک کے طور پر درکار ہیں اور یہ تیری ذمے داری ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے دس بیس ہزار سوڈانی میرے پاس پہنچتے رہیں ورنہ میں یہاں کی حکومت کسی اور کے حوالے کردوں گا۔"

بادشاہ گڑگڑانے لگا "حضور والا! آپ جو چاہیں کرسکتے ہیں مگر میرے خلاف اس لیے کچھ نہیں کریں گے کہ میں مسلمان بادشاہ ہوں اور آپ ہم مسلمانوں کے ملجا وماوا ہیں اور مجھے آپ سے بھلائی کی توقع ہے۔"

سلطان نے کہا "میرے دو آدمی تیرے دربار میں موجود رہیں گے جو تیری نگرانی اور نمبہانی کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "آپ صرف دو آدمیوں کی بات کررہے ہیں' میں تو آپ کے سیکڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔"

سلطان نے کہا "نہیں' میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا بلکہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تو یہاں اسلام کو صحیح صورت میں نافذ کرتا رہ۔ بس یہی میری خدمت ہوگی اور سوڈانی نوجوانوں کو قاہرہ ترسیل جاری رہنا چاہیے۔"

سلطان نے بادشاہ کو بہت زیادہ نصیحتیں کیں اور پھر اس کش مکش میں مبتلا ہوگیا کہ وہ سوڈان سے خالی ہاتھ واپس جائے یا بادشاہ سے کچھ وصول بھی کرلیا جائے۔

پھر سلطان نے بادشاہ سے معذرت کرلی اور محل سے باہر نکل کر فوج کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے خیموں میں واپس جائے۔

دیکھتے ہی دیکھتے محل کے چاروں طرف موجود سلطانی فوج نے اپنے اپنے خیموں میں مراجعت اختیار کی۔

سلطان کو سوڈان آکے بے حد ندامت محسوس ہورہی تھی کہ وہ یہاں بادشاہ کے خلاف جو کارروائی اختیار کرنے والا تھا اس کا یہاں کوئی جواز ہاتھ نہیں آیا اور اتنے دنوں قاہرہ سے بھی دور رہا حالانکہ اس کی سوڈان سے زیادہ شام اور فلسطین میں ضرورت تھی۔

یہیں سوڈان میں فرصت کے لمحات میں اس نے سوچا کہ اس کی بحری قوت نہ ہونے کی وجہ سے عیسائی فائدے اٹھالے جاتے ہیں اور اگر اس کی کوئی طاقت ور بحریہ بھی ہوتی تو وہ عیسائیوں کا دور تک پیچھا کرسکتا تھا۔

انہی فرصت کے لمحات میں وہ عیسائی دنیا کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی



میں کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جائے جس سے مسلمان مدتوں خود کو محفوظ محسوس کرتے رہیں۔

اسے اچانک جزیرہ قبرص کا خیال آیا کیونکہ اس نے عیسائیوں کے اس جزیرے کا بہت ذکر سنا ہے۔ جرمنی کا فریڈرک اس جزیرے کا کبھی حکمران تھا اور مشہور کاؤنٹ جو بعد میں فریڈرک کا سسر کہلایا وہ بھی اس جزیرے کا حکمران رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ مغرب کے جتنے صلیبی جہاز شام اور فلسطین اور مصر آتے تھے' وہ سب قبرص ہی میں قیام کرتے تھے۔ یہاں سستاتے تھے اور یہیں سے آگے بڑھنے کی تیاریاں کرتے تھے اس لیے اگر مسلمان اس جزیرے پر قابض ہوجائیں تو مغربی ممالک سے آنے والے عیسائیوں کو اسی جزیرے میں روکا جاسکتا ہے۔

وہ گھنٹوں اسی مسئلے پر غور کرتا رہا اور اس نے سوڈان آنے کو مبارک اور جائز قرار دیا کہ شاید وہ قاہرہ میں رہ کے قبرص کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچ سکتا لیکن سوڈان میں خلوت کے ایام یہ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آتی جارہی تھیں۔

دن کے اجالے میں جب وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ رہا تھا تو اسے داڑھی کے بہت سے سفید بالوں میں اپنا بڑھاپا نظر آیا اور اچانک یہ خیال بھی آیا کہ اب شاید وہ قبرص کی مہم پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ بحری قوت دو چار سال میں پیدا نہیں کی جاسکتی اس کے لیے دس پندرہ سال درکار تھے مگر اسے اپنی زندگی مختصر محسوس ہورہی تھی۔ سفید بالوں نے اس کا حوصلہ پست کردیا تھا۔ اس نے گھبرا کے آئینے کو چھپادیا اور تہیہ کرلیا کہ وہ آئندہ اسے نہیں دیکھے گا۔

کئی دن بعد سلطان نے فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔

سوڈان کے بادشاہ سے الوداعی ملاقات کی اور اسے ایک بار پھر ہدایت کی کہ وہ عورتوں کے معاملے میں شروع حیا کا خاص خیال رکھے اور اسے پورے سوڈان میں قائم کرے۔

اس نے بادشاہ کے فریا کا بھی ذکر کیا جس کے علاقے میں عورتوں کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ وہ مردوں سے دوستیاں کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ بادشاہ نے سلطان سے وعدہ کرلیا کہ وہ فریا کو ہدایت کردے گا کہ وہ عورتوں کو مردوں سے دوستی کرنے سے روکے۔

واپسی میں سلطان نے کوئی اور راستہ اختیار کیا۔

لیکن اب وہ خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا تھا اس لیے وہ قریہ یا قصبے میں رکا بھی نہیں۔ اس کے رہنما بھی خوش تھے کہ سلطان نے انہیں بہت زیادہ اس لیے نہیں ستایا کہ اب سلطان کو قاہرہ پہنچنے کی جلدی تھی۔

قاہرہ میں سلطان نے ایوان کبیر میں خلیفہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے دورۂ سوڈان کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

لیکن خلیفہ کو ان معاملات میں کچھ بھی مزہ نہ آیا۔ اسے تو قصرِ خلافت میں کسی بت کی طرح رکھ دیا گیا تھا اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سلطان کا اپنے دورۂ سوڈان کی تفصیلات سے خلیفہ کو آگاہ کرنا ضروری ہے یا غیر ضروری۔

خلیفہ چاہتا تو یہی تھا کہ اسے سلطان کے مقابلے میں زیادہ امتیازی حیثیت حاصل رہے اور سلطان اپنے ہر معاملے میں اس سے اجازت حاصل کرے مگر اس معاملے میں اسے تلخ تجربہ حاصل ہوچکا تھا اور اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ مملوک سلطان خلیفہ کو ایک بت کی طرح رکھنا پسند کرتے تھے۔ ایک پجاری کی طرح وہ اس بت کا احترام تو کرتے تھے مگر یہ بت اس کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔

سلطان نے خلیفہ کو بتایا "میں بحری قوت کو مستحکم کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کیا مشورہ دیں گے؟"

خلیفہ نے دریائے نیل میں بہت سے جہازوں اور کشتیوں کو دیکھا تھا۔ انہی کے پیش نظر جواب دیا "سلطان کے پاس بحری قوت ہے تو سہی پھر سلطان کسی بحری قوت کا ذکر کیوں کررہا ہے؟"

سلطان نے شام اور فلسطین کے بہت سے قلعوں کا ذکر کیا اور بتایا "عیسائی کئی بار اپنی بے پناہ بحری قوت کے بل پر دمیاط تک آگئے۔ اس پر قبضہ کرلیا اور ہم نے انہیں منصورہ میں روک دیا لیکن اب میں ان عیسائیوں کو بہت دور روکنا چاہتا ہوں۔"

خلیفہ نے پوچھا "تو انہیں کہاں یعنی کس جگہ روک دینا چاہتا ہے؟"

سلطان نے جزیرۂ قبرص کا نام لیا۔ "یہ ایسا جزیرہ ہے جہاں عیسائی آکر دم لیتے ہیں اور پھر یہیں سے ہمارے پاس پہنچ کر ہماری قوت کا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ ہم بحری قوت نہ ہونے کی وجہ سے ایک بار بھی ان کے کسی ملک میں نہیں پہنچ سکے لیکن اب اگر میں اپنی بحری قوت پیدا کرلوں تو عیسائیوں کو یہاں تک پہنچنے سے روک سکتا ہوں اور قبرص میرے اس مقصد کو بہت اچھی طرح پورا کرسکتا ہے کیونکہ یہ جزیرہ اپنی معدنیات اور محل وقوع کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔"

خلیفہ نے پوچھا "یہ جزیرہ ہے کہاں؟ اور اس پر ہم کس

طرح اپنا تسلط قائم کریں گے؟"

سلطان اسے دیر تک قبرص کے محل وقوع سے آگاہ کرتا رہا مگر خلیفہ 'سلطان کی کسی بات کو بھی نہیں سمجھ سکا۔ جزیرہ قبرص کہاں واقع ہے؟ اور اس کا جغرافیائی محل وقوع کیسا ہے؟ اور یہاں عیسائی کیوں بستے ہیں؟ اور سلطان کو اس جزیرے میں اپنایا مسلمانوں کا کون سا فائدہ نظر آرہا ہے؟ یہ سارے سوالات خلیفہ کی سمجھ میں بعید ترین تھے۔ اس نے دبے لفظوں میں سلطان سے کہا "تم اپنی فوجی قوت بڑھاتے رہو یعنی اگر تم پر کوئی وقت پڑے تو کم از کم ایک لاکھ فوج میدان جنگ میں اتار سکو اس لیے میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ قبرص کا خیال دل سے نکال دو اور اپنی فوجی قوت بڑھاتے رہو۔"

بیبرس نے رسماً خلیفہ سے باتیں کرکے اس کی ذہنی اور فکری سطح کا اندازہ لگالیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر وہ طویل عرصے کے لیے قاہرہ سے دور رہے تو اس کی عدم موجودگی میں خلیفہ اس کے خلاف سازشیں نہیں کرسکے گا اور اگر ایسا کرنے کی جرأت کرے گا تو کوئی لائق مملوک امیر اس کو استعمال کرتے ہوئے گھبرائے گا۔

پہلے تو بیبرس نے قاہرہ کی جامعہ اور کئی مساجد کا جائزہ لیا جہاں وہ زمانہ امن میں تعمیرات کا کام شروع کروا کے مصروف رہ سکتا تھا کیونکہ اگر وہ بیرونی مہمات سے فارغ ہوکے قاہرہ میں بیٹھ جاتا تو اسے خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ مشاغل ضرور نکالنے پڑتے اور یہ مشاغل مساجد کی تعمیر سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتے تھے۔

لیکن پھر اسے قبرص کی تسخیر کا شوق چرایا اور اس نے بحری قوت پر توجہ دینا شروع کردی۔ وہ شب و روز اپنی مضبوط بحریہ کی تعمیر اور تشکیل میں مصروف رہا اور جب وہ اس لائق ہوگیا تو وہ قبرص کی تسخیر کے لیے دمیاط سے روانہ ہوگیا۔

فلاؤن کو خشکی کے راستے آگے بڑھایا گیا اور خود بحری راستوں سے قبرص کی طرف روانہ ہوگیا لیکن ناسازگار موسم نے اس کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور وہ شامی ساحلوں پر ہی رک گیا۔ طوفانی ہواؤں نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا اور وہ مجبوراً غزہ کے ساحل پر اتر کے موسم کے خوش گوار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

فلاؤن نے آگے بڑھ کر عکا کی خبر لینی چاہی مگر اب قاہرہ کی طاقت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ بحری قوت بیبرس نے سنبھال رکھی تھی اور بری فلاؤن کے ہاتھ میں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خشکی میں تو فلاؤن نے نے کچھ کامیابی حاصل کرلی مگر بیبرس کئی ماہ سمندری طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا اور بالآخر اپنے بیڑے کی تباہی کے بعد وہ مصر واپس چلا گیا کیونکہ اب اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی عمر کسی خطرناک مشغلے سے اس کو باز رکھ رہی ہے۔

اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر وہ اپنے بیرونی دشمنوں میں الجھا رہا تو اس کے اندرونی مخالف اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور وہ اندرونی خلفشار میں پھنس جائے گا جس سے قاہرہ کو نقصان پہنچے گا۔

اس نے نہایت ہوشیاری سے فلاؤن کو بھی واپس بلوالیا اور اس کے رویّوں سے بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ دم لے کر اور کوئی اعلیٰ منصوبہ بندی کرکے شام اور فلسطین کے بچے کھچے صلیبی قلعوں کی تسخیر کے لیے نکلنا چاہتا ہے۔

فلاؤن بھی بیبرس کے انحطاطی رویوں کو غائبانہ نظروں سے دیکھ اور محسوس کررہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیبرس فوجی کمان اس کے حوالے کردے تاکہ بیبرس کے حصے کا بچا کھچا کام وہ انجام دے دے لیکن بیبرس' فلاؤن کو زیادہ اختیارات نہیں دینا چاہتا تھا اور یہی کہتا رہتا تھا کہ میں پہلے قاہرہ کے ضروری تعمیری کام انجام دے لوں اس کے بعد فیصلہ کن آخری مہم کے ارادے سے شام اور فلسطین کے بقیہ صلیبی قلعوں کو بھی فتح کرنے کے لیے نکلوں گا اور انہیں فتح کرکے دم لوں گا۔

فلاؤن نے شاید پہلی بار بیبرس کو مشورہ دیا "جناب! پہلے عکا کے قلعے کو فتح کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ مضبوط قلعہ دشمنوں کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے۔"

بیبرس نے فلاؤن کو غور سے دیکھا "ہاں' میں بھی سمجھتا ہوں مگر اس سے پہلے میں قبرص کو فتح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ عیسائیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ قبرص ہے۔ اگر قبرص مسلمانوں کے قبضے میں ہو تو عیسائیوں کی یلغاری قوت کو اسی جزیرے کے سائے منتشر کیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد عکا بھی کمزور پڑجائے گا اور دمیاط بھی محفوظ ہوجائے گا۔

فلاؤن نے کہا "ابھی کچھ عرصے پہلے آپ نے بحری قوت تیار کی تھی اور قبرص پر حملہ آور بھی ہوجانا چاہتے تھے مگر وقت اور حالات نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو کیا اب آپ دوبارہ بحری قوت سے قبرص پر حملہ آور ہونے کی کوشش کریں گے؟"

بیبرس نے کہا "ہاں' میرے عزائم تو یہی ہیں اور ایک بار اگر قسمت ساتھ نہ دے اور حالات میرے خلاف نظر آئیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ہمیشہ ناکام رہوں گا۔ بار بار جدوجہد اور کوشش مجھے اس مقام تک لائی ہے جہاں میں دنیا کو نظر آرہا ہوں۔"

فلاؤن نے بحث جاری رکھی اور کہا "جناب! ابھی تک آپ نے صرف خشکی کے محاذوں پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ بحری محاذ ایک بالکل علیحدہ شعبہ ہے اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس شعبے میں عیسائیوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں اس لیے ان کی ہم سری فی الحال ایک دشوار مرحلہ ہے اور آپ کو اس پر بار بار سوچنا چاہیے اور میرے رائے میں آپ فی الحال اس میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں۔"

بیبرس' فلاؤن کو کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔

فلاؤن نے محسوس کرلیا کہ بیبرس کو اس کا مشورہ اچھا نہیں لگا۔ اٹھتے ہوئے بولا "میں چلتا ہوں' میں آپ کو جو مشورہ دیا' وہ میری رائے ہے اور رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ ویسے ہمارے پاس مضبوط بحریہ ضرور ہونی چاہیے اور اگر ہم اس میں کامیاب ہوجائیں تو ہم مغربی ملکوں کی بالادستی کو انہی کے ممالک میں جاکے ختم کرسکتے ہیں۔"

بیبرس نے فلاؤن کو روک لیا "کہاں چلے؟ ابھی کچھ دیر بیٹھو' مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

فلاؤن کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں بیبرس نے اس کی باتوں کا برا مان کے اس کے خلاف کوئی نقصان دہ فیصلہ تو نہیں کرلیا۔

وہ بیبرس کے سامنے دوبارہ بیٹھ گیا۔

بیبرس کچھ دیر خاموش سوچتا رہا۔

اس خاموشی نے فلاؤن کو اور زیادہ خوف زدہ کردیا۔

بیبرس نے کہا "اے فلاؤن! تو میرے بعد حکومت مصر کا لائق ترین شخص ہے۔ میں نے تیرے مشورے اور تیری رائے پر غور کرنے کا فیصلہ کیا ہے مگر فی الحال میں قاہرہ میں چند ضروری کام انجام دینا چاہتا ہوں کیونکہ ان کاموں کا تعلق میری آخرت سے ہے۔"

فلاؤن نے سلطان کی داڑھی اور اس کے سر کے بالوں کو غور سے دیکھا۔

بیبرس نے سمجھ لیا کہ فلاؤن کیا دیکھ رہا ہے۔ فلاؤن کی نظریں سلطان کے سفید بالوں کو دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی یہ سمجھ چکا تھا کہ بیبرس اب بوڑھا ہوتا جارہا ہے اور اب وہ کسی طویل المیعاد منصوبے پر عمل کرنے کے لائق نہیں رہا۔"

بیبرس نے پوچھا "یہ تو میری داڑھی اور میرے سر کے بالوں کو کیوں دیکھ رہا ہے؟"

فلاؤن نے جواب دیا "آپ نے آخرت کی بات کی اس لیے میں نے غیر ارادی طور پر آپ کے سفید بالوں کو دیکھا کیونکہ دنیا کے بیشتر لوگ اسی سفیدی کے عالم میں آخرت کی فکر کرتے ہیں مگر آپ نے تو اتنے بڑے بڑے دین اسلام کے لیے کام کیے ہیں کہ آپ کو آخرت کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔"

بیبرس' فلاؤن کی ہوشیاری اور چالاکی سمجھ رہا تھا۔ کہنے لگا "بے شک' میں نے صلیبیوں کو شکستیں دے کر اور مغلوں کو منتشر کرکے خلافت عباسیہ کو بحال کردیا۔ اس کا اجر مجھے آخرت میں مل سکتا ہے مگر پوری زندگی جنگ وجدل میں گزارنے کے بعد اب میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ مجھے جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی کام کرنا چاہیے اور مساجد کی شان دار تعمیر کروانا چاہیے۔ یہ دونوں کام صدقہ جاریہ میں شمار کیے جائیں گے اور اس کا اجر میرے نامہ اعمال میں گرانقدر اضافہ کرتا رہے گا۔"

فلاؤن نے کہا "ٹھیک ہے' مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں آپ سے اختلاف کروں لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی زندگی میں اس لائق کردیں کہ آپ ہی کی طرح میں بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دوں۔"

بیبرس نے مسکراتے ہوئے اس کی پشت تھپتھپائی "تو اس لائق ہے کہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکے۔"

فلاؤن نے بات کاٹتے ہوئے کہا "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں اگر آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں تو مجھے عکا کے قلعے کی تسخیر کی ذمے داریاں سونپ دیں۔ میں اپنے اس کارنامے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں گا۔"

بیبرس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "درست' واقعی عکا کے قلعے کی تسخیر تیری زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اگر قبرص نہیں تو عکا کا قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں ضرور ہونا چاہیے۔"

فلاؤن کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوگئے اور آنکھوں میں چمک دار روشنی نظر آنے لگی "تب پھر اگر آپ اجازت اور اختیارات دیں تو میں عکا کی تسخیر کے لیے تیاریاں شروع کردوں۔"

بیبرس نے جواب دیا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تو تیاریاں کر اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ عکا کا قلعہ میری زندگی ہی میں سر کرلیا جائے۔"

فلاؤن نے بیبرس کا بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا "تو اب میں جاسکتا ہوں؟"

بیبرس نے دو ٹوک جواب دیا "نہیں، ابھی نہیں۔ پہلے تو مجھے اپنی مکمل منصوبہ بندی سے آگاہ کر تاکہ میں یہ اندازہ لگاؤں کہ کہیں تیری عکا میں ناکامی ہمارے لیے کسی مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔"

قلاؤن نے کہا "آپ نے عکا کے قلعے کی تسخیر کی ذمے داریاں میرے سپرد کردیں، اب میں اس کی منصوبہ بندی کروں گا اور اس سے آپ کو آگاہ کرتا رہوں گا۔"

بیبرس کو بڑھاپا اور اس سے پیدا ہونے والی قنوطیت پریشان کررہی تھی۔ اس نے پوچھا "پھر بھی کچھ بتا تو صحیح کہ کیا کرے گا؟"

قلاؤن نے بیبرس کو اتنا بے چین اور منتشر الخیال کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قلاؤن نے فی الوقت پیچھا چھڑانے کے لیے کہا "مجھے منجنیقوں کو عکا تک لے جانے کا خاص انتظام کرنا پڑے گا اور وہاں پہنچ کے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر منجنیقوں کی تنصیب اور ان سے سنگ باری، جیسا کہ میں آپ کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں کہ دشمن کو مسلسل حرکتوں اور کوششوں سے خوف زدہ کردیا جائے۔"

بیبرس کو ہنسی آگئی "تو، تو میری نقالی کرے گا؟ جانتا ہے اس نقالی کے لیے تجھے اپنا اطمینان، سکھ چین سب کچھ تج دینا پڑے گا اور خود تیری فوج کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس وقت تو کہاں ہے۔"

قلاؤن نے فخریہ کہا "جناب والا! میرا نام سیف الدین قلاؤن ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں دین کی تلوار ہوں۔ میں اپنے اس نام کی تذلیل نہیں ہونے دوں گا۔"

بیبرس کچھ دیر خاموش قلاؤن کی باتوں پر غور کرتا رہا اور کہا "تو تسخیر عکا کی تیاریاں کراس دوران میں، میں بھی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

بیبرس نے قلاؤن کو رخصت کردیا اور کئی دن تک خاموش رہا۔ اس دوران میں قلاؤن جنگ کی تیاریوں میں مشغول رہا۔

خود بیبرس بھی اپنے تعمیراتی کاموں سے وقت نکال کر چھاؤنی میں پہنچ جاتا اور قلاؤن کی تیاریوں کا مشاہدہ کرتا۔

اس کی فوج حیران تھی کہ بیبرس کی موجودگی میں قلاؤن کو اتنے اختیارات کیوں مل گئے لیکن بیبرس نے کچھ خاص خاص فوجی سرداروں کو ہدایت کی۔ وہ فی الحال قلاؤن کا ساتھ دیں۔

ادھر قلاؤن کو ہدایت کی "جب تیاریاں مکمل ہوجائیں تو مجھے آگاہ کیا جائے تاکہ میں اپنے آئندہ منصوبے کا اعلان کروں۔"

قلاؤن سوچ میں پڑ گیا کہ بیبرس کے آئندہ منصوبے کیا ہوسکتے ہیں۔"

سلطان نے خاموشی سے ایوان کبیر پہنچ کے خلیفہ سے ملاقات کی اور اس کے سامنے ولی عہدی کے لیے اپنے بیٹے ملک السعید کا نام پیش کیا اور کہا "آپ میرے بیٹے کے نام فرمان ولی عہدی جاری کردیں۔ باقی رسم میں ادا کروں گا۔"

خلیفہ کو کیا انکار ہوسکتا تھا۔ اس نے ولی عہدی کا فرمان جاری کردیا۔

خلیفہ کی یہ تحریر بیبرس نے اپنے قبضے میں کی اور اپنی طرف سے ایک فرمان جاری کردیا۔ اس میں بیبرس نے اپنے جملہ امرا اور فوجی سرداروں کو آگاہ کردیا تھا کہ اب اس کے بعد اس کا بیٹا ملک السعید سلطان ہوگا اور قلاؤن اس کا اتابک (نائب)۔

اس اعلان سے سرگوشیاں شروع ہوگئیں کیونکہ ملک السعید ابھی نابالغ تھا اور وہ بیبرس کی نمائندگی کرنے کے لائق بالکل نہیں تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ قلاؤن اس فیصلے سے اتفاق نہیں کرے گا مگر قلاؤن نے اپنی کسی بات سے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے سلطان کے فیصلے سے اختلاف ہے۔

ولی عہدی کے اعلان کے کئی دن بعد سلطان نے جملہ امرا اور فوجی سرداروں کو آگاہ کیا کہ مستقبل کے سلطان کے جلوس میں سب ہی کو شرکت کرنی ہے۔

یہ جلوس ایوان کبیر سے سلطان بیبرس کے محل تک جانے والا تھا۔

تمام امرا اور فوجی سردار ایوان کبیر میں پہنچ گئے اور خود سلطان بیبرس بھی وہاں خلیفہ کے پاس اپنے بیٹے کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔

خلیفہ نے ان امرا اور فوجی سرداروں کو اپنے روبرو طلب کرلیا اور انہیں خود آگاہ کیا کہ سلطان بیبرس کے بعد ملک السعید سلطان ہوگا۔

یہ جملہ امرا اور فوجی سردار باری باری خلیفہ کے پاس گئے اور اس نے ملک السعید کے حق میں سب سے حلف لیا۔ یہاں بھی قلاؤن کو سب سے آگے رکھا گیا۔ وہ خلیفہ کے پاس مودب کھڑا رہا جب کہ ملک السعید کو خلیفہ کے روبرو بٹھادیا گیا تھا۔

امرا اور سردار باری باری وہاں پہنچتے اور خلیفہ سے اقرار کرتے کہ وہ سلطان رکن الدین بیبرس کے بعد اس کے بیٹے ملک السعید کو سلطان تسلیم کریں گے اور اس کے وفادار رہیں گے۔

اس وقت کسی امیر یا سردار میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ولی عہد کی صغیر سنی پر اعتراض کرتا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا اور جب سارے امرا اور سردار ولی عہد کے ہاتھوں پر بیعت کرچکے تو بیبرس نے اپنے بیٹے کو ایک حج سجائے گھوڑے پر بٹھایا۔ گھوڑے کی زین اپنے کاندھے پر رکھی اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر پاپیادہ اپنے محل کی طرف روانہ ہوگیا۔

بیبرس کے اتباع میں جملہ امرا اور سردار، ولی عہد کے گھوڑے کے ساتھ چلنے لگے۔

بازاروں میں قاہرہ کی آبادی یہ دلچسپ منظر دیکھتی رہی اور اس نے ملک السعید کو اچھی طرح پہچان لیا۔

ایک معلن یہ آواز بلند اعلان کررہا تھا "لوگو! سنو، امیر المومنین خلیفہ المسلمین نے ملک السعید پسر سلطان رکن الدین بیبرس ملک الظاہر کو سلطان کے بعد سلطان نامزد کردیا ہے۔ جملہ درباری امرا اور فوجی سرداروں نے سلطان کی موجودگی میں ولی عہد ملک السعید کے ہاتھوں پر بیعت کرلی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ سب ملک السعید کو اپنا مستقبل کا سلطان تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھو اور پہچانو کہ سلطان وقت رکن الدین بیبرس ملک الظاہر مستقبل کے سلطان کی عاشیہ برداری کررہا ہے اور اس نے ولی عہد کے گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی ہے۔ تمام امرا اور فوجی سردار سلطان کی طرح قلعہ الجبل کے ایوان کبیر سے اس طرح قصر سلطانی تک پیدل جائیں گے اور شہر کے عوام وخواص کو یہ مبارک منظر دیکھنے کے بعد ملک السعید کو مستقبل کا سلطان تسلیم کرلینا چاہیے۔"

یہ جلوس کئی گھنٹے قاہرہ کی سڑکوں پر رواں دواں رہا اور لوگ اپنے مستقبل کے سلطان کو بڑے ذوق وشوق سے دیکھ رہے تھے۔

قلاؤن کو ملک السعید کا اتابک (نائب) مقرر کیا گیا تھا تو امرا اس کو خوش رکھنے کے لیے مناسب تھا مگر قلاؤن خود کو اتنا حقیر کرنے کے لیے دل میں تیار نہیں تھا۔ اگر سلطان بیبرس ولی عہد کی عاشیہ برداری کررہا تھا اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر پیدل چل رہا تھا تو ملک السعید، سلطان کا بیٹا تھا اور وہ اپنے بیٹے کے لیے جو کچھ بھی کرے، کم ہوگا لیکن اس کم سن بچے کو اعزاز بخش کر دوسرے معززین کو ذلیل ورسوا کرنا کہاں کی شرافت تھی۔

شام تک سب ہی ہلکان ہوگئے مگر بیبرس اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا کیونکہ کسی ایک نے بھی اس کے اس فعل کی مخالفت نہیں کی تھی اور خاص کر قلاؤن بھی اپنے بے عزتی آسانی سے برداشت کرگیا تھا۔

مغرب کے بعد سلطان نے ان سب کی شان دار دعوت کی اور وہ لذیذ کھانے کھانے کے بعد سلطان بیبرس کی مدح سرائی کرنے لگے۔

سلطان نے کھانے سے فراغت کے بعد جملہ امرا اور سرداروں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے سلطان کے کسی فعل سے بھی اختلاف کی جرأت نہیں کی تھی۔

سلطان نے ان سب کے دلوں کو ٹٹولنے کے لیے ان سب سے فرداً فرداً اپنے فیصلے کی تائید چاہی اور اس میں سلطان کو ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ سب سلطان کے فیصلے کی بظاہر دل وجان سے تائید کررہے تھے۔

ان سب کو رخصت کردینے کے بعد سلطان نے قلاؤن کو روک لیا اور تخلیے میں اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "قلاؤن! معاف کرنا میں نے ملک السعید کو ولی عہد بنا کے تجھ پر ظلم کیا کیونکہ میرے بعد تم کو سلطان ہونا چاہیے تھا مگر میں اپنے بیٹے کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تعمیرات میں مشغول رہوں گا اور تم عکا کی تسخیر کو نکل جاؤ گے۔ ملک السعید ہم دونوں کی عدم توجہ کی وجہ سے۔"

قلاؤن نے بات کاٹ دی اور کہا "آپ یقین کریں کہ آپ کے اس انتخاب سے مجھے جو خوشی حاصل ہوئی ہے اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ کہتے ہیں مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھائے گا؟ ولی عہد ملک السعید آپ کے صاحب زادے ہیں۔ میں ان میں وہ ساری خصوصیات اور اوصاف محسوس کررہا ہوں، جو آپ میں پائی جاتی ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنے ولی عہد موصوف کا اتابک مقرر کردیا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ولی عہد موصوف کے ساتھ عکا کی مہم سر کروں۔"

سلطان بیبرس نے کہا "میں ابھی ملک السعید کو کسی کے حوالے نہیں کرسکتا۔ میں نے ولی عہد کو تیری اتابکی میں بہت سوچ سمجھ کر دیا ہے اور جیسا کہ تو نے میری داڑھی اور سر کے بالوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ میں اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوچکا ہوں چنانچہ انہی احساسات کی وجہ سے میں تکان محسوس کرنے لگا ہوں اور مجھے قطعاً یہ امید نہیں کہ میں پہلے جیسے کارنامے انجام دے سکوں گا لیکن خیر جانے دے۔"

سلطان بیبرس نے ملک السعید کو فلاؤن کے سامنے کھڑا کردیا اور کہا "بیٹے! یہ فلاؤن تیرا اتالیک ہے اس لیے جب یہ شخص تیری رہنمائی کررہا ہو یا کسی قسم کی تربیت دے رہا ہو تو اس کی عزت اپنے باپ کی طرح کرنا۔"

ملک السعید نے جواب دیا "بے شک' آپ نے جو کچھ فرمایا' اسے میں نے گرہ میں باندھ لیا۔"

فلاؤن کے چلے جانے کے بعد سلطان نے بیٹے سے کہا۔ "بیٹے! میں نے فلاؤن کے سامنے جو کچھ کہا' وہ سچ نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اسی شخص سے خوف محسوس ہوتا ہے اس لیے میں نے فلاؤن کے سامنے اس کی تعریف کرکے اور اس کا مرتبہ بڑھا کے دراصل اس کی انا اور بڑائی کو تھپکیاں دی ہیں۔ وہ تیرا اتالیک ضرور ہے مگر تیرا ہم سراور ہم رتبہ ہرگز نہیں۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے' اپنے آپ کرنا ہے۔ کسی کو اپنے معاملات میں دخل مت دینے دینا کیونکہ یہ مداخلت کار اکثر و بیشتر ایسے ہی موقعوں پر فائدے اٹھانے کی کوششیں کرتے ہیں۔"

ملک السعید نے پوچھا "کیا میں عکا کی مہم میں شریک ہوجاؤں۔"

سلطان نے اسے منع کردیا "میں نے ہمیشہ اپنے امرا اور اپنے درباریوں کے مقابلے میں خود کو ترجیح دی' نمایاں رکھا اور منفرد قرار پایا۔ میرے نقش قدم کی تم بھی پیروی کرو گے۔ اب میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ محل سے نکلو اور اپنے لیے جگہ بناؤ اور اگر جگہ نہ بنا سکو تو۔"

ولی عہد ملک السعید اس پرچم کا ذکر کرنا چاہتا تھا جسے رکن الدین بیبرس ملک الظاہر میدان جنگ میں آگے آگے رکھا کرتا تھا۔

بیبرس نے کہا "تجھے پرچم کی فکر نہیں کرنا چاہیے تو کسی بھی پرچم سے کام لے سکتا ہے۔ ہمیشہ اپنا پرچم بردار میں خود رہا۔ تو میدان جنگ میں اللہ کے نام کا پرچم بلند رکھ۔ تخلیے سے دور رہنا' تخلیے میں رہنا عالموں کا کام ہے۔ میرے بیٹے کو مجھ سے دو قدم آگے ہی رہنا چاہیے۔ تجھ کو بھی اسی سے حظ حاصل ہوگا اور میری روح بھی خوشی محسوس کرے گی۔"

ملک السعید نے کہا "جب آپ لوگ میرے گھوڑے کے ساتھ چل رہے تھے تو میں بہت خوش تھا حالانکہ کئی امرا اور سردار اس روش میں اپنی اہانت محسوس کررہے تھے۔ میں نے ان سب کو پہچان لیا ہے اور وہ ہمیشہ میری نظروں میں رہیں گے اور میں کبھی بھی ان پر اعتبار نہیں کروں گا۔ خواہ وہ اپنی صداقت اور خلوص کا یقین دلانے کے لیے کوئی بھی قسم کھالیں۔"

سلطان بیبرس نے ولی عہد کی ان باتوں سے خوشی محسوس تو کی مگر اس کی بہت سی باتیں اس کی عمر سے زیادہ لگ رہی تھیں۔

اب ولی عہد کا بیشتر وقت اپنے باپ کے ساتھ گزرنے لگا۔

باپ نے ولی عہد کو کئی بار خلیفہ کی خدمت میں بھی بھیجا اور یہ تاکید کردی کہ خلیفہ کا رسماً اور اخلاقاً احترام کیا جائے مگر اسے دل سے کمتر ہی سمجھا جائے "خلیفہ میری وجہ سے قوت اور اختیار کا حامل ہے ورنہ اس کے خاندان کو تو منگولوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند کر رکھ دیا تھا اور اب ان کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ ازراہِ ترحم اور ازراہِ مہمانی ایوان کبیر میں رہ رہا ہے ورنہ اس میں کوئی ایک بھی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے لوگ اس کی عزت و احترام کریں۔"

ملک السعید اپنے باپ کی باتوں پر حیران تھا جو خلیفہ کی اس طرح اہانت کررہا تھا جب کہ لوگوں کے بقول اس کا باپ خلیفہ کو نہایت عزت و احترام سے ایوان کبیر میں لے گیا تھا اور اس کو وہ عزت بخشی تھی جو خاندان عباسیہ کے عباسی خلفا کو حاصل تھی۔

ملک السعید اپنے باپ کی بڑائی کے چرچے دوسروں سے سن چکا تھا اور لوگوں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ اسلامی دنیا میں اس کا باپ وہ واحد شخص ہے جو ناقابلِ شکست منگولوں کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ انہیں بھی شکست دی جاسکتی ہے اور منگول ناقابلِ شکست نہیں ہیں اور عین جالوت میں منگولوں کو شکست دے کر اس نے اپنے قول کو سچ کر دکھایا تھا۔

○☆○

بیبرس نے اپنے جاسوسی نظام کو برقرار رکھا اور کسی کو کچھ علم نہ تھا کہ اس کے آدمی کہاں کہاں اور کس کس شکل اور حلیے میں موجود ہیں۔

اسی دوران میں بیبرس کو اس کے کسی آدمی نے بتایا کہ اکثر قونی سردار ملک السعید کی ولی عہدی سے خوش نہیں اور یہ امکان موجود ہے کہ کوئی ملک السعید کو نقصان پہنچادے۔

بیبرس نے بیٹے کو تاکید کردی کہ وہ تنہا باہر نہ نکلا کرے اور اول تو باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ملک السعید نے باپ کی ہدایت کو نظرانداز کردیا کیونکہ



اسے سلطانی کا نشہ چڑھا ہوا تھا اور اسے قاہرہ کا ہر فرد کمتر نظر آرہا تھا۔ وہ دنیا کو خود سمجھنا چاہتا تھا اور اس میں کسی کی دخل اندازی اسے بالکل گوارا نہیں تھی۔

ملک السعید دنیا داروں سے تو بہت زیادہ مل چکا تھا مگر اسے کسی نے بتایا کہ اسی دنیا میں ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں دنیا سے نفرت کرنے والے رہتے ہیں۔

یہ دنیا درویشوں اور قلندروں کی دنیا تھی۔ یہ لوگ کسی سلطان' خلیفہ یا سردار کے پاس نہیں جاتے اور ان کا کوئی کام رکتا بھی نہیں تھا۔ قاہرہ میں بھی خانقاہیں موجود تھیں جن میں درویشوں کا ڈیرا رہتا تھا۔

جو چھوٹے موٹے خدمت گار نوجوان' بوڑھے اور محل کی کنیزیں ملک السعید سے باتیں کرتی تھیں' انہی سے ملک السعید کو معلوم ہوا کہ یہاں خانقاہ میں بے غرض لوگ بھی رہتے ہیں۔ ملک السعید کو جب سے ولی عہدی ملی تھی' اس وقت سے وہ دنیا کو سمجھنے میں لگا ہوا تھا۔

اسے محل کی کنیزیں بتاتی تھیں کہ اگر ولی عہد کو خانقاہوں کے درویشوں کی دعائیں بھی حاصل ہوجائیں تو اس کی زندگی سے خطرات سے نکل جائیں گے۔

ملک السعید نے باپ سے ان خانقاہوں اور ان میں رہنے والے درویشوں کے بارے میں پوچھا "آپ لوگ پہروں میں رہتے ہیں پھر بھی جان و مال کے زیاں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کیا یہاں ایسی جگہیں بھی موجود ہیں' جہاں کے لوگ بے غرض اور بے نیاز ہوتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کی باتوں اور دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ کیا یہ ساری باتیں درست ہیں؟"

بیبرس نے بیٹے کو سمجھایا "مجھے میرے بعد سلطانی کرنا ہے اور سلطانی کے دوران میں یہ بزرگ بے غرض اور بے نیاز لوگ تجھ سے بھی ملیں گے۔ اگر ان کے بارے میں کسی نے بھی یہ تاثر دیا ہے کہ وہ لوگ بے غرض ہوتے ہیں تو یہ غلط تاثر ہے۔ وہ لوگ ہمارے ہی ٹکڑوں پر پلتے ہیں اور پھر خود کو بے غرض اور بے نیاز بھی کہتے ہیں۔ جب تم سلطان بن جاؤ گے تو ان لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوا کریں گی۔"

ملک السعید نے کہا "مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ان درویشوں کے لیے خانقاہیں تعمیر کروا رہے ہیں۔"

سلطان نے بتایا "ہاں' میں کئی مسجدیں از سرِ نو تعمیر کروا رہا ہوں۔ انہی مسجدوں سے ملحق خانقاہیں ہیں۔ ان کے اخراجات بھی حکومت ہی برداشت کرتی ہے کیونکہ وہ ناکارہ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے۔"

ملک السعید' سلطان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا کیونکہ محل کے خدمت گار اور کنیزیں خانقاہ نشینوں کی عظمت کی قائل تھیں اور انہوں نے ولی عہد کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس عجیب و غریب دنیا کو خود جا کے دیکھے۔ وہاں بے حد سکون ہے۔

ملک السعید اپنے طور پر کچھ جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ باہر نکلنے کے لیے بے چین تھا جب کہ سلطان کو کسی نے یہ بتادیا تھا کہ ولی عہد کی زندگی خطرے میں ہے۔

سلطان جامعہ کی تعمیر میں بہت زیادہ مشغول ہوگیا اور اس مشغولیت میں وہ کئی کئی دن تک محل میں بھی نہیں جاتا تھا۔ سلطان کی اسی مشغولیت کا فائدہ اٹھا کر ولی عہد ایک بوڑھے خدمت گار کے ساتھ مذکورہ خانقاہ پہنچ گیا۔ وہاں کے لوگوں کو جب یہ بتایا گیا کہ ان کی خانقاہ کو دیکھنے کے لیے ولی عہد تشریف لائے ہیں تو خانقاہ نشینوں کو فائدے کی امید بندھی اور وہ بھاگ بھاگ کر شنرادے کے تزہب منڈلانے لگے۔

ولی عہد نے یہاں کئی قلندر بھی دیکھے جن کے جسموں پر لباس کی جگہ کفنی نظر آئی اور ان کے چہار ابرو صاف تھے۔

ولی عہد نے اپنے بوڑھے رہنما سے پوچھا "یہ لوگ اتنی بری وضع قطع میں کیوں رہتے ہیں؟ ان سے تو کوئی بات کرنا بھی پسند نہیں کرے گا پھر یہ بے غرض اور بے لوث کیونکر ہیں؟"

بوڑھے خدمت گار نے ولی عہد کو بتایا "آپ یہاں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جائیں اور آنے والوں پر نظریں رکھیں۔ بہت سی باتیں اور فضیلتیں دیکھنے کو ملیں گی۔ میں سمجھتا ہوں یہاں سے بہتر جگہ کوئی اور آپ کو نہیں ملے گی۔"

ولی عہد خانقاہ میں اس جگہ جا کر بیٹھ گیا' جہاں اس خانقاہ کا ایک بڑا خانقاہ نشین اٹھتا بیٹھتا تھا۔

ولی عہد کا اس جگہ بیٹھنا خانقاہ کے قلندروں کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مسند نشین درویش بھی آگیا۔ یہ ساٹھ پینسٹھ سالہ قلندر خانقاہ کے دوسرے قلندروں سے درشت لہجے میں پوچھنے لگا "کیا بات ہے؟ کیا ولی عہد کے لیے اس خانقاہ میں میری جگہ کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں تھی؟"

ولی عہد نے اپنی سلطانی کے نشے میں کہا "اے قلندر! تو جس خانقاہ میں اپنے دوسرے قلندر ساتھیوں کے ساتھ رہتا ہے' اس کی تعمیر کس نے کروائی؟ کچھ جانتا ہے؟"

عمر رسیدہ قلندر نے جواب دیا "ہاں جانتا ہوں' اس کی تعمیر خدا نے کروائی ہے۔"

ولی عہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا خدا نے اس کی تعمیر کے لیے آسمان سے فرشتے اتارے تھے؟"

درویش نے حقارت سے جواب دیا "خدا نے تیرے باپ کو حکم دیا کہ خانقاہ کی تعمیر ہونا چاہیے اور تیرے باپ نے مزدور لگوا کے خانقاہ تعمیر کروادی۔"

ولی عہد نے اس عمر رسیدہ قلندر کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھا۔ قلندر کی داڑھی' مونچھ' پلکیں سر کے بال اور بھویں ندارد نظر آئیں تو اسے بے ساختہ ہنسی آگئی اور ولی عہد سے چپ نہیں رہا گیا۔ قلندر سے پوچھا "تو کبھی آئینے میں بھی اپنے چہرے کو دیکھتا ہے؟ واللہ تیرے چہرے پر ایک عجیب سی بے رونقی اور مضحکہ خیزیت پائی جاتی ہے۔ اللہ نے تیری شکل بہت اچھی بنائی تھی مگر تو نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا۔"

عمر رسیدہ قلندر نے پوچھا "تیرا اس خانقاہ سے کیا تعلق ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں ولی عہد سلطنت ہوں۔ میں تجھ سے پوچھتا ہوں' تیرا اس خانقاہ سے کیا تعلق ہے؟"

ایک قلندر نے جواب دیا "جناب! آپ نہیں جانتے کہ جب تک ہم لوگ یہاں نہیں بیٹھے تھے' اس پر جنوں کا قبضہ تھا مگر ہم لوگوں نے یہاں قیام کرکے جنوں کو نکال باہر کیا۔ اب خدا کی مخلوق ہم سے فیض حاصل کرتی ہے۔"

ملک السعید نے کہا "اگر تم لوگوں کے بیٹھنے سے جن یہاں سے بھاگ گئے اور تم خدا کی مخلوق کو فائدے پہنچانے لگے تو کیا تم ہمیں بتاؤ گے کہ کس قسم کے فائدے تم خدا کی مخلوق کو پہنچاتے رہتے ہو؟"

عمر رسیدہ قلندر نے بے مروتی سے کہا "ولی عہد! تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ اس دنیا کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

ولی عہد نے بھی دھمکی دی "تجھے نہیں معلوم کہ سلطان کے بعد یہاں کی حکومت مجھے مل جائے گی اس لیے مستقبل کے سلطان کی اہانت کرکے خود کو سزا کا مستوجب نہ قرار دے۔"

عمر رسیدہ قلندر بجھتے ہوئے چراغ کی بھڑکنے والی لو کی طرح بھڑکا اور کہا "بس جناب! تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ ہم تمہاری سلطان سے شکایت بھی کریں گے۔"

ولی عہد کو قلندر کی اس دھمکی پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ مضحکہ خیز شکل و صورت رکھنے والا قلندر بھی اس کے سلطان باپ کی نظروں میں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے یہ قلندر ولی عہد کی شکایت کرے تو سلطان اپنے ولی عہد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرے۔

ملک السعید نے خانقاہ سے نکلتے ہوئے کہا "میں تیری شکایت سلطان سے کروں گا کہ تو نے مجھ سے گستاخانہ لب ولہجے میں باتیں کیں۔ تیری سرزنش ہونی چاہیے۔"

عمر رسیدہ قلندر نے ولی عہد کو روکا "جناب! آپ ذرا سی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جائیں تاکہ میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔ سلطان مجھ سے اچھی طرح واقف ہے اور میں...."

ولی عہد نے قلندر کی پوری بات نہیں سنی اور باہر نکل آیا۔

اس کے ساتھ جو چند خدمت گار تھے۔ انہوں نے عمر رسیدہ قلندر اور ولی عہد میں ہونے والی لفظی جھڑپ سنی بھی تھی اور دیکھی بھی۔

ولی عہد نے اپنے خدمت گاروں سے کہا "تم لوگوں نے بھی اس بندر جیسی شکل رکھنے والے قلندر کی باتیں سنیں۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا اور اس کی پدر بزرگوار سے شکایت کروں گا۔ تم لوگ گواہی دینا کہ تمہارے سامنے قلندر نے میری اہانت کی ہے۔" لیکن ملک السعید کو حیرت ہوئی کہ اس کے کسی بھی خدمت گار نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے سرد مہری اختیار کرلی ہے اور جیسے انہوں نے ولی عہد کی بات سنی ہی نہ ہو۔

ملک السعید نے اپنے خدمت گاروں کو ان کی سرد مہری پر ٹوکا "کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

ایک خدمت گار نے اپنے ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے نظریں جھکالیں اور کہا "آپ ہمیں اس معاملے میں نہ ڈالیں تو بہتر ہے۔"

ولی عہد کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا خدمت گار یہ کیسی بات کررہا ہے۔

ایک دوسرے خدمت گار نے ملک السعید کو مشورہ دیا "ولی عہد محترم! آپ قلندر سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو بہتر ہے۔"

ملک السعید نے کہا "یہ تم لوگ مجھ سے کس قسم کی باتیں کررہے ہو؟ میں نے تو اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی بلکہ اسی نے مجھے دھمکی دی ہے۔"

خدمت گار نے کہا "جناب! آپ کے والد ملک پر حکومت کرتے ہیں اور یہ قلندر، سلطان پر حکمران مقرر کیے گئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے، ان سے تو سلطان بھی ڈرتے ہیں۔"

ولی عہد نے غصے میں پوچھا "ان میں ڈرنے والی کون سی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔"

خدمت گار نے جواب دیا "میں یا ہم اس سلسلے میں کیا بحث کریں۔ آپ جب سلطان سے ان کے بارے میں بات کریں گے تو سلطان آپ کو خود سمجھا دیں گے کہ یہ قلندر کس پائے کے لوگ ہیں اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرنا کسی بھی صورت میں جائز یا فائدے کی بات نہیں۔"

ملک السعید کا ان قلندروں اور مشائخ سے کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ ان سے محل کی تمام کنیزیں اور خدمت گار خوف زدہ رہتے ہیں اور ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ "ابھی ابھی تم میں سے کسی نے یہ کہا تھا کہ سلطان تو ملک پر حکومت کرتے ہیں مگر یہ قلندر، سلطان پر حکومت کرتے ہیں۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔"

خدمت گار نے کئی بار بس یہی بات کہی کہ آپ ان قلندروں کے بارے میں سلطان سے بات کر لیجیے گا۔ وہاں سے آپ کو صحیح جواب مل جائے گا۔

ملک السعید نے محل میں داخل ہونے کے بعد اپنے باپ کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کئی دن سے محل میں نہیں آیا اور کچھ علم نہیں کہ وہ ان دنوں قاہرہ میں موجود بھی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے۔

محل میں جو مملوک پہرہ دیتے تھے، انہوں نے ولی عہد پر پابندی عائد کر دی کہ اب ولی عہد ان کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائے گا کیونکہ اس کی جان کو خطرہ ہے اور کئی فوجی سردار سلطان سے ولی عہدی کے سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں۔

اب ملک السعید کو اپنے باپ کی سخت ضرورت تھی مگر اس کا بوڑھا باپ اس عمر میں بھی چھلاوا بنا ہوا تھا۔

کئی دنوں بعد سلطان محل میں اچانک نظر آیا تو ملک السعید باپ کے پاس شکایت لے کر پہنچ گیا کہ محل کے محافظ اور نگراں اس کو محل سے نکلنے نہیں دیتے۔

سلطان نے بڑی محبت آمیز نظروں سے ملک السعید کو دیکھا اور کہا "جان پدر! وہ تجھے باہر نہیں نکلنے دیتے تو اس میں تیری ہی بہتری ہے۔ میں اپنے کئی لائق آدمیوں کی مدد سے ان فوجی سرداروں کا سراغ لگانے میں مصروف ہوں جو تیری ولی عہدی سے خوش نہیں ہیں۔"

ملک السعید نے کہا "آپ ان کا سراغ لگاتے رہیے گا مجھے اس وقت ایک خانقاہ کے قلندر کی آپ سے شکایت کرنا ہے۔"

سلطان نے نہایت سنجیدگی سے ولی عہد کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس سے قلندر کی پوری روداد سننے کے بعد کہا "تو ابھی ان کی قوت سے واقف نہیں۔ یہ ایک گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے لوگ بہت طاقت ور ہیں اس لیے ان سے بنا کر رکھنی چاہیے۔"

ملک نے کہا "میں نے تو اس کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ اس نے تو اپنے چہرے اور سر کے سارے بالوں کا صفایا کر رکھا ہے۔ عجیب بدہیبت شخص ہے۔ اس سے ہم کیوں ڈریں؟ اور آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ اس کی وجہ تو معلوم ہو۔"

سلطان نے کہا "بیٹے! انسان بہت ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے۔ انسان کی اس کمزوری سے یہ لوگ فائدے اٹھاتے ہیں اس لیے ہمیں ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے۔"

ملک السعید بے حد تلملایا ہوا تھا کہ اس کا طاقت ور باپ جو سلطان بھی ہے، اس قلندر کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز کر رہا ہے۔ باپ سے کہا "اس نے تو مجھے دھمکی دی ہے اور میں نے بھی اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں مستقبل کا سلطان ہوں اس لیے میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

سلطان نے بیٹے کو سمجھایا "بیٹے! وہ شہد کی مکھیوں کی طرح کے لوگ ہیں۔ ان سے چھیڑ چھاڑ کرو گے تو ان کے بہت سے حامی اور طرف دار تمہارا پیچھا لے لیں گے۔ تم ان سے واقف بھی نہیں ہو گے اس لیے تم ان سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکو گے اور وہ تم سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا دیں گے۔"

ملک السعید ابھی حکومتی اور سلطنتی رموز سے واقف نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ سلطان کسی بھی ملک کی طاقت ور ترین شخصیت ہوتی ہے اور ملک و قوم اس کی فرمانبرداری کرتی ہے تو کیا خانقاہوں میں بیٹھنے والے یہ لوگ جو قلندر بھی کہلاتے ہیں، کیا یہ سلطان سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں؟"

سلطان نے اپنے بیٹے کو کسی فکر میں غلطاں و پیچاں دیکھا تو نہایت شفقت سے پوچھا "جان پدر! تو کن فکروں میں



مبتلا ہے؟"

ملک السعید نے جواب دیا "میں نے تو اس سے کہہ دیا ہے کہ میں اسے سزا دے کر رہوں گا۔ آپ اس کو قید خانے میں ڈلوا دیں۔ تاکہ میں وہاں پہنچ کے اس کی مزاج پرسی کروں اور بتاؤں کہ سلطان اور قلندر میں سے طاقت کس کے پاس ہوتی ہے۔"

سلطان نے کہا "نہیں بیٹے! میں تجھے ان باتوں کی اجازت نہیں دوں گا۔ میرے ساتھ خانقاہ میں چل، میں اس قلندر سے تیری دوستی کروا دوں گا۔"

ملک السعید کو خالی خولی خانقاہ میں جانا بھی گوارا نہیں تھا۔ وہ اس قلندر کو ہر صورت سزا دلوانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بہت زیادہ مجبور کیا اور کہا "آپ اس قلندر کو اپنے محل میں بلوائیں اور میرے سامنے اس سے باز پرس کریں۔"

سلطان نے ولی عہد کو سمجھایا "بیٹے! حکومت کرنے کے لیے کشادہ دلی بہت ضروری ہے اور ایک اچھے سلطان کو فراخ دلی سے کام لے کر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ اگر کوئی سلطان ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لینے لگے گا تو وہ بڑے بڑے کارنامے انجام نہیں دے سکے گا۔"

ولی عہد کو بس ایک ہی ضد ہو گئی تھی کہ خانقاہ کے قلندر کو اس کی شیخی کے پیش نظر ذلیل کیا جائے۔ بیٹے نے باپ سے پوچھا "چلیے پدر محترم! میں اس قلندر کو نظر انداز کرتا ہوں مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ خانقاہ نشینوں اور قلندروں سے آخر کیوں ڈرتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "بیٹے! ان دنیا سے نفور لوگوں کو خلقت میں یہ برتری حاصل ہو گئی ہے کہ انہوں نے دنیا کی حرص و طمع سے پیچھا چھڑا لیا۔ اللہ سے لو لگائی اور ان کے شب و روز سائنسیں اور پر اللہ کی یاد میں بسر ہوتے ہیں۔ جس سے اللہ نے ان میں روحانی قوت پیدا کر دی ہے اور وہ اپنی اس روحانی قوت سے مخلوق کو نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں اسی لیے دنیا سے بیزار یہ لوگ سلطانوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔"

ولی عہد نے پوچھا "کیا یہ لوگ واقعی اللہ کی مخلوق کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "بیٹے سعید! تقریباً تیس چالیس سال پہلے صلیبیوں نے دمیاط پر قبضہ کر لیا تھا۔ دمیاط میں جمال الدین قلندر کی خانقاہ ہے۔ اس وقت ملک الکامل اور مسلمان فوجی صلیبیوں سے جہاد کر رہے تھے مگر اس جہاد میں خانقاہ کے قلندروں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور مسلسل یہی کہتے رہے کہ دمیاط اور اس کے مضافات قلندر جمال الدین کے روحانی تسلط میں ہیں اسی لیے وہی اس کی حفاظت کریں گے مگر قلندر نے مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ دمیاط کو صلیبیوں نے برباد کر دیا اور ستر ہزار مسلمان عیسائیوں کے ہاتھوں ذبح کر دیے گئے۔ بعد میں منصورہ میں ملک الکامل، ملک الاشرف اور ملک المعظم نے اپنی متحدہ قوت سے صلیبیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور مسلمان انجینئروں کی کوششوں سے صلیبیوں کو شکست دے دی گئی۔ عیسائی رہنما گرفتار کر لیے گئے اور اس وقت صلیبیوں کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور پھر جب عیسائیوں کو دمیاط سے نکال دیا گیا تو خانقاہ کے قلندر یہ کہتے پھر رہے تھے کہ عیسائیوں کو جمال الدین قلندر نے نکلوا دیا۔ عام مسلمان اس وقت بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ واقعی صلیبیوں کو قلندر جمال الدین کے روحانی دباؤ نے نکالا ہو گا۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ عام سپاہی بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ تم ان قلندروں کے خلاف کس طرح کوئی قدم اٹھا سکتے ہو جنہوں نے عوام و خواص کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

ملک السعید نے پھر وہی سوال کیا "کیا قلندروں کا دل و دماغ پر روحانی تسلط ہوتا ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "نہیں، قطعاً نہیں۔ یہ روحانی لوگ میرے اپنے خیال کے مطابق بالکل بے فیض ہوتے ہیں مگر ہم کریں تو کیا کریں؟ ان کے خوف ناک پنجے عوام و خواص کے دلوں میں گڑے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے کوئی بھی سلطان ان سے پنجہ آزمائی نہیں کرے گا۔"

ملک السعید نے سب کچھ سننے کے بعد بھی باپ سے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ خانقاہ چلوں گا۔ آپ قلندر سے رسماً ہی کہہ دیجیے گا کہ وہ مجھ سے معذرت کر لے۔ تاکہ میں اپنے خدمت گاروں کی نظروں میں سرخ رو ہو جاؤں۔"

سلطان نے جواب دیا "ٹھیک ہے، اگر تو قلندروں کی معذرت سے خوش ہو سکتا ہے تو میں اس سے معذرت کروا دوں گا۔" سلطان نے بیٹے کو سمجھایا "بیٹے! اس وقت سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تیری حفاظت کی جائے کیونکہ میں اپنی ذات میں عجیب و غریب انحطاط محسوس کر رہا ہوں۔ اس سے میری زندگی ناقابل اعتبار لگ رہی ہے۔"

ملک السعید نے فکر مند لہجے میں کہا "مجھے کن لوگوں کی طرف سے خطرہ ہو سکتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے واقف

ہونے کے بعد انہیں سخت ترین سزائیں دیں۔ آپ سلطان ہیں اور سلطان کے اختیارات کا دوسرا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

سلطان نے کہا "بیٹے! سلطان بے شک طاقت ور ترین انسان ہوتا ہے مگر اس طاقت کو کام میں لانے کے لیے عقل اور فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے وہ طاقت میسر ہے مگر تو ابھی کمسن اور ناتجربے کار ہے۔ میں تیرے دشمنوں کو سزا دے سکتا ہوں مگر ان دشمنوں کے لواحقین کو سزا نہیں دی جاسکتی اور ان لواحقین میں خانقاہ کے لوگ بھی ہوسکتے ہیں اسی لیے اگر درگزر سے کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔"

لیکن ملک السعید کی ظلّانہ ضد برقرار رہی "میں خانقاہ کے اس قلندر کو ہر قیمت پر خوار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے اپنی دلیری کی معذرت کرلے۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا۔"

سلطان نے کہا "اچھا پھر میں اسے محل میں بلوالوں گا اور اگر اس نے محل میں آنے سے انکار کیا تو خانقاہ کے کسی گوشے میں بیٹھ کر اس قلندر سے معذرت کروا دوں گا۔"

ملک السعید نے کہا "وہاں میرے خدمت گاروں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس بدبخت قلندر نے میرے خدمت گاروں کے سامنے تند و تیز لہجے میں باتیں کی تھیں اور مجھے اپنے خدمت گاروں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑ گیا تھا۔"

جب اس بحث نے اتنا طول پکڑا تو سلطان کو احساس ہوا کہ آخر یہ قلندر ہے کون اور اس میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی کہ وہ ولی عہد سے جھگڑ بیٹھا۔

سلطان نے ولی عہد سے پوچھا "تجھے اس قلندر کا نام معلوم ہے؟"

ولی عہد نے جواب دیا "نہیں، میں اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔"

سلطان نے پوچھا "تجھے وہ خانقاہ یاد ہے؟ تو مجھے وہاں پہنچا سکتا ہے۔"

ولی عہد نے انکار کیا "نہیں، مجھے اس خانقاہ کا راستہ بھی نہیں یاد لیکن میرا خدمت گار مجھے وہاں پہنچا سکتا ہے۔"

سلطان نے ولی عہد کو حکم دیا "اچھا اب تو آرام کر۔ میں تیرے خدمت گاروں سے اس خانقاہ کا پتا معلوم کروں گا اور شاید دو دن بعد تجھے لے کر وہاں پہنچوں۔"

ولی عہد اس وقت بھی غصے میں تھا۔ وہ اپنے باپ کو اسی وقت خانقاہ میں لے جانا چاہتا تھا مگر سلطان تحمل اور برداشت سے کام لے رہا تھا۔

ملک السعید کے جانے کے بعد سلطان نے اس کے خدمت گاروں کو طلب کیا اور ان سے ناخوش گوار لہجے پوچھا "تم لوگ میرے بیٹے کو کس خانقاہ میں لے گئے تھے؟"

ایک خدمت گار نے بتایا "مسجد عمرو بن العاص سے متعلق جو خانقاہ ہے اور آپ نے اس کی مرمت اور تعمیر کی دی ہے۔ اسی خانقاہ میں۔"

سلطان نے خدمت گاروں کو سمجھایا "تم لوگ آئندہ محل کے باہر اسے کہیں نہیں لے جاؤ گے۔"

سلطان کو اپنے جملہ امرا اور سرداروں میں سب سے زیادہ اندیشہ فلاؤن کی طرف سے تھا۔ سلطان نے کہا "ہم میں ایک ایسا شخص بھی ہے کہ یہ شخص جتنا خلوص اور ارتباط دکھاتا ہے اسی قدر میری نظروں میں مشکوک ہوتا جارہا ہے۔"

لیکن اس کے مخبروں نے کئی فوجی سرداروں کے بارے میں بتایا کہ وہ مشتبہ ہیں اور ان کی وفاداریوں پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

سلطان نے ان فوجی سرداروں کو اسکندریہ بھیج دیا کیونکہ ایسے مشکوک اور مشتبہ سرداروں کو قاہرہ میں رکھنے کا یہ مطلب تھا کہ انہیں سازشوں کے لیے بااثر امرا اور سرداروں میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنے بیٹے کی ولی عہدی کے مخالفین کو برداشت اسی صورت میں کرسکتا تھا کہ وہ قاہرہ سے بہت دور چلے جائیں۔

ان اچانک اقدامات نے فلاؤن کو چوکنا کردیا کیونکہ جن فوجی سرداروں پر سلطان نے شبہ کیا تھا وہ سب فلاؤن کے گہرے دوست تھے۔

فلاؤن کے جی میں آئی کہ وہ سلطان سے معلوم کرے کہ آخر ان کام کے فوجی سرداروں کو قاہرہ سے دور اسکندریہ کیوں بھیج دیا گیا جب کہ فلاؤن ان سرداروں سے اپنی مہمات میں مدد لینا چاہتا تھا۔

فلاؤن بے حد چالاک اور سمجھ دار مملوک امیر تھا۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ اگر اس نے ان معتوب فوجی سرداروں کے بارے میں سلطان سے بات کی تو وہ خود بھی سلطان کی نظروں میں مشتبہ ہوجائے گا۔

ان چند مشتبہ فوجی سرداروں کے اسکندریہ چلے جانے کے بعد سلطان کو سکون سا آگیا کیونکہ چھاؤنی میں اس کا یہ اثر ہوا تھا کہ وہ فوجی سردار جو اب بھی چھاؤنی میں موجود تھے، انہوں نے معتوب فوجی سرداروں کے بارے میں کھل کر سلطان کو بتایا کہ وہ لوگ واقعی سلطان کی ولی عہدی سے متعلق فیصلے سے خوش نہیں تھے۔



الٰہی میں ایک فہد نامی شخص بھی تھا۔ یہ شخص ماضی میں سلطان کے لیے بہت کام کرچکا تھا اور اس وقت بھی وہ چھاؤنی میں موجود سلطان کے لیے بلا اجرت کام کررہا تھا۔ اس کے دو ساتھی اس سے پیچھڑ چکے تھے مگر فہد سلطان کو عالم اسلام کی لاثانی روزگار شخصیت سمجھ کے اس کی بے حد عزت کرتا تھا اور اپنے خرچ پر چھاؤنی میں موجود رہ کر سلطان کے دوستوں اور دشمنوں کو سمجھنے اور جاننے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔

فہد نے سلطان کی خدمت میں حاضری دی تو سلطان کو پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جانا پہچانا ہے۔

فہد نے سلطان کو تخلیے میں بتایا "اگر سلطان کا حافظہ اب بھی صحیح کام کررہا ہے تو انہیں یاد ہونا چاہیے کہ میں اپنے دو ساتھیوں کفیل اور عبداللہ کے ساتھ مخبری اور سراغ رسانی کی خدمت کئی سالوں سے برس ہا برس انجام دیتا رہا ہوں۔"

سلطان نے ان ذرا سے حوالوں کے بعد اس کو پہچان لیا اور پوچھا "تو چھاؤنی میں کیا کرتا ہے؟"

فہد نے جواب دیا "میرا فوجیوں سے اتنا گہرا واسطہ اور تعلق ہے کہ وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں۔ میں نوجوان فوجیوں کو ماضی کے دلچسپ قصے اور واقعات سناتا رہتا ہوں جس سے وہ مجھ سے خوش رہتے ہیں اور مجھے فلاؤن نے فوجیوں کا دل بہلانے کے لیے چھاؤنی میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ کبھی کبھی کچھ معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔"

سلطان نے پوچھا "کیا تو سچ کہہ رہا ہے کہ تو نے میری خاطر میرے لیے چھاؤنی میں رہنا اختیار کیا تاکہ تو میرے لیے بلا اجرت مخبری اور سراغ رسی کرتا رہے۔"

فہد نے بڑے اداس اور افسردہ لہجے میں کہا "سلطان محترم! اگر میں اجرت لے کر آپ کے لیے یہ کام کرتا تو آپ مجھ پر اعتبار کرتے مگر۔"

سلطان نے کہا "ہاں، میں تجھ پر اعتبار کرتا اور اب تو مجھے بتا کہ فوج میں میرے خلاف کون کون ہے؟ اور میری ولی عہدی کے فیصلے سے کس کس کو اختلاف ہے؟"

فہد نے کسی قدر تحمل، تامل اور برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا "سلطان معظم! میں نہیں چاہتا کہ آپ کی پرسش کے جواب میں ایک ایسا نام لوں جس سے آپ بہت فکرمند ہوجائیں اور الجھن میں پھنس جائیں۔"

سلطان نے کہا "تو کسی بات کی فکر نہ کرنا کیونکہ میں نے زندگی بھر نہایت سفاکانہ فیصلے کیے ہیں اور مجھے دنیا کی کوئی بدترین خبر بھی پریشان نہیں کرسکتی۔"

فہد نے کہا "وہ جو اسکندریہ بھیج دیے گئے، سارے ہی فلاؤن کے آدمی ہیں اور فلاؤن خود کو ولی عہد کے بجائے تیار کررہا ہے یعنی اس وقت آپ کا سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار ساتھی فلاؤن ہے۔"

سلطان نے کہا "ہاں، میں بھی یہی سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت وہی میرا سب سے زیادہ معتمد امیر ہے اور وہ مجھ سے غیر معمولی خلوص اور ربط تعلق کا اظہار کرتا رہتا ہے حالانکہ جو واقعی میرے لیے مخلص اور جاں نثار ہے، اس کو قول سے زیادہ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرنا چاہیے۔ میرا زندگی بھر کا یہ تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سبب کے بغیر اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا اظہار کرنے لگے تو اس کی وفاداری اور جاں نثاری مشتبہ ہوجاتی ہے۔"

فہد حیران تھا کہ اس وقت سلطان اس سے نہایت بے تکلفی اور یگانگیت سے پیش آرہا تھا۔ جب کہ ماضی میں سلطان نے ایسے موقعوں پر فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ لمحوں میں فہد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سلطان میں تبدیلی اس کی پیری نے پیدا کردی ہے۔

سلطان نے فہد کو سمجھایا "آج سے تو ہمارا کارندہ ہے۔ تجھے تیرے کام کی خفیہ طور پر اجرت ملتی رہے گی۔ تو کوشش کر کہ تجھے فلاؤن کی زیادہ قربت حاصل ہوجائے اور وہ تجھ پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگے۔"

فہد نے جواب دیا "آپ کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں تو یونہی آپ کا بے دام غلام ہوں اور ہمیشہ آپ کے لیے کام کرتا رہوں گا۔"

سلطان نے اسے ہدایت کی "اب تو مجھ سے ملنے کے لیے میرے محل میں نہیں آئے گا بلکہ میں خود تجھ سے مل لیا کروں گا۔"

فہد نے نہایت بے چینی اور بے قراری سے کہا "آپ فلاؤن کو دمیاط بھیج دیں اور اسے کوئی بڑی ذمے داری ہرگز نہ سونپیں۔"

سلطان نے پوچھا "وہ کیوں؟"

فہد نے جواب دیا "جناب! یہ شخص اقتدار کا حریص ہے۔ میں نے کئی بار اس کی زبان سے یہی سنا ہے کہ اقتدار غیر ذمے دار بچوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔"

سلطان نے جواب دیا "فلاؤن صحیح کہتا ہے کیونکہ جب میں اقتدار میں نہیں تھا تو اقتدار میں آنے کے لیے میں بھی اسی قسم کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ فلاؤن ہر طرح اس کا مستحق ہے، جو وہ چاہتا ہے اسی لیے میں نے اسے اپنے بیٹے کا تابک

مقرر کردیا ہے۔"

فہد نے کہا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ولی عہد کا یہ اتابک ولی عہد کا وفادار رہے گا؟"

سلطان نے جواب دیا "مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں' میں اس تشویش ناک پہلو پر غور کرکے فکر مند نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے اپنے بیٹے کو وہاں تک پہنچادیا جہاں وہ اپنی کوششوں سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب اسے اپنے لیے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ جب تک میں زندہ ہوں' اس کی رہنمائی کرتا رہوں گا۔ میرے بعد میرے بیٹے کو خود بڑے بڑے فیصلے کرنا ہوں گے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو تاریخ کا بڑا آدمی بن جائے گا اور اگر ناکام رہا تو اس سے زیادہ لائق آدمی اس کی جگہ لے لے گا اور اس کے بعد میرے بیٹے پر کیا گزرے گی؟ اس کا کیا اثر ہوگا؟ یہ ساری باتیں میری سوچنے کی نہیں ہیں اور اگر میں سوچوں بھی تو اس سے مجھے یا میرے بیٹے کو کیا فائدہ پہنچے گا۔" سلطان بہت جذباتی ہو رہا تھا اور شاید اس وقت اس کی پوری زندگی کے واقعات تڑا باندھے اس کے حافظے کے میدان میں آکھڑے ہوئے تھے۔ جب اس کے بچپنے میں منگولوں نے اس کے علاقے پر حملہ کردیا تھا اور مقابلے میں اس کی قوم کے بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے تھے اور اس کو قید کرکے غلاموں کی منڈی میں پہنچادیا گیا تھا۔ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے کئی بار فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہوگئی تھی اور پھر اسے دمشق کی غلاموں کی منڈی میں بیچ دیا گیا تھا اور اس منڈی سے اسے قاہرہ تک پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ ماضی کے ان انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس نے آگے بڑھنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں اور خوش قسمتی سے اسے ایوبی خاندان نے شاہی محلات کا نگراں مقرر کردیا اور پھر وہ زیادہ فکری اور دماغی جدوجہد سے کام لے کر توڑ جوڑ میں مشغول ہوگیا تھا۔ اس دوران میں اس کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑ گئی تھی مگر وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے قاہرہ سے بھی نکل گیا اور دور بیٹھ کر قاہرہ کے اقتدار میں داخل ہونے کی کوششیں کرتا رہا اور آخر سلطان مصر بننے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور اب اپنے بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہوا وہ اپنے بیٹے کو کامیاب سلطان بنانے کی تدبیریں کررہا تھا مگر یہاں سلطان ہی جیسا ایک مملوک امیر سیف الدین قلاؤن موجود تھا اور سلطان بننے کی خاموشی سے تدبیریں کررہا تھا۔

فہد نے سلطان کو فکری مندی میں مستغرق دیکھا تو پوچھا "کیا میں جاؤں یا سلطان کچھ اور ہدایتیں فرمائیں گے؟"

سلطان نے جواب دیا "اب تو جاسکتا ہے مگر یہاں سے جانے کے بعد تو مسجد عمرو بن العاص کی خانقاہ میں ضرور جائے گا اور وہاں ایک قلندر نہ جانے کہاں سے آکے بیٹھ گیا ہے' اس سے میرے بیٹے کو بہت تکلیف پہنچی ہے تو اسے اپنے طور پر سمجھائے گا کہ شاہی محل سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں۔ ویسے میں خود بھی اس سے ملوں گا اور کوشش کرکے اس کو دمیاط بھیج دوں گا۔ وہاں جمال الدین قلندر کا مزار ہے۔ اس خانقاہ میں اس قلندر کے لیے گنجائش ضرور ہوگی۔"

فہد نے سلطان کو بتایا "جناب! ان خانقاہ نشینوں سے حکومت کو دور رہنا چاہیے کیونکہ زندگی سے بیزار یہ لوگ حکومت سے نہیں ڈرتے اور چونکہ ان کا حلقہ اثر بہت زیادہ ہوتا ہے تو یہ اسی حد تک خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔"

سلطان نے بے نیازی سے سر ہلا دیا "بے شک بے شک' یہ فضول لوگ نہ صرف خود اپنے بلکہ دوستوں کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔ میری اس بات کو تو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرکہ میں ان کی فلاح اور بہتری کے لیے مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کروا رہا ہوں مگر یہ میرا احسان ماننے کے بجائے میری مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ میں نے۔"

سلطان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

فہد چلا گیا لیکن اب وہ حالات کا تجزیہ کرنے لگا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سلطان کو قاہرہ میں اپنی مصروفیات حد کمال کو پہنچادینا چاہئیں کیونکہ اس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ قلاؤن سے چھیڑ چھاڑ پسند نہیں کرتا تھا اور وہ ایسا قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے وہ قاہرہ کے ماحول میں سازشوں کا شکار ہوجائے۔ جو ان قلاؤن کے پاس کام کے لیے بڑا وقت تھا جب کہ سلطان کے پاس بڑھاپے کی وجہ سے بالکل وقت نہیں تھا۔ اگر سلطان کی غلطی سے بڑھاپے اور جوانی میں تصادم ہوجاتا اور کسی وجہ سے سلطان کو پیچھے ہٹنا پڑتا تو اس کے بیٹے کا مستقبل تاریک ہوجائے گا اس لیے سلطان' قلاؤن سے بھی خوش گوار تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔

○☆○

فہد نے چھاؤنی پہنچ کے اپنا کام شروع کردیا۔ وہاں اس وقت بھی قلاؤن موجود تھا اور وہ دوسرے فوجی سرداروں سے سلطان کی شکایت کررہا تھا "پتا نہیں' سلطان مجھے عکا کیوں نہیں بھیجنا چاہتا۔ وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں عکا کو فتح کرلوں گا تو فوج اور



عوام میں سلطان سے زیادہ مقبول ہوجاؤں گا۔

ان بہت سے بیٹھے ہوئے فوجیوں کی نشست کے پیچھے کچھ مہریں' کچھ ٹوٹی پھوٹی ڈھالیں اور دو سرا فضول اور بے کار سامان پڑا ہوا تھا۔

فہد سب کی نظروں سے بچتا بچاتا' جھکے جھکے' فوجیوں اور کاٹھ کباڑ کے پیچھے بیٹھ گیا۔

قلاؤن کہہ رہا تھا "عکا کی مہم بڑی مشکل اور ہلاکت خیز ثابت ہوگی۔ شاید سلطان یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے عکا فتح کرلیا تو فوج اور قاہرہ کے لوگ سلطان کی ولی عہدی پر مجھے ترجیح دے دیں گے لیکن میں خود سلطان کو کس طرح باور کراؤں کہ سلطان نے جو مقام حاصل کرلیا ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں عزت اور وقار کی جو جگہ بنالی ہے' میں وہاں کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

ایک فوجی سردار نے کھڑے ہوکر اپنی رائے دی "آپ اپنی کوشش جاری رکھیں اور بوڑھے سلطان سے درخواست کریں کہ وہ آپ کے معاملات میں دخل نہ دیں۔"

قلاؤن نے ان سب کو بتایا "گو کہ شاید تم اپنے گردوپیش سے مجھ سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ تم میں ایک فضول اور بے کار شخص فہد ہے جو بے اجرت تم سب کو لطائف اور اپنی زندگی بھر کے دلچسپ واقعات سناتا رہتا ہے۔ اب سننے میں آیا ہے کہ سلطان نے اس کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ فہد بہت اچھا انسان ہے مگر اسے سلطان یا مجھ جیسے لوگ خراب کردیتے ہیں۔"

فہد اپنے بارے میں یہ دلچسپ تبصرہ سن کر پریشان ہوگیا۔ اسے اس محفل میں چوروں کی طرح جھکے جھکے پیچھے آکے بیٹھ جانے پر ندامت محسوس ہورہی تھی کیونکہ قلاؤن نے اس کو اس طرح آتے ہوئے یقیناً دیکھ لیا تھا۔

قلاؤن کہتا رہا "سلطان نے اپنے نابالغ بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کردیا' مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہم سب ذہنی طور پر سلطان کے شاگرد اور احسان مند لوگ ہیں۔ اگر اس احسان مندی میں ہم ولی عہد کی خدمت کریں گے تو یہ کسی پر کوئی احسان نہیں ہوگا۔ مجھے تو کسی کی ماتحتی میں کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

فہد بہت زیادہ خوف زدہ تھا کہ اگر وہ قلاؤن کی نظروں میں مشتبہ قرار پاگیا تو چھاؤنی میں اس کا رہنا مشکل ہوجائے گا۔

کسی فوجی سردار نے پوچھا "ہاں' فہد نامی بوڑھے سے ہم بھی واقف ہیں۔ وہ بہت دلچسپ انسان ہے۔ وہ تو ہر کسی سے اچھی طرح ملتا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ اس نے جوانی میں سلطان کے لیے بہت کام کیے ہیں۔"

قلاؤن نے کہا "ہاں' شاید وہ اب بھی سلطان کے لیے کام کررہا ہو اور اگر نہیں کررہا ہے تو اب اسے کرنا چاہیے۔ اس جیسے وفادار سمجھ دار اور وضع دار لوگ اب کہاں۔"

فہد سے اور تو کچھ نہ ہوسکا۔ وہ فرش پر لیٹ گیا اور لیٹے ہی لیٹے کھسکتا ہوا وہ کاٹھ کباڑ کے پیچھے چلا گیا اور اب اسے یقین آگیا کہ یہاں اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

قلاؤن نے موضوع ہی بدل دیا اور عکا کی باتیں شروع کردیں اس نے اپنے جوان بیٹے کا ذکر کیا جسے وہ عکا کی مہم میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

قلاؤن نے کہا "میں سلطان سے مل کر عکا کی مہم پر جانے کی بات کروں گا اور اس مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں عکا ہی میں رہ جاؤں گا تاکہ سلطان کی بدگمانیوں میں اضافہ نہ ہو۔"

جب یہ محفل برخاست ہوگئی۔ لوگ اِدھر اُدھر ہوگئے تو فہد ابھی وہاں سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ قلاؤن کی آواز سنائی دی "فہد! اب نکل آ۔ میرے سوا اب یہاں کوئی نہیں۔ وہ سب چلے گئے۔"

فہد خاموشی سے اٹھا اور مجرموں کی طرح قلاؤن کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

قلاؤن نے پوچھا "یہ تو چوروں کی طرح یہاں آیا اور کاٹھ کباڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ کیا تو کسی کے لیے مخبری کررہا ہے؟"

فہد نے تردید کی "نہیں' ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اب میں خود حیران ہوں کہ میں نے ایسی حرکت کیوں کی؟"

قلاؤن نے پوچھا "مجھے سلطان نے طلب کیا تھا؟"

فہد نے جواب دیا "مجھے سلطان نے طلب نہیں کیا تھا بلکہ میں خود سلطان سے ملاقات کرنے گیا تھا۔"

قلاؤن نے پوچھا "وہ کیوں؟"

فہد نے جواب دیا "میں ایک عرصے سے چھاؤنی میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں اور میں نے شادی بھی نہیں کی۔ مجھے بھی سلطان کی طرح بڑھاپے کا احساس ستانے لگا ہے چنانچہ میں نے سلطان سے درخواست کی کہ مجھے آپ کے ساتھ عکا جانے دیا جائے اور مجھے شاہی ملازمین میں شمار کیا جائے۔"

قلاؤن نے اس کو سوالیہ نظروں سے گھورا "کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

فہد نے جواب دیا "اب میں اس عمر میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔"

فلاؤن نے پوچھا "پھر سلطان نے کیا جواب دیا؟"

فہد نے کہا "سلطان نے پوچھا کہ میں عکا کی مہم میں آپ کے ساتھ جا کے کون سی خدمت انجام دوں گا۔؟"

فلاؤن اب فہد کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا' پوچھا "پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

فہد نے جواب دیا "میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سپاہی مجھ سے بہت خوش ہیں اور میں انہیں اپنے زندگی بھر کے دلچسپ واقعات اور لطائف سناتا رہتا ہوں اور انہیں سن کر سپاہی مجھ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔"

فلاؤن نے پوچھا "کیا سلطان نے تیری درخواست قبول کرلی؟"

فہد نے جواب دیا "نہیں جناب! بلکہ سلطان نے مجھے جھڑک دیا کہ مجھے اس سلسلے میں سلطان کے بجائے آپ سے بات کرنی چاہیے کیونکہ فوجی معاملات سلطان نے آپ کے حوالے کردیے ہیں۔"

فلاؤن نے ایک بار پھر سنجیدگی سے پوچھا "کیا سچ؟ سلطان نے تجھ سے یہی کہا جو تو بتا رہا ہے؟"

فہد نے پھر وہی جواب دیا "میں اس بڑھاپے میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

فلاؤن بولا "لیکن میں تجھے اپنے ساتھ عکا اس لیے نہیں لے جاؤں گا کہ میدان جنگ میں سپاہیوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا کہ وہ تیری زندگی کے دلچسپ واقعات اور لطائف سنیں۔"

فہد نے فلاؤن کی خوشامد کی "آپ مجھے مایوس نہ کریں۔ سلطان نے مجھے آپ کے حوالے کردیا اور آپ مجھے دھتکار رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم فرمائیں اور مجھے اپنے ساتھ عکا لے جائیں۔"

فلاؤن نے کہا "میں تجھے عکا اسی وقت لے جاؤں گا' جب مجھے وہاں جانے کی اجازت ملے گی۔ سلطان نے عکا کی مہم کو التوا میں ڈال رکھا ہے۔ جب میں خود جاؤں گا تو اپنے ساتھ تجھے بھی لے جاؤں گا۔"

فہد نے زور دے کر کہا "آپ ضرور جائیں گے کیونکہ سلطان نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کے ساتھ عکا کی مہم پر جاؤں۔"

فلاؤن نے کچھ دیر فہد کو دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا "یہ بات ہے تو آج سے میں تیرا روزینہ مقرر کرتا ہوں اور دیکھ اب شادی کرلے۔ اگر اس عمر میں بھی خدا نے تجھے بیٹا دے دیا تو پندرہ بیس سال بعد تیری خدمت کرنے کے لائق ہوجائے گا۔"

فہد نے جواب دیا "نہیں جناب! اب میں شادی کرکے دو جانوں پر ظلم نہیں ڈھانا چاہتا۔"

فلاؤن نے حیرت سے پوچھا "دو جانوں پر ظلم ڈھانے کا معاملہ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔"

فہد نے جواب دیا "معاملہ بالکل صاف ہے۔ اب اگر میں شادی کروں گا اور شادی کے بعد اولاد بھی ہوگئی پھر میں چل بسا تو میرے بعد میری بیوہ اور اس یتیم بچے کی پرورش و سرا کون کرے گا؟"

فلاؤن کو ہنسی آگئی "تو تو بے حد دور اندیش معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی باگ دوڑ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اپنے کام کرتے رہتے ہیں اور اللہ اپنی مخلوق کی اچھائی برائی کا رکنان قضا قدر کے ذریعے نمٹاتا رہتا ہے۔ تجھے اپنی بیوی اور بچے کے معاملے میں اتنا زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔"

فہد نے کہا "میں نے پوری زندگی بہت زیادہ مصروف گزاری ہے اور چھاؤنی میں عسکری مزاج رکھنے والوں جوانوں میں رہ بس کے میرا مزاج کچھ عجیب سا ہوگیا ہے۔ اب اگر میں اس ماحول سے نکل کر شادی کروں گا تو مجھے تنہائی کا احساس بہت جلد مار دے گا اس لیے مجھے اسی حال میں رہنے دیں۔"

فلاؤن نے کہا "تیری مرضی' مجھے جو مشورہ تیری فلاح و بہبود میں دینا تھا' دے چکا۔ مجھے شادی ضرور کرنی چاہیے۔ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی ہے اور انسانی ضرورت بھی ہے۔"

فہد نے پھر مردہ دلی سے انکار کیا "نہیں جناب! بہت کچھ گزر گئی' تھوڑی سی جو باقی ہے' وہ بھی گزر جائے گی۔"

فلاؤن نے کہا "اچھا' اب تو چھاؤنی میں رہ۔ میں نے تیرا روزینہ بھی مقرر کردیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ مجھ سے غداری مت کرنا۔"

فہد نے دونوں کان پکڑے اور عاجزی سے کہا "نہیں جناب! کیا اس بڑھاپے میں مجھے خوار ہونا ہے کہ میں ایک طاقت ور امیر سے غداری کروں گا۔"

فلاؤن تو فہد کی طرف سے مطمئن ہو کر چلا گیا اور فہد نے چھاؤنی میں دوسرے بہت سے سپاہیوں سے ملاقاتیں کیں تو فہد کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں بھی فہد اور سلطان ہی کے حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے ان سب کو



کس نے یہ خبریں پہنچادی تھیں۔

لیکن جب سپاہیوں کو یہ معلوم ہوا کہ فلاؤن نے فہد کا روزینہ مقرر کردیا ہے اور فلاؤن فہد پر بہت زیادہ مہربان ہوگیا ہے تو سپاہیوں کو اس لیے بڑی خوشی ہوئی کہ اب فہد بھی ان کا اجرت دار ساتھی ہوگیا ہے۔

فہد نے اب پہلا کام یہ کیا کہ وہ سیدھا عمرو بن العاص کی مسجد سے ملحق خانقاہ پہنچا اور وہاں اس قلندر سے ملنے کی کوشش کی جس کا ذکر سلطان نے کیا تھا لیکن اس وقت مذکورہ قلندر خانقاہ میں موجود نہیں تھا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے دمیاط گیا ہوا ہے۔

وہ جس وقت قلندر کے سلسلے میں خانقاہ کے لوگوں سے باتیں کررہا تھا۔ اسی وقت سلطان کے کئی آدمی بھی خانقاہ میں داخل ہوئے اور مذکور قلندر کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگے اور انہیں بھی وہی جواب دیا گیا جو فہد کو دیا گیا تھا۔

سلطان کے آدمی نے خانقاہ والوں سے پوچھا "کیا تمہاری خانقاہ کا کوئی شخص دمیاط جائے گا؟"

اسے جواب دیا گیا "فی الحال کوئی نہیں جائے گا۔ اگر کوئی جائے تو کیا سلطان کا قلندر مذکورہ کے لیے کوئی پیغام ہے؟"

سلطان کے آدمی نے کہا "ہاں' اس قلندر سے کہہ دو کہ وہ اب قاہرہ نہ آئے کیونکہ ولی عہد اس قلندر سے بہت ناراض ہے۔"

سلطان کے آدمی یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ اب فہد نے اس قلندر کے بارے میں سوالات کرنے شروع کردیے۔

فہد کو خانقاہ کے لوگوں نے بتایا "ولی عہد کی بھی فضول بیکانہ بیکار باتوں نے قلندر کو ناراض کردیا تھا ورنہ ہم اللہ والے لوگ کسی کی بات کا کہاں برا مانتے ہیں؟"

فہد نے خانقاہ کے دوسرے لوگوں کو سمجھایا "تم لوگوں کو حکمرانوں سے اس لیے نہیں الجھنا چاہیے کہ تم لوگ انہی کی سرپرستی میں رہتے ہو۔ اگر حکمران وقت تم سے ناراض ہوجائیں گے تو تمہاری اللہ اللہ میں فرق اور رکاوٹ پیدا ہوجائے گی۔"

خانقاہ کے ایک شخص نے بتایا "جناب! ولی عہد نے ناشائستہ باتیں کی تھیں جس کا انہیں نہایت معقول جواب دے دیا گیا اور ہمارے پیرو مرشد قلندر اسی وجہ سے دمیاط چلے گئے۔ وہ خود بھی قاہرہ میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اگر بات بن گئی تو اب وہ دمیاط ہی میں رہیں گے اور یہاں ان کی جگہ کوئی اور قلندر آجائے گا۔"

فہد کو اتنا اندازہ نہیں تھا کہ ولی عہد اور قلندر میں اتنی زیادہ ان بن ہوگئی ہے۔

فہد خانقاہ سے نکل کر دمیاط روانہ ہوگیا حالانکہ دمیاط روانگی سے پہلے فلاؤن کو بتا دینا چاہیے تھا لیکن اس وقت وہ سلطان اور ولی عہد کے لیے کام کررہا تھا کیونکہ اب تک فہد کو خانقاہ' قلندر' سلطان اور ولی عہد کے حوالوں سے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بات بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ولی عہد سے قلندر کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ اگر کسی تیسرے نادیدہ فریق نے ان دونوں کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کے لیے ولی عہد کو کسی قسم کا نقصان پہنچا دیا تو درمیان میں قلندر کا نام لیا جائے گا اور سلطان اس قلندر کو کوئی نہ کوئی سزا دے دے گا اور پھر سلطان کے اس اقدام کے خلاف خانقاہ نشینوں کی دنیا سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس لیے فہد نے فوری یہ فیصلہ کیا کہ وہ قلندر سے مل کر دونوں میں صلح صفائی کروادے گا۔ سلطان اس عمل سے فہد کا شکر گزار ہوگا۔

وہ جس قافلے کے ساتھ دمیاط روانہ ہوا تھا اس میں بیشتر جینوا اور وینس کے تاجر تھے۔ ان میں سے دو ایک نے فہد کو پہچان لیا کیونکہ ان دونوں تاجروں کی فہد' کفیل اور عبداللہ سے یروشلم میں ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔

جینوا کے دونوں تاجروں نے فہد سے گرم جوشی سے ملاقات کی اور باری باری سینے سے لگالیا اور پوچھا "آج کل تم تینوں کیا کررہے ہو؟"

فہد نے انہیں جواب دیا "مجھے ان دونوں کا علم نہیں کہ آج کل وہ کیا کررہے ہیں لیکن میں نے چھاؤنی میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ فلاؤن نے میرا روزینہ مقرر کردیا ہے اس لیے زندگی بڑی پرسکون گزر رہی ہے۔"

منصورہ پہنچ کے فہد نے یہاں کی خانقاہوں میں احتیاطاً مذکورہ قلندر کو تلاش کیا مگر وہ یہاں نہیں تھا۔

جینوا کے دونوں تاجر سلطان کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ انہیں سلطان کی یہ ادا بہت بھائی کہ اس نے ٹیوٹنس کے سامنے نہایت کثیر عیسائی فوج کو شکست دے دی تھی اور فرانس کا بادشاہ لوئی نہم وہیں کام آگیا تھا اور آج اٹلی' ٹیونس' دمیاط' اسکندریہ اور وینس کے راستے محفوظ ہوگئے تھے اور آزادی سے تجارت جاری تھی۔ ان عیسائی تاجروں کو صلیبی جنگ جوؤں سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے بہت سے علاقوں کا سکون غارت کردیا جب کہ سلطان بیبرس ہمیشہ تجارت کے لیے راہیں پرامن' پرسکون اور کھلی رکھنا چاہتا ہے۔

فہد ان کی خوشامدوں سے یہی محسوس کرتا رہا کہ وہ مسلمانوں کی خوشامد کرکے اپنی تجارت کو برقرار، محفوظ اور جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

فہد نے افسوس کرتے ہوئے کہا "لیکن اب تو سلطان نے جنگ جوئی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اور حکومت سلطان کے بیٹے ملک السعید کے پاس جانے والی ہے تو کیا اب اس تبدیلی کے بعد بھی عیسائی دنیا اسی طرح آزادی سے مسلم ممالک سے تجارت کرتی رہے گی؟"

جینوا کے تاجر بہت مطمئن تھے، کہنے لگے "سلطان نے جو فضا پیدا کرلی ہے، اب وہ سالہا سال برقرار رہے گی۔"

فہد نے دعائیہ انداز میں کہا "خدا ایسا ہی کرے مگر عیسائیوں کو قرار نہیں ہے۔ وہ صلیبیوں کی صورت میں جمع ہوجاتے ہیں اور پرسکون اور پرامن رہنے والے مسلمانوں کو جہاد پر مجبور کردیتے ہیں ورنہ مسلمانوں نے تو ایک بار بھی اس طرح کا اجتماعی حملہ کسی مغربی ملک پر نہیں کیا۔"

جینوا کے تاجروں نے جب یہ محسوس کیا کہ اب اگر بحث ومباحثہ جاری رہا تو دونوں میں تلخ بحث شدت اختیار کرجائے گی اور نہ جانے اس کا کیا نتیجہ نکلے۔ اس لیے انہوں نے فہد کو دعوت دی کہ وہ جینوا آئے اور دیکھے کہ وہاں کے تاجر اور شہری مسلمانوں کو کس قدر پسند کرتے ہیں۔

فہد نے دونوں تاجروں کو بتایا "جناب! اب میں کیا بتاؤں کہ میں جینوا آ بھی سکتا ہوں یا نہیں اور اگر دو ایک سال حالات پرسکون رہے تو عکا والے اس سکون کو زیادہ دنوں برقرار نہیں رہنے دیں گے۔"

ان نئی باتوں نے جینوا کے تاجروں کو چونکا دیا اور جب انہوں نے اس کی تفصیل جاننا چاہی تو فہد نے انہیں تفصیل سے بتادیا کہ سلطان کا فلاؤن نامی امیر عن قریب عکا پر فوج کشی کرنے والا ہے۔ اس سے ایک نئی صلیبی جنگ شروع ہوجائے گی۔"

جینوا کے تاجر نے پوچھا "کیا اس جنگ میں سلطان کی مرضی اور اجازت شامل ہے یا امیر فلاؤن خود یہ جنگ شروع کرنا چاہتا ہے؟"

عیسائی تاجر نے جب یہ معلوم کرلیا کہ یہ نئی جنگ امیر فلاؤن کی سپہ سالاری میں اس کی مرضی سے لڑی جائے گی تو تاجروں کو بہت افسوس ہوا اور فوراً کہا "جناب! آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے شکایت کی تھی کہ عیسائی صلیبی آپ لوگوں پر حملے کرتے رہتے ہیں اور مسلمان دفاعی جنگ لڑتے ہیں تو اب تم لوگ عکا کے اس معرکے کے متعلق کیا کہو گے؟ جو تم مسلمانوں کی طرف سے شروع ہونے والی ہے۔"

فہد نے عیسائیوں کی شکایت کی "تم لوگ یہ بتاؤ کہ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر تم نے عکا میں کیوں ڈیرے ڈال رکھے ہیں؟" فلاؤن نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب بیبرس کے بعد اس کے منصوبے پر فلاؤن عمل کرتا رہے گا اور جن علاقوں کو سلطان بیبرس نے آزاد نہیں کروایا، انہیں فلاؤن آزاد کروائے گا۔"

جینوا کے تاجر نے بڑی بے دلی سے کہا "جناب! یہ جنگیں کسی کی بھی طرف سے ہوں۔ بالکل مناسب نہیں ہیں۔ ان سے ملکوں کی معیشت تباہ ہوجاتی ہے۔ خداوند ہمیں کبھی تو ایسا بیدار کرے گا کہ جنگیں نہیں ہونی چاہیے۔ اے کاش! عیسائی روحانیت اختیار کرلیں اور مسلمان قلندری۔ اگر ایسا ہوجائے تو ملکوں میں ہر طرف امن ہی امن نظر آئے۔"

فہد نے کہا "یہ تم غلط کہتے ہو یا سمجھتے ہو کہ روحانیت اور قلندری ملکوں میں امن وامان قائم کردے گی کیونکہ آج تک جتنی بھی صلیبی جنگیں ہوئیں، ان میں راہبوں کا کردار بنیادی رہا ہے۔ اصل میں فساد کی جڑ راہب ہی ہیں۔"

ایک دوسرے جنیوی تاجر نے کہا "سالہا سال پہلے جرمنی کے فریڈرک بادشاہ کے دربار میں چند مسلمان ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی مگر ان میں کا ایک معلوم نہیں کیوں دنیا سے کنارہ کش ہوگیا اور اس نے قلندری اختیار کرلی۔ غالباً وہ بھی مسلم عیسائی جنگوں سے تنگ آگیا ہوگا اور اس پر قنوطیت نے ایسا غلبہ پایا کہ وہ ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہوگیا۔"

فہد نے پوچھا "یہ تو کس کی بات کررہا ہے؟"

جینوا کے تاجر نے جواب دیا "مجھے اس کا نام تو یاد نہیں آرہا ہے لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ جن تین مسلمانوں نے منصورہ کے سیلاب زدہ حصوں سے صلیبیوں کو نکالنے میں تین رکنی وفد کی شکل میں صلیبیوں کا ساتھ دیا تھا اور ملک الکامل اور اس کے دونوں بھائیوں کے روبرو سفارتی نمائندگی کی تھی، ان میں یہ قلندر بھی شامل تھا۔ بعد میں اس پر یہ الزام لگا تھا کہ اس نے بیت المقدس میں فریڈرک کو کچھ راز پہنچادیے تھے جس سے وہ مصر کی اسلامی حکومت کے لیے ناقابلِ اعتبار قرار پایا تھا۔"

قلندر کا یہ تعارف فہد کو پہچاننے کے لیے کافی تھا۔ اسے یاد آیا کہ مہدی ہی وہ جوان تھا جس نے فریڈرک کو کچھ ایسی باتیں بتادی تھیں، جس سے اس کو غدار سمجھا گیا اور وہ الکامل کے خوف سے فریڈرک کے پاس چلا گیا تھا۔



دمیاط پہنچنے کے بعد فہد، جمال الدین شاہ قلندر کی درگاہ میں گیا۔ وہاں قاہرہ کا آیا ہوا قلندر مہدی موجود تھا۔

فہد اسے غور سے دیکھتا رہا تو مہدی نے کہا "تو مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے؟ جب کہ میں نے تجھے ایک نظر میں ہی پہچان لیا ہے۔"

فہد نے پوچھا "تو اس خانقاہ میں واپس کیوں آگیا؟ تو نے تو اس سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔"

مہدی نے جواب دیا "بے شک، ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوکر میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ برسہا برس اس کے لیے ذلیل وخوار رہا لیکن وہ لڑکی مجھے نہیں ملی۔ حکومتوں نے مجھے ایسا الجھایا اور مصروف رکھا کہ میری عدم موجودگی میں اس کی شادی کہیں اور کردی گئی اور جب میں یہاں واپس آیا تو مجھے گویا کچھ بھی نہ ملا۔ میں نے جس کے لیے خانقاہ چھوڑی، اس نے مجھ سے سب کچھ چھڑوادیا اور خود بھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی۔ میں بدرجہ مجبوری دوبارہ خانقاہ کی پناہ میں آگیا ہوں۔"

فہد نے اسے بتایا "تجھے کچھ علم ہے کہ تو نے بیبرس کے بیٹے ملک السعید سے بڑی ناشائستہ گفتگو کی۔ کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ولی عہد بھی ہے؟ سلطان بیبرس تیری طرف داری کرتا رہا مگر ولی عہد تجھ کو سزا دلوانا چاہتا ہے۔"

مہدی نے کہا "میں ولی عہد کی چیقلش سے تنگ آکے یہاں چلا آیا لیکن اگر ولی عہد یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے خوف سے یہاں آگیا ہوں تو میں دوبارہ قاہرہ پہنچ جاؤں گا۔"

فہد نے مہدی کو سمجھایا "نہیں، اب ایسی غلطی نہ کرنا کیونکہ ان دنوں سلطان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور اسے فلاؤن کی طرف سے اندیشے پیدا ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں تیرا قاہرہ پہنچنا سلطان کے لیے دردِ سری کا سبب بن جائے گا۔"

مہدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے فہد کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی کہ اچانک خانقاہ کے ایک نوجوان قلندر نے مہدی سے پوچھا "پیرومرشد! مولانا عبدالرحمٰن کی صاحب زادی اپنے بیٹے کے ساتھ دعاؤں کی طالب ہے اور اجازت۔۔۔"

مہدی نے غصے سے بھرائی آواز میں جواب دیا "اس کو، مجھے پریشان نہ کرے اور میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں اس سے نہیں مل سکتا۔"

اب فہد کو معلوم ہوا کہ مہدی نے اس کی طرف سے منہ کیوں پھیر لیا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور اپنی اس کیفیت کو فہد سے چھپانا چاہتا تھا۔

فہد نے دیکھا نوجوان قلندر واپس جاچکا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک عورت اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ خانقاہ میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا "قلندر! میرے کئی بیٹے فوت ہوگئے۔ بس یہ ایک بچا ہے۔ میں اس کے لیے دعا کرانے آئی ہوں۔"

مہدی نے اپنا منہ دوسری طرف کیا ہوا تھا، جواب دیا "عورت! اب تو مجھے خانقاہ میں چین سے رہنے دے۔ میں نے تیری وجہ سے خانقاہ چھوڑ دی تھی اور پھر دو بعد تیری ہی وجہ سے میں دوبارہ اس خانقاہ میں واپس آگیا۔ میں نے قاہرہ کو اس لیے پسند کرلیا تھا کہ وہاں تو نہیں تھی لیکن وہاں ولی عہد نے مجھے نہیں رہنے دیا اور میں یہاں چلا آیا لیکن

صحیح اور باکفایت
ہومیوپیتھک علاج
مرض کچھ بھی ہو کوالیفائڈ اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی نگرانی میں امپورٹیڈ دواؤں کے ذریعے علاج کے لئے رجوع کریں۔
معلومات کے لئے
فون: 5058064
کلینک کے اوقات
شام 5 بجے سے رات 10 تک (جمعہ تعطیل)
ہومیوڈاکٹر محمود احمد مودی
کلینک کا پتا:
I-H-6 پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی
نرسری اسٹاپ۔ نزد نظام ملک شاپ۔
(پلاٹینم بینک والی گلی)

یہاں تو پریشان کررہی ہے۔ اب بتا میں کہاں جاؤں؟"

عورت نے کہا "میرے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا اور اب اگر مجھ سے میرا یہ بیٹا بھی چھین گیا تو میں تو کہیں کی بھی نہیں رہوں گی۔"

مہدی میں اچانک تغیر پیدا ہوگیا' پوچھا "تیرے شوہر کا کب انتقال ہوا؟"

عورت نے جواب دیا "تقریباً پانچ ماہ پہلے۔ کیا تجھے یہ قلندری کی زندگی اچھی لگتی ہے۔ صفاچٹ ابرو' سر و داڑھی مونچھ کے بال ندارد۔"

مہدی کسی سوچ میں ڈوب گیا اور کچھ دیر بعد نہایت عجلت سے اٹھا اور خانقاہ کے گوشے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اے عورت! کیا تو مجھے ورغلانے کے لیے آئی ہے؟ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے کیونکہ اب میں یہ خانقاہ چھوڑ کر تیرے پاس نہیں آسکتا۔"

مہدی نے خانقاہ کے ایک انتہائی گوشہ میں روپوش ہوکے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ یہ عورت اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ دروازے کے سامنے پڑی ہوئی چھوٹی سی کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔

فہد نے کچھ دیر مہدی کی واپسی کا انتظار کیا اور مایوس ہوکے قاہرہ واپس پہنچا۔

وہاں اسے سلطان کے بارے میں تشویش ناک خبریں سننے کو ملیں۔

سلطان کسی کسی جنگ میں زخمی ہوا ہوگا۔ طبیبوں کے بقول اسی زخم نے اندر ہی اندر سلطان کا کام تمام کردیا تھا اور بیسیوں سے بڑھاپے کی کمزوری سمجھتا رہا' وہ دراصل پرانے زخم کا اس پر قابو پالینے کا عمل اور اثر تھا۔

اسے بہ مشکل سلطان کے پاس جانے دیا گیا۔ اس وقت سلطان کے پاس صرف قلاؤن موجود تھا اور وہ سلطان کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کے بعد ملک السعید ہی سلطان ہوگا اور وہ خود اس کے اتابک کی حیثیت سے کام کرتا رہے گا۔

سلطان نے فہد کو اچانک اپنے سامنے دیکھا تو قلاؤن کو حکم دیا "اب تو جاسکتا ہے اور اب باہر نکل کے میری تجہیز و تکفین کی تیاریاں کر۔"

قلاؤن نے فہد کو انتہائی غور اور متجسسانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تو یہاں بیٹھ کے کیا کرے گا؟ میرے ساتھ چل؟"

لیکن سلطان نے اس کو منع کیا "اسے بیٹھا رہنے دے' تو جا۔"

قلاؤن کے چلے جانے کے بعد سلطان نے فہد سے پوچھا "یہ تو اچانک کہاں غائب ہوگیا تھا؟"

فہد نے سلطان کی کیفیت دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ اب سلطان اس کی تفصیلی روداد سننے کے لائق نہیں ہے اس لیے اس نے مختصراً بتایا "وہ قلندر جس کی ولی عہد سے ان بن ہوگئی تھی' پرانا خانقاہ کا نکلا ہوا مہدی ہے لیکن بڑھاپے تک خوار و زبوں رہنے کے بعد وہ دوبارہ قلندر بن گیا اور اب میں اس کو جس حال میں دیکھ کر آیا ہوں' اس سے یہی لگا کہ اب وہ شاید اسی عورت کی خاطر دوبارہ اس دنیا میں واپس آجائے گا جس کے لیے اس نے نوجوانی میں قلندری کی زندگی ترک کردی تھی۔"

سلطان نے آہستہ سے کہا "ملک السعید کو بلاؤ۔"

کئی خدمت گار ملک السعید کو تلاش کرنے چلے گئے۔

سلطان نے فہد سے کہا "تو وہ قلندر مہدی ہے لیکن تو جس عورت کی بات کررہا ہے اس کی تو شادی ہوگئی تھی تو اب وہ شادی شدہ عورت بوڑھے مہدی قلندر کے پاس کیا لینے گئی تھی؟"

فہد نے جو کچھ دیکھا تھا' اس کی تفصیل بتانا شروع کردی اور کہا "میں نے تو یہی سنا کہ اس کے کئی بیٹے فوت ہوچکے ہیں اور تقریباً پانچ ماہ پہلے اس کا شوہر بھی چل بسا اور اس دن وہ خانقاہ میں اپنے نوجوان بیٹے کے حق میں دعا کرانے آئی تھی اور مہدی پریشان ہوکے اپنے حجرے کے آخری گوشے میں دروازہ بند کرکے متقید ہوگیا تھا اور جب میں وہاں سے چلا ہوں تو میں نے دیکھا کہ بند دروازے کے سامنے کھجور کی چٹائی پر اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھی عورت دروازہ کھلنے کا انتظار کررہی تھی۔"

فہد نے سلطان کی طرف سے مکمل خاموشی محسوس کی تو اس نے گھبرا کر سلطان کی طرف دیکھا "سلطان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا اور نیم وا آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔"

ملک السعید' طبیبوں کے ساتھ اندر داخل ہوا اور کچھ دیر بعد طبیبوں نے تصدیق کردی کہ سلطان کا انتقال ہوچکا ہے۔

(جاری ہے)

تاریخی ڈیس منظر کے مختلف

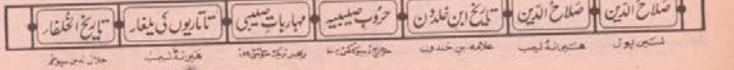


بات صرف اتنی تھی کہ میرے پاس بی اے کی ایک ڈگری آگئی تھی۔ ماں اٹھتے بیٹھتے بی اے کے حوالے سے ڈگری کا طعنہ دیتی تھی اور باپ محنت میں عظمت کے موضوع کو سامنے رکھ کر ٹھیلا لگانے کا مشورہ دیتا تھا اس سلسلے میں اس نے جگہ کا انتخاب بھی کر رکھا تھا اور میں اپنے بے شمار خوابوں کو ذہن میں بسائے "اے میرے دل کہیں اور چل" سوچتا رہتا تھا مگر خالی جیب کہیں نہیں جاسکتا تھا۔

ایک دن بازار میں مجھے اکرم مل گیا "کیسے ہو زبیر؟" اس نے سائیکل سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوں یار۔" میں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"پریشان لگ رہے ہو؟"

"ہاں یار! بے روزگاری کے طعنے آج کل کچھ زیادہ ہی ملنے لگے ہیں اور تم تو جانتے ہی ہو کہ انسان کی عزت اس کے روزگار سے وابستہ ہوتی ہے۔"

"ایک نوکری ہے کرو گے؟" اکرم نے پوچھا۔

"کیوں نہیں کروں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میرے چھوٹے بھائی کو ایک پرائمری اسکول میں جاب کی آفر ہوئی ہے مگر وہ یہ نوکری نہیں کرنا چاہتا تم تو تعلیم یافتہ ہو اس جاب میں بہت ترقی کرو گے۔"

"کب تک مل جائے گی؟" میں نے بے قراری کو بمشکل چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"تم یوں کرو کہ اپنے سرٹیفکیٹس وغیرہ کی مصدقہ نقول میرے گھر بھجوا دو آرڈر تم کو گھر پر مل جائے گا۔"

"ارے یار تم نے تو آج دل ہی خوش کردیا۔ نجانے کب سے میرے کان اس قسم کی خبر سننے کو ترس رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں سودا خریدنا ہے شام ہوگئی تو دکانیں بند ہوجائیں گی۔" اکرم سائیکل کے پیڈل پر

ایک معلم کی پیشہ ورانہ زندگی میں پیش آنے والے دلگداز واقعات کا احوال

**زندگی** ماں باپ کے یتیم بچے کی داستانِ خونچکاں۔ اُس کی ہمت اُس سے دُوں تھی اور وہ اس کے شرب کا طالب تھا پھر اس کی اس خواہش کی اک عجب طرح تکمیل ہوگئی۔

**سورا**

محمد زبیر سلیمانی

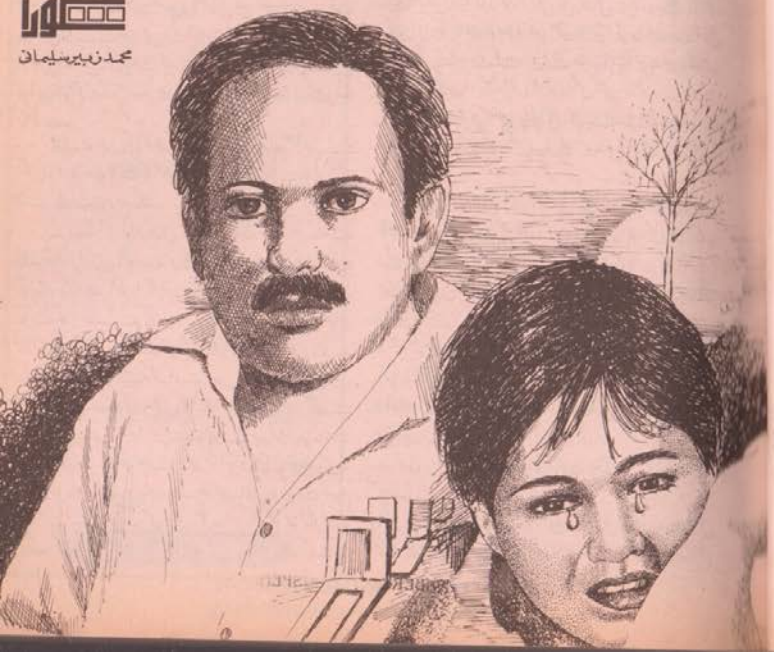

پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ایک کپ چائے تو پی لو وہ سامنے ہی ہوٹل ہے۔"

"نہیں یار صرف چائے نہیں پوری دعوت کھاؤں گا پہلے تمہیں نوکری مل جائے۔ اچھا خدا حافظ۔" اکرم سائیکل چلاتے ہوئے آگے نکل گیا۔

گھر جاکر سب کو یہ خبر سنائی۔ اس خبر کے سنتے ہی کھوئی ہوئی عزت بحال ہوگئی۔ اس دور نے ماں باپ کو بھی کتنا مجبور کردیا ہے کہ اولاد سے ان کی محبت 'اولاد کی نوکری سے مشروط ہوگئی ہے۔

چند روز بعد نوکری کے آرڈر مل گئے میری تعیناتی شہر سے ۳۰ میل دور ایک نیم ریگستانی دیہات میں ہوئی جہاں پر نقد آور فصل کی جگہ ببول کے کانٹے اور کیکر کے درخت اگتے تھے۔

اسکول میں آکر میں نے اپنی کلاس کا چارج سنبھال لیا۔ کلاس کے بچوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی۔ ان بچوں میں ایک نام پچھلے کئی دنوں سے میرے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا وہ نام تھا شکور الدین عرف شکورا۔

کلاس میں آتے ہی میں نے حاضری لگائی حسب معمول تمام بچے حاضر تھے اور حسب معمول ہی شکورا غائب تھا۔ حاضری لگانے کے بعد میں نے تمام بچوں سے شکورے کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا تو تقریباً سب ہی بچوں نے یہی جواب دیا کہ وہ صبح سویرے اپنا بستہ یہاں چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے۔

میں نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "شکورے کو کون ڈھونڈ کے لائے گا؟ جواب میں کئی بچے اسے ڈھونڈ کر لانے کے لیے تیار ہوگئے۔

میں نے ان بچوں میں سے دو صحت مند قسم کے بچے نکالے اور انہیں شکورے کو پکڑ کر لانے کے لیے کہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد شکورا مجرموں کی طرف سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اسے پکڑ کر لانے والے دونوں بچے فاتحانہ انداز سے مسکرا رہے تھے ان کی مسکراہٹ میں شکورے کے لیے تمسخر بھی تھا جیسے کہہ رہے ہوں "بچو! اب تیری خیر نہیں۔" میں نے دونوں بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور شکورے کا ندامت سے جھکا ہوا سر اپنے ہاتھ سے سیدھا کردیا۔ بہت خوب صورت بچہ تھا چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ ناک بہہ رہی تھی۔ گریبان چاک تھا اور پاؤں جوتی سے محروم تھے سر بے پناہ خاک آلود ہوئی تھی۔ اس کی عمر چھ سال کے قریب تھی یا پھر سات سال ہوگی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ سہم گیا۔ میں اس کی کیفیت دیکھ کر مسکرا دیا۔

"شکورے!" میں نے اسے مخاطب کیا "یہ تمام بچے جو تمہارے جتھے ہیں بلا ناغہ اسکول آتے ہیں اپنا سبق یاد کرتے ہیں مگر تم روزانہ اسکول سے بھاگ جاتے ہو کیوں ایسی حرکت کرتے ہو تم؟"

میری بات سن کر شکورے کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے پشیمانی کے سائے سے لہرا گئے پھر وہ سر جھکا کر بولا "استاد جی کل سے روزانہ آؤں گا۔"

"یوں نہیں مجھ سے پکا وعدہ کرو۔"

یہ بات سن کر اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات پیدا ہوئے جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ پکا وعدہ کیسے کیا جاتا ہے' پھر وہ خود ہی شرما دیا اور یہ شرمانا ہی دراصل اس کی جانب سے پکے وعدے کا اقرار تھا۔ میں نے اسے دوسرے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ بظاہر میں بچوں کو پڑھا رہا تھا مگر میری نظریں شکورے پر تھیں جو کبھی ایک بچے کو چھیڑتا پھر دوسرے کو تھپڑ مار کر چھپ جاتا۔ میں خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔

دوسرے دن تمام بچے حاضر تھے مگر شکورا غائب تھا میں بہت حیران ہوا اور فوراً اس کی تلاش میں دو بچے روانہ کردیے تقریباً پندرہ منٹ بعد شکورا میرے سامنے تھا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت تھے سر پر بھی کہیں کہیں کالک لگی ہوئی تھی۔

"استاد جی یہ عمکھی چاچا کی دکان کے سامنے بنے ہوئے تالاب میں نہا رہا تھا۔" ایک بچے نے اس کی شکایت لگاتے ہوئے کہا۔

میں نے دونوں لڑکوں کو اپنی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شکورے کو کان سے پکڑا اور اپنے سامنے کھڑا کردیا۔ ایک لمحے کو شکورے نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر نظریں جھکا دیں یوں محسوس ہوا جیسے اسے اپنے استاد کے ساتھ ہونے والے "پکے معاہدے" کو توڑنے پر افسوس ہوا ہو۔

"دیکھو شکورے۔" میں نے اس کا کان چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ایک بار پھر میں تمہیں معاف کرتا ہوں مگر اب تم اسکول سے غیر حاضر ہوئے تو تمہاری کھال اتار دوں گا۔ جاؤ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔"

اور شکورا بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

بچوں کو پڑھانے کے دوران میں میری نظریں بار بار اس سے ٹکراتیں مگر آج وہ گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اسے اپنی



آزادی اب خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے کسی کام سے بلایا جب پانچ منٹ بعد وہ واپس لوٹا تو علم ہوا کہ شکورے نے میرے جانے کے بعد مانیٹر سے چھوٹی چھٹی لی تھی اور ابھی تک واپس نہ لوٹا تھا۔ میری نظریں اس کی واپسی کی راہ دیکھتی رہ گئیں اور شکورا واپس نہ آیا۔

اگلے روز بھی سب بچے حاضر تھے مگر شکورا پھر غیر حاضر تھا۔ میں بہت حیران ہوا اور مجھے کلیش بھی آیا اور میں نے فوراً دو بچے اس کی تلاش میں روانہ کردیے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد شکورا ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور اسے اسکول سے بھاگنے پر تعلیم میں دلچسپی نہ لینے کے انجام پر ایک طویل لیکچر جھاڑ دیا۔ مثال کے طور پر پر مفو مستری' چھیما حلوائی اور چاچا مکھی کے نام گنوائے۔ تعلیم حاصل کرنے کے صلے میں ایک روشن مستقبل کی نوید دی اور پھر حسب معمول آئندہ سے باقاعدہ اسکول آنے کی تاکید کرنے کے بعد اسے بٹھا دیا۔

اگلے روز اپنے طالب علم ساتھیوں کے درمیان وہ.... براجمان تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا اور مسکرانے لگا جیسے استاد سے کیے ہوئے عہد کی پابندی پر اسے خوشی ہوئی ہو۔ آج وہ مجسمۂ شرافت نظر آرہا تھا۔ سوائے معمولی شرارتوں کے اس نے کوئی خاص شرارت نہ کی مجھے اس کی اس تبدیلی پر بے حد خوشی ہوئی اور اپنی کامیابی پر مسرت بھی پھر اسکول کی چھٹی کا وقت ہوگیا اور شکورا اپنے تمام ساتھیوں سمیت اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

تین روز تک متواتر وہ اسکول آتا رہا۔ تعلیم سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف اپنے استاد کی خوشی کی خاطر اسکول آتا ہو مگر تعلیم میں عدم دلچسپی کے باوجود وہ ایک غیر معمولی ذہن رکھنے والا بچہ تھا۔

اگلے روز جب میں اپنی کلاس میں داخل ہوا تو خلافِ توقع اسے غائب پایا اس کا پچھلا رٹا بستہ جیسے میرا منہ چڑا رہا تھا۔ کلاس کے پندرہ لڑکے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جیسے آج انہیں اسی واقعے کی توقع ہو۔ میں نے بچوں سے اس کی بابت دریافت کیا تو اکثر نے یہی کہا کہ وہ بستہ رکھ کر خود غائب ہوجاتا ہے اور یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ ادھر ہیڈ ماسٹر تک اس کے سابقہ اور حالیہ "کارناموں" کی رپورٹ پہنچ چکی تھی اور انہوں نے مجھے تاکید کردی تھی کہ اب کی بار اس کا نام خارج کردیا جائے مگر میں اس کا نام خارج کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس طرح کرنے سے شکورے کو سدھارنے کے تمام امکانات معدوم ہوجاتے اور میں ایک ذہین بچے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حاضری لگانے کے بعد میں نے کلاس' مانیٹر کے سپرد کی اور خود اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا اسے زیادہ تلاش کی ضرورت پیش نہ آئی۔ عمکھی چاچا کی دکان کے سامنے بنے ہوئے گندے جوہڑ میں وہ نہا رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر اپنے استاد پر پڑی اور اس کی ہنسی غائب ہوگئی۔ یوں لگا جیسے اس کی روح فنا ہوگئی ہو شاید اس نے میرے خطرناک تیور بھانپ لیے تھے۔ میں نے اسے اشارے سے باہر نکلنے کو کہا۔ وہ ڈرتا


## سوسالہ فلم ڈائریکٹری

نیا ایڈیشن سرورق کی تبدیلی اور لائف ٹائم کیلنڈر کے ساتھ آگیا۔ اس فلم ڈائریکٹری کو نایاب کتابوں میں شمار کیا گیا ہے۔

قیمت 250 روپے' ڈاک خرچ 25 روپے

لکشمی چوک

جناب یاسین گورچہ نے فلمی دنیا کے ان رازوں پر سے پردہ اٹھایا ہے جس کی ہمت کوئی نہ کرسکا۔ زبردست واقعات اور بے لباس شب و روز کی قلم کاری۔

قیمت 125 روپے ڈاک خرچ 20 روپے

نگار گولڈن جوبلی نمبر دو ہزار سالہ جشن

لاجواب شہ پارہ پوری پاکستانی فلمی دنیا کا چپہ چپہ تحریر میں محفوظ کیا ہے۔ سدا بہار شاہکار جس کے پاس نگار گولڈن جوبلی نمبر نہیں اس کا فلمی دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوسکتا۔ ایک تاریخی دستاویز

صفحات 466 سائز ڈبل۔ قیمت 300 روپے ڈاک خرچ 50 روپے

قیمت بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں وی پی نہیں بھیجا جاتا

روپ پبلشرز آسن مل لوجھارو ڈکراچی

فون: 2628939-2624097

ڈرتا باہر نکلا۔ کچھ بچے جوہڑ سے نکل آئے تھے اور کچھ جوہڑ کے اندر سے ہی یہ سارا کھیل دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے شکورے کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور شکورا بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اسکول تک آگیا۔ میں نے اسے کان سے پکڑا اور مٹی کی تپتی ہوئی دھوپ میں مرغا بنا دیا اوپر سے چار پانچ زوردار بید رسید کردیے۔ تقریباً بیس منٹ تک وہ مرغا بنا رہا بالآخر اس کی مسلسل آہ وزاری اور توبہ کرنے پر میں نے اسے چھوڑ دیا اور پھر اسے تنبیہہ کی کہ آئندہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو اسے دو گھنٹے تک مرغا بننا پڑے گا۔

اگلے روز شکورا کلاس میں موجود تھا آج اس نے نسبتاً اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور تعلیم میں دلچسپی لینے کی تلقین کی اور اسے واپس بٹھا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے پانی کی چھٹی مانگی جو اسے بخوشی دے دی گئی اور پھر چھٹی کا وقت بھی آگیا مگر شکورا واپس نہ آیا اس دفعہ مجھے شکورے سے زیادہ اس کے والدین پر طیش آرہا تھا جنہوں نے بے پروائی کی حد کردی تھی۔ ادھر ہیڈ ماسٹر صاحب کے کانوں تک اس کے "مزید کارناموں" کی فہرست پہنچ چکی تھی لہٰذا انہوں نے مجھے تاکید کردی کہ اگلے دن سے شکورے کا نام خارج کردوں مگر میں اس بات کے حق میں نہیں تھا۔

"شکورے کا گھر کس نے دیکھا ہے؟" میری اس بات کے جواب میں کئی بچوں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔

"اس کے پڑوس میں کون رہتا ہے؟" اس بات پر تمام ہاتھ گر گئے صرف ایک بچے کا ہاتھ فضا میں بلند رہا "جاؤ شکورے کے باپ کو بلا لاؤ۔" میں نے اس بچے سے کہا۔

"استاد جی' وہ اپنے باپ کے پاس نہیں رہتا بلکہ دادی کے ساتھ رہتا ہے اس کا باپ تو اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہتا ہے۔" بچے نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ ماں کے ہوتے ہوئے دادی کے ساتھ رہتا ہے آخر کیوں؟"

"استاد جی' شکورے کے باپ نے جب سے دوسری شادی کی ہے تب سے وہ الگ رہتا ہے اس نے اپنے دونوں بیٹوں شکورے اور غفورے کو گھر سے نکال دیا ہے۔"

"مگر شکورے کی ماں تو ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"استاد جی اس کی ماں شاد آباد میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہتی ہے شکورے کے باپ نے اسے بھی گھر سے نکال دیا ہے۔" وہ لڑکا یہ تمام باتیں بتا کر بیٹھ گیا۔

میرے پاس ماسوائے سوچوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

اس لمحے مجھے بہتی ہوئی ناک اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے شرارتی سے شکورے پر بہت پیار آیا۔ میں نے اسے جو سزا دی تھی اس پر اب پشیمانی ہو رہی تھی۔ ماں باپ کی موجودگی میں ان کے سائے سے محروم بچے تو کتوں کے پلوں کی طرح ہوتے ہیں جس نے جب چاہا ٹھوکر لگا دی۔

دوسرے دن پھر شکورا غائب ہوا مگر اب مجھے اس پر بالکل غصہ نہ آیا۔ میں نے کلاس مانیٹر کے سپرد کی اور خود اسے ڈھونڈنے چل دیا۔ مکھی چاچے کی دکان کے سامنے والا جوہڑ خشک ہو چکا تھا اور جوہڑ کے قریب ہی تنے سے ٹیک لگائے شکورا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سرہانے پہنچا اور جونہی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ... ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے استاد کو اتنا قریب محسوس کر کے وہ سہم گیا میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ بکھیری اور پھر شکورے کو اسکول پہنچنے کی تاکید کر کے واپس آگیا تھوڑی دیر بعد شکورا بھی آگیا۔

میں نے اسے اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"شکورے اگر تم کل سے اسکول نہ آئے تو پھر میں بھی یہ اسکول چھوڑ دوں گا اور پھر کبھی تم لوگوں کو پڑھانے نہیں آؤں گا۔" میری یہ بات سن کر چند ثانیوں کے لیے شکورے کا چہرہ فق ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا گئے جیسے واقعی استاد اس کی آئندہ غیر حاضری پر اسکول آنا چھوڑ دے گا۔ میں نے چند باتیں مزید کیں اور شکورے کو بیٹھنے کے لیے کہا میری وہ "دھمکی" شاید کام کر گئی اور اس دن کے بعد سے شکورا بلا ناغہ اسکول آنے لگا۔ وہ اکثر کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔

ایک دن میں نے اسے اپنے پاس بلایا "شکورے تم اپنی ماں سے ملنے جاتے ہو؟"

"جب دادی پیسے دیتی ہے تب جاتا ہوں ورنہ نہیں جاتا۔"

"کیا تمہاری ماں کا گھر دور ہے؟"

"استاد جی! بیس میل دور ہے بس پہ جانا پڑتا ہے۔ استاد جی! بس والے مفت کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟" شکورے نے سوال کیا۔

"وہ اس لیے بیٹے کہ بس کو چلانے کے لیے پٹرول درکار ہوتا ہے جو کہ بہت مہنگا ہوتا ہے اب اگر وہ سب کو مفت بٹھائیں تو پٹرول کے پیسے کہاں سے لائیں گے۔" "اچھا خیر یہ بتاؤ کہ اب ماں سے ملنے کب جاؤ گے؟" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔



"ماں تو روز یاد آتی ہے۔"

یہ بات سن کر میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور شکورے کی جیب میں ٹھونس دیا۔ شکورے نے پیسے لینے سے انکار کیا تو میں نے کہا کہ یہ میں تمہیں ادھار دے رہا ہوں جب تم پڑھ لکھ کر نوکری کرو گے تب دے دینا۔ یہ سن کر اس نے پیسے رکھ لیے۔

"یہ پیسے میں نے تمہیں اس لیے دیے ہیں کہ تم ابھی اور اسی وقت جا کر اپنی ماں سے مل آؤ۔"

میری یہ بات سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اس نے بستہ بغل میں دبایا اور اسکول سے نکل گیا۔ ایک دن کی غیر حاضری کے بعد وہ دوبارہ اسکول آگیا میں نے بچوں کو تازہ سبق پڑھایا اور پھر شکورے کو اپنے پاس بلایا "کہو شکورے ماں سے مل آئے ہو؟"

"جی استاد جی۔" وہ شرماتے ہوئے بولا۔

"ماں نے پیار تو بہت کیا ہوگا؟"

"ہاں استاد جی بہت پیار کیا تھا مگر روتے ہوئے پیار کیا تھا۔ استاد جی ماں کیوں رو رہی تھی؟" اس نے حسب عادت ایک معصوم سا سوال کر دیا۔

"بس یوں سمجھو بیٹا کہ کچھ مائیں صرف رونے کے لیے ہوتی ہیں۔"

یہ فلسفہ شکورے کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ قمیص کی آستین سے ناک صاف کرنے لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے بڑے بھائی کے متعلق بھی کچھ پوچھتی تھی۔"

"ہاں استاد جی' کہہ رہی تھی کہ اسے تنگ نہ کیا کروں اور استاد جی ماں نے جب مجھے اپنے پاس سلایا تھا تو مجھے گلے لگا کر بہت دیر تک روتی رہی تھی پھر دوسرے دن اڈے تک چھوڑنے آئی تب بھی رو رہی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے آستین سے اپنی بہتی ہوئی ناک صاف کی اور ارد گرد بیٹھے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا۔

میں نے اسے اپنی جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ چند روز کے بعد میں بیمار ہو گیا ٹائیفائیڈ کا حملہ تھا لہٰذا دس پندرہ دن گھر میں گزر گئے۔ پندرھویں دن مجھے اسکول میں حاضری دینی پڑی۔ ہیڈ ماسٹر سے مصافحے کے بعد اپنے کمرے میں چلا آیا۔ حاضری لگانے کے بعد پڑھانے میں مصروف ہو گیا لیکن اس دوران میں میرا ذہن شکورے کے بارے میں سوچتا رہا جو آج بھی غیر حاضر تھا اور جس کی زندگی تیزی سے تباہی کی جانب گامزن تھی۔

"شکورا کدھر ہے؟" میں نے کتاب کھول کر بچوں سے سوال کیا۔

"استاد جی! اس کی ماں مر گئی ہے۔" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"کیا؟ ماں مر گئی؟" میں نے زیر لب دہرایا' اندھیرا میری آنکھوں کے آگے چھانے لگا تھا۔

کسی معصوم بے سہارا سے اس کا ایک کمزور سہارا چھین لیا گیا تھا۔ کوئی گاؤں کے لوگوں کی گالیاں اور استاد کی دھمکیاں کھانے کے بعد اس سہارے کی گود میں سمانے جاتا تھا آج وہ گود واپس لے لی گئی تھی۔ میں فوراً کلاس سے باہر نکل آیا کہ کہیں بچے میری آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی دیکھ نہ لیں۔

"اس کی ماں کی قبر کہاں ہے؟" میں نے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"استاد جی! بالے ہوٹل والے کے پیچھے جو قبرستان ہے وہاں پیر سائیں داد کے قریب ہی اس کی قبر ہے۔" ایک بچے نے جواب دیا۔

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا قبرستان کی جانب چل دیا۔ آج چاچا مکھی کے سامنے والا تالاب خشک تھا جیسے اس نے شکورے کے غم میں تمام پانی آنسو بنا کر بہا دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی کیکر کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا جیسے قدرت کے اس فیصلے نے اسے بھی اداس کر دیا ہو۔ قبرستان میں داخل ہو کر پیر سائیں داد کی قبر ڈھونڈنے مجھے کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ پیر سائیں داد کی قبر کے قریب ہی ایک تازہ قبر بنی ہوئی تھی کتبے سے محروم اس قبر کے سرہانے شکورا سو رہا تھا آج بھی اس کے سر پر کپڑا جما ہوا تھا اور کپڑے میل سے اٹے ہوئے تھے۔

اب شکورے کی ماں اپنے گاؤں میں آگئی تھی جہاں وہ روزانہ اس سے ملنے جا سکتا تھا۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ استاد جی! ماں سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔ قبرستان کے پراسرار ماحول میں ہوا جیسے سسکیاں لے رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا شکورے کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی شکورا نیند سے جاگے گا اور حیرت سے پوچھے گا۔ "استاد جی ماں کیوں مر جاتی ہے؟"

## گزشتہ قسط کا خلاصہ

صولین موت سے دیر تک زیدی وہری طرح تڑپتا رہا مگر اس نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا اور وہ چین روانہ ہوگیا۔ علی تیمور بھی اس کے ساتھ تھا۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ ٹرانزفارمر مشین کا نقشہ آفریدی کے پاس ہے۔ انہوں نے ایک خوبرو چینی دوشیزہ 'ماؤ لی' کے ذریعے ولیر آفریدی کو ٹریپ کرنا چاہا مگر وہ خود آفریدی کے سامنے اپنا دل ہار گئی۔ ماؤ لی کی بغاوت کے بعد ولیر آفریدی اور علی تیمور نے اسے ساتھ لے کر طیارے سے چھلانگ لگادی۔ دشمن بھی ان کے تعاقب میں تھے۔ طیارہ بحفاظت چین پہنچ گیا اور میں نے طیارے کے کپتان کی گھڑی میں پوشیدہ مائیکرو فلم چینیوں کے سپرد کردی۔ الپا نے ٹرانزفارمر مشین کے نقشے کو حاصل کرنے کے بعد اس کے ماہر جیکی ہنٹر کو بھی اغوا کرکے اسرائیل پہنچوادیا۔ جہاں وہ جیکب رابن کے جادوئی عمل کے بعد اس کا غلام بن گیا۔ الپا نے پولی کی اس... شاندار کارکردگی کے عوض اپنا آپ اسے سونپ دیا۔ بھیا نے نارنگ سے بچنے کے لیے اپنی روح آزاد کرائی اور پھر غلطی سے ایک خوبصورت لڑکی کے جسم میں جا پھنسا۔ اس لڑکی کے حاسّوں میں ایک جادوگر جھوت پال بھی تھا جس نے اس کے حصول کے لیے لڑکی کو اس کے منگیتر سمیت اغوا کرلیا۔ تھائی لینڈ اور کمبوڈیا میں کامیاب مشن کے بعد سونیا اور ثانی وغیرہ واپس آگئیں۔ پال پوت کا انجام بہت برا ہوا۔ وہ تھائی لینڈ کے شاہی محل میں تھائی فوج کا نشانہ بنا اور مارا گیا۔ ادھر نپال اور کھٹمنڈو کے سرحلاقوں میں آفریدی، علی اور ماؤ لی اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھے۔ نیلی جینتی جانے والے تمام امریکی اپنے ایجنٹوں کی پشت پناہی کررہے تھے۔ انہوں نے خاصی جدوجہد کے بعد آفریدی اور ماؤ لی کو ایک غار میں گھیرلیا۔ ان کی مدد کرنے والے ہمارے محافظ نے کہا۔ "انہوں نے تمہارے فرار کا راستہ روک رکھا ہے۔ یہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے....."

**سسپنس کا مقبول ترین سلسلہ جو دو سو گیارہ ماہ سے جاری ہے**

دو سو چوراسی واں مہینہ

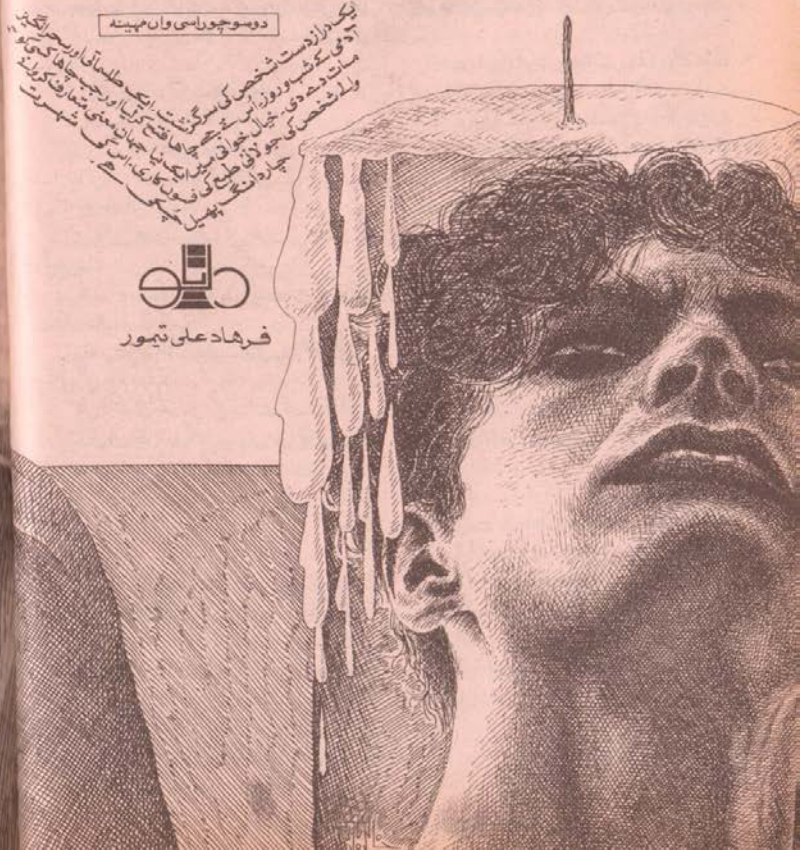

فرہاد علی تیمور

لٹی اور آفریدی بری طرح پھنس گئے۔ ان کی کامیابی یقینی تھی۔ علی ایک بیلی کاپٹر حاصل کرچکا تھا۔ خیال خوانی کے ذریعے یہ معلوم کررہا تھا کہ آفریدی، لٹی کے ساتھ آرہا ہے۔ ان کے آتے ہی وہ بیلی کاپٹر میں وہاں سے چین کی طرف جاسکتے تھے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر قدم پر کامیابی ہو۔ ناکامیاں بھی ساتھ چلتی ہیں اور وہ عین کامیابی حاصل کرتے وقت ناکام ہوگئے۔

محافظ ٹیلی پیتھی جاننے والے نے آفریدی کو منع کیا تھا کہ غار کے اندر نہ جائے اور آفریدی اس کی ہدایت پر عمل کررہا تھا۔ غار سے دور رہنا چاہتا تھا لیکن لٹی کے زخمی ہونے کے باعث اس کی مرہم پٹی کے لیے غار کے اندر آنا پڑا۔ اس کے بعد ہی باہر جانے کا راستہ بند ہوگیا۔

غار کے دہانے پر فائرنگ ہوئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر باہر آجائیں۔ دشمنوں کو یقین تھا کہ باہر نکلنے کا وہی ایک راستہ ہے۔ لٹی اور آفریدی نہیں جانتے تھے کہ وہ غار اندر ہی اندر کہاں تک گیا ہے، اگر کہیں نکلنے کا دوسرا راستہ ہے تو وہ برف سے اس طرح چھپ گیا ہوگا کہ اسے تلاش کرنے کے لیے جگہ جگہ برف توڑنی ہوگی اور یہ کام آسان نہیں تھا۔ دشمن ایسا کرنے کا موقع دینے والے نہیں تھے۔

لٹی اور آفریدی اندر کی طرف غار کے ایک موڑ پر دو پتھروں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ جس دشمن نے انہیں ہتھیار پھینک کر باہر آنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے پھر کہا "آفریدی! تم باہر نہیں آنا چاہتے، نہ آؤ۔ کہیں سے چھپ کر اس مائیکرو فلم کو ہماری طرف پھینک دو۔ ہم تمہیں نقصان پہنچائے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

لٹی اور آفریدی خاموش تھے۔ ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے سراغ رساں اس بولنے والے دشمن کے دماغ میں پہنچ گئے تھے لیکن اسے آلہ کار نہیں بنا پارہے تھے کیونکہ ڈینی، بے فلو اور بے سامونے اس کے دماغ پر بڑی مضبوطی سے قبضہ جمار کھا تھا۔

اس نے کہا "دیر نہ کرو۔ تمہارے ٹیلی پیتھی جاننے والے میرے دماغ میں گڑبڑ کرنا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں اور انہیں کہتا ہوں۔ میرے دوسرے ساتھیوں کے دماغوں میں کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ سب گونگے بنے رہیں گے۔ اگر تم نے مجھے کسی چالاکی سے اپنا آلہ کار بنایا تو یہ گونگے ساتھی مجھے گولی ماردیں گے۔"

علی نے کہا "آفریدی! کٹ سے منی مشعل نکال کر جلاؤ۔ اس کی روشنی میں غار کے اندر دور تک جاؤ۔ باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ نہ ملے۔ کوئی بات نہیں، دشمن مائیکرو فلم کے لیے غار کے اندر آنے پر مجبور ہوں گے دشمنوں کو اپنے پیچھے آنے کے لیے للکارو۔"

آفریدی نے کٹ سے ایک منی مشعل نکال کر جلائی پھر بلند آواز سے کہا "یہ نہ سمجھو، ہمارے لیے باہر نکلنے کا دوسرا تیسرا راستہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اندر ہی اندر دور تک جارہے ہیں۔ مائیکرو فلم چاہیے تو چلے آؤ۔"

اس کے ہاتھ میں ایک فٹ کی چھوٹی سی مشعل تھی۔ اس کی روشنی سے غار دور تک روشن ہوگیا تھا۔ وہ لٹی کے ساتھ دوسرے راستے کی تلاش میں جانے لگا۔ دشمنوں نے غار کے اندر بہت دور روشنی دیکھی تھی اور سمجھ گئے تھے کہ آفریدی واقعی کسی دوسرے راستے سے باہر جانے والا ہے۔ وہ سب غار کے اندر آنے پر مجبور ہوگئے۔

ان میں سے ایک ہی دشمن بول رہا تھا۔ اس نے کہا "آفریدی! تم حماقت کررہے ہو۔ دوسرا راستہ نہیں ملے گا۔ ہم تمہیں گولی ماردیں گے اور مائیکرو فلم حاصل کرلیں گے۔ تمہارے ٹیلی پیتھی جاننے والے تمہیں ہلاکت سے نہیں بچا سکیں گے۔"

آفریدی نے مشعل بجھادی۔ دشمنوں کو بہت دور روشنی دکھائی دے رہی تھی، وہ روشنی بجھ گئی۔ پورے غار میں گہری تاریکی چھاگئی۔ وہ سب سوچ میں پڑگئے، آگے بڑھنا چاہیے یا واپس غار سے باہر جانا چاہیے؟

ڈینی، بے فلو اور بے سامونے ان کے دماغوں میں کہا۔ "تم میں سے کوئی واپس نہیں جائے گا۔ اس مائیکرو فلم کو ہر حال میں حاصل کرنا ہے۔"

لٹی پہلے اس کا بازو تھامے ہوئے تھی۔ تاریکی پھیلتے ہی وہ اس سے چپک کر بولی "مشعل کیوں بجھادی؟ ہم آگے کیسے بڑھیں گے؟"

وہ جھک کر اس کے کان میں بولا "جو کہتا ہو، کان میں کہا کرو۔ ورنہ آواز سن کر دشمن معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔"

اس نے تاریکی میں اس کے چہرے کو ٹٹول کر اسے اپنی طرف جھکایا پھر بولی "تم کسی ٹاور کی طرح اونچے ہو۔ مجھے بات کرنے کے لیے بار بار تمہارا سر پکڑ کر جھکانا ہوگا یا تم مجھے اوپر اٹھایا کرو گے۔"

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے لے کر اٹھایا۔ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے برابر ہوگئے۔ تاریکی میں دونوں



کی سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ وہ سرگوشی میں بولی "اگر یوں رہنا ہے تو میں ساری زندگی اس غار میں گزار دوں گی۔"

آفریدی کو کچھ ہورہا تھا۔ وہ بولا "کام کی بات کرو۔"

وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی "دشمن کام کریں گے۔ ہم آرام کریں گے۔"

اس نے بازو ڈھیلے کردیے۔ تاکہ وہ نیچے زمین پر کھڑی ہوجائے لیکن اس کی بانہیں گردن میں حمائل تھیں۔ وہ گردن سے لٹکی رہ گئی۔ وہ بولا "چھوڑو مجھے۔"

وہ بولی "نہ آگے جانا ہے۔ نہ پیچھے ہٹنا ہے پھر بھی کچھ تو کرنا ہے۔ کچھ تو کرو۔"

"لٹک کیا کروں؟ گردن تو چھوڑو۔"

"پہلے کی طرح اٹھالو۔ تمہاری گردن پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

اس نے دوبارہ اٹھالیا۔ وہ تاریکی میں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن سانسوں کے ٹکراؤ سے پتا چل رہا تھا کہ ایک دوسرے کے چہرے کو آنچ دے رہے ہیں۔ اس نے لٹی کو باتیں کرنے کے خیال سے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا تھا مگر اب خود جکڑ گیا تھا۔ ان دونوں کے لیے فرار کا راستہ نہیں تھا۔ دشمن جیسے سر پر سوار تھے۔ اس کے باوجود خاموشی اور سناٹے میں دو دلوں کی دھڑکنیں بج رہی تھیں۔

انہیں قریب کا یہ موقع اس لیے مل گیا کہ دشمن ابھی سوچ رہے تھے کہ اس گہری تاریکی میں انہیں کیا کرنا ہے۔ بے فلو نے ان سے کہا "خطرہ مول لینا پڑے گا۔ چھپ کر مشعل جلاؤ اور دور تک دیکھو۔ وہ نظر آجائیں تو گولی ماردو۔"

"ہم روشنی کریں گے تو وہ بھی ہمیں گولی مارسکتے ہیں۔"

"بحث نہ کرو۔ مشعل جلاؤ۔ کم آن!"

ایک نے مشعل جلائی۔ وہ لٹی کو بازوؤں میں اٹھائے کھڑا تھا۔ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی وہ اس کے بازوؤں سے اتر گئی۔ دونوں نے اپنی گنیں سنبھال لیں۔ دشمنوں نے روشنی میں دُور تک دیکھا۔ وہ نظر نہیں آئے۔ ڈینی نے کہا "آفریدی یہاں اندر ہی اندر کہیں جارہا ہے۔ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ ہاتھ سے نکلنے نہ دو۔ آگے بڑھو۔"

وہ سب آگے بڑھنے لگے۔ لٹی اور آفریدی نے چٹان کے پیچھے سے دیکھا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ ہاتھوں میں گنیں لیے ایک ایک قدم بڑھتے ہوئے چٹان کی طرف آرہے تھے۔ دونوں نے اچانک ہی چٹان کے پیچھے سے نکل کر تڑاتڑ فائرنگ کی۔ ان میں سے دو کو گولیاں لگیں۔ تیسرے کے پیر میں گولی لگی۔ وہ لنگڑاتا ہوا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بھاگنے لگا۔ لٹی نے پھر فائرنگ کی پھر ایک کو گولی لگی۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ گرتے ہی مشعل بجھ گئی۔ مشعل کے ساتھ وہ بھی بجھ گیا۔

ڈینی نے غصے سے کہا "گدھے کے بچو! تم ایک آدمی کو مار کر مائیکرو فلم نہیں لاسکتے؟"

"میں کیا کروں؟ انہوں نے اچانک فائرنگ کی تھی۔"

"تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ چٹان کے پیچھے چھپے ہوں گے؟"

"سر! آپ کو بھی یہی سمجھ کر ہمیں گائیڈ کرنا چاہیے تھا۔"

"یو شٹ اپ۔ اپنے زخمی ساتھی کی مرہم پٹی کرو۔"

"اندھیرے میں کیسے کروں؟ یہ زخمی میرے لیے مصیبت بن جائے گا۔ دشمن اس کے دماغ میں پہنچ گئے ہوں گے۔ ہمارے جو مسلح فوجی، بیلی کاپٹر میں تھے۔ آپ انہیں یہاں بھیجیں۔ میں تمہارہ گیا ہوں۔"

لٹی نے آفریدی سے کہا "وہ پانچ تھے۔ ہم نے ایک کو زخمی اور تین کو ہلاک کیا۔ ایک رہ گیا ہے۔"

وہ بولا "آگے ایک بڑا پتھر ہے۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے اس پتھر کے پیچھے جائیں گے۔ وہ اندھیرے میں قریب ہونے والی فائرنگ سے پریشان ہوگا۔ ہم سے دور ہونے کے لیے غار کے دہانے کی طرف جائے گا۔"

"ہوں۔ اس طرح ہم اسے رگیدتے ہوئے غار کے باہر لے جائیں گے۔"

محافظ نے کہا "آئیڈیا اچھا ہے۔ اس تنہا دشمن کو غار سے باہر لے جاکر ہلاک کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا لیکن فی الوقت اپنی جگہ سے حرکت نہ کرو۔"

"ہمیں غار سے نکلنے کے لیے اسے ہلاک کرنا چاہیے۔"

"اسے ہلاک کرکے غار سے نکلو گے۔ باہر وہ چار مسلح فوجی ہیں، جو بیلی کاپٹر سے تم دونوں پر فائرنگ کررہے تھے۔"

"ان سے... باہر نمٹنا بہتر ہوگا۔"

"ان حالات کی حکمت عملی کو سمجھو۔ وہ چاروں دشمن اپنے ساتھی کی مدد کرنے اس غار میں ضرور آئیں گے۔ وہ تم دونوں کو غار میں گھیرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش پوری ہونے دو۔"

آفریدی نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیسا مشورہ دے رہے

ہو؟ اس طرح ہم غار سے نکل نہیں سکیں گے۔"

"آفریدی! تم اسی طرح تجربات حاصل کرو گے۔ وہ سب تمہیں گھیرنے آئیں گے۔ غار میں داخل ہوں گے۔ ان کے پیچھے تمہارا ساتھی (علی) غار کے دہانے پر راستہ روکے گا۔ ادھر تم دونوں ہو۔ اس طرح دشمن تم تینوں کے درمیان پھنس جائے گا۔"

آفریدی نے قائل ہو کر کہا "ہاں۔ یہ ہے حکمت عملی، ہمارا ساتھی انہیں غار سے باہر نہیں جانے دے گا۔ وہ ادھر سے فائر کرے گا۔ ہم ادھر سے۔ آگے اور پیچھے کا راستہ بند رہے گا۔ دشمنوں کو فرار ہونے کے لیے تیسرا راستہ نہیں ملے گا۔"

محافظ نے کہا "میں جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھی کی پلاننگ پوری طرح سمجھنے کے بعد آؤں گا۔"

یہی باتیں دوسرا محافظ للی کے دماغ میں بیان کر رہا تھا پھر ان دونوں کے دماغوں میں خاموشی چھا گئی۔ للی نے کہا "ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے محافظ بہت سمجھ دار ہیں۔ ہمیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔"

وہ بولا "ہمیں ان کی واپسی تک دشمنوں سے محتاط رہنا چاہیے۔"

وہ اس کی کمر کے گرد بانہوں کا گھیرا ڈال کر بولی "میرے ہاتھ تمہاری گردن سے لپٹ نہیں سکتے۔ میں محتاط رہنے کے لیے تمہارے قریب کیسے رہوں؟ پلیز بیٹھ جاؤ' میرے برابر ہو جاؤ۔"

"میں مرد ہوں۔ ایک لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا۔"

وہ اس کے شانوں کو ٹٹول کر دونوں ہاتھ وہاں تک لے گئی پھر اچھل کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی "یہ لو' میں تمہارے برابر ہو گئی۔"

وہ بھاری بھرکم لباس میں تھی۔ بوجھ کے باعث گر سکتی تھی۔ آفریدی نے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ تھامنے کے لیے جکڑ لیا۔ اس نے کہا "تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ ابھی میں ایسا نہ کروں تو گر پڑو گی۔"

"تم بہت اچھے ہو' مجھے گرنے نہیں دیتے ہو۔ مجھے دشمنوں سے بچا رہے ہو۔ میرے لیے خطرات سے کھیل رہے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے اتنا دلیر اور اتنا چاہنے والا ملے گا۔"

"تم نے طیارے میں اچھے کردار کا ثبوت پیش کیا تھا پھر تمہیں بابا صاحب کے ادارے کی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے میں تمہارے کام آ رہا ہوں۔"

"کام آنا اور بات ہے مگر شے دل سے چاہا جائے' اس کے لیے خطرات سے کھیلا جاتا ہے۔ میں درست کہہ رہی ہوں نا؟"

"وہ ساتھی جو باہر تنہا گیا ہے' میں اسے بھی دل سے چاہتا ہوں اور وہ ساتھی بھی ہمیں دل سے چاہتا ہے۔ ہماری سلامتی کی خاطر تنہا باہر گیا ہے۔"

"ابھی صرف میری اور اپنی بات کرو۔ کیا میں تمہارے لیے اسپیشل نہیں ہوں؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "اسپیشل۔۔۔؟"

"ابھی تو میں موٹے موٹے کپڑوں میں چھپی ہوئی ہوں مگر وہاں جہاز میں تم نے مجھے دیکھا تھا۔ سچ بتاؤ' میں اچھی ہوں نا؟ مجھ میں کشش ہے نا؟ ویسے یہ مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے۔ مجھ میں کشش ہے اسی لیے مجھے پکڑ رکھا ہے۔"

اب وہ سمجھ رہا تھا کہ طیارے میں جب وہ شرم و حیا کی خاطر اپنے دوستوں سے دشمنی مول لے رہی تھی تب ہی سے اس نے لاشعوری طور پر متاثر کیا تھا۔ وہ بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اندر ہی اندر سرنگ بناتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ گئی تھی۔

اس نے پوچھا "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ کیا میں تمہارے لیے اسپیشل نہیں ہوں؟"

دونوں کی سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔ آفریدی بڑی خاموشی سے اس کی سانسوں میں اترنے لگا۔

وہاں تاریکی تھی' بہت ہی گہری تاریکی۔ ایسی تاریکی جو ڈسنے کے لیے عذاب تھی مگر دوستی کے لیے لاجواب تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ دوستی کے خاموش معاہدے کرتے وقت دیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ دیکھنے کا مسئلہ دشمنوں کا تھا۔ وہ تاریکی کو روشن کیے بغیر آگے پیچھے دیکھے بغیر دشمنی جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

جو دشمن غار میں تنہا رہ گیا تھا۔ وہ اپنے زخمی ساتھی کی مرہم پٹی کرنے کے لیے زخم دیکھنا چاہتا تھا۔ تاریکی میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ڈبی نے اس کے خیالات پڑھ کر کہا "گولی اس کے اندر رہ گئی ہے۔ وہ گولی آپریشن کے ذریعے ہی نکالی جا سکتی ہے۔ اور یہاں آپریشن ممکن نہیں ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ موت اس کا مقدر بن چکی ہے۔"

وہ زخمی تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ کراہ رہا تھا۔ جے فلو نے اس کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے تاریکی میں واپس وہیں جانے پر مجبور کیا' جہاں سے وہ گولی کھا کر آیا تھا۔ وہ بے چارہ آخری لمحات میں چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا چٹان کی طرف جانے لگا۔ اس چٹان کے پیچھے للی اور آفریدی بڑے پیار سے خطرات بھرے لمحات گزار رہے تھے۔



زخمی دشمن کی کراہتی ہوئی آوازیں قریب آنے لگیں تو انہوں نے محتاط ہو کر اپنی اپنی گنیں سنبھال لیں۔ اور فائر کرنے کے لیے آواز کی صحیح سمت کا اندازہ کرنے لگے۔

محافظوں نے دونوں کے دماغوں میں آگر کہا "گولی نہ چلانا۔ وہ مرنے والا ہے۔ دشمنوں نے اسے چارہ بنا کر بھیجا ہے۔ تمہاری طرف سے گولی چلے گی تو وہ سمجھ لیں گے کہ تم دونوں ابھی تک چٹان کے پیچھے ہو اور فرار کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے ان سے دور نہیں گئے ہو۔"

آفریدی نے کہا "میں سمجھ گیا۔ دشمنوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ میں مائیکرو فلم لے کر اس غار میں بہت دور جا چکا ہوں۔ اگر میرا تعاقب نہ کیا گیا تو مجھے غار سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ مل جائے گا۔"

للی نے کہا "بے شک! انہیں یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ابھی تک یہاں ہیں۔ میں اس زخمی کی آواز بہت قریب سن رہی ہوں۔"

محافظ نے کہا "اسے مرنا تو ہے ہی' لہٰذا میں خیال خوانی کے ذریعے اسے ختم کر رہا ہوں۔"

آفریدی نے کہا "بسٹ اے منٹ۔ جب خدا نے اتنی تکلیف کے باوجود اسے زندہ رکھا ہے تو پھر اسے اپنی آخری سانس تک جینے دو۔"

للی نے پوچھا "اسے گولی کہاں لگی ہے؟"

محافظ نے کہا "وہ بھاگ رہا تھا۔ ایسے وقت اس کی کمر میں پیچھے گولی پیوست ہو گئی ہے۔"

للی نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیے۔ وہ اس کے قدموں کے پاس آ گیا تھا۔ للی نے اسے ٹٹول کر چھو لیا۔ پھر تاریکی میں رینگتی ہوئی اس کی کمر کے پاس آئی۔ اس کے زخم کو ہاتھ لگایا تو وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ محافظ نے پوچھا "کیا کر رہی ہو؟ دور کھڑے ہوئے دشمن کو تمہاری پوزیشن کا علم ہو جائے گا۔"

وہ بولی "تم اس کے دماغ میں رہو۔ اسے اسی طرح چیخنے دو' جیسے یہاں تنہا پڑا اپنا آخری وقت گزار رہا ہو۔"

"مگر۔۔۔ یہ تم نے چاقو کیوں نکال لیا ہے؟ یہ۔۔۔ تمہاری سوچ کہہ رہی ہے کہ تم اس کی کمر میں پیوست ہونے والی گولی نکالنا چاہتی ہو۔ یہ حماقت ہے للی!"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو' یہ گولی نکلنے والی تکلیف برداشت نہیں کر سکے گا۔ مر جائے گا اور بچ جائے گا تو جتنا خون بہہ رہا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا خون نہیں ملے گا۔ یہ ہر حال میں مرے گا۔"

"جب سمجھ رہی ہو تو گولی کیوں نکال رہی ہو؟"

"ابھی تم اسے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں بھی ہلاک کر رہی ہوں مگر بچانے کی کوشش کرتے ہوئے۔ پلیز اس کے دماغ میں جاؤ۔ خیال خوانی کے ذریعے اس میں توانائی اور حوصلہ پیدا کرو۔"

محافظ اس زخمی کے دماغ میں چلا گیا۔ تاریکی میں پیوست ہونے والی گولی نکالنا سراسر مضحکہ خیزیات تھی۔ لیکن علی نے محافظ سے کہا "وہ جو چاہتی ہے' اسے کرنے دو۔ اس سے تعاون کرو۔"

وہ اپنی من مانی کرنے لگی۔ گویا حماقت کرنے لگی۔ اس کے خیال کے مطابق دشمن کو اذیتیں دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ وہ اس نیک مقصد سے اذیتیں دے رہی تھی کہ مرتا تو اسے ہے لیکن مقدر میں زندگی ہو گی تو بچ لے گا۔

گولی گہرائی میں نہیں تھی۔ زخم کے منہ کے پاس ہی تھی۔ اس نے ایک اندھے ڈاکٹر کی طرح چاقو کی نوک سے اسے نکالا تو وہ شدید تکلیف کے باعث چیخ پڑا۔ اس کے بعد ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ للی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر معلوم کیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر بے ہوش ہو گیا تھا۔

آفریدی فرسٹ ایڈ باکس نکال چکا تھا۔ للی امریکا میں میڈیکل کی طالبہ تھی۔ اندھیرے میں دواؤں کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ سونگھ کر مرہم اور دواؤں کو سمجھتی رہی۔ زخم سے خون کا بہاؤ روکنے اور مرہم پٹی کرنے کے طریقوں پر عمل کرتی رہی۔

ڈبی' جے فلو اور جے سامو اس زخمی کے دماغ میں تھے۔ وہ بھی تاریکی میں ہونے والے للی کے احمقانہ آپریشن پر حیران تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ للی اور آفریدی اسی چٹان کے پیچھے ہیں لیکن ان پر قاتلانہ حملہ کرانے کے لیے اس غار میں ایک ہی فوجی تھا۔ باقی چار مسلح جوان بیلی کاپٹر چھوڑ کر اس کی مدد کے لیے آنے والے تھے۔ ان کے پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ اس لیے وہ زخمی کے دماغ میں رہ کر للی کے ظالمانہ آپریشن کو سمجھ رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر اس کے دماغ میں نہ رہ سکے۔ گولی کے نکلنے سے وہ بے ہوش ہو گیا تو وہ اس کے اندر سے نکل گئے۔ اس بے ہوشی کے بعد معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ اب وہ دونوں اس چٹان کے پیچھے کیا کر رہے ہیں؟

فی الوقت دشمنی کا وقفہ تھا۔ دشمن کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ للی اور آفریدی کو وہاں خاموشی سے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ للی نے کہا "زخمی کو انجکشن لگانا ضروری ہے۔ فرسٹ ایڈ باکس میں انجکشن کی چار شیشیاں

ہیں۔ اندھیرے میں کس طرح معلوم کروں کہ زخم کے لیے اینٹی سیپٹک انجکشن کی شیشی کون سی ہے؟"

آفریدی نے پوچھا "انجکشن کیوں ضروری ہے؟"

"میں چاقو کے پھل کو گرم نہ کر سکی۔ یہاں آگ جلائی نہیں جا سکتی تھی۔ چاقو کے لوہے سے زخم میں زہر پھیل سکتا ہے۔"

"پھینکو دو۔ میں تمہیں منی مشعل جلانے اور انجکشن کا انتخاب کرنے نہیں دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔ ادھر روشنی ہوتے ہی دشمن فائر کرے گا۔"

وہ انجکشن کی ایک شیشی اٹھا کر اسے سرنج میں بھرتی ہوئی بولی "میں اندازے سے یہ انجکشن لگا رہی ہوں۔ یہ مطلوبہ انجکشن بھی ہو سکتا ہے۔"

میں آرمی ہیڈ کوارٹر میں چینی فوج کے اعلیٰ افسران کے ساتھ بیٹھا ہوا۔ انہیں لِلی، آفریدی اور علی کے حالات بتا رہا تھا۔ ایک اعلیٰ افسر نے حیرانی سے پوچھا "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ تینوں خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہاں سے زندہ واپس آنا بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور ان حالات میں بھی وہ آپریشن کر کے اپنے ایک دشمن کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے لِلی کو آپریشن کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن علی تیمور نے بارود کے ڈھیر میں اجازت دی ہے۔ علی فرشتہ نہیں ہے لیکن اس کے لہو میں مسیحائی ہے۔"

○☆○

پارس اور پورس کو پھر ایک بار تنہا رہنے کی آزادی مل گئی تھی۔ تقدیر مہربان ہو گئی تھی۔ ثانی اور ثباتہ، بابا صاحب کے ادارے میں چلی گئی تھیں۔ پارس اسرائیل گیا تھا۔ اس کا ذکر بعد میں ہوگا۔ ابھی پورس ممبئی ائرپورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر سے گزر رہا تھا۔

بنکاک سے ممبئی کا سفر اس کے نقطہ نظر سے بہت ہی بور تھا۔ دل پر دستک دینے والا ایک بھی حسین چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ یوں کہنے کو تو کتنی ہی جوان اور اسمارٹ لڑکیاں آس پاس رہیں۔ وہ خوب صورت بھی تھیں لیکن ان میں وہ کشش نہیں تھی، جو پہلی ہی نظر میں دل کھینچ لیتی ہے۔

ویزیٹرز ہال میں پہنچتے ہی وہ صورت نظر آ گئی۔ صورت کیا تھی، اجنتا کی مورت تھی۔ ایسی من موہنی اور..... سوہنی تھی کہ اسے دیکھتے ہی پورس کے قدم رک گئے۔ اس نے ساڑی اتنے سلیقے سے پہنی تھی کہ بدن کا حسن شاعرانہ انداز میں نمایاں ہو گیا تھا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا جبکہ وہ کسی میک اپ کی محتاج نہیں تھی۔

اس کے ساتھ ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ جس طرح گلاب کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں۔ وہ بھی کانٹا لگ رہی تھی۔

پورس نے قریبی کاؤنٹر سے ایک ٹھنڈی بوتل لی۔ اسے پیتے ہوئے اسٹال کے مالک کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس مالک نے اس کی مرضی کے مطابق اپنے ملازم سے کہا "چندو! بک اسٹال کے سامنے نیلے اور پیلے رنگ کی ساڑیاں پہنے ہوئے دو میلائیں کھڑی ہیں۔ انہیں دو لیمن جوس دے آ۔"

چندو نے کہا "ابھی جا کر دیتا ہوں۔"

وہ دو ٹھنڈی بوتلیں لے کر جانے لگا۔ پورس اپنی بوتل کے پیسے ادا کر کے وہاں سے دور چلا گیا۔ ایک جگہ بیٹھ کر چندو کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ عورت پوچھ رہی تھی "یہ کیوں لائے ہو؟ ہم نے بوتلوں کا آرڈر نہیں دیا ہے۔"

"میرے مالک نے حکم دیا۔ میں لے آیا۔"

اس من موہنی نے ناگواری سے دور دکان کے مالک کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی "اس بڈھے سے بول، منہ میں جتنے دانت رہ گئے ہیں۔ انہیں بھی توڑ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ چل پھوٹ یہاں سے۔"

چندو واپس جانے لگا۔ پورس اس حسینہ کے دماغ میں پہنچا تو وہ کچھ بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اس کا نام کرشمہ کماری تھا۔ وہ اپنی ساتھی عورت سے مخاطب..... ہو کے کہہ رہی تھی "پدمنی! مجھے غصہ آ رہا ہے۔"

پدمنی نے پریشان ہو کر کہا "بھگوان کے لیے برداشت کرو۔ میں اس دکان دار کو گالیاں دے کر آتی ہوں۔"

"مجھے دکان دار پر غصہ نہیں آ رہا ہے۔ میرے دماغ میں کوئی پہنچا ہوا ہے۔ اے! کون ہو تم؟"

"کرشمہ! تم غصے میں عقل سے کام نہیں لیتی ہو۔ سانس روک لو۔ وہ چلا جائے گا۔"

"مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ کون کتا مجھے پریشان کر رہا ہے۔ صبح سے تیسری بار اسے محسوس کر رہی ہوں۔"

پورس کو بڑا غصہ آیا۔ وہ دماغ میں آنے والے کو کتا کہہ رہی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر پدمنی کے دماغ میں آیا۔ وہ کہہ رہی تھی "وہ صبح پہلی بار تمہارے اندر آ کر بول رہا تھا۔ دوسری بار آ کر خاموش رہا۔ اب بھی خاموش ہے۔ اسے دماغ سے تھوک دو۔ وہ باہر نکل جائے گا۔"

کرشمہ نے کہا "اے! میں تمہیں آخری بار کہتی ہوں۔ دماغ میں چھپ کر مت آؤ۔ مرد کی طرح سامنے آؤ۔"

پورس حیران ہوا کیونکہ وہ اس کے دماغ میں نہیں تھا۔

یہ سمجھ میں آگیا کہ کوئی نامعلوم ٹیلی پیتھی جاننے والا ہے' جو کرشمہ کو صبح سے پریشان کررہا ہے۔ وہ پھر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہاں کوئی کہہ رہا تھا "کرشمہ! میں تم سے کہہ چکا ہوں' لندن کے ایک میگزین میں تمہاری تصویر دیکھ کر دیوانہ ہوگیا ہوں۔"

"اپنا نام اور پتا ٹھکانا بتاؤ۔"

"میں تمہارے انڈیا میں پہلی بار آرہا ہوں پھر نام اور پتا بتاؤں گا۔ میرے آتے ہی تم اپنے دماغ میں بے چینی محسوس کرنے لگتی ہو۔ آج رات یہ بے چینی دور کردوں گا۔"

"کیسے دور کرو گے؟"

"جب تم نیند میں ہوگی تو میں تم پر تنویمی عمل کروں گا۔ اس کے بعد تم مجھ سے محبت کرنے لگو گی۔"

"خبردار! مجھ پر کوئی عمل نہ کرنا۔ میں بہت بری ہوں۔ بہت خطرناک فائٹر ہوں۔ منہ باتھ توڑ کر رکھ دوں گی۔"

"ابھی میں نے پوری طرح تمہارے چور خیالات نہیں پڑھے ہیں پھر بھی اتنا معلوم ہوچکا ہے کہ تمہاری ذہانت میں چالاکی اور مکاری ہے اور واقعی تم ایک خطرناک فائٹر ہو۔"

"یہ جان کر بھی میرے قریب آؤ گے تو عمر بھر پچھتاؤ گے؟"

"تم ایک بیش قیمت نگینہ ہو۔ مجھ جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے کے کام آتی رہو گی۔ میں ابھی جارہا ہوں۔ رات کو تمہارے سونے کے وقت آؤں گا۔"

دوسرے ہی لمحے میں کرشمہ کماری نے کہا "پدمنی! وہ چلا گیا ہے لیکن کہہ رہا تھا' رات کو آئے گا اور مجھ پر تنویمی عمل کرے گا۔ تنویمی عمل کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"ہاں! وہ تمہیں اپنی معمولا' اپنی کنیز بنالے گا۔"

"ہے بھگوان! میں کیا کروں؟ کیا میرے بھیا اپنے منتروں سے مجھے بچالیں گے۔"

"تمہارے بھیا بڑے تجربے ہیں۔ تم انہیں فون کرو۔ اپنے حالات بتاؤ۔ وہ ٹیلی پیتھی کے بھوت کو تمہارے دماغ میں نہیں آنے دیں گے۔"

وہ دونوں ٹیلی فون بوتھ کی طرف جانے لگیں۔ پورس' پدمنی کے خیالات پڑھنے لگا۔ معلوم چلا کہ کرشمہ کی ماں کا نام مائی جمنا ہے۔ پورس جس فلائٹ سے آیا ہے۔ اسی فلائٹ سے مائی جمنا آئی ہے لیکن ابھی تک امیگریشن اور کسٹم چیکنگ سے گزر کر ویٹنگ ہال میں نہیں آسکی ہے۔ بھارت کے بیشتر صوبوں میں کالا جادو جاننے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ نارنگ اور بھیما جیسے جادو جاننے والوں کا تعلق صوبہ سارا شٹر سے تھا۔ مائی جمنا صوبہ بنگال میں پیدا ہوئی تھی۔

کودھ کی دیوی' کالی مائی کی پجارن تھی۔ کتنے ہی معصوم بچوں اور کنواری لڑکیوں کو اس نے کالی مائی کے چرنوں میں قربان کیا تھا۔ ان کی گردنیں کاٹ کر بلی چڑھائی تھی۔ تیس برس تک مختلف منتروں کا جاپ کرکے طرح طرح کے جادوئی ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کرتی رہی۔ اب وہ اتنی خطرناک جادوگرنی بن چکی تھی کہ بڑے بڑے جادوگر اسے چڑیل کہا کرتے تھے۔

مائی جمنا اپنی جوانی میں حسین رہی ہوگی۔ تب ہی کرشمہ کماری جیسی حسین بیٹی پیدا کی تھی۔ لیکن اب تیس برسوں تک کالے جادو کے عمل نے مائی جمنا کو بدصورت بنادیا تھا اور وہ صورت سے ہی چڑیل لگنے لگی تھی۔

اس نے اپنے بیٹے جسونت پال کو جادوئی ہتھکنڈے سکھائے تھے لیکن وہ اپنی ماں کی طرح ویچ ڈاکٹر نہیں بن پایا تھا۔ اس کی بیٹی کرشمہ کماری کالے جادو کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ وہ ذہین اور نہایت مکار تھی۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ جوڈو کراٹے' را نفل شوٹنگ' سومنگ اور پارس رائڈنگ سیکھی تھی۔ ایک ائرلائن میں پائلٹ بننے کی بھی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ یعنی وہ اپنی ماں اور بھائی سے مختلف تھی۔

وہ فون پر کہہ رہی تھی "ہیلو بھیا! آپ کیا کررہے ہیں۔ ماں کو لینے ائرپورٹ کیوں نہیں آئے؟"

"میں ایک معاملے میں مصروف ہوں۔ ماں میرے ہی معاملے سے نمٹنے کے لیے برما سے یہاں آئی ہیں۔ ابھی اس نے فون پر بتایا ہے کہ کسٹم والوں نے اس کا سامان روک لیا ہے۔ وہ تمہارے فون پر تم سے بات کرنے کی کوششیں کرتی رہیں لیکن تمہارا فون بند ہے۔"

"پلیز ماں کو بتائیں' میں اپنا موبائل فون گھر پر بھول آئی ہوں لیکن ماں کے گلے لگنے یہاں پہنچی ہوئی ہوں۔"

"میں ابھی بتادوں گا اور کوئی بات؟"

"ہاں بھیا! کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا صبح سے اب تک تین بار میرے دماغ میں آچکا ہے۔"

"اوہ گاڈ! یہ ٹیلی پیتھی کی مصیبت تمہارے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

"وہ کہہ رہا تھا' لندن کے ایک میگزین میں میری تصویر دیکھی تھی اور کل یہاں پہنچ رہا ہے۔"

"میں پہلے ہی ایک مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔ یہ نیا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔"

"وہ کہہ رہا تھا۔ جب میں رات کو سوجاؤں گی تو مجھ پر تنویمی عمل کرے گا۔ بھیا! میں بہت پریشان ہوں۔ وہ مجھے اپنی



لونڈی بنالے گا۔"

"حوصلہ کرو۔ ماں ہماری حفاظت کے لیے پہنچ گئی ہے۔ میں ابھی ماں سے بات کرتا ہوں۔"

پورس نے پدمنی کے دماغ سے نکل کر خیال خوانی کی پرواز کی پھر جسونت پال کے دماغ میں پہنچنا چاہا۔ اس نے سانس روک لی۔ پورس پھر پدمنی کے اندر پہنچ گیا۔ فی الحال وہی ذریعہ تھی کیونکہ کرشمہ کے دماغ میں جانے سے وہ بے چینی محسوس کرکے سانس روک لیتی تھی اور اس کا بھائی جسونت پال یوگا کا ماہر تھا۔

یہ وہی ٹھاکر جسونت پال تھا' جس نے کلپنا کو اغوا کیا تھا۔ گویا کلپنا کے اندر رہنے والے بھیما کو اغوا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کلپنا مرچکی تھی۔ وہ اپنے کالے عمل سے کلپنا کو ایک گھنٹا بعد زندہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے عمل کرنے سے پہلے ہی وہ زندہ ہوگئی تھی۔ اس طرح وہ سمجھ رہا تھا کہ کلپنا کے اندر کوئی دوسری آتما سمائی ہے۔

لیکن یہ معلوم نہیں کرسکتا تھا کہ جس کلپنا کی عزت سے کھیلنے کے لیے اغوا کیا ہے' اس کے اندر کیسی آتما سمائی ہوئی ہے؟ کسی عورت کی آتما ہے یا مرد کی؟ اس حد تک سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ آتما پراسرار شکتی رکھتی ہے۔ اسی لیے کلپنا کے اندر پہنچی ہوئی ہے۔

وہ کلپنا کو اغوا کرکے گوا لے آیا تھا۔ بھیما پریشان تھا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ کلپنا کا جسم چھوڑ کر کسی دوسرے جسم میں چلا جائے۔ ایسا کرنے سے اس کی آتما شکتی کسی حد تک کمزور ہوجاتی اور وہ کمزوری نہیں چاہتا تھا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے جسونت پال کے دماغ کو کمزور بنائے۔ اس نے یہ سوچ کر اس کے دماغ میں پہنچنا چاہا تو اس نے سانس روک لی۔ وہ ایک ذرا وقفے سے دوسری بار دماغ میں پہنچا۔ جسونت پال نے پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ کلپنا کے جسم میں سامنے کے بعد بے اختیار نسوانی آواز میں بولنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار مردانہ آواز میں بولنے کی کوششیں کیں۔ کوشش کرنے پر وہ ایک دو فقرے مردانہ آواز میں بولتا تھا پھر قدرتی طور پر اس کی آواز زنانہ ہوجاتی تھی۔

اس نے کہا "میں کلپنا ہوں۔ دروازہ کھولو۔ مجھے کمرے میں قید نہ کرو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"چلو یہ تو معلوم ہوا' تمہارے اندر ٹیلی پیتھی جاننے والی آتما سمائی ہوئی ہے۔ میں اس آتما سے کہتا ہوں' مجھ سے دوستی کرو۔ میں کالا جادو جانتا ہوں اور تم ٹیلی پیتھی جانتی ہو۔ ہماری دوستی ہمیں بہت فائدے پہنچائے گی۔"

"میں صرف ٹیلی پیتھی ہی نہیں' تم سے زیادہ کالا جادو جانتی ہوں۔ میرا مطلب ہے جانتا ہوں۔"

"جب عورت ہو تو مرد کی طرح بول کر مجھے دھوکا نہ دو۔"

"میں دھوکا نہیں دے رہی ہوں۔ میں سچ مچ مرد ہوں۔"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کلپنا کا خوب صورت جسم چاہتا ہوں جب میں اسے حاصل کرتا رہوں گا تو تم اپنی بے آبروئی کا ماتم کرتے رہنا۔"

"میں تمہیں اپنا بدن حاصل نہیں کرنے دوں گی۔۔۔ دوں گا۔"

"تم مجھے روک نہیں سکو گی۔ یہ دیکھ چکی ہو کہ میں کس طرح کلپنا کو اغوا کرکے یہاں لے آیا ہوں۔ اسی طرح اسے دوبارہ بے ہوش کرکے یا کالے عمل سے اسے دماغی طور پر کمزور بنا کر اس کی تنہائی میں آؤں گا تو تم بالکل بے بس ہوجاؤ گی۔"

"اور جب میں تمہارے کالے عمل کا توڑ کروں گی۔ تب تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کتنی مہاشکتی مان ہوں۔"

"اور تم یہ نہیں جانتیں کہ میری ماں بنگال کی ایسی خطرناک جادوگرنی ہے' جس کے آگے بڑے بڑے جادوگر ہاتھ جوڑتے اور سرجھکاتے ہیں۔"

جسونت پال نے یہ چیلنج کیا اور اسے کمرے میں قید کرکے چلا گیا۔ بھیما سوچتا رہ گیا کہ اگر اس کی ماں مقابلے میں زبردست ثابت ہوگی اور وہ کالے عمل کے دوران کم تر ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟

ہوگا کیا؟ اپنی آبرو لٹنے کا تماشا دیکھے گا اور کچھ کر نہیں پائے گا۔

اس رات جسونت پال سمندر کے ایک ویران ساحل پر جاکر کالے جادو کا عمل کرنے لگا۔ اس عمل کے ذریعے وہ کلپنا کے دل اور دماغ کو تسخیر کرنا چاہتا تھا۔ جب اس کے عمل کا اثر کلپنا کے دماغ پر ہونے لگا تو بھیما نے سمجھ لیا کہ جسونت پال اسے اپنا معمول بنانے کا عمل کررہا ہے۔

کلپنا ایک کمرے میں قید تھی۔ وہ اسی کمرے کے فرش پر بیٹھ کر منتر پڑھنے لگا۔ جسونت پال کے عمل کا توڑ کرنے لگا۔ ایسے میں دونوں کے منتر ٹکرانے لگے۔ وہ کلپنا کے نام سے کپڑے کی ایک گڑیا بنا کر سمندر کے کنارے لے گیا تھا۔ جب اس کا جادو مکمل ہوجاتا تو وہ آخر میں ایک سوئی کپڑے

کی گڑیا کے سر میں پیوست کرتا، جس کے نتیجے میں کلپنا کا دماغ بے حس ہو جاتا۔ وہ اپنا اچھا برا کچھ سوچ نہ پاتی۔ بھیما اپنی آتما شکتی سے اور خیال خوانی سے اس کے دماغ کو اپنے قابو میں نہ رکھ پاتا اور جسونت پال اپنی من مانی کرتا رہتا۔

لیکن بھیما کے آگے جسونت پال کا جادو کمزور پڑ گیا۔ اس نے کپڑے کی گڑیا کے سر میں ایک سوئی چبھوئی لیکن بھیما کے منتر کلپنا کے دماغ پر حاوی ہو چکے تھے۔ وہ سمندر کے ساحل سے اپنی کوٹھی میں واپس آیا پھر بند دروازے کے پاس پہنچ کر بولا "میں یہ تو مان گیا کہ تمہاری جادوئی شکتی مجھ سے زیادہ ہے لیکن تم کبھی مان جاؤ گی کہ میری ماں تم سے زیادہ زبردست ہے۔ وہ صرف میری نہیں، شیطان کی بھی ماں ہے۔ میں نے اسے بلایا ہے۔ وہ کل دوپہر کی فلائٹ سے آنے والی ہے۔"

اور وہ آگئی تھی۔ کرشمہ اور پدمنی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پورس نے پدمنی کے خیالات سے اس کا حلیہ معلوم کیا۔ معلوم ہوا، وہ بہت ہی بدصورت ہے۔ پہلے کبھی خوب صورت رہی ہوگی لیکن جوانی سے بڑھاپے تک کالا جادو کرتے کرتے کالی چڑیل بن گئی ہے۔

دو برس پہلے وہ اپنے بیٹے اور بیٹی سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ ایک زبردست جادوئی شکتی حاصل کرنے کے لیے برما کے جنگلات میں جا رہی ہے۔ جب تک وہ شکتی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی، واپس نہیں آئے گی۔ وہ فون کے ذریعے اپنے بیٹے اور بیٹی سے رابطہ رکھتی تھی۔ پچھلی رات جسونت پال نے فون پر بات کی اور اسے اپنی مدد کے لیے بلایا تو اس نے کہا "تم فون نہ کرتے، تب بھی میں ضرور آتی، میں وہ زبردست شکتی حاصل کر چکی ہوں۔"

اس نے کہا "ماں! تم اپنے بچوں کے لیے بھی پراسرار بنتی جا رہی ہو۔ ہمیں اب تک نہیں بتایا ہے کہ تم نے کون سی زبردست شکتی حاصل کی ہے؟"

"ذرا صبر کرو۔ میں آ رہی ہوں۔ جب سامنے آؤں گی تو میری شکتی دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔"

کرشمہ اور پدمنی پورس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے اب تک پورس کو نہیں دیکھا تھا۔ ایسے وقت کسٹم افسر کے دفتر سے ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ ٹرالی میں سامان رکھے باہر آئی۔ پورس سفر کے دوران میں اسے طیارے میں دیکھ چکا تھا اگرچہ اس کا حسن قابلِ دید تھا لیکن پورس نے اس میں کشش محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا، وقت گزارنے کے لیے سفر کے دوران میں دوستی رکھی جائے۔ اس طرح شاید اس سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی لیکن وقتی طور پر دوستی کرنے کے لیے بھی اس پر دل مائل نہیں ہوا۔

وہ حسینہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی کرشمہ اور پدمنی کے سامنے آئی پھر بولی "کرشمہ! میری جان! تم ماں کا انتظار کر رہی ہو۔ کیا اپنی ماں کو پہچانتی ہو؟"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کرشمہ نے پوچھا "تم کون ہو؟ یہ کیسے جانتی ہو کہ میں اپنی ماں کا انتظار کر رہی ہوں؟"

حسینہ نے کہا "میری جان! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔"

اس نے خود ہی کرشمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا پھر اس کے ہونٹ یوں ہلنے لگے جیسے زیرِ لب منتر پڑھ رہی ہو۔ کرشمہ نے سحر زدہ ہو کر کہا "تم میری ماں کی آواز اور لہجے میں بول رہی ہو۔ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں دے کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنی ماں کی آغوش میں آ گئی ہوں۔"

پھر وہ حسینہ کے گلے لگ کر بولی "ماں! تم میری ماں ہو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم پلاسٹک سرجری کے ذریعے حسین اور جوان بن کر آئی ہو۔"

وہ بولی "پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرہ بدلتا ہے۔ جسم نہیں بدلتا۔ دو برس پہلے میں یہاں سے گئی تو دبلی پتلی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا لگتی تھی۔ کیا دنیا کا کوئی ڈاکٹر مجھے صحت مند اور جوان بنا سکتا ہے؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا "پھر یہ کیا ہے؟ تم ایک دم کیسے بدل گئی ہو؟ تمہاری جوانی کی تصویریں گھر میں ہیں۔ اس لیے میں نے پہچان لیا ہے۔ کوئی دوسرا کبھی یقین نہیں کرے گا کہ تم ہاون برس کی ہو اور ہماری ماں ہو۔"

"یہ بات زبان پر نہ لاؤ کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم اور جسونت آج سے مجھے مسٹر کہا کرو گے۔"

"مگر یہ کیسے ہو گیا؟"

"میں نے کہا تھا، ایک زبردست شکتی حاصل کرنے جا رہی ہوں اور وہ میں حاصل کر چکی ہوں۔ میں جب بھی بوڑھی ہونے لگوں گی تو خود کو جوان بنا لیا کروں گی۔"

"ماں! اب تو تم شادی کرو گی؟ ہمارے لیے دو سرا باپ لاؤ گی؟"

"میں نے ابھی سمجھایا ہے، مجھے ماں نہیں، بہن کہو۔ بہن کے رشتے سے تمہارے لیے ایک بیجاجی (بہنوئی) پسند کر چکی ہوں۔"

"کیا چ؟ وہ کہاں ہے؟ کیا برما میں ہے؟"

"یہاں ہے۔ میں نے اسے طیارے میں دیکھا پھر دیکھتے ہی اس پر دل آ گیا۔"



"اس فلائٹ کے تمام مسافر جا چکے ہیں۔ تم نے اس سے دوستی نہیں کی؟"

"میں اپنی شکتی سے اسے اپنی طرف مائل کرتی رہی۔ اس نے مجھے کئی بار دیکھا۔ نہ معلوم کیوں میری طرف نہیں آیا۔ یوں بھی اس کی سیٹ مجھ سے دور تھی لیکن میں نے ایک ایسا منتر پڑھا ہے، جس کا اثر اس پر ہو چکا ہے۔ وہ مجھ سے دور جانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ تمام مسافر جا چکے ہیں مگر میرے کالے جادو نے اسے یہاں بٹھا رکھا ہے۔"

کرشمہ نے خوش ہو کر پوچھا "کہاں ہے وہ؟"

اس نے پورس کی طرف اشارہ کیا۔ کرشمہ اور پدمنی اسے دیکھنے لگیں۔ پورس، پدمنی کے دماغ میں رہ کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ مائی جمنا، پورس پر عاشق ہو گئی ہے اور معشوق بننے کے لیے اپنے کالے جادو کے ذریعے اسے وہاں بٹھا رکھا ہے۔

پورس نے حیرانی سے سوچا "کیا میں اس کے کالے جادو کے اثر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو کرشمہ کی کشش نے یہاں روک رکھا ہے پھر کرشمہ اور اس کے خاندانی حالات اتنے دلچسپ ہیں کہ میں مسلسل معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا ہوں۔"

پارس، پورس، علی، فہمی، ثانی اور ثبانہ کے دماغوں پر روحانی عمل کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں دشمن نیلی چیختی جاننے والے ان کے دماغوں میں پہنچ کر جو خیالات نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کے دماغ کسی کالے عمل سے بھی متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔ پورس وہاں واقعی کرشمہ کی خاطر بیٹھ گیا تھا اور مائی جمنا خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ پورس اس کے زیرِ اثر آ گیا ہے۔

وہ تینوں اس کی طرف آنے لگیں۔ پورس نے یوں ظاہر کیا، جیسے وہاں سے جانے والا ہو۔ کرشمہ نے آواز دی "مسٹر! جسٹ اے منٹ۔"

وہ رک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے قریب آ گئیں۔ کرشمہ نے کہا "تم یہاں بہت دیر سے بیٹھے ہو۔ کیا کسی کا انتظار ہے؟"

وہ کچھ پریشان سا ہو کر بولا "کچھ سمجھ نہیں آ رہا میری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں ممبئی کیوں آیا ہوں۔ اگر میرا مکان یہاں ہے تو وہ کہاں ہے؟"

مائی جمنا خوش ہو گئی۔ اس کے جادو نے اثر دکھایا تھا۔ وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر بولی "میرا نام جمنا کماری ہے۔"

"میرا نام شہباز ہے۔" اس نے مصافحہ کیا پھر کہا "یہ... یہ تمہارا ہاتھ... بہت..."

جمنا مسکرا کر بولی "بہت خوب صورت ہے۔ مجھ سے ہاتھ ملانے والے کبھی لوگ یہی کہتے ہیں۔"

وہ فوراً ہی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا "خوب صورت تو ہے مگر بہت وہ ہے۔"

"کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں، بہت عجیب سا ہے۔ دیکھنے میں بھرپور صحت مند جوان ہاتھ ہے مگر ہاتھ ملاتے ہی یوں لگا، جیسے پلپلا ہے۔ گوشت کم اور ہڈیاں زیادہ ہیں۔ جیسے کسی بوڑھی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

وہ ایک دم سے چونک گئی۔ پریشان ہو کر اپنے اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے چھو کر محسوس کرنے لگی۔ کرشمہ نے ناگواری سے کہا "کیا بکتے ہو؟ میری بہن کا ہاتھ تمہیں کسی بوڑھی کا ہاتھ لگ رہا ہے؟"

جمنا کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا "کیا میں اندر سے بوڑھی ہوں مگر میرا ہاتھ مجھے پلپلا نہیں لگ رہا ہے۔"

وہ بھی ناگواری سے بولی "مسٹر شہباز! کیا تم پاگل ہو؟ جوان ہاتھ کو بوڑھا کہہ رہے ہو؟"

کرشمہ نے کہا "مسٹر! یہ سچ مچ پاگل ہے۔ اسے تو یہ تک یاد نہیں ہے کہ اس شہر میں کہیں اس کا مکان ہے یا نہیں؟"

پورس نے کہا "تم بہنوں کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے جو محسوس کیا ہے، وہی کہا ہے۔ مس جمنا! تم کسی دوسرے شخص سے ہاتھ ملا کر معلوم کرو کہ میں نے سچ کہا ہے یا جھوٹ؟"

دو افراد باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ جمنا نے ان کی طرف بڑھ کر مخاطب کیا "ایکسکیوزمی۔"

وہ دونوں رک گئے۔ جمنا نے ان کے قریب جا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "آپ لندن کی فلائٹ کا ارائیول ٹائم بتا سکتے ہیں؟"

اس نے ہاتھ ملا کر کہا "آگے انفارمیشن بورڈ پر لکھا ہوا ہے۔"

اس کی آواز اور لہجہ سنتے ہی پورس اس کے اندر پہنچ گیا۔ اس شخص نے فوراً ہی جمنا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "یہ... یہ تمہارا ہاتھ... بہت..."

جمنا نے پوچھا "بہت کیا؟"

"بہت عجیب ہے۔ دیکھنے میں جوان ہاتھ ہے لیکن کسی بوڑھی کے ہاتھ کی طرح پلپلا لگ رہا ہے۔"

اس کے ساتھی نے حیرانی سے پوچھا "ٹونی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ مس جوان اور خوب صورت ہے اور تم اس کے جوان ہاتھ کو بوڑھا کہہ رہے ہو؟"

جمنا اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولی "پلیز تم میرا ہاتھ تھام کر دیکھو۔"

پورس اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس نے جمنا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اسے سہلانے لگا پھر پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ کرشمہ نے پوچھا "میری سسٹر کا ہاتھ کیسا ہے؟"

وہ ہاتھ چھوڑ کر بولا "مس! تعجب ہے۔ تم دیکھنے میں جوان اور چھونے میں بوڑھی لگتی ہو۔"

جمنا نے غصے سے کہا "شٹ اپ۔ بوڑھی ہوگی تمہاری ماں۔"

ایک نے کہا "غصہ کیوں دکھاتی ہو گھر جاؤ اور لباس اتار کر دیکھو۔ اندر سے کچھ ہو۔ اوپر سے کچھ۔"

وہ اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے جانے لگا۔ جمنا نے کرشمہ کو پورس سے ذرا دور لے جا کر کہا "معلوم ہوتا ہے' میری اپنی شکتی میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میں گھر جا کر اپنی شکتی کو پورا کرنے کے لیے عمل کروں گی مگر اس جوان کو ساتھ لے چلو۔ میرا دل اس پر آگیا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں اسے جانے نہیں دوں گی۔"

ادھر پورس نے پدمنی سے پوچھا "کیا تم بھی ان دونوں کی بہن ہو؟"

پدمنی نے جواب دیا "میں ان کی ملازمہ ہوں۔ مگر مجھے بہن بنا کر رکھتے ہیں۔ کیا سچ مچ جمنا بہن کا ہاتھ بوڑھی عورت جیسا ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ دوسرے دو آدمیوں نے بھی تمہاری جمنا بہن کو اندر سے بوڑھی کہا ہے۔ جب وہ گھر میں لباس بدلتی ہوگی تو تم اسے دیکھتی ہوگی۔ پلیز بچ کہو' وہ اوپر سے جیسی ہے' ویسی اندر سے نہیں ہے نا؟"

وہ پریشان ہو کر بولی "آں۔۔۔؟ میں۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ دونوں قریب آگئیں۔ کرشمہ نے کہا "شہباز! میں اپنی سسٹر کا ہاتھ پکڑ کر دیکھ چکی ہوں۔ یہ تو بھرپور جوان ہاتھ ہے۔"

پورس نے کہا "اس سلسلے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ تم ایک لڑکی ہو۔ تمہارے چھونے میں اور ایک مرد کے چھونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہرحال اس بات تو جانے دو۔ مس جمنا بہت ہی حسین اور دلکش ہیں۔ میں ایک حسین لڑکی کا دل دکھانے کی معافی چاہتا ہوں۔"

جمنا خوش ہو کر بولی "میں ایک شرط پر معاف کروں گی۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"میں! میں تم بہنوں کے ساتھ کہاں جاؤں گا؟"

"ہمارے گھر۔ کیونکہ تم اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہو۔"

کرشمہ نے کہا "ہمارے ساتھ رہو۔ بعد میں تمہارا گھر تلاش کریں گے۔"

"مجھے کہیں نہ کہیں جا کر رہنا ہے۔ تم دونوں اصرار کر رہی ہو تو تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔"

وہ ان کے ساتھ ائرپورٹ کی عمارت کے باہر آیا۔ کرشمہ کار لے کر آئی تھی۔ اس کار میں ممبئی سے گوا تک ایک لمبا سفر شروع ہونے والا تھا۔ جمنا کار کی پچھلی سیٹ پر پورس کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ بولا "دیکھو جمنا! برا نہ ماننا' میں تمہارے بالکل قریب رہنا چاہتا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ تمہارے قریب رہنے سے عجیب سی بو آتی ہے۔ جیسے پورا پکا ہوا پھل رکھا رہے اور کوئی اسے نہ کھائے۔ اس پھل کی عمر گزرتی جائے تو اس میں سے بو آنے لگتی ہے۔"

کرشمہ نے کہا "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بہن کی عمر گزر گئی ہے؟"

"میں پھل کی عمر کا حساب بتا رہا ہوں۔ ایک پھل کی تازگی کی مدت ختم ہو جائے تو اس میں سے بُو آنے لگتی ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ میری سچی بات بری لگتی ہے۔"

کرشمہ نے کہا "سسٹر! تم خوا مخواہ اس پاگل کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔"

جمنا پھر کرشمہ کو پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور بولی "غصہ نہ کرو۔ میری نئی شکتی میں ضرور کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میں گھر جا کر مخصوص منتروں کا جاپ کروں گی تو پھر کسی مرد کو میرا بدن پلپلا نہیں لگے گا اور میرے اندر سے بڑھاپے کی بو محسوس نہیں ہوا کرے گی۔"

"ماں! تم تو اس جوان پر بری طرح مرمٹی ہو۔ ٹھیک ہے۔ اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔"

جمنا نے واپس آ کر پورس سے کہا "تم کرشمہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھو۔ میرے اندر جو خامیاں ہیں' وہ جلد ہی دور ہو جائیں گی۔"

"پھر تو میں تمہارے اتنے قریب آؤں گا کہ اس کے بعد کبھی دور نہیں جاؤں گا۔"

وہ سب کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ جمنا نے موبائل فون کے ذریعے جسونت پال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں کرشمہ کے ساتھ آ رہی ہوں۔ میرے ساتھ ایک خاص مہمان ہے۔ اس کا نام شہباز ہے۔ اس کے لیے ہماری کوٹھی میں ایک کمرا ٹھیک کرا دو۔ یہ ہمارے ساتھ رہے



گا۔"

جسونت پال نے کہا "ماں! وہ نام سے مسلمان لگتا ہے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوٹھی میں رہے گا؟"

جمنا بنگالی بھاشا میں اسے بتانے لگی کہ وہ اپنی نئی شکتی کے ذریعے جوان ہو گئی ہے۔ شہباز کے اور دنیا والوں کے سامنے کبھی اسے ماں نہ کہا جائے۔ جسونت نے ماں کے جوان ہونے پر خوشی کا اظہار کیا پھر اسے کلپنا کے بارے میں بتانے لگا۔

پورس نے بچپن سے ابتدائی جوانی تک ہندوستان میں زندگی گزاری تھی۔ وہاں کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ جمنا کی بنگالی بھاشا کو بھی سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ جسونت نے کلپنا نامی کسی لڑکی کو ایک کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ وہ کلپنا مر چکی تھی لیکن ایک آتما اس کے اندر سمائی ہے۔ اس طرح کلپنا کو ایک نئی زندگی ملی ہے۔ اور جو آتما اس کے اندر سمائی ہوئی ہے' وہ جسونت پال کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔

جمنا نے بیٹے کو تسلی دی "میں جلد ہی اس آتما کی شکتی کو ختم کر کے تمہاری معمول بنا دوں گی۔"

پورس سوچنے لگا۔ پہلے نیلمان آتما شکتی کی حامل تھی۔ وہ فنا ہو چکی ہے۔ نئی الوقت نارنگ اور بھیما آتما شکتی رکھتے ہیں۔ ان دو میں سے کوئی ایک ایسا ہے' جو کلپنا کے جسم کے اندر گھسا ہوا ہے۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے آمنہ کو مخاطب کیا "ماما! میں ہوں آپ کا بیٹا پورس۔ السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔ خوش رہو بیٹے! نارنگ اور بھیما کے علاوہ مائی جمنا بھی آتما شکتی کی حامل ہے۔ کلپنا کے جسم میں بھیما کی آتما سمائی ہوئی ہے۔ اب جاؤ۔ میں عبادت میں مصروف ہوں۔"

وہ دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔

○☆○

للّی نے زخمی دشمن کا آپریشن کیا تھا۔ گہری تاریکی میں اس کے جسم سے گولی نکالی تھی۔ اندھیرے میں دو آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں' نہ پہچانی جا سکتی تھیں۔ اس نے اندازے سے مرہم لگایا تھا اور انجکشن لگائے تھے۔ ناممکن کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ پانی میں آگ نہیں لگائی جا سکتی مگر وہ لگا رہی تھی۔

زخمی دشمن کو مرہم ہی تھا۔ ایسے میں وہ ایک انسانی زندگی کو بچانے کا تجربہ کر چکی تھی۔ اس کی جان بچا چکی تھی۔ آپریشن کے بعد وہ زندہ تھا اور بے ہوش پڑا تھا۔ اس انتہائی سرد علاقے میں ٹھنڈی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ کمبل میں لپیٹ کر گرمی پہنچائی تھی لیکن گرمی پہنچانے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ بدنصیب زندگی پانے کے باوجود سرد موت سے لڑ رہا تھا۔

آفریدی نے کہا "تم نے اس کی جان بچا کر اس پر ظلم کیا ہے۔ یہ مر جاتا تو آپریشن کے بعد کی تکلیف اور ناقابل برداشت سردی کے عذاب سے بچ جاتا۔"

وہ بولی "مجھے خوشی ہے کہ میں نے تاریکی میں ناممکن کو ممکن بنایا ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا یادگار کارنامہ ہے۔ اگر ہم انسانی آبادی میں ہوتے تو اسے خون بھی مل جاتا اور یہ سردی کے عذاب سے بھی محفوظ رہتا۔ یہاں یہ مقدر کے رحم و کرم پر ہے۔ جیے گا یا مر جائے گا۔"

آفریدی نے محافظ سے پوچھا "کیا تم موجود ہو؟"

وہ اس وقت آفریدی کے دماغ میں نہیں تھا۔ للّی کے دماغ میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ سب غار سے باہر علی کے پاس پہنچے ہوئے تھے۔ معلوم کر رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر والے چار دشمن کہاں رہ گئے ہیں؟

غار میں ایک ہی دشمن تھا۔ اپنے چاروں ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈینی وغیرہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ چاروں اس کی مدد اور آفریدی سے مائیکرو فلم چھین لینے کے لیے آ رہے ہیں لیکن ان کے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔

دراصل اس دوسرے ہیلی کاپٹر کو اترنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔ علی اور دوسرے ساتھی ٹیلی پیتھی جاننے والے پرواز کرنے والے ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہے تھے۔ کبھی کبھی اس کی سرچ لائٹ دکھائی دیتی تھی پھر گہری دھند میں گم ہو جاتی تھی۔

للّی' آفریدی کی آغوش میں سمٹ آئی تھی۔ کانوں میں سرگوشیاں کرنے کے لیے دونوں کے چہرے ایک دوسرے سے لگ گئے تھے۔ آفریدی نے کہا "تم بڑی دل والی ہو۔ دشمنوں سے بھی محبت کرتی ہو۔"

"تم میری قدر کر رہے ہو' مجھے اپنی محبت دے رہے ہو' یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے۔"

"میری زندگی کا یہ عجیب و غریب تجربہ ہے۔ ہمارے چاروں طرف خطرات منڈلا رہے ہیں اور ہم بڑے اعتماد اور بڑے پیار سے وقت گزار رہے ہیں۔"

"ان حالات میں محبتیں ملتی رہیں تو موت سے ڈر نہیں لگتا۔ میرے محبوب! مجھے اسی طرح سینے سے لگائے رہو۔"

وہ پہلے ہی سینے سے لگی ہوئی تھی۔ آفریدی اور لگانے لگا۔ جیسے سینے کے اندر چھپا لینا چاہتا ہو۔

میں نے علی سے کہا "بیٹے! ایسے انتہائی سرد علاقے میں

زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے۔ لمبی برفانی علاقوں میں رہنے کی عادی ہے۔ تم سخت جان ہو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا لیکن آفریدی اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی جگہ آیا ہے۔ وہ ناقابل برداشت سردی کو اپنے حوصلے اور قوت ارادی سے برداشت کررہا ہے لیکن بیمار ہوسکتا ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے' اسے وہاں سے نکالو۔"

اس نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہوئے کہا "پاپا! دشمنوں کو اترنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے اور ہیلی کاپٹر میرے نشانے پر نہیں آرہا ہے۔ اس لیے دیر ہورہی ہے۔ ہمارے تمام ہیلی پیتھی جاننے والے میرے دماغ میں موجود ہیں۔ ہم اپنی پلاننگ میں کچھ تبدیلیاں کررہے ہیں۔ ان کا خاطر خواہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

اس وقت علی غار سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ادھر کی برفانی سطح ٹھوس تھی۔ اس نے نئی پلاننگ کے مطابق اس ٹھوس سطح پر ایک واکنگ اسٹک گاڑ دی۔ اس کے اوپری سرے پر ایک رومال باندھ دیا تھا پھر دور جاکر ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔

اس طرح وہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو بتا رہا تھا کہ وہ جگہ ٹھوس ہے اور وہاں ہیلی کاپٹر کو اتارا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ کار سے یہ ہوتا کہ ہیلی کاپٹر بحالت مجبوری اترنے آتا کیونکہ دیر تک پرواز کرتے رہنے سے ایندھن کم ہوتا جارہا تھا۔ ان کے لیے نہیں اترنا لازمی ہوگیا تھا۔

وہ چٹان کے پیچھے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سرچ لائٹ کی دھندلی سی روشنی دکھائی دی۔ گردش کرتے ہوئے پنکھے کی آوازیں قریب آنے لگیں پھر سرچ لائٹ کی روشنی میں برف میں گاڑی گئی اسٹک نظر آنے لگی۔ ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ کر قدرے بلندی پر ٹھہر گیا۔ پائلٹ سمیت وہ چاروں مسلح فوجی فیصلہ کررہے تھے کہ وہاں اترنا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ ان کا مخالف وہاں ضرور کہیں چھپا ہوگا۔

وہ ایک مخالف کا مقابلہ کرسکتے تھے لیکن ہیلی کاپٹر کے ایندھن میں اب کمی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس فیصلے کے مطابق ہیلی کاپٹر وہاں اترگیا۔ اترنے کے بعد اس کا سلائیڈنگ دروازہ نہیں کھلا۔ کوئی باہر نہیں آیا۔ وہ سب اندر بیٹھے باہر کا جائزہ لے رہے تھے۔ دو سرچ لائٹس دائیں بائیں تھیں۔ ان کی روشنی کے باوجود گہری دھند میں صرف چند گز کے فاصلے تک نظر آرہا تھا۔ اس حد تک ان کا مخالف نظر نہیں آرہا تھا۔

ان سب کو یہ علم تھا کہ غار میں دو مخالفین ہیں۔ ایک لمبی اور دوسرا آفریدی اور غار کے باہر صرف ایک مخالف (علی) ہے۔ وہ ایک مخالف سے خوف زدہ نہیں تھے۔ احتیاطاً یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ مخالف کہاں ہوسکتا ہے؟ کدھر سے آکر فائر کرسکتا ہے؟ انہیں یہ بھی خیال تھا کہ جب تک وہ ہیلی کاپٹر سے باہر نہیں نکلیں گے' وہ فائر نہیں کرے گا۔

یہ ان کا اپنا خیال تھا۔ علی نے اپنے خیال کے مطابق انہیں اترنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ایندھن بچانے کی خاطر وہاں ضرور اتریں گے اور اترنے کے بعد فوراً ہی ہیلی کاپٹر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ وہاں کی گہری دھند میں اپنے ایک مخالف کا انتظار کریں گے لیکن ایک جگہ بیٹھ کر دور تک نہیں دیکھ سکیں گے۔ ان کے برعکس علی چٹان کے پیچھے سے نکل کر ان کی طرف آرہا تھا۔

جب... ہیلی کاپٹر دھندلا سا نظر آنے لگا تو وہ رک گیا۔ اسے ہیلی کاپٹر نظر آرہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی ہیلی کاپٹر والوں کو نظر آسکتا تھا۔ وہ پیچھے کی طرف آیا۔ اب اگر وہ فائرنگ شروع کرتے تو... اس کے لیے انہیں دونوں طرف کے دروازے کھولنے پڑتے۔

اس نے کاندھے سے سب مشین گن اتاری۔ اسے برف کی سطح پر جما کر کھڑا کیا پھر ہیلی کاپٹر کے اس حصے کا نشانہ لیا' جہاں ایندھن کی ٹنکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس نے فائرنگ شروع کردی۔ دشمن پہلے سے الرٹ تھے۔ انہوں نے دونوں طرف کے سلائیڈنگ دروازے کھولے پھر انتظار کرنے لگے۔ دوبارہ فائرنگ ہونے پر وہ معلوم کرسکتے تھے کہ ان کا دشمن کہاں ہے؟

علی تین فائر کرنے کے بعد جگہ بدل چکا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کے اگلے حصے کی طرف پہنچ کر پائلٹ سیٹ کی طرف دو فائر کیے۔ پائلٹ بچ گیا مگر سہم گیا۔ اس کے بعد آنے والی کوئی گولی اس کی زندگی چھین سکتی تھی۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں سے بولا "وہ تیزی سے جگہ بدل رہا ہے۔ پہلے پیچھے تھا۔ اب آگے ہے۔ ہمیں پرواز کرتے ہوئے سرچ لائٹس کے ذریعے اس پر فائرنگ کرنی ہوگی۔"

ہیلی کاپٹر برفانی سطح سے بلند ہوگیا۔ نیچی پرواز کرتا ہوا ایک دائرے میں گھومتا ہوا علی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چٹان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کا یہ طریقہ کار سمجھ میں آگیا کہ پرواز کے دوران وہ نظر نہیں آئے گا۔ ہیلی کاپٹر کو اتارا جائے گا تو وہ گہری دھند سے فائدہ اٹھا کر چھپ کر فائر کرتا رہے گا۔

انہوں نے اس کی یہ چال سمجھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہاں دوبارہ ہیلی کاپٹر کو نہیں اتارا جائے گا۔ وہ اب دوسری مناسب جگہ تلاش کرنے کے لیے وہاں سے دور جانے لگے۔ اسی وقت ڈیش بورڈ پر ایندھن کی مقدار بتانے والا میٹر تیزی سے صفر کی طرف جانے لگا اور تب معلوم ہوا کہ اس ایک مخالف نے پہلے تین فائر ایندھن کی ٹنکی پر کیے تھے۔ ٹنکی میں

لیکن جلد سوراخ ہو گئے تھے۔ وہ خالی ہوتی جا رہی تھی۔

وہ اتنی دور آ گئے تھے کہ دوبارہ اس ٹھوس برفانی سطح کی طرف واپس جاتے تو تنکی بالکل خالی ہو جاتی۔ بیلی کاپٹر کہیں بھی گر سکتا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ جہاں پہنچے تھے، وہیں نیچی پرواز کر کے رسی کی سیڑھی کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ پہلے ایک فوجی جوان نے سیڑھی کے نچلے حصے پر آ کر صرف چھ فٹ کی بلندی سے برف کی سطح پر چھلانگ لگائی۔ نیچے پہنچتے ہی وہ پیروں کی طرف سے دھنسنے لگا۔ برف کی سطح کچی تھی۔ اس کے نیچے پانی ہی پانی تھا۔ اس نے آس پاس کی سطح پر ہاتھ مار کر ڈوبنے سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن جہاں ہاتھ مارتا گیا۔ وہاں کی پکی سطح ٹوٹتی گئی۔ کوئی اسے برف کی نامعلوم تہ میں ڈوبنے سے نہ بچا سکا۔

اپنے ساتھی کی عبرت ناک موت دیکھ کر پھر کسی نے نیچے اترنے کی جرأت نہیں کی۔ رسی کی سیڑھی اوپر کھینچ لی گئی۔ پائلٹ بیلی کاپٹر کو بلند کر کے آگے جانے لگا تو نچلے کی گردش تھمنے لگی۔ انجن جھٹکے کھاتے ہوئے بند ہو رہا تھا۔ موت 'زندگی' کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔

علی نے چٹان کے پیچھے سے نکل کر دیکھا دور سرچ لائٹ نظر آتے آتے برف کی پکی سطح میں دھنس گئی تھی۔ پھر وہ لائٹ نظر نہیں آئی۔ پورے بیلی کاپٹر کے ساتھ دھنسنے والے آخری بار چیخ رہے ہوں گے لیکن تیز و تند ہواؤں کے شور میں ان کی چیخوں کا دم گھٹ گیا تھا۔

علی واکنگ اسٹک کی نوک کو برف کی سطح پر ٹیکتے ہوئے غار کی طرف جانے لگا۔

غار میں پہلے جیسی تاریکی تھی۔ اب وہاں ایک ہی دشمن رہ گیا تھا۔ ڈینی، بے فلو اور بے سامو نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی مدد کو آنے والے موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ اسے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ خود کو تنہا سمجھ کر ہمت ہار جاتا۔ ان تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا وہی ایک آلہ کار رہ گیا تھا۔

انہوں نے اسے حکم دیا "غار کی پتھریلی زمین پر لیٹ کر رینگتے ہوئے آگے جاؤ۔ تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ وہ چٹان تم سے کتنے فاصلے پر ہے۔"

ڈینی نے کہا "تاریکی میں اندازے سے رینگتے رہو۔ ہم جہاں رکنے کا حکم دیں۔ رک جاؤ۔ بڑی پھرتی سے اٹھ کر ایک منی مشعل جلاؤ۔ دوسرے ہاتھ میں ریوالور رکھو۔ روشنی ہوتے ہی اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے اس چٹان کے دوسری طرف چھپ جاؤ پھر اگلی فائرنگ کے لیے دوسری گن سنبھال لو۔"

بے فلو نے کہا "شاید اگلی فائرنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ تم ان کی توقع کے خلاف تاریکی میں اچانک موت بن کر پہنچو گے۔ تمہاری پہلی ہی فائرنگ نتیجہ خیز ہوگی۔"

وہ زمین پر اوندھے منہ رینگنے لگا۔ تینوں نے اس کے دماغ پر قبضہ جما لیا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں خطرہ مول لینے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ سوال بھی نہ کر سکا کہ اس کی مدد کو آنے والے کہاں رہ گئے ہیں؟ اس تنہا بے یار و مددگار کے پاس کیوں نہیں آ رہے ہیں؟

ان تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو چٹان تک فاصلے کا اندازہ تھا۔ ڈینی نے اسے ایک جگہ رکنے کا حکم دیا وہ رک گیا۔ وہ تینوں اس کے ذریعے اس سناٹے میں پوری توجہ سے سننے لگے۔ کچھ ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے رک رک کر سرگوشیاں کی جا رہی ہوں۔ وہ ڈینی کے حکم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

للی اور آفریدی ایک دوسرے سے لگے ہوئے زمین پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہتھیار قریب ہی ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ زخمی دشمن کچھ فاصلے پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں زندگی کے عملی میدان میں ابھی کچے تھے۔ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ جنگ کے دوران میں وقفہ ہوتا ہے تو وہ وقفہ حملے کی تیاریوں کے لیے ہوتا ہے، روبانس کے لیے نہیں ہوتا۔ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ دشمن تاریکی میں قریب آنے کا حوصلہ نہیں کریں گے پھر یہ کہ ان کے محافظ ٹیلی پیتھی جاننے والے آئندہ اقدامات کے لیے ان کی رہنمائی کریں گے۔

لیکن وہ محافظ بھی نہیں جانتے تھے کہ ڈینی وغیرہ اپنے تنہا آلہ کار کو تاریکی میں استعمال کر رہے ہیں۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ علی غار کی طرف جا رہا ہے۔ وہ پیچھے سے اس تنہا دشمن کو للکارے گا تو وہ نہ آگے بھاگ سکے گا اور نہ ہی پیچھے علی پر حملہ کر سکے گا لیکن وہاں دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی حکمت عملی بدل گئی تھی۔

بالکل خلاف توقع، اچانک ہی منی ٹارچ روشن ہو کر ان دونوں کے قریب آ کر گری۔ دشمن کو ریوالور دونوں ہاتھوں سے پکڑنے میں جتنا کم وقت لگا۔ اتنے کم وقت میں آفریدی بڑی پھرتی سے للی کو اپنے اوپر لے کر اس جگہ سے لڑھکنے لگا۔ تڑا تڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں لڑھکتے ہوئے فائرنگ سے بچتے جا رہے تھے۔

صرف بچتے رہنے سے موت نہیں ٹل جاتی۔ جوابی فائرنگ لازمی ہوتی ہے لیکن وہ دونوں جہاں سے لڑھکتے ہوئے آئے تھے، ہتھیار وہاں رہ گئے تھے۔ گویا میدان جنگ میں دونوں خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔



دشمن کے ریوالور میں چھ گولیاں تھیں۔ وہ چھ فائر کر چکا تھا۔ ادھر وہ ریوالور کو پھینک کر دوسری گن سنبھال رہا تھا۔ ادھر آفریدی دوڑتا ہوا اپنے ہتھیار کی طرف جا رہا تھا۔ للی اس کے ساتھ جانے کے لیے فوراً ہی نہ اٹھ سکی۔ ڈینی نے اپنے آلہ کار کے ذریعے للی کو نشانے پر رکھتے ہوئے آفریدی سے کہا "ہالٹ! ہتھیار کو ہاتھ لگاؤ گے تو تمہاری ساتھی ماری جائے گی۔"

آفریدی اپنی گن تک پہنچتے پہنچتے رک گیا۔ وہ اپنی گن کو ہاتھ لگا کر للی کی موت نہیں چاہتا تھا۔ ڈینی نے کہا "باہر تمہارے ایک ساتھی نے ہمارے تمام آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ تم خیال خوانی کے ذریعے اس سے کہو کہ تمام ہتھیار پھینک کر یہاں آ جائے۔ باہر جو ایک بیلی کاپٹر رہ گیا ہے، میں اس میں جاؤں گا۔ مائیکرو فلم مجھے دو۔"

ڈینی، جے فلو اور بے سامو اس آلہ کار کے دماغ پر سختی سے قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ علی اور دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے اس آلہ کار کے ہاتھوں سے گن نہیں چھین سکتے تھے کسی طرح بھی اس پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔

وہ کہہ رہا تھا "مائیکرو فلم دے دو گے تو میں تمہارے ساتھی کو بھی اس غار میں زندہ چھوڑ کر بیلی کاپٹر میں چلا جاؤں گا۔"

"مائیکرو فلم نہیں تھی۔ آفریدی کہاں سے لا کر دیتا۔ اگر ہوتی اور وہ دشمن کو دے دی جاتی۔ تب بھی وہ للی اور آفریدی کو زندہ نہ چھوڑتا۔

اس نے کہا "میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ تمہارا ساتھی اچانک یہاں آ کر مصیبت بن سکتا ہے۔ میں تین تک گن رہا ہوں۔ اگر تم مائیکرو فلم نکال کر میری طرف نہیں اچھالو گے تو میں تین کہتے ہی تمہاری اس ساتھی کو گولی مار دوں گا۔"

پھر اس نے گنتی شروع کی "ایک۔۔۔"

آفریدی نے کہا "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ مائیکرو فلم میرے پاس نہیں ہے۔ میرے ساتھی کے پاس ہے۔"

اس نے کہا "دو۔۔۔"

آفریدی نے کہا "میں نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ساتھی کو بلایا ہے۔ وہ آ رہا ہے۔"

"پھر تو صرف تمہارا ساتھی زندہ رہے گا۔ تم دونوں مرو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے للی کا نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا پھر اچانک ہی وہ ہو گیا، جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دشمن کے ٹریگر دبانے سے پہلے ہی بے ہوش زخمی کے جسم میں لرزش سی پیدا ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ اٹھا۔ ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس دشمن آلہ کار کے سنبھلنے سے پہلے ہی ٹھائیں سے گولی چل گئی۔

گولی حلق میں پیوست ہوئی۔ اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ دوسری سانس نہ لے سکا۔ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے اسے آخری بار کسی طرح سنبھال کر آفریدی کو ہلاک کرنا چاہا لیکن اس کے ہاتھ سے گن نکل کر زمین پر گر چکی تھی پھر وہ بھی زمین پر گر کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

للی اور آفریدی دوڑتے ہوئے بے ہوش زخمی کے پاس آئے۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے دیکھا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ ڈھلک گیا تھا۔ گردن بھی ڈھلک گئی تھی۔ اس کی پھیلی ہوئے ساکت بے جان آنکھیں للی سے کہہ رہی تھیں "نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔۔۔"

○☆○

جیکی ہنٹر اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ الپا اس کے اور بوبی اسمتھ کے سروں میں کیلیں پیوست کرانے کے بعد دونوں کو اپنا معمول بنا چکی تھی اور مڈل ایسٹ سے دور اپنے ایک مکان کے تہ خانے میں ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے کے انتظامات کر رہی تھی۔

ایک مختصر سی پلاسٹک سرجری کے ذریعے جیکی ہنٹر کے چہرے کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہ ایک عام شہری کی حیثیت سے بوبی کے ساتھ رہتا تھا۔ مشین تیار کرنے کا ضروری سامان تل ابیب سے اس خفیہ مکان کے تہ خانے میں پہنچا رہا تھا۔ چند اہم پرزے ایسے تھے، جنہیں وہ لیتھ مشین کے ذریعے تیار کرنے کے بعد ٹرانسفارمر مشین کو مکمل کر سکتا تھا۔ اس نے الپا سے کہا تھا کہ ایک یا ڈیڑھ ماہ میں مطلوبہ مشین کامیابی سے تیار ہو سکے گی۔

امریکا میں جو ٹرانسفارمر مشین تیار ہو چکی تھی۔ اس کے بارہ رازدار تھے۔ ان میں پانچ امریکی اکاؤنٹنٹ، دو ٹیلی پیتھی جاننے والے لیزی گارڈ اور کینی بال، دو سکیلیٹن ماہرین جیکی ہنٹر اور وائرمین اور تھری جے تھے۔ ان بارہ میں سے جیکی ہنٹر کو الپا نے اغوا کرا لیا تھا۔ باقی گیارہ رازدار رہ گئے تھے۔

جیکی ہنٹر کی گمشدگی ان گیارہ افراد کو پریشان کر رہی تھی۔ انہوں نے چاہا تھا کہ امریکا میں ٹرانسفارمر مشین کی موجودگی کا علم کسی کو نہ ہو لیکن جیکی ہنٹر کی گمشدگی بتا رہی تھی کہ کسی دشمن کو یہ راز معلوم ہو چکا ہے۔

ان گیارہ رازدار ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے جیکی ہنٹر کی بیوی اور اس کی جوان بیٹی ڈانا کے خیالات پڑھنے کے بعد یقینی طور پر اندازہ کیا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس صبح وہاں سے روانہ ہونے والی تمام فلائٹس کے مسافروں کے نام

چیک کیے گئے۔ ان میں ایک نام ایسا تھا، جس کا پاسپورٹ جعلی ثابت ہوا۔ جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سفر کرنے والا اسرائیل کے شہر تل ابیب گیا تھا۔

تب یقین ہو گیا کہ الپا کسی طرح جیکی ہنٹر کو ٹریپ کر کے اسے اپنا معمول بنا چکی ہے اور یقینی طور پر اس کے خیالات سے امریکا میں ٹرانسفارمر مشین کی موجودگی کا راز معلوم کر چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹرانسفارمر مشین کے باقی گیارہ رازداروں کے نام اور پتے بھی معلوم کر چکی ہوگی۔

ڈانٹا اور اس کی ماں کے خیالات سے معلوم ہوا کہ جیکی ہنٹر اپنے گھر میں کسی مشین کا نقشہ بنایا کرتا تھا۔ لیزی گارڈنے اپنے رازدار ساتھیوں سے کہا "جیکی ہنٹر نے یقیناً ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ بنایا ہوگا۔ الپا اسے نقشے کے ساتھ ٹریپ کر چکی ہے۔"

جے کافونے کہا "وہ بہت مکار ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے میں مصروف ہو گی۔"

لیزی گارڈنے ہاٹ لائن پر اسرائیلی آرمی انٹیلی جنس والوں سے رابطہ کیا۔ ان سے کہا "ہم الپا سے ضروری گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ میرے دماغ میں آئے یا ہمیں اپنے دماغ میں آنے دے۔ ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد الپا نے لیزی گارڈ کے دماغ میں آ کر کہا "میں الپا ہوں۔ مجھے کس لیے یاد کیا ہے؟"

"تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ ہم جیکی ہنٹر کے لیے پریشان ہیں۔"

"کس جیکی ہنٹر کی بات کر رہے ہو؟ بہتر ہے، مجھ سے صاف اور سیدھی گفتگو کرو۔"

"امریکی جیکی ہنٹر ٹرانسفارمر مشین کا تکنیکی ماہر ہے۔ تم نے ٹرانسفارمر مشین کے نقشے کے ساتھ اسے اغوا کرایا ہے۔"

الپا نے حیرانی سے کہا "او مائی گاڈ! ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ تمہارے ریکارڈ روم سے چوری ہو گیا ہے؟ اور تمہارا خیال ہے کہ میں نے اسے نقشے کے ساتھ اغوا کرایا ہے۔ کاش ایسا ہوتا تو میں خوشی سے جشن مناتی۔ اس سلسلے میں مجھ پر شبہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟"

"جس دن جیکی ہنٹر گم ہوا تھا۔ اس صبح ہی ایک فلائٹ سے ایک شخص جعلی پاسپورٹ کے ذریعے اسرائیل گیا ہے۔"

"کتنے ہی مجرم مختلف ہتھکنڈوں سے ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ میں انٹیلی جنس والوں سے کہوں گی کہ وہ جعلی پاسپورٹ پر یہاں آنے والے شخص کا سراغ لگائیں۔"

"الپا! تم بڑی خوب صورتی سے انجان بن رہی ہو۔"

"اور تم بڑی حماقت سے جیکی ہنٹر کی گمشدگی کا الزام مجھ پر لگا رہے ہو۔ پچھلے دنوں نارنگ میرے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس سے نجات پا کر سکون کا سانس لے رہی ہوں۔ ایسے وقت تم پریشان کرنے والی باتیں کر رہے ہو۔ پلیز دشمن کو پہچانو۔ تمہارا ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا..... آندرے پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ساتھ باغی ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اس پر شبہ کیوں نہیں کر رہے ہو؟ تیج پال کی رہنمائی میں رہنے والے بیزون، بڑی رابرٹ، جوزف وسکی اور مائیک مورو نے بھی امریکی حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ایسے بغاوت کرنے والوں پر شبہ کرنا چاہیے اور تم خوا مخواہ مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟ صرف اس لیے کہ کوئی امریکا سے جعلی پاسپورٹ پر یہاں آیا ہے؟"

"جعلی پاسپورٹ کے ذریعے جیکی ہنٹر تمہارے پاس پہنچا ہوا ہے۔ مگر تم تسلیم نہیں کرو گی۔"

"خوا مخواہ الزام دیتے رہو۔ میری صحت پر اثر نہیں پڑے گا۔ میں تمہارے دماغ سے جا رہی ہوں۔ آئندہ جیکی ہنٹر کے سلسلے میں میرا وقت ضائع نہ کرنا۔"

وہ لیزی گارڈ کے دماغ سے چلی گئی۔ کینی بال نے کہا "ہمیں آندرے اور تیج پال کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہیے۔"

ڈینی نے کہا "ہماری لسٹ میں الپا، آندرے اور تیج پال ہیں لیکن یہ تینوں کبھی ہمارے سامنے مجبور ہو کر حقیقت نہیں اگلیں گے۔"

جے کافونے کہا "جیکی ہنٹر کی جوان بیٹی ڈانٹا کسی بوبی نامی جوان سے محبت کرتی تھی۔ ڈانٹا کے خیالات بتا رہے ہیں کہ جس دن سے اس کا باپ گم ہوا ہے۔ اسی دن سے بوبی بھی لاپتا ہے۔ اس نے فون کے ذریعے بھی ڈانٹا سے رابطہ نہیں کیا ہے۔"

"یہ معلوم کیا جائے کہ بوبی کون ہے؟ اور اس دن سے کہاں گم ہو گیا ہے؟"

ٹرانسفارمر مشین کے وہ گیارہ رازدار ایک ایک سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بار بار جیکی ہنٹر کی بیوی اور بیٹی کے دماغوں میں جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے پھر ایک بار ڈانٹا کے خیالات پڑھے۔ ظاہر ہوا جیکی ہنٹر کی پوری فیملی کی طرح بوبی بھی یہودی ہے۔ وہ جیوز ویلفیئر سوسائٹی کے اکاؤنٹ سیکشن میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ یہودیوں کا ادارہ تھا۔ بوبی یہودی تھا۔ اس حوالے سے یہی رائے قائم کی جا رہی تھی کہ بوبی اپنے ملک اسرائیل کے مفادات کے لیے امریکا میں کام کر رہا تھا۔ یہودیوں کے ایک ادارے میں بظاہر ملازم تھا۔ مگر



الپا کی خفیہ سراغ رسانوں کی ٹیم کا ایک جاسوس تھا۔

لڑکی سے لڑکی ملنے لگی کہ بوبی نے پہلے ڈانٹا کو محبت کے جال میں پھانس لیا۔ اس کے ذریعے معلوم کیا کہ جیکی ہنٹر اپنے گھر میں بڑی رازداری سے کس مشین کا نقشہ بنا تا رہتا ہے۔ بوبی نے کسی طرح تصدیق کی یا الپا، اس کی محبوبہ ڈانٹا کے دماغ میں رہ کر جیکی ہنٹر کی بیوی کے دماغ میں پہنچ کر اس نقشے کی اہمیت کو سمجھتی رہی۔ یہ بھی معلوم کیا گیا ہوگا کہ جیکی ہنٹر امریکا میں دوبارہ ٹرانسفارمر مشین بنا چکا ہے۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جیکی ہنٹر کو مشین کے نقشے سمیت اسرائیل پہنچایا گیا ہے۔

ٹرانسفارمر مشین کے وہ گیارہ رازدار اس سلسلے میں آندرے اور تیج پال پر بھی شبہ کر رہے تھے۔ ان کے خلاف بھی انکوائری کر رہے تھے لیکن الپا پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اسرائیل میں تمام امریکی سراغ رسانوں کو الرٹ کر دیا۔ اپنے گیارہ رازداروں میں سے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے فوج کے اعلیٰ افسر مارک فورڈ کو ان سراغ رسانوں کا رہنما مقرر کیا۔ تاکہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اور ان سراغ رسانوں کے ذریعے الپا کی مصروفیات کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور جیکی ہنٹر کو تلاش کیا جا سکے۔

وہ اپنے طور پر درست سوچ رہے تھے کہ الپا نقشے کو اور تکنیکی ماہر جیکی ہنٹر کو حاصل کر لینے کے بعد مشین تیار کرانے میں مصروف ہو گی۔ ویسے مصروفیات کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے الپا تک پہنچنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ ایک تو تم ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے لیے اس کا دماغ مردہ رہتا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ کس بھروپ میں اور کہاں رہتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

جے کافونے کہا "ڈانٹا اب بھی بوبی کو چاہتی ہے۔ شاید بوبی اب بھی اس سے پیار کرتا ہوگا لیکن الپا کے زیر اثر اپنی محبوبہ سے دور رہنے پر مجبور ہوگا۔ میرا مشورہ ہے، ڈانٹا کو اسرائیل بھیجا جائے۔"

ایک نے کہا "الپا اپنے ملک میں ڈانٹا کو دیکھے گی تو بہت محتاط رہے گی۔ بوبی اور جیکی ہنٹر کو ٹیلی پیتھی کے پردوں میں چھپا کر رکھے گی۔"

"ان پردوں کو چاک کرنے کے لیے ہمارے پاس بھی ٹیلی پیتھی کے ہتھیار ہیں۔ وہاں ڈانٹا کا باپ بھی ہے اور محبوب بھی، ہم اس کے ذریعے الپا کو ذہنی طور پر الجھائیں گے، تب ہی اسے ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے سے روک سکیں گے۔"

جے کافو بظاہر انہیں مشورہ دے رہا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ مشورہ ان کے لیے حکم ہے۔ کیونکہ لیزی گارڈ، کینی بال اور پانچوں اکابرین ان تھری جے کے معمول اور غلام تھے اور اپنی غلامی سے بے خبر تھے۔ جے کافو کی مرضی کے مطابق ڈانٹا پر تخویفی عمل کیا گیا۔ اسے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے مارک فورڈ کی محکوم بنایا گیا پھر اسی رات ایک فلائٹ سے اسے اسرائیل پہنچا دیا گیا۔

دوسری صبح ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسرائیل کے تمام اخبارات میں ڈانٹا کی تصویر کے ساتھ ایک اطلاعی خبر شائع کرائی گئی۔ خبر یوں تھی "ڈیڈی! میں تمہاری بیٹی ہوں۔ بوبی! میں تمہاری جان، تمہاری زندگی ہوں۔ تمہاری تلاش میں آئی ہوں۔ ہم دونوں کہاں ہو؟ جب تک تم دونوں سے ملاقات نہیں ہوگی، میں اسی ملک میں رہوں گی۔"

جیکی ہنٹر اور بوبی مشین کی تیاری کے دوران میں ساتھ رہتے تھے پھر جیکی ہنٹر اسی خفیہ مکان میں آرام کرتا تھا، جس کے تہ خانے میں مشین تیار ہونے والی تھی اور بوبی رات گزارنے کے لیے الپا کے پاس چلا آتا تھا۔ اس روز اسی مصروفیت کے دوران میں انہوں نے ایک اخبار میں ڈانٹا کی تصویر دیکھی۔ جیکی نے کہا "یہ میری بیٹی ہے۔ اوہ گاڈ! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ یہاں مجھے تلاش کرنے آئی ہے۔"

بوبی بڑی محبت سے ڈانٹا کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "تمہاری بیٹی! مجھے بھی تلاش کر رہی ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو۔ وہ مجھے بھی دیوانہ وار چاہتی ہے۔"

جیکی ہنٹر نے سوچا، تصویر کی آنکھوں میں جھانک کر بیٹی کے دماغ میں پہنچے گا۔ وہ الپا کے تخویفی عمل اور جادوئی کیل کے اثر سے اپنی بیوی اور بچوں کو بھول چکا تھا۔ تصویر دیکھ کر بیٹی یاد آئی تھی لیکن وہ بیٹی کے پاس پہنچنے کے لیے خیال خوانی نہ کر سکا۔ تخویفی عمل کے ذریعے یہ بات بھی نقش کی گئی تھی کہ وہ کبھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنی بیوی اور بچوں سے رابطہ نہیں کرے گا۔

وہ پریشان ہو کر بولا "بوبی! میں ٹیلی پیتھی جانتا ہوں مگر اس کے ذریعے بیٹی سے بات نہیں کر سکتا۔ میرا دماغ مجھے خیال خوانی سے روک رہا ہے۔"

آدمی دماغ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا..... اس کا دماغ الپا کی مٹھی میں تھا۔ بوبی نے کہا "ہم ایسا کوئی کام نہیں کر سکتے، جو میڈم کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ ہماری مالک ہے۔ ہمیں مالک کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہیے۔"

وہ دونوں ڈانٹا کی تصویر دیکھتے رہے۔ باپ کے اور عاشق کے دلوں میں اس کی چاہت تھی۔ اس سے ملنے کے لیے بے چینی تھی لیکن محکوم دماغ کے سامنے دل ہار رہا تھا۔

جب بوبی رات کو الپا کے خفیہ بنگلے میں جاتا تھا تو وہ بن سنور کر تیار رہتی تھی پھر اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بنگلے سے باہر نکلتی تھی۔ کبھی رات کا کھانا کھاتی تھی پھر اس کے ساتھ واپس آکر سو جاتی تھی۔ اس رات بوبی نے بنگلے میں پہنچ کر غسل خانے میں جاتے ہوئے پوچھا "تم نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"ڈانا یہاں آئی ہے۔"

"کون ڈانا؟"

"جیکی ہنٹر کی بیٹی ڈانا۔"

وہ چونک کر باتھ روم کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "کیا اس کی آمد کی خبر اخبار میں شائع ہوئی ہے؟ وہ ایسی تو کوئی معروف ہستی نہیں ہے۔"

"اس نے خود اپنی تصویر کے ساتھ اطلاعی خبر شائع کرائی ہے۔ مجھے اور جیکی ہنٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک ہم دونوں سے ملاقات نہیں کرے گی، اسی ملک میں رہے گی۔"

الپا فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈریسنگ روم میں صبح کا اخبار تھا۔ وہاں تیزی سے چلتی ہوئی گئی۔ ایک اخبار کو کھول کر دیکھا۔ پہلے ہی صفحے پر ڈانا کی تصویر اور اطلاعی خبر دکھائی دی۔ وہ خبر پڑھتی ہوئی بیڈ روم میں آئی پھر بوبی کو مخاطب کرتی ہوئی بولی "کیا جیکی ہنٹر نے اپنی بیٹی سے رابطہ کیا تھا؟"

"وہ خیال خوانی کے ذریعے اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا دماغ خیال خوانی کی طرف مائل نہیں ہوا۔ میں نے اسے سمجھایا، ہم اپنی میڈم کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ تب اس نے صبر کر لیا۔"

"شاباش بوبی! تم واقعی میرے وفادار ہو۔ ویسے تم ڈانا سے محبت کرتے ہو۔ کیا تم اسے ملنا نہیں چاہتے؟"

"تم حکم دو گی تو ملوں گا۔ ورنہ میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ تمہاری جیسی ٹیلی پیتھی کی دنیا کی ناقابل شکست ہستی میری محبوبہ بن چکی ہے۔"

"میں تم سے بہت خوش ہوں۔ ویسے میں ڈانا کو ٹریپ کر کے تمہاری تنہائی میں پہنچاؤں گی۔ تم میرے وفادار ہو۔ میں تمہارا دل خوش کروں گی۔"

"میڈم! پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ڈانا اچانک یہاں کیوں آئی ہے؟ کیا صرف باپ اور محبوب کو تلاش کرنے؟ یا وہ گیارہ ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے ذریعے جیکی ہنٹر کو یہاں ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ انہیں جیکی ہنٹر کی یہاں موجودگی کا علم ہو گا تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کر رہے ہیں۔"

"بوبی! تم بے حد ذہین ہو۔ تمہاری ذہانت اور وفاداری کی وجہ سے میں الپا کی حیثیت سے تم پر ظاہر ہو چکی ہوں۔ اب آگے ذہانت سے سوچو اور بولو، ہمیں دشمنوں کو کس طرح منہ توڑ جواب دینا چاہیے؟ میں ابھی ڈانا کے دماغ میں جا رہی ہوں۔"

وہ ڈانا کی تصویر دیکھنے لگی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی اس کے دماغ میں پہنچ گئی لیکن اسی لمحے ڈانا نے سانس روک لی۔ بوبی نے باتھ روم کے دروازے سے جھانک کر کہا "میڈم! ابھی میرے دماغ میں بات آئی ہے کہ تمہیں ڈانا کے دماغ میں جا کر نہیں بولنا چاہیے۔"

الپا نے بوبی کی بات سنی مگر اسے نظر انداز کیا۔ دوسری بار خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں پہنچی۔ اس نے سانس نہیں روکی۔ کسی قدر خوش ہو کر بولی "ڈیڈی! تم ہو؟ تم نے اخبار میں میری تصویر دیکھی ہے۔ میری باتیں پڑھی ہیں۔ اسی لیے آئے ہو۔"

الپا فوراً اس کے دماغ سے نکل کر جیکی ہنٹر کے پاس آئی پھر بولی "میں اجازت دے رہی ہوں۔ بیٹی سے باتیں کرو۔"

جیکی خوش ہو کر اسی وقت ڈانا کے دماغ میں پہنچ کر بولا "میری بیٹی! میری جان! تم ہزاروں میل دور سے مجھے تلاش کرنے آئی ہو۔ تم کہاں ہو؟"

وہ بولی "ڈیڈی! تمہاری آواز اپنے دماغ میں سن کر یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے پھر تو میں بوبی کو بھی ڈھونڈ لوں گی۔"

جیکی ہنٹر، بوبی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ الپا نے اس کی بات بدل دی۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق بولا "میری بات کا جواب دو، تم کہاں ہو؟"

"تم میرے دماغ میں آ کر دیکھ رہے ہو، میں اپنے بیڈ روم میں لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹی ہوئی ہوں۔ تل ابیب میرے لیے انجانا شہر ہے۔ میں نہیں جانتی کہ یہاں کس علاقے کے کس مکان میں ہوں۔"

"بیٹی! لائٹ آن کرو۔ باہر نکلو۔ میں معلوم کر لوں گا۔"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ ہم سب کو چھوڑ کر اچانک یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تمہارے پاس آ کر تمہارے تمام سوالات کے جواب دوں گا۔"

"نہیں ڈیڈی! میں تمہارے پاس آؤں گی۔ اپنا پتا بتاؤ۔"

"یہ شہر تمہارے لیے انجانا ہے۔ پتا بتاؤں گا۔ تب بھی بھٹکتی رہو گی۔ بات مانو۔ لائٹ آن کرو۔ باہر نکلو۔"

"ڈیڈی! تم پر کیسے بھروسا کروں؟ تم پر ایا بن کر خون کے



رشتوں کو چھوڑ آئے۔ میری عقل کہتی ہے کہ الپا نے تمہیں اپنا لیا ہے۔ تمہیں اغوا کر کے یہاں لے آئی ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم کس الپا کی بات کر رہی ہو؟"

اسی وقت ڈانا کے دماغ میں ایک اور آواز ابھری۔ کسی نے کہا "اے بڈھے! شرم کر۔ بیٹی تجھے تلاش کرنے دوسرے ملک میں آئی ہے اور تو اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتا رہا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ جس طرح تجھے ٹریپ کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیری بیٹی کو امریکا سے ٹریپ کر کے یہاں بھیجا گیا ہے۔"

امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والا فوج کا اعلیٰ افسر مارک فورڈ، ڈانا کے دماغ میں رہا کرتا تھا۔ وہ حیرانی سے سوچنے لگا "یہاں جیکی ہنٹر کے علاوہ کون بول رہا ہے۔ ہماری بھی پول کھول رہا ہے کہ ہم نے ڈانا کو ٹریپ کر کے یہاں بھیجا ہے۔"

الپا نے جیکی ہنٹر کے ذریعے پوچھا "اے تم کون ہو؟ یہ کیسے جانتے ہو کہ ڈانا کو امریکا کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے بھیجا ہے؟ اور یہ غلط ہے کہ مجھے ٹریپ کیا گیا ہے۔ میں اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔"

اس اجنبی نے کہا "مگر اپنی مرضی سے بیٹی کو اپنا پتا نہیں بتا سکو گے۔ الپا تمہیں اجازت نہیں دے گی اور بیٹی اپنا پتا نہیں بتا سکے گی۔ اسے امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والا اجازت نہیں دے رہا ہے۔"

ڈانا نے پریشان ہو کر پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے ڈیڈی؟ تمہارے علاوہ اور کون بول رہا ہے۔ مجھے اس کی باتیں سچ لگ رہی ہیں۔"

الپا نے جیکی ہنٹر کو حکم دیا "دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو جاؤ۔ میری اجازت کے بغیر خیال خوانی نہ کرو۔ دس منٹ کے اندر گہری نیند سو جاؤ۔"

جیکی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ دماغی طور پر حاضر ہو کر آنکھیں بند کرنے کے بعد سونے کے لیے دماغ کو ہدایات دینے لگا۔

ڈانا اسے مخاطب کر رہی تھی "ڈیڈی! تم خاموش کیوں ہو؟ کیا میرے دماغ سے چلے گئے ہو؟"

اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ الپا، جیکی کو خیال خوانی نہ کرنے اور سو جانے کا حکم دے کر خود ڈانا کے دماغ میں رہ گئی۔ یہ تجسس پیدا ہو گیا کہ وہ اجنبی کون ہے، جو ڈانا کے دماغ میں آ کر صرف اس کے ہی نہیں، امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے بھی خلاف بول رہا ہے؟

ڈانا کے دماغ میں رہنے والا امریکی مارک فورڈ بھی یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اجنبی کون ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے الپا، مارک فورڈ اور وہ اجنبی تینوں ہی ڈانا کے دماغ میں موجود تھے اگر مارک فورڈ موجود نہ رہتا تو ڈانا دوسروں کو محسوس کر لیتی اور سانس روک لیتی۔ وہ تینوں انتظار کر رہے تھے کہ کوئی بولے گا تو بات آگے بڑھے گی پھر اس اجنبی کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے گا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ آخر اس اجنبی نے کہا "ڈانا! تم پر تنویمی عمل کرنے والا تمہارے دماغ میں خاموشی سے موجود ہے۔ اس کی موجودگی کے باعث تم ہماری سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر رہی ہو۔ اچھا ہے اسے موجود رہنا چاہیے۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت الپا بھی موجود ہے۔"

الپا حیران ہو رہی تھی۔ پریشان ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "کیا دُور کی کوڑی لانے والا، دونوں طرف کے خیال خوانی کرنے والوں کو پہچاننے والا وہی مکار ہے؟ وہی شیطان ہے، جس سے میں ڈرتی ہوں اور جس پر مرتی بھی رہتی ہوں؟"

آخر مارک فورڈ نے کہا "مسٹر اَن نون! تم جو بھی ہو۔ اس وقت سچ کہہ رہے ہو۔ ہماری آرمی کے ایک اہم تکنیکی ماہر کو الپا اغوا کر کے یہاں لے آئی ہے لیکن اس الزام کو تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ ہم نے ڈانا کو باپ کی تلاش میں پہنچایا ہے۔ ابھی جیکی ہنٹر نے بیٹی سے رابطہ کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنا پتا بیٹی کو نہیں بتا سکتا اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارا اغوا کیا جانے والا ماہر جیکی ہنٹر اس ملک میں ہے۔ الپا کا جھوٹ کھل گیا ہے۔"

اجنبی نے کہا "اب الپا خود کو نہیں چھپائے گی۔ جھوٹ کھلنے کے بعد امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی دشمنی کو اہمیت نہیں دے گی۔ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین رہے گی کہ میں کون ہوں؟"

مارک فورڈ نے پوچھا "تم کون ہو؟ تم ڈانا کے دماغ میں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں کون ہوں؟ یہ الپا پوچھے گی۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ صبح کے اخبار میں ڈانا کی تصویر دیکھی۔ یہ پڑھ کر ہمدردی ہوئی کہ ایک بیٹی باپ کو اور اپنے محبوب کو تلاش کر رہی ہے۔ میں تصویر کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس وقت اس نے سانس نہیں روکی۔ کیونکہ تم اس کے دماغ میں رہ کر یہ انتظار کر رہے ہو گے کہ اس کا باپ خیال خوانی کے ذریعے رابطہ کرے گا۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں۔ میں صبح سے ڈانا کے دماغ میں آتا جاتا رہا ہوں۔ یہ میری سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کرتی ہے۔ میری موجودگی کے باعث تمہیں اس کے دماغ میں آنے کا موقع ملا

رہا۔"

"اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے ڈائنا کے چور خیالات پڑھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا باپ جیکی ہنٹر امریکن آرمی میں نمبر ون مکینک ہے تو یاد آگیا کہ اسی نے ٹرانسفارمر مشین بنائی تھی۔"

مارک فورڈ نے پوچھا "تم کون ہو؟ تم نے اتنی معلومات کیسے حاصل کی ہیں؟"

"میں کہہ چکا ہوں' یہ نہ پوچھو کہ میں کون ہوں؟ یہ الپا مجبور ہو کر پوچھے گی۔ جہاں تک معلومات حاصل کرنے کا تعلق ہے تو میں کڑی سے کڑی ملا کر معلومات کی زنجیر بناتا ہوں۔ جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ٹرانسفارمر مشین کا ماہر الپا کا قیدی بن گیا ہے تو کوئی نادان بھی سمجھ لے گا کہ الپا جیسی مکار عورت نے اس ماہر کو یونہی قیدی نہیں بنایا ہے۔ اسے اپنا معمول اور محکوم بنا کر ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کرا رہی ہے۔"

الپا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی پھر وہ گہری سانس لے کر خیال خوانی کی پرواز کرتی ہوئی اس کے دماغ میں پہنچ کر بولی "میں جانتی ہوں' تم سانس نہیں روکو گے۔ تم دنیا کے تمام ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے لیے اپنے دماغ کے دروازے کھلے رکھتے ہو۔ مکار! شیطانوں کے شیطان! میں تمہیں گالیاں بھی نہیں دے سکتی۔ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اوگاڈ! تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں کہاں آیا ہوں؟ کیا تم سمجھ رہی ہو' میں اسرائیل میں ہوں؟"

اس نے بے یقینی سے پوچھا "تم یہاں تل ابیب میں نہیں ہو؟"

"ابھی نہیں ہوں۔ بلاؤ گی تو آجاؤں گا۔"

وہ جلدی سے بولی "نہیں۔ پلیز یہاں نہ آنا۔"

پھر وہ چونک کر بولی "تم پکے جھوٹے اور فراڈ ہو اگر یہاں نہیں ہو تو اخبار میں ڈائنا کی تصویر کیسے دیکھی؟"

"کیا آج کل گھاس کھا رہی ہو۔ کیا تمہارے ملک کے اخبار لندن اور پیرس نہیں پہنچتے ہیں۔ میں نے ایفل ٹاور کے فونٹین کے پاس بیٹھ کر وہ اخبار پڑھا اور ڈائنا کی تصویر دیکھی۔"

اسے ذرا اطمینان ہوا مگر وہ پھر بے یقینی سے بولی "بڑی مشکل ہے۔ تمہارے دماغ میں رہ کر معلوم نہیں ہو تا تم کس ملک کس شہر یا کس مکان میں ہو یا مکان کے باہر ہو۔"

"کھڑکی میں بلا نٹڈ گلاس (دھندلے شیشے) لگے ہوں تو دوسری طرف دکھائی نہیں دیتا۔"

"دیکھو' میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ میں تم سے کہنے کا حق نہیں رکھتی پھر بھی التجا کرتی ہوں۔ میرے موجودہ معاملات میں مداخلت نہ کرو۔"

"میرے مکان کے ہر کمرے میں.... ایک ٹرانسفارمر مشین رکھی رہتی ہے۔ میں تم سے مشین ادھار مانگنے نہیں آؤں گا۔ ابھی بھول جاؤں گا کہ تمہارے موجودہ معاملات کیا ہیں؟"

"میں خوا نخواہ التجا کر رہی ہوں۔ تم دیکھتے ہوئے انگاروں پر بھی بیٹھ کر مداخلت نہ کرنے کی قسم کھاؤ گے۔ تب بھی میں یقین نہیں کروں گی۔ فار گاڈ سیک' مجھ سے کوئی سمجھوتا کرو۔"

"جب میری قسم پر یقین نہیں ہے تو کسی سمجھوتے پر کیسے یقین کرو گی؟"

"مجبوری ہے۔ کسی نہ کسی معاملے میں یقین کرنا ہی پڑے گا۔"

"مجبوری ہے تو بولو۔ کس طرح کا سمجھوتا کرو گی؟"

"میں تحفظ چاہتی ہوں اگر تم میرے موجودہ معاملات میں مداخلت نہیں کرو گے بلکہ امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے خلاف سیکیورٹی دو گے تو میں تمہاری کنیز بن کر رہا کروں گی۔"

"تمہیں شریک حیات بنایا تھا پھر تم سے نجات حاصل کرنے کے بعد اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ جو اعلیٰ شریک حیات بن کر نہ رہ سکی' وہ ادنیٰ کنیز بن کر کیا بھلا کرے گی۔"

"غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہو گئیں۔ تم فراخ دل ہو۔ مجھے معاف کر کے ایک موقع دو۔ میں ایک دوست بن کر تمہارے کام آتی رہوں گی اور اپنی وفاداری ثابت کرتی رہوں گی۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔ میں تمہیں ایک بہترین دوست سمجھ کر اپنی وفاداری ثابت کرنے کا موقع دے رہا ہوں۔"

"شکریہ' تم بہت اچھے ہو۔ میں بہت نادان ہوں۔ خوا مخواہ تم سے دشمنی کرتی رہی۔ تم پھر دوستی کا موقع دے رہے ہو۔ اب میں مرتے دم تک ہر حال میں دوستی نبھاتی رہوں گی۔"

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ابھی کام کی باتیں کرو۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"یہ تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ میں بڑی رازداری سے ٹرانسفارمر مشین تیار کرا رہی ہوں۔"

"اب رازداری کہاں رہی؟ جیکی ہنٹر اور اس کی بیٹی ڈائنا کی آمد سے تمہاری ٹرانسفارمر مشین کا راز کھل چکا ہے۔"



"یہی تو پریشانی ہے۔ وہ لوگ مشین کی تیاری کے دوران میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ میں ان سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتی ہوں پھر بھی تمہارا تعاون چاہتی ہوں۔"

"میں کس طرح تعاون کر سکتا ہوں؟"

"صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری ٹرانسفارمر مشین کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہ کرو۔"

"تمہاری وہ مشین مہینے دو مہینے میں تیار ہو جائے گی۔ مجھ سے تمہاری دوستی اور وفاداری کی مدت بھی دو ماہ کی ہو گی۔ مشین تیار ہوتے ہی تمہارے اندر کی یہودی عورت بیدار ہو جائے گی۔"

"پلیز ایسا نہ کہو۔"

"پہلے وفاداری ثابت کرو پھر ٹرانسفارمر مشین تیار کرو۔"

"اتنی جلدی کس طرح ثابت کروں؟ کس معاملے میں وفاداری کا مظاہرہ کروں؟"

"آئندہ ایک برس تک کئی معاملات درپیش ہوں گے۔ ان تمام معاملات میں میری دوست اور وفادار رہو گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا تو پھر میں تمہاری ٹرانسفارمر مشین کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔"

وہ بے اختیار چیخ کر بولی "ایک برس؟ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک برس تک تمہاری غلامی کرتی رہوں اس کے بعد ٹرانسفارمر مشین تیار کروں؟"

"اصولی بات ہے۔ پہلے دوستی اور وفاداری کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔"

"تم بڑے وہ ہو۔ پلیز مذاق نہ کرو۔"

"اگر یہ مذاق ہے تو بتاؤ' دوستی اور وفاداری کیسے ثابت کرو گی؟"

"جب دوستی رہے گی۔ رابطہ رہا کرے گا تو میں وفاداری ثابت کرتی رہوں گی؟"

"میں اس وفاداری کی بات کر رہا ہوں' جسے مشین کی تیاری کے بعد قائم رہنا چاہیے۔ یہ تمہارا آج تک کا ریکارڈ ہے کہ اپنا کام نکالتے ہی نظریں پھیر لیتی ہو۔"

"اب ایسا نہیں کروں گی۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"ایک برس تک یقین دلانے کے بہت سے مواقع ملتے رہیں گے۔"

"تم چاہتے ہو' اس کے بعد میں مشین تیار کراتی رہوں۔ اس ایک برس میں مشین کا ماہر جیکی ہنٹر مر سکتا ہے یا دشمن اسے ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس مشین کا نقشہ مجھ سے چھین لیا جا سکتا ہے۔"

"میں ایک برس تک جیکی ہنٹر اور نقشے کی حفاظت کروں گا۔ جیکی ہنٹر طبعی موت مرے گا تو میں تمہاری وہ ٹرانسفارمر مشین تیار کروں گا۔"

"تم مجھے ٹال رہے ہو۔ ٹرانسفارمر مشین تیار کرنا آسان نہیں ہے اگر تم مکینک ہو' تب بھی ایک عام مکینک یہ مشین تیار نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اور علی نے بابا صاحب کے ادارے میں یہ مشین تیار کی تھی اور علی یہی مشین تیار کرنے چین پہنچ رہا ہے۔"

"پھر تو یہ زیادتی ہے کہ یہ مشین چین کو فراہم کرو اور مجھے نہ کرو۔"

"ہمارے چینی بھائی طوطا چشم نہیں ہیں۔ آگے کا حال خدا جانتا ہے۔ تمہارا حال شیطان بھی جانتا ہے۔ اپنے حال پر خود رحم کرو۔ ایک برس میں اپنی عادتیں درست کرو۔ اس کے بعد مشین تیار کرو۔"

"یہ کیا تم نے ایک برس کی رٹ لگائی ہے؟ گھنٹے بھر سے تمہاری خوشامدیں کر رہی ہوں۔ تم کہو گے تو ساری زندگی خوشامدیں کرتی رہوں گی لیکن ایک ماہ کے اندر ٹرانسفارمر مشین تیار کراؤں گی۔"

"الپا! ہر چیز کے پیدا ہونے اور فنا ہونے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ تم کیا جانو کہ تمہاری ٹرانسفارمر مشین کب پیدا ہو گی؟ اور پیدا ہو بھی سکے گی یا نہیں؟"

"میں خوب سمجھ رہی ہوں' تم ڈھکے چھپے الفاظ میں چیلنج کر رہے ہو کہ مجھے مشین تیار کرنے نہیں دو گے؟"

"میں کسی کو خوش نصیب یا بدنصیب بنانے کا احمقانہ چیلنج نہیں کرتا۔ میں تمہیں بیوی بنا کر تمہارے نصیب نہیں بدل سکا۔ اب بھلا کیسے بدل سکتا ہوں؟ جو پیش آنا ہے' وہ تمہارے نصیب سے آئے گا۔"

وہ جھنجلا کر بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا' میں زندگی کی سب سے اہم کامیابی حاصل کرنے والی ہوں اور ایسے وقت تم یہاں مرنے کیوں آگئے ہو؟"

"میں پیرس میں جی رہا ہوں۔ تمہارے تل ابیب میں مرنے نہیں آیا ہوں۔"

"میں ابھی معلوم کر لوں گی کہ تم کہاں ہو؟ مجھے کمزور نہ سمجھنا' اگر تم میرے ملک کے کسی بھی حصے میں پائے جاؤ گے تو میں تمہاری راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دوں گی۔"

"اب وہ جوانی کہاں رہی کہ راتوں کی نیندیں اڑا سکو۔ ذرا آئینہ دیکھو' ڈھل چکی ہو۔"

وہ اس کے دماغ سے نکل آئی۔ جیکب رابن کے پاس پہنچ کر بولی "تم نے ایک بار اپنے کالے جادو سے معلوم کیا تھا کہ میرا دشمن نارنگ کہاں چھپا ہوا ہے۔"

جیکب رابن نے کہا "یس میڈم! وہ نارنگ چالیس دنوں کی تپسیا کر رہا تھا۔ بھیما نے کالے جادو سے اس کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچ دیا تھا۔ اس دائرے کے اندر میرے جادو نے اس پر اثر نہیں کیا تھا لیکن یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بھارت میں ہے۔"

"اب یہ معلوم کرو کہ۔ پارس کہاں ہے؟"

"میڈم! یہ کالا عمل بہت مشکل ہے۔ ذرا وقت لگے گا۔ میں دو گھنٹے تک اس کا سراغ لگا سکوں گا۔"

"میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ مسلسل عمل کرتے رہو۔ اس کا سراغ ملتے ہی اسے اپنے زیر اثر لاؤ اگر اس کے دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکو تو اسے جسمانی طور پر نقصان پہنچاؤ۔ میں بھی کسی کو آلہ کار بنا کر اسے ختم کر دوں گی۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ زندہ رہے گا تو مجھے مشین تیار کرانے نہیں دے گا۔ اسے مرنا ہے۔ ہر حال میں مرنا ہے۔"

"میڈم! آپ دیکھ رہی ہیں، میں کالا عمل شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ دو گھنٹے کے اندر آپ کے قدموں میں ہو گا۔"

الپا اس کے دماغ میں رہ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ پارس کے خلاف کالا جادو شروع کر رہا تھا۔ اسے کسی حد تک اطمینان ہوا۔ وہ اتنا سمجھتی تھی کہ کالے جادو کے ذریعے پارس کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، اس کا سراغ ضرور ملے گا کہ وہ کس ملک، کس شہر اور کس علاقے میں ہے۔

الپا کے لیے اتنا ہی بہت ہوتا۔ اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہوتے ہی وہ کسی آلہ کار کے ذریعے اسے گولی مار سکتی تھی اور اگر اس کے مقدر میں زندگی ہوتی تو اسے کم از کم اپاہج ضرور بنا سکتی تھی۔

زندہ رہنے کے لیے سانسیں لیتے رہنا ضروری ہے لیکن موجودہ حالات میں الپا کے لیے ٹرانسفارمر مشین لازمی تھی۔ وہ مشین تیار نہ ہوتی تو اس کا دم نکل جاتا۔ وہ مشین اسے نئی توانائیاں، نئی صلاحیتیں، نئی حکمرانی اور رعب و دبدبہ دینے والی تھی۔ یہ سب کچھ اسی وقت حاصل ہوتا، جب پارس زندگی ہار جاتا یا اپاہج اور معذور ہو جاتا یا اس کے راستے سے ہٹ جاتا۔

وہ ہٹنے والا نہیں تھا اور وہ جان کی بازی لگا کر اسے ہٹانے والی تھی۔

○☆○

تھری جے کے تینوں دوست ایک دوسرے سے بے مثال دوستی کا ثبوت دیتے آ رہے تھے۔ ان تینوں میں جے کافو بڑی ذمے داریاں پوری کرتا رہتا تھا۔ وہ عاشق مزاج نہیں تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں جے سامو اور جے فلو کو سمجھایا کرتا تھا کہ عشق و محبت کے جذبات کو دل میں جگہ نہ دیں۔ کوئی پسند آ جائے تو اس سے عارضی دوستی کریں۔ اپنے گلے کا پھندا کبھی نہ بنائیں۔

لیکن ان دونوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مونا اور ہیلو ریٹا سے شادیاں کیں۔ جے کافو نے ان شادیوں کے برے نتائج کا انتظار نہیں کیا۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی اس نے ہیلو ریٹا کو ایک کار کے حادثے سے دو چار کرایا۔ وہ مر گئی۔ اس نے مونا کو جے سامو سے دور کر دیا۔ اس طرح دور کیا کہ مونا پر تنویمی عمل کیا۔ اس کے دماغ کو لاک کیا۔ جس کے نتیجے میں جے سامو خیال خوانی کے باوجود مونا کو تلاش نہ کر سکا۔

جے کافو نے دوست ہو کر دونوں دوستوں کے دلوں کی دنیا اجاڑ دی۔ دونوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جے کافو نے ان کی محبوباؤں سے دشمنی کی ہے۔ اس نے حقیقتاً دانائی کا ثبوت دیا تھا۔ ان دونوں دوستوں کے ساتھ ہمیشہ کامیابی سے روپوش رہنے اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے ہی دوستوں اور ان کی محبوباؤں سے دشمنی لازمی تھی۔

بہر حال جے فلو کو صبر آ گیا تھا۔ اس کی محبوبہ ہیلو ریٹا مر گئی تھی لیکن مونا زندہ تھی۔ کہیں گم ہو گئی تھی جے سامو کو صبر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ پریشانی سے سوچتا رہتا تھا کہ نہ جانے اس کی مونا کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ جے کافو اور جے فلو اسے سمجھاتے رہتے تھے۔ یہ اندیشہ تھا کہ جے سامو کسی اہم معاملے میں خیال خوانی کے دوران میں کوئی غلطی کرے گا تو چالاک دشمن ان کا پتا ٹھکانا معلوم کر لیں گے۔ ایک عاشق دیوانہ اپنے دونوں دوستوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں جے کافو نے پھر ایک چال چلی۔ بنی نام کی ایک حسین لڑکی پر تنویمی عمل کیا۔ جے سامو کو اس کا آئیڈیل بنایا۔ اس حسینہ بنی نے خواب میں دیکھا کہ وہ اتوار کو چرچ جائے گی تو وہاں اس کے آئیڈیل سے ملاقات ہو گی۔

جے سامو ہر اتوار کو اس چرچ میں عبادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ اسی لیے جے کافو نے بنی کو خواب میں اس چرچ کا منظر دکھایا تھا۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اسی طرح وہ بنی کے ذریعے مونا کے سحر کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ بے شک اس نے ایسی حکمت عملی اختیار کی تھی کہ جے سامو جیسے عاشق کا دل ایک کھلونا گم ہونے کے بعد دوسرے کھلونے سے بہل جاتا۔

اس کے بعد جے فلو دوسرے اہم معاملے میں مصروف

ہو گیا۔ ان تینوں نے یہ اہم فیصلہ کیا تھا کہ جے کافو ذہین اور باصلاحیت افراد کو تلاش کرے گا۔ تعویذ عمل کے ذریعے انہیں اپنا معمول اور محکوم بنائے گا پھر انہیں ٹرانسفارمر مشین کے ذریعے ٹیلی پیتھی سکھائے گا۔ اس طرح وہ تھری جے بڑی رازداری سے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی فوج بناتے رہیں گے۔

بارہ افراد نے رازداری سے ٹرانسفارمر مشین تیار کی تھی۔ جیکی ہنٹر کے اغوا ہوتے ہی وہ اس مشین کو دوسرے خفیہ اڈے میں منتقل کر رہے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ الپا، جیکی ہنٹر کو اغوا کرانے کے بعد اس کے چور خیالات پڑھ کر ان کے بارے میں اور مشین کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر رہی ہوگی۔ لہٰذا وہ مشین کے مختلف پارٹس کھول کر دوسرے خفیہ اڈے میں پہنچا کر وہاں دوبارہ اس مشین کو مکمل کر رہے تھے۔

اس مشین کی دوبارہ تکمیل تک جے کافو نے تین ایسے صحت مند جوانوں کا انتخاب کیا، جو نہایت ذہین ہونے کے علاوہ بہترین فائٹر بھی تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق اسپین سے تھا اور بقیہ دو جوانوں کی رہائش لندن میں تھی۔ وہ ایسے ہی صحت مند اور ذہین افراد کی تلاش میں یورپ کے مختلف ملکوں میں تنہا سفر کر رہا تھا۔ لندن کے ہائیڈ پارک میں ایک ہندوستانی حسینہ سے سامنا ہوا۔ وہ ایک جگہ کھڑا خیال خوانی کے ذریعے جے فلو سے ایک اہم بات کر رہا تھا۔ جبکہ وہ عوامی مقامات پر کبھی خیال خوانی نہیں کرتا تھا۔ صرف ایک منٹ ایسا کرنے کے بعد وہ دماغی طور پر حاضر ہوا تو سامنے وہ حسینہ کھڑی ہوئی تھی اور... سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے بھی حسینہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوچھا "ویل مس! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہی میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ تم ایسے گم صم کھڑے ہوئے ہو جیسے بھولا ہوا راستہ یاد کر رہے ہو۔ میں تمہیں گائیڈ کر سکتی ہوں۔"

بعض لوگ آدم بیزار ہوتے ہیں۔ جے کافو حوا بیزار تھا۔ عورتوں سے ہمیشہ دور رہتا تھا۔ وہ مونا اور ہیلو ریٹا کو اپنے ساتھیوں سے دور کر چکا تھا۔ اب اسے اس ہندوستانی حسینہ سے بھی دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن پہلی بار اس نے ایک نامعلوم سی کشش محسوس کی۔ پہلی بار علم ہوا کہ دنیا کی تمام حسین عورتوں کا سیلہ لگ جائے، تب بھی کسی حسینہ پر دل نہیں آتا۔ دراصل دل آنے کی بات ہے۔ کسی خاص کے لیے خاص قدرتی کشش ہوتی ہے۔ ایسی خاص کشش کے سامنے جے کافو جیسے سخت اصول پسند بھی دل ہار جاتے ہیں۔

وہ بولا "مجھے اپنے ہوٹل کا راستہ یاد ہے۔ ویسے میں پہلی بار لندن آیا ہوں۔ سوچتا ہوں، تنہا شہر میں گھومتا رہوں گا تو بھٹک جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں بے اختیار اس حسینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دل کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ وہ بولی "صاف کیوں نہیں کہتے کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہو۔"

وہ چونک گیا۔ جو بات وہ سوچ رہا تھا، وہی بات وہ زبان سے کہہ رہی تھی۔ کیا وہ ٹیلی پیتھی جانتی ہے؟

"نہیں... اگر وہ دماغ میں آتی تو بے کافو اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس کر لیتا۔ اس نے پوچھا "تم کون ہو؟ تم نے میرے دل کی بات کیسے سمجھ لی؟"

"یہ تمہارے دل کی بات نہیں تھی۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ ارادہ کرتے ہی تمہاری پیشانی کو دیکھا تو یہی ارادہ تمہارے دماغ میں پیدا ہو گیا۔ تم نے بھی یہی سوچا کہ میرے ساتھ وقت گزارنا چاہیے۔"

یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ وہ جو سوچتی تھی۔ ایسا ہی کچھ سوچنے کے لیے دوسروں کو مجبور کر دیتی تھی۔ جبکہ وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتی تھی۔ جے کافو نے اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ یوگا کا ماہر تھا۔ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ خیال خوانی کرنا نہیں جانتی ہے۔

وہ اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے اس کے دماغ میں پہنچنا چاہتا تھا لیکن دماغ میں یہ بات آئی کہ پہلے اس حسینہ سے متعارف ہونا چاہیے۔ اپنے بارے میں کچھ بتایا جائے گا تو وہ بھی اپنے بارے میں کچھ بتائے گی۔

پھر اس نے سوچا "اس کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں اس کے چور خیالات پڑھ کر بہت کچھ معلوم کر لوں گا۔"

وہ بولی "تم اپنے بارے میں کچھ بتانا کیوں نہیں چاہتے؟ کیا اس بات سے پریشان ہو کہ جو بات میں سوچتی ہوں، وہی بات تمہیں کیسے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہوں؟"

"میں یہی سمجھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنا خیال، اپنا ارادہ میرے اندر کیسے پیدا کرتی ہو۔ کیا ٹیلی پیتھی جیسا کوئی علم جانتی ہو؟"

"میں کسی طرح کا کوئی علم نہیں جانتی ہوں۔ میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی قوت ہے۔ میں کسی کی پیشانی پر نظریں جما کر جو بات سوچتی ہوں، وہی بات وہ سوچنے لگتا ہے۔ دیکھو، ابھی میں خاموش ہو کر تمہاری پیشانی کو تکنے اور ایک ارادہ کرنے والی ہوں۔ اس کا نتیجہ ابھی سامنے آئے گا۔"

وہ اس کی پیشانی کو تکنے لگی۔ اس نے بے اختیار کہا



"میرا نام جے کافو ہے۔"

اتنا کہتے ہی وہ ایک دم سے سنبھل گیا۔ اس نے عوامی ظالمانہ میں آگر کبھی کسی کو اپنا اصلی نام نہیں بتایا تھا۔ اس وقت بے اختیار اس کی زبان پر اپنا نام آگیا تھا۔

وہ بولی "میں نے تمہارا نام معلوم کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے تمہاری پیشانی کو دیکھا۔ تم نے فوراً ہی اپنا نام بتا دیا۔ کیا اب تمہیں یقین آیا کہ میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی قوت ہے؟"

"یقین آگیا۔ تم بہت خطرناک ہو۔ اپنی نگاہوں سے ملتا ہوا، پہنچتا ہوا ارادہ کسی کے بھی دماغ میں پہنچا کر اس کے اندر کی باتیں معلوم کر لیتی ہو۔ تم کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟"

"میرا نام شیوانی بھاسکر ہے۔ انڈیا سے آئی ہوں۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ جہاں چاہتی ہوں رہ جاتی ہوں۔ مہنگے سے مہنگا لباس پسند آئے تو اسے خریدتی نہیں، مگر پہن لیتی ہوں۔"

"جب خریدتی نہیں ہو تو پہن کیسے لیتی ہو؟"

"دکان دار کی پیشانی کو دیکھ کر پسندیدہ لباس پہننے کا ارادہ کرتی ہوں۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہی لباس لا کر مجھے دے دیتا ہے۔ میرے آراؤں کے مطابق بڑے بڑے ہوٹلوں کے مالکان مجھ سے کمروں کا کرایہ اور کھانے کا بل نہیں لیتے ہیں۔ تم ابھی میرے ساتھ لنچ کرو گے۔"

وہ انکار کرتے کرتے رک گیا۔ شیوانی اس کی پیشانی کو تک رہی تھی۔ وہ بے اختیار اس کے ارادے کے مطابق بولا "ہاں تمہارے ساتھ لنچ کروں گا۔"

وہ راضی تو ہو گیا مگر پریشان بھی ہو گیا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار ایک حسینہ کے زیر اثر آرہا ہے۔ پریشانی یہ تھی کہ وہ ایک عاشق کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرماں بردار کی حیثیت سے اس کی باتیں مان رہا تھا۔

اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ بہت دیر سے اس کے دماغ میں جاگزیں خیالات پڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن شیوانی کے ارادوں میں الجھتا جا رہا تھا۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "وہ کوئی بلا ہے۔ صرف اس کی آنکھوں میں غیر معمولی قوت نہیں ہے۔ اس کے اندر اور بھی کچھ ہے۔"

اس بار اس نے مستحکم ارادہ کیا۔ خیال خوانی کی پرواز کی اور پھر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔

انسانی دماغ میں خلا نہیں ہوتا۔ یعنی دماغ کبھی خالی نہیں رہتا۔ وہاں مختلف خیالات کی بھرمار رہتی ہے۔ انسان ان میں سے صرف شعوری خیالات کو سمجھتا ہے۔ باقی تمام خیالات لاشعور اور تحت الشعور کے خانوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ شیوانی کے دماغ میں شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری تمام خیالات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کوئی انفرادی خیال واضح نہیں تھا۔ ایک خیال دوسرے سے، دوسرا خیال تیسرے سے اور چوتھے سے ٹکرا رہا تھا۔ یوں کئی خیالات ایک دوسرے میں جذب ہو رہے تھے۔

جے کافو ایک خیال پڑھنا چاہتا تو ایسے وقت دوسرا خیال اس میں شامل ہو کر کوئی نیا بات پیدا کر رہا تھا۔ اس نے جو خیالات پڑھے، وہ کچھ یوں تھے "میرا نام شیوانی بھاسکر... میں تجھ کو بھگا لاؤں گی، تیرے گھر سے... تو مر جائے گا، میرے باپ کے ڈر سے... میری عمر پورے بیس... میں ستر برس کے بعد مروں گی۔ گنگو پر سادمر گیا۔ مجھے مارنے کا ارادہ نہ کرتے تو وہ لوگ نہ مرتے... جینا یہاں، مرنا یہاں، اور ہمیں جانا کہاں..."

جے کافو پریشان ہو گیا۔ کوئی خیال ایک جگہ نہیں ٹھہر رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا خیال حاوی ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا "تم خاموش کیوں ہو؟ کیا میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"کیا تم اپنے بارے میں سچ بتا سکتی ہو کہ کون ہو؟ کیا تنہا ہو یا رشتے دار، دوست احباب وغیرہ بھی ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو تنہا کیوں رہتی ہو؟ کس طرح کی زندگی گزارتی رہتی ہو؟"

"میں اپنا نام بتا چکی ہوں۔ میرے رشتے دار بھی ہوں گے۔ دوست بھی ہوں گے۔ فی الحال وہ مجھے یاد نہیں ہیں اور نہ میں یاد کرنا چاہتی ہوں اور تم نے کیا پوچھا ہے؟"

"تم تنہا زندگی کیوں گزار رہی ہو؟"

"یوں تنہا زندگی گزارنے سے دنیا والوں کو تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ کیا تمہیں ہو رہی ہے؟"

"میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بھلا مجھے کیوں تکلیف ہوگی؟"

"واسطہ رہے گا، تب بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ البتہ تم خود کوئی مصیبت مول لو گے تو یہ تمہاری نادانی ہوگی۔"

"میں ابھی اس ملاقات کو پہلی اور آخری ملاقات بنا رہا ہوں اور اب جا رہا ہوں۔"

"کیوں جا رہے ہو؟ کیا میں تمہارے لیے پرابلم بن رہی ہوں؟"

"پرابلم بن سکتی ہو۔ تم نے میرے کسی سوال کا معقول جواب نہیں دیا۔ صرف نام بتایا۔ ماں باپ اور رشتے داروں کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"کیا تم نے بتایا کہ تمہارے ماں باپ اور رشتے دار کون ہیں؟ کیا میں نے تم سے پوچھا؟ نہیں... میں نے نہیں پوچھا۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ یا بہت کچھ معلوم کر کے کیا حاصل کر لیں گے؟"

"میں کسی اجنبی مرد یا عورت سے ملنا پسند نہیں کرتا۔"

"تم نے میرے ساتھ لنچ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"میں لنچ کے لیے وقت نہیں نکال سکوں گا۔"

"پھر تو یہ میری انسلٹ ہوگی۔ تم میرے لیے چیلنج بن جاؤ گے۔"

"اگر میں چیلنج بن جاؤں تو کیا کرو گی؟"

"تمہیں سمجھاؤں گی کہ مصیبت کو دعوت نہ دو۔ کسی کے لیے چیلنج نہ بنو۔ اس طرح دوست نہیں، دشمن پیدا ہوتے ہیں۔ میں درست کہہ رہی ہوں نا؟"

وہ اس کی پیشانی کو دیکھ کر بول رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ جب وہ دیکھتی تھی تو پیشانی میں ہلکی سی جلن پیدا ہوتی تھی پھر پورے جسم میں حرارت سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے حرارت محسوس کرتے ہوئے کہا "درست کہہ رہی ہو۔ کسی کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔"

اس نے اس کی گہراتی ہوئی نظروں کے زیر اثر رہ کر اس کی مرضی کے مطابق کہہ دیا کہ کسی کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ حقیقت پریشان کر رہی تھی کہ اس کی خوب صورت اور خطرناک آنکھیں اسے اپنا معمول بنا لیتی ہیں۔

اب تک یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ ٹیلی پیتھی کی دنیا میں جو معمول بنتے ہیں، وہ پھر اپنے اختیار میں نہیں رہتے لیکن شیوانی کے سامنے بات مختلف تھی۔ جب وہ نظروں سے گرما رہی تھی۔ تب وہ فرماں بردار بن رہا تھا۔ اس کے بعد آزادی سے اپنی مرضی سے شیوانی کے خلاف سوچ رہا تھا۔ وہ واقعی ٹیلی پیتھی نہیں جانتی تھی اگر جانتی تو بے کانفو کے دماغ میں آکر اسے اپنے خلاف سوچنے کی اجازت نہیں دیتی۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے بے فلو سے کہا "میرے دماغ میں آؤ۔ ایک عجیب و غریب انڈین لڑکی میرے لیے مصیبت بن رہی ہے۔"

بے فلو اسی وقت خیال خوانی کے ذریعے بے کانفو کے دماغ میں آگیا۔ اس کے خیالات پڑھتے ہوئے شیوانی کے بارے میں معلوم کرنے لگا اور اس حسینہ کی باتیں بھی سننے لگا۔

وہ پوچھ رہی تھی "تم میرے ساتھ لنچ کرنا کیوں نہیں چاہتے؟"

"میں دوسری جگہ مصروف ہوں پھر کبھی ملاقات ہوگی تو ہم کہیں ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔"

اس نے پھر اپنی پیشانی پر گرمی محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی پورے جسم کے اندر حرارت ہونے لگی۔ وہ بولی "اگر مصروف نہیں ہو تو سچ کہہ دو۔ جھوٹ نہ بولو۔"

اس نے بے اختیار کہا "میں کہیں مصروف نہیں ہوں۔"

پھر وہ سوچ کے ذریعے بولا "یار فلو! دیکھو، میں سچ نہیں بولنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں نے مجھے سچ بولنے پر مجبور کر دیا۔"

بے فلو نے کہا "سنا تھا کہ حسین آنکھیں دلوں میں اتر جاتی ہیں لیکن یہ آنکھیں تو دماغی ارادے بدلنے کی طاقت رکھتی ہیں۔"

شیوانی نے کہا "تم بہت اچھے ہو، تم نے سچ کہہ دیا۔ آؤ۔ ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں چلیں۔"

وہ شیوانی کے ساتھ جانے لگا۔ بے فلو نے کہا "اس کے ساتھ لنچ کرو۔ وقت گزارو۔ ہم اس حسینہ کو سمجھنے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے، اس کی کوئی کمزوری ہمیں معلوم ہو جائے۔"

وہ اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ شیوانی کار ڈرائیو کرنے لگی۔ بے کانفو نے کہا "ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہونا چاہیے۔ پلیز مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ تمہاری آنکھوں میں کیا جادو ہے؟ جب تم مجھے ایک خاص انداز سے دیکھتی ہو تو میں تمہاری مرضی کے مطابق تمہاری ہر بات مان لیتا ہوں۔"

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے، ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی ہوئی بولی "تمہارے اس سوال کا جواب مجھے خود کبھی نہیں ملا۔ بچپن میں میرے ماں باپ پریشان ہو جاتے تھے۔ میں ماں کو دیکھتی تھی تو وہ میرے باپ سے جھوٹ نہیں بول پاتی تھی۔ باپ کو دیکھتی تھی تو وہ میری ماں سے یہ بات چھپا نہیں پاتا تھا کہ وہ گھر سے باہر کسی دوسری عورت کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی بولی "ہم دیوی ماں کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ بے چارے سمجھتے تھے کہ میرے اندر ماں جگدمبے سما گئی ہے اور وہ دیوی ماں میرے ذریعے ان کا جھوٹ سچ ظاہر کرتی رہتی ہے۔"

"کیا صرف تمہارے ماں باپ تم سے پریشان تھے؟"

"محلے پڑوس والے بھی مجھ سے ڈرتے تھے۔ مجھ سے کبھی کوئی ضروری بات کرتے تھے پھر دور دور رہنے لگتے تھے۔ میں کتنے ہی جھوٹوں اور دغابازوں کا پول کھولتی رہتی تھی۔ اسکول سے لے کر کالج تک تمام اسٹوڈنٹس، ٹیچرز اور پروفیسرز وغیرہ مجھ سے ڈرتے بھی تھے، مجھے چاہتے بھی تھے۔ فرسٹ ائر کے بعد مجھے کالج سے چھٹی دے دی گئی۔"

"کیا تم آگے پڑھنا نہیں چاہتی تھیں؟"

"انہوں نے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں



امتحانات میں تمام سوالات کے جواب اپنی آنکھوں کی قوت سے معلوم کر لیتی تھی۔"

"کیسے معلوم کر لیتی تھیں؟ امتحانات میں ایک ہی ممتحن کا اس میں نگرانی کرتا ہے۔ تمہارا کوئی پروفیسر تمہارے سامنے نہیں رہتا ہوگا پھر تم اپنے کسی پروفیسر کی پیشانی کو کیسے دیکھ لیتی تھیں؟"

"ظاہر ہے، وہ سامنے نہیں ہوتا تھا، میں اسے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر تصور میں دیکھتی تھی۔ میری نگاہیں اس کی پیشانی تک پہنچتی تھیں۔ وہ سوالات کے جوابات بولنے لگتا تھا، میں لکھتی چلی جاتی تھی۔"

اس نے ہوٹل شیرٹن کے پارکنگ ایریا میں کار روک دی۔ بے کانفو نے پریشان ہو کر پوچھا "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے نہیں رہوں گا، تب بھی تمہاری نگاہیں میری پیشانی تک پہنچیں گی؟"

وہ دونوں کار سے باہر آئے۔ ہوٹل کے اندر جانے لگے۔ شیوانی کہہ رہی تھی "تم دنیا کے آخری سرے پر بھی ہو گے تو تمہارا چہرہ یاد رہے گا۔ میری نگاہیں تمہاری پیشانی تک پہنچتی رہیں گی۔"

بے کانفو زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ سے خوف کھانے لگا۔ بے فلو نے کہا "یار! یہ ایک طرح سے ٹیلی پیتھی جانتی ہے۔ ہم بھی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی کے بھی دماغ میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"اس کی سوچ کی لہریں دماغ میں نہیں پہنچتی ہیں۔ میں نے اب تک اسے اپنے اندر محسوس نہیں کیا ہے پھر... ہم اس کے خلاف باتیں کر رہے ہیں اور وہ ہماری باتوں سے اور تمہاری موجودگی سے بے خبر ہے۔"

وہ شیوانی کے ساتھ ڈائننگ ہال میں آیا۔ وہ دونوں ایک میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ بے کانفو نے کہا "تم میری پیشانی پر نظر ڈالتی ہو اور مجھ سے سچ اگلوا لیتی ہو۔ میں تم سے کیسے سچ اگلوا سکتا ہوں؟"

"میں جھوٹ بولوں تو سچ اگلوانے کی بات کرو۔ میں نے اب تک کیا جھوٹ کہا ہے؟"

"تم اپنی آنکھوں سے نہیں، ٹیلی پیتھی کے ذریعے میرے دماغ پر حاوی ہو کر سچ اگلوا رہی ہو۔"

"دو برس پہلے ایک بوڑھے راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ میں ٹیلی پیتھی جانتی ہوں۔ میں اسے یقین نہ دلا سکی۔ اب تمہیں بھی یقین نہیں دلا سکوں گی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں کسی خوف کے بغیر سچ کہتی ہوں۔ میں ٹیلی پیتھی نہیں جانتی ہوں۔"

شیوانی مینو پڑھ کر کھانے کا آرڈر دینے لگی۔ ویٹر آرڈر نوٹ کرنے کے دوران میں بولتا جا رہا تھا۔ بے فلو نے کہا "یار! ہم نہیں جانتے یہ کتنی سچی ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی یہ تم پر حاوی ہو چکی ہے۔ کسی طرح مجھ تک پہنچ جائے گی۔ ایسی پراسرار لڑکی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں مگر کیسے چھڑاؤں؟ میں جہاں جاؤں گا، اس کی آنکھیں میرا پیچھا کریں گی۔"

"یہی ایک آزمودہ نسخہ ہے کہ ابھی اسے اعصابی کمزوری میں مبتلا کیا جائے پھر اس پر تنویمی عمل کر کے اسے اپنی کنیز بنا لیا جائے۔"

"اس کے دماغ میں خیالات گڈمڈ رہتے ہیں۔ شعوری سوچ واضح رہے گی۔ تب اس سوچ کو گرفت میں لے کر تنویمی عمل کیا جا سکے گا۔"

"جب وہ اعصابی کمزوری میں مبتلا رہے گی۔ دماغ کمزور رہے گا تو دماغ کے اندر مختلف خیالات بھی کمزور رہیں گے۔ ایسے وقت شعوری سوچ کو گرفت میں لے کر ہم بہت کچھ کر سکیں گے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ بے کانفو کے دماغ سے باہر آئے۔ ہوٹل کے اندر جانے لگے۔ شیوانی کہہ رہی تھی "تم دنیا کے آخری سرے پر بھی ہو گے تو تمہارا چہرہ یاد رہے گا۔ میری نگاہیں تمہاری پیشانی تک پہنچتی رہیں گی۔"

بے کانفو زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ سے خوف کھانے لگا۔ بے فلو نے کہا "یار! یہ ایک طرح سے ٹیلی پیتھی جانتی ہے۔ ہم بھی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی کے بھی دماغ میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"اس کی سوچ کی لہریں دماغ میں نہیں پہنچتی ہیں۔ میں نے اب تک اسے اپنے اندر محسوس نہیں کیا ہے پھر... ہم اس کے خلاف باتیں کر رہے ہیں اور وہ ہماری باتوں سے اور تمہاری موجودگی سے بے خبر ہے۔"

وہ شیوانی کے ساتھ ڈائننگ ہال میں آیا۔ وہ دونوں ایک میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ بے کانفو نے کہا "تم میری پیشانی پر نظر ڈالتی ہو اور مجھ سے سچ اگلوا لیتی ہو۔ میں تم سے کیسے سچ اگلوا سکتا ہوں؟"

"میں جھوٹ بولوں تو سچ اگلوانے کی بات کرو۔ میں نے اب تک کیا جھوٹ کہا ہے؟"

"تم اپنی آنکھوں سے نہیں، ٹیلی پیتھی کے ذریعے میرے دماغ پر حاوی ہو کر سچ اگلوا رہی ہو۔"

"دو برس پہلے ایک بوڑھے راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ میں ٹیلی پیتھی جانتی ہوں۔ میں اسے یقین نہ دلا سکی۔ اب تمہیں بھی یقین نہیں دلا سکوں گی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں کسی خوف کے بغیر سچ کہتی ہوں۔ میں ٹیلی پیتھی نہیں جانتی ہوں۔"

شیوانی مینو پڑھ کر کھانے کا آرڈر دینے لگی۔ ویٹر آرڈر نوٹ کرنے کے دوران میں بولتا جا رہا تھا۔ بے فلو نے کہا "یار! ہم نہیں جانتے یہ کتنی سچی ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی یہ تم پر حاوی ہو چکی ہے۔ کسی طرح مجھ تک پہنچ جائے گی۔ ایسی پراسرار لڑکی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں مگر کیسے چھڑاؤں؟ میں جہاں جاؤں گا، اس کی آنکھیں میرا پیچھا کریں گی۔"

"یہی ایک آزمودہ نسخہ ہے کہ ابھی اسے اعصابی کمزوری میں مبتلا کیا جائے پھر اس پر تنویمی عمل کر کے اسے اپنی کنیز بنا لیا جائے۔"

"اس کے دماغ میں خیالات گڈمڈ رہتے ہیں۔ شعوری سوچ واضح رہے گی۔ تب اس سوچ کو گرفت میں لے کر تنویمی عمل کیا جا سکے گا۔"

"جب وہ اعصابی کمزوری میں مبتلا رہے گی۔ دماغ کمزور رہے گا تو دماغ کے اندر مختلف خیالات بھی کمزور رہیں گے۔ ایسے وقت شعوری سوچ کو گرفت میں لے کر ہم بہت کچھ کر سکیں گے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ بے کانفو کے دماغ سے باہر آئے۔ ہوٹل کے اندر جانے لگے۔ شیوانی کہہ رہی تھی "تم دنیا کے آخری سرے پر بھی ہو گے تو تمہارا چہرہ یاد رہے گا۔ میری نگاہیں تمہاری پیشانی تک پہنچتی رہیں گی۔"

بے کانفو زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ سے خوف کھانے لگا۔ بے فلو نے کہا "یار! یہ ایک طرح سے ٹیلی پیتھی جانتی ہے۔ ہم بھی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی کے بھی دماغ میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"اس کی سوچ کی لہریں دماغ میں نہیں پہنچتی ہیں۔ میں نے اب تک اسے اپنے اندر محسوس نہیں کیا ہے پھر... ہم اس کے خلاف باتیں کر رہے ہیں اور وہ ہماری باتوں سے اور تمہاری موجودگی سے بے خبر ہے۔"

وہ شیوانی کے ساتھ ڈائننگ ہال میں آیا۔ وہ دونوں ایک میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ بے کانفو نے کہا "تم میری پیشانی پر نظر ڈالتی ہو اور مجھ سے سچ اگلوا لیتی ہو۔ میں تم سے کیسے سچ اگلوا سکتا ہوں؟"

"میں جھوٹ بولوں تو سچ اگلوانے کی بات کرو۔ میں نے اب تک کیا جھوٹ کہا ہے؟"

"تم اپنی آنکھوں سے نہیں، ٹیلی پیتھی کے ذریعے میرے دماغ پر حاوی ہو کر سچ اگلوا رہی ہو۔"

"دو برس پہلے ایک بوڑھے راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ میں ٹیلی پیتھی جانتی ہوں۔ میں اسے یقین نہ دلا سکی۔ اب تمہیں بھی یقین نہیں دلا سکوں گی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں کسی خوف کے بغیر سچ کہتی ہوں۔ میں ٹیلی پیتھی نہیں جانتی ہوں۔"

شیوانی مینو پڑھ کر کھانے کا آرڈر دینے لگی۔ ویٹر آرڈر

"تھینکس۔ تم میری آواز اور لہجے کو یاد رکھتی ہو۔"

"تم اپنا نام کیوں نہیں بتاتے؟ میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"تم یہ سوالات محبت سے کر سکتی ہو مگر ناگواری سے پوچھ رہی ہو۔ ایسا رویہ اختیار کرو گی تو میں سامنے کیسے آؤں گا۔"

"پلیز، جو کہنا ہے، سامنے آکر کہو۔"

"آل رائٹ۔ ایو میریا چرچ میں سامنا ہوگا۔"

بنی کے دل کی دھڑکنیں یک بارگی تیز ہو گئیں۔ اس نے چرچ میں ملنے کی بات کی تھی۔ گویا خواب کی تعبیر سنائی تھی۔ اس نے خوش ہو کر کہا "ہیلو! مسٹر! ہیلو!..."

اس نے بڑے جذبے سے مخاطب کیا تھا مگر دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ اسے ذرا مایوسی ہوئی مگر خوشی بھی ہوئی۔ اطمینان بھی ہوا کہ خواب حقیقت بن رہا تھا۔ وہ جیسے ہوا کے دوش پر پرواز کرتی ہوئی جانے لگی۔

کبھی خواب درست ہوتے ہیں لیکن تعبیر بھٹکا دیتی ہے۔ جے کافو نے بنی پر تنویمی عمل کر کے اسے جے سامو کی طرف مائل کیا تھا۔ بنی نے جے سامو کو دیکھا نہیں تھا لیکن چرچ میں جس سے ملاقات ہوتی، خواب کے مطابق وہی اس کا مطلوب ہوتا۔

جے کافو نے خواب میں چرچ کے اندر وہ تین سیٹیں بھی دکھائی تھیں، جہاں وہ تھری جے ہر اتوار کو عبادت کے دوران میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس اتوار کو صرف جے سامو ہوگا۔ وہاں بنی پہنچے گی تو یقیناً جے سامو سے ہی ملاقات ہوگی۔

بنی کو جے سامو کی طرف مائل کرنے سے پہلے اس کے چور خیالات اچھی طرح پڑھ لیے گئے تھے۔ یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ بنی کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور اس کے حلقہ احباب میں کوئی ایسا مشکوک فرد نہیں ہے، جس کا تعلق جرائم سے یا ٹیلی پیتھی کی دنیا سے ہو۔ وہ شکوک و شبہات سے بالاتر تھی۔ کوئی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے ذریعے جے سامو تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

انسان بدنصیبی سے بچنے کی تدابیر کرتا رہتا ہے۔ کبھی بچ جاتا ہے، کبھی ناکام بھی ہو جاتا ہے۔ اب جیسے تھری جے کی شامت آنے والی تھی۔ شاید ان کی روپوشی کا دور ختم ہونے والا تھا۔ جس رات جے کافو، بنی پر تنویمی عمل کرنے والا تھا۔ اس سے چھ گھنٹے پہلے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے سائن ہارورڈ نے بنی کو دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔

ٹیلی پیتھی جاننے والے آندرے کا ذکر ہو چکا ہے۔ آندرے کے پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والے ماتحت تھے اور وہ پانچوں اپنے سینیئر آندرے کے ساتھ امریکا سے چلے گئے تھے۔ امریکی اکابرین کی اطاعت سے انکار کرنے کے بعد وہ چھ ٹیلی پیتھی جاننے والے اپنی اپنی مرضی کے مطابق مختلف ملکوں میں رہائش اختیار کرنے چلے گئے تھے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھیں گے اور ایک دوسرے کے بُرے وقت میں مدد کریں گے۔

سائن ہارورڈ ان چھ میں سے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا تھا۔ تھری جے کی طرح آندرے اور اس کے پانچ ساتھی بھی بہت محتاط رہا کرتے تھے۔ سائن نے بنی کو دیکھا تو دل ہارنے کے باوجود صبر کیا۔ عقل نے سمجھایا، فوراً اس کے روبرو جانا اور اس سے متعارف ہونا نادانی ہوگی۔ پہلے دُور ہی دُور سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے۔

اس رات اس نے فون کے ذریعے بنی کی آواز سنی۔ بنی نے ریسیور اٹھا کر پوچھا "ہیلو کون ہے؟"

سائن ریسیور رکھ کر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ اس کے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر رہی تھی۔ ایسے وقت سائن کی سمجھ میں آیا کہ اس کے دماغ میں کوئی دوسرا بھی ہے اور وہ اسے گہری نیند سلا رہا ہے۔

چونکہ سائن خاموش تھا۔ اس لیے جے کافو اس کی موجودگی کو سمجھ نہ سکا۔ بنی پر تنویمی عمل کرتا رہا پھر اسے خواب میں چرچ کا اور ان مخصوص تین سیٹوں کا منظر دکھا کر یہ نقش کرتا رہا کہ وہ اگلے اتوار کو اپنے آئیڈیل سے ملنے چرچ جائے گی پھر اس نے جے سامو کی آواز لہجہ اس کے ذہن میں نقش کیا اور حکم دیا کہ اس مخصوص آواز اور لہجے کو وہ محسوس نہیں کرے گی۔ باقی تمام سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر انہیں اپنے دماغ سے نکال دیا کرے گی۔

جے کافو نے تنویمی عمل کے اختتام پر اسے تنویمی نیند سونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اسے اطمینان تھا کہ اب کوئی اس کے اندر نہیں آئے گا۔ اس نے تمام پہلوؤں سے اطمینان حاصل کیا تھا۔ اس کے باوجود تقدیر اپنے تیور بدل چکی تھی۔

وہ بنی کے دماغ سے چلا گیا۔ سائن نے جے کافو کی اس آواز اور لہجے کو یاد رکھا۔ جب وہ دوسری صبح بیدار ہوئی تو سائن مخصوص آواز اور لب و لہجے کے ساتھ اس کے دماغ میں آیا۔ وہ اسے محسوس نہ کر سکی۔ سائن نے یہ سمجھ لیا کہ بنی کو کسی آئیڈیل کے عشق میں مبتلا کیا گیا ہے لہٰذا وہ اس کی طرف مائل نہیں ہوگی۔

یوں بھی اب اسے اپنی طرف مائل کرنے سے زیادہ یہ

لازمی ہو گیا تھا کہ بنی پر تخریبی عمل کرنے والے کا سراغ لگایا جائے اور یہ اتوار کی صبح چرچ میں معلوم ہو سکتا تھا۔ اس نے خیال خوانی کے ذریعے آندرے کو بنی اور تخریبی عمل کرنے والے کے بارے میں بتایا۔ آندرے نے کہا "سائن! تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ تم اٹلی میں ہو اور ان تھری جے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اٹلی کے مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔"

سائن نے کہا "میں تم سے یہی کہنے والا تھا۔ بنی پر تخریبی عمل کرنے والا تھری جے میں سے کوئی ایک ہوگا۔ ہو سکتا ہے' وہ خود بنی سے محبت کر رہا ہو اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے خواب والا ڈراما پلے کر کے اسے چرچ میں بلا رہا ہو۔"

آندرے نے کہا "ایسا ہی کچھ ہوگا۔ تھری جے میں سے کوئی ایک جے اس چرچ میں بنی سے ضرور ملے گا۔ آج جمعہ ہے۔ پرسوں اتوار کی صبح میں تھری جے میں سے کسی ایک جے کو ضرور دیکھ سکوں گا۔"

"تم دور سے دیکھو گے۔ انہیں اپنی موجودگی کا شبہ نہیں ہونے دو گے۔ چرچ میں کسی کو دیکھنے کے بعد بڑے صبر اور اطمینان سے باقی دو جے کا بھی پتا ٹھکانا معلوم کرو گے۔ میں بھی بنی کے دماغ میں جاتا رہوں گا۔"

آندرے خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ برسوں سے روپوش رہنے والے تھری جے تک پہنچنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اگر وہ تھری جے کو ٹریپ کر لیتے۔ انہیں اپنا تابع بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوتا۔ اس طرح وہ ٹرانسفارمر مشین تک پہنچ سکتے تھے۔

بہرحال اتوار کی وہ صبح آگئی تھی۔ بنی بہت پہلے ہی چرچ میں پہنچ کر آس پاس متلاشی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر وہ تھری جے کی مخصوص سیٹوں میں سے ایک سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے خواب میں ایسی ہی ایک سیٹ پر خود کو بیٹھے دیکھا تھا۔ جے سامو نے وہاں پہنچ کر ایک اجنبی حسینہ کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ جے کا فو یورپ کے کسی ملک میں ہے۔ وہاں اس کی سیٹ خالی رہے گی وہاں جے فلو کے آنے کی توقع تھی۔ اس نے ایک سیٹ پر بیٹھ کر اسے پھر دیکھا۔ وہ بار بار دیکھنے کی چیز تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

جے سامو نے کہا "یہ سیٹیں سب سے پیچھے ہیں۔ یہاں بعد میں آنے والے بیٹھتے ہیں لیکن تم پہلے سے آ کر بیٹھی ہوئی ہو۔"

وہ بولی "تم بھی آخر میں نہیں آئے ہو پھر بھی ان آخری سیٹوں پر بیٹھ گئے ہو۔ کیا مجھے دیکھ کر؟"

"آں؟" وہ ہکلاتے ہوئے بولا "ایسی بات نہیں ہے۔ میں ہر اتوار کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں بیٹھتا ہوں۔"

"پھر تو میرا یہاں بیٹھنا نامناسب ہوگا۔ کیا میں دوسری جگہ چلی جاؤں؟"

"نہیں۔ یہاں بیٹھ سکتی ہو۔ آج میرا ایک ساتھی نہیں آئے گا۔"

وہ مسکرا کر بولی "اسی لیے تم نے کہا تھا کہ ابھی یہاں ملاقات ہوگی۔ تم میرے روبرو آؤ گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "میں نے ایسا کب تھا؟ میں تو تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ پہلی ملاقات ہے مگر تم نے فون پر کہا تھا۔"

"میں نے فون پر کہا تھا؟ تمہیں مغالطا ہو رہا ہے۔ میں تو تمہارا نام تک نہیں جانتا ہوں۔"

"میرا نام بنی ہے۔ مس بنی ویسنزا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے رودی کہتے ہیں۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ عبادت شروع ہو گئی تھی۔ وہ سر جھکائے سوچنے لگا "یہ کون ہے؟ نہ جانے' کس نے اسے فون پر یہاں ملاقات کرنے کی بات کی تھی۔ یہ کسی کے دھوکے میں میرے پاس چلی آئی ہے۔"

اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ اس میں کشش تھی۔ وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سائن کو وہ مخصوص آواز اور لہجہ معلوم تھا' جس کے ذریعے بنی کے اندر پہنچا جا سکتا تھا اور وہ اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت سائن کو اپنے اندر محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس کے اندر رہ کر جے سامو کی باتیں سنتا رہا تھا۔

آندرے بھی بنی کے دماغ میں پہنچ گیا۔ جے سامو نے اپنا نام رودی بتایا تھا۔ آندرے نے کہا "سائن! اس نے ایک فرضی نام بتایا ہے۔ یہ ضرور تھری جے میں سے کوئی ایک ہے۔ ہمیں بڑے صبر و تحمل سے اس کی اصلیت معلوم کرنی ہوگی۔"

عبادت کے بعد بنی نے جے سامو سے پوچھا "آج تمہارے ساتھی نہیں آئے؟"

"ہاں۔ نہیں آئے۔ معلوم نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔"

وہ خیال خوانی کے ذریعے معلوم کر چکا تھا۔ جے فلو نے کہا تھا کہ وہ آج عبادت کے لیے نہیں آئے گا۔ بنی نے کہا "تمہاری تنہائی دور ہو سکتی ہے۔ میرے گھر چلو۔ میں کافی اچھی بناتی ہوں۔"



وہ انکار نہ کر سکا۔ دل اس کی طرف مائل تھا۔ بنی اپنے بنگلے میں ایک بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ جے سامو اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی کافی پینے آیا تھا۔ کافی پینے کے بعد بھی اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ دل کہتا رہا' بہت دنوں کے بعد ٹھنڈی چھاؤں ملی ہے۔ اپنے خالی گھر کی دھوپ میں نہیں جانا چاہیے۔

بنی نے کہا "میں تمہارے لیے لنچ تیار کروں گی۔"

"میں کمرے میں تمہارہ جاؤں گا۔"

"تم بھی کچن میں چلو۔ وہاں باتیں کرتے رہیں گے۔"

اتنی دیر میں دونوں بے تکلف ہو چکے تھے۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ ہونے لگی تھی۔ جے سامو کو یہ چھیڑ چھاڑ کچن میں بہت مہنگی پڑی۔ وہ بنی کو بازوؤں میں قید کرنا چاہتا تھا۔ بنی نے شوخی سے دھکا دیا تو وہ ایک قدم پیچھے گیا۔ ایسے میں اس کا ایک ہاتھ جلتے ہوئے چولھے پر پہنچ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ آگ تھوڑا بھی جلائے تو ہوش اڑا دیتی ہے۔

اس کے ہوش اڑتے ہی سائن اور آندرے اس کے دماغ میں پہنچ گئے۔ فوراً ہی اس کے چور خیالات معلوم کیے' معلوم ہوا اس کا نام جے سامو ہے۔ اس کا ایک ساتھی جے فلو شہر روم میں ہے اور دوسرا ساتھی جے کافو یورپ کے ملکوں کا دورہ کر رہا ہے۔ ذہین اور صحت مند جوانوں کا انتخاب کر رہا ہے۔ انہیں ٹرانسفارمر مشین سے گزار کر ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی فوج بنانے والا ہے۔

پھر تو معلومات کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ آندرے اور سائن کو معلوم ہونے لگا کہ امریکا میں بارہ افراد نے بڑی رازداری سے ٹرانسفارمر مشین تیار کی ہے۔ ان میں سے ایک جیکی ہنٹر کو اپنا لے اغوا کیا ہے اور وہ بھی ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے والی ہے۔

تھری جے کی یہ چالبازی بھی معلوم ہوئی کہ انہوں نے ٹرانسفارمر مشین کے باقی آٹھ رازداروں کو اپنا معمول اور محکوم بنا رکھا ہے۔ ان آٹھ ٹیلی پیتھی جاننے والے فرماں بردار دلی میں پہنچ امریکی اکابرین ہیں' ایک مشین کا تکنیکی ماہر وائرمین اور دو ٹیلی پیتھی جاننے والے لیزی گارڈ اور کینی ہال ہیں۔

بنی فرسٹ ایڈ کے طور پر جے سامو کے متاثرہ ہاتھ کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے خیال خوانی کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہاتھ جلنے کی تکلیف کے باعث دماغ عارضی طور پر خیال خوانی کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنی موجودہ حالت کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا تھا اور ان دونوں ساتھیوں نے کئی گھنٹوں سے اس کی خبر نہیں لی تھی کیونکہ وہ دونوں اس عجیب و غریب حسینہ شیوانی بھاسکر کے معاملے میں الجھے ہوئے تھے۔

ادھر جے سامو کی شامت آ چکی تھی۔ ادھر جے کافو کی شامت آ رہی تھی۔ وہ غیر معمولی آنکھیں رکھنے والی شیوانی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس سے پیچھا چھڑا کر دنیا کے آخری حصے میں بھی جا کر چھپتا تو اس کی غیر معمولی آنکھوں کی حرارت وہاں بھی اس کی پیشانی تک پہنچ جاتی۔

جے کافو اور جے فلو اسے اعصابی کمزوری کی دوا کے ذریعے اپنا تابع بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں جے فلو ویٹر کو آلہ کار بنا کر سوپ کے دو باؤل میں سے ایک باؤل میں وہ مضر رساں دوا ملا چکا تھا۔ اس باؤل کو شیوانی کے سامنے رکھ چکا تھا۔

پھر اس نے جے کافو سے کہا "شیوانی کے سامنے جو باؤل رکھا ہے' اس میں اعصابی کمزوری کی دوا ملی ہوئی ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد اس بلا سے نجات حاصل کر لو گے۔ ہم اسے اپنی معمولہ بنا سکیں گے۔"

جے کافو ٹھنڈکس گاڈ کہہ کر سوپ پینے لگا۔ اس کی طرف چور نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے باؤل سے ایک پیالے میں سوپ نکال کر پی رہی تھی۔ اس نے دو چمچ پینے کے بعد ایک ذرا منہ بنایا پھر کہا "اس کا مزہ کچھ عجیب سا ہے۔"

جے کافو نے کہا "اس کا مزہ تو دہی ہوگا' جو ہونا چاہیے۔ ابھی تم نے دو ہی چمچ پیے ہیں اور پیتی رہو' اچھا لگے گا۔"

وہ تعجب سے بولی "تم چمچ گن رہے ہو کہ میں کتنا سوپ پی چکی ہوں؟"

اس نے بات بنائی "نہیں' میں نے محاورتاً ایسا کہا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے' سفر میں دو جوڑے کپڑے رکھ لو۔ دو باتیں کر لو۔ دو لقمے کھا لو۔ اسی طرح میں نے دو چمچ سوپ پینے کی بات کی ہے۔"

وہ مزید ایک چمچ پینے کے بعد بولی "اس کا مزہ بدل گیا ہے مگر اچھا لگ رہا ہے۔"

وہ مطمئن ہو کر بولا "پھر تو اچھی بات ہے۔ مزے لے لے کر پیتی رہو۔"

اس نے پھر ایک چمچ پینے کے بعد باؤل سے سوپ نکال کر دوسرے پیالے میں ڈالا۔ اسے آگے بڑھا کر جے کافو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "تم بھی پی کر دیکھو۔ مزہ عجیب سا ہے مگر مزے دار ہے۔"

وہ جلدی سے بولا "نہیں۔ میں تو اپنی پسند کا سوپ پی رہا

ہوں۔ یہی کافی ہے۔"

"میں چاہتی ہوں' میری پسند کا سوپ بھی پیو۔"

وہ انکار نہ کرسکا۔ پہلے اسے اپنی پیشانی پر' پھر پورے جسم میں حرارت محسوس ہوئی۔ شیوانی نے اس کی پیشانی کو تکتے ہوئے اپنی پسند کا سوپ پلانے کا ارادہ کیا تھا۔ ایسے وقت اس کا ارادہ اس قدر مستحکم ہوتا تھا کہ فولادی دماغ والے بھی اس کے ارادے کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

جے کافو اس کے دیے ہوئے پیالے سے وہ سوپ پینے لگا۔ جے فلو نے اس کے دماغ میں آکر کہا "یار! میں ذرا جے سامو کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔ تمہارا تنسخہ کامیاب رہا ہے۔ وہ مونا کو بھول کر بنی میں دلچسپی لے رہا ہے مگر اس احمق نے محبت کے جوش میں اپنا ہاتھ جلالیا ہے۔"

شیوانی اس کی پیشانی کو تک رہی تھی۔ وہ سوپ پیتا جارہا تھا۔ وہ بولی "تم پیتے جارہے ہو۔ یہ تو بتاؤ۔ اس کا مزہ کیسا ہے؟"

وہ بولا "تمہیں اچھا لگ رہا ہے تو مجھے بھی اچھا لگ رہا ہے۔"

"تو پھر شرط لگاؤ۔ ہم میں سے جو اپنا پیالہ پہلے خالی کرے گا۔ وہ جیت جائے گا۔ ہارنے والا اٹھ کر جیتنے والے کو سیلوٹ کرے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ تم جلدی پیو۔"

وہ اسے دیکھتی ہوئی' حرارت پہنچاتی ہوئی بولی "تم بھی جلدی پیو۔"

وہ سمجھ رہا تھا' نہیں پینا چاہیے مگر بے اختیار پی رہا تھا۔ جے فلو نے کہا "شیوانی سے باتیں کرو مگر اس اہم مسئلے پر بھی غور کرو۔ ہاتھ جلنے کے باعث جے سامو کا دماغ وقتی طور پر کمزور ہوگیا ہے۔ کوئی بھی دشمن اس کے دماغ میں آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔"

پھر وہ چونک کر بولا "یہ کیا؟ میں محسوس کررہا ہوں کہ تمہارا دماغ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ تم جسمانی کمزوری محسوس کررہے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے جے کافو کے خیالات پڑھے تو علم ہوا کہ جب وہ جے سامو کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔ تب شیوانی نے اپنے باؤل سے جے کافو کو سوپ پینے دیا تھا۔ تب سے وہ اس مضر رساں سوپ کا آدھا پیالہ پی چکا ہے۔

شیوانی اسے حیرانی سے دیکھ کر بولی "یہ تمہیں کیا ہورہا ہے؟ تم سوپ چھوڑ کر میز پر جھک رہے ہو؟"

وہ بڑی نقاہت سے بولا "ڈاکٹر۔ پلیز مجھے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ اسے سہارا دے کر کرسی پر سیدھا بٹھایا پھر بولی "ہے بھگوان! تمہارا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ تم برسوں کے بیمار نظر آرہے ہو۔"

جے فلو نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ ویٹر کے دماغ میں پہنچ کر ہوٹل کے منیجر کے دماغ پر قبضہ جما کر کئی ملازموں کو وہاں لے آیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر باہر شیوانی کی کار میں لے آئے پھر وہ منیجر شیوانی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ایک اسپتال کی طرف جانے لگا۔

تین ساتھیوں میں سے دو ساتھی دماغی طور پر کمزور ہوگئے تھے۔ جے فلو پریشان ہو کر سوچ رہا تھا' ایسے میں ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے دونوں ساتھیوں کے دماغوں میں آسکتے تھے۔ وہ بیک وقت دونوں کے دماغوں میں آنے والے دشمنوں کو نہیں روک سکے گا۔

اس نے سوچا' فوری طور پر کیا کرنا چاہیے؟ کیا پہلے جے کافو کی حفاظت لازمی ہے؟

جے کافو ان تینوں میں زیادہ ذہین اور فعال تھا۔ پہلے اس کی حفاظت لازمی تھی پھر خیال آیا۔ شیوانی نے دانستہ جے کافو سے دشمنی نہیں کی ہے پھر یہ کہ وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتی ہے۔ اس کے دماغ میں جاکر اہم معلومات حاصل نہیں کرسکے گی اگر اس کے قریب رہ کر تنویمی عمل کرنا چاہے گی تو جے فلو ایسا نہیں کرنے دے گا۔

پھر جے فلو نے سوچا' جے سامو سے بھی کسی نے دشمنی نہیں کی ہے۔ بنی سے رومانس کے دوران میں اس کا ہاتھ جل گیا ہے۔ وہ دوبار جے سامو کے دماغ میں جاچکا تھا' وہاں اس نے کسی دشمن کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔ کوئی جے سامو کو ٹریپ نہیں کررہا تھا۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وقفے وقفے سے دونوں ساتھیوں کے دماغوں میں جاتا رہے گا۔ انہیں کسی دشمن کے شکنجے میں نہیں آنے دے گا۔ فی الحال دانش مندی یہ ہے کہ ٹرانسفارمر مشین کے جو آٹھ رازدار ان کے معمول ہیں۔ ان کے اندر فرداً فرداً جاکر ان کے دماغوں کو لاک کردیا جائے تاکہ کسی دشمن کو امریکا میں ٹرانسفارمر مشین کی موجودگی کا علم نہ ہو۔

جے فلو کے اس فیصلے سے پہلے ہی آندرے سائمن اور ان کے دوسرے چار ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے جے سامو کے چور خیالات سے اس آواز اور لب ولہجے کو معلوم کیا



جن کے ذریعے وہ تھری جے باقی آٹھ رازداروں کو اپنا معمول اور تابع بنائے رکھتے تھے۔ آندرے اور اس کے ساتھیوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہ بیک وقت چھ رازداروں کے دماغوں میں پہنچ گئے۔ انہیں بے وقت سونے پر مجبور کیا۔ جب وہ سوگئے تو ان پر تنویمی عمل کرکے ان کے دماغوں میں دوسری آواز اور لہجے کو نقش کیا۔ ان چھ رازداروں کو اپنا معمول اور تابع بنایا پھر باقی دو رازداروں کے دماغوں میں پہنچے۔ ایسے وقت جے فلو ایک رازدار کے دماغ کو لاک کررہا تھا۔ انہوں نے بڑی خاموشی سے جے فلو کے عمل کو ناکام بنا دیا۔ جے فلو نے اس کے بعد دوسرے رازدار کے دماغ میں پہنچنا چاہا تو اس نے سانس روک لی۔ اسے اپنے دماغ سے بھگا دیا۔

وہ سمجھ گیا کہ کوئی دشمن اپنا کام کرچکا ہے۔ اس نے دوسرے رازدار کے دماغ میں پہنچنا چاہا پھر تیسرے اور پھر چوتھے رازدار کے دماغوں میں پہنچنے کی ناکام کوششیں کیں۔ آخر تھک ہار کر تسلیم کرنا پڑا کہ وہ تھری جے ٹرانسفارمر مشین کی بہت بڑی بازی ہار چکے ہیں۔

اب یہ جے فلو کی ذمے داری تھی کہ اپنے دونوں دوستوں جے کافو اور جے سامو کے دماغوں کو دشمنوں کے شکنجے میں نہ پھنسنے دے۔ ایسے وقت ایک پریشان کن سوال پیدا ہورہا تھا کہ شیوانی نے بھی اسی مضر رساں سوپ کا پورا پیالہ پیا تھا لیکن وہ جے کافو کی طرح کمزور نہیں ہوئی تھی۔ کیوں نہیں ہوئی تھی؟

○☆○

ایک طویل عرصے سے یہی دیکھا جارہا تھا کہ ٹرانسفارمر مشین کسی کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا رہی تھی۔ پہلی ٹرانسفارمر مشین سے موجودہ مشین تک جتنے امریکی افراد نے ٹیلی پیتھی سیکھی تھی۔ وہ سب اپنے کسی نہ کسی مخالف کے زیر اثر آتے رہے تھے۔ دوسروں کے بنتے رہے تھے یا پھر امریکی اکابرین سے بغاوت کرکے انہوں نے اپنی ایک علیحدہ تنظیم بنالی تھی۔

موجودہ مشین تیار کرنے والے آٹھ افراد پہلے تھری جے کے معمول اور تابع تھے۔ اب آندرے اور سائمن نے انہیں غلام بنالیا تھا۔ وقت نے انہیں مقدر کا سکندر بنا دیا تھا۔ وہ بیٹھے بٹھائے ایک ٹرانسفارمر مشین کے مالک بن گئے تھے۔ اس مشین کے رازدار پانچ امریکی اکابرین' ایک کلینک وائزمین' لیزی گارڈ اور کینی ہال اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ پہلے تھری جے نے انہیں غلام بنایا تھا۔ اب وہ آندرے اور سائمن کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

ان آٹھ غلام بننے والوں میں ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا فوج کا اعلیٰ افسر ڈینی تھا۔ وہ اپنے دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھیوں کے ساتھ برف پوش پہاڑیوں میں علی' للی اور دلیر آفریدی کو ہلاک کرڈالنے اور ان سے مائیکرو فلم چھین لینے میں مصروف رہا تھا۔

اس مہم میں فوج کے کئی آلہ کار جوان مارے گئے تھے۔ ٹیلی کاپٹرز تباہ ہوگئے تھے۔ ڈینی مائیکرو فلم حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جب وہ دماغی طور پر ناکام و نامراد اپنی جگہ حاضر ہوا تو ایسے وقت پھر اس کی قسم بختی آگئی۔ آندرے نے مخصوص آواز اور لہجے کے ذریعے اس کے اندر پہنچ کر اسے سونے پر مجبور کیا۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ تھری جے کا معمول رہنے کے بعد اب آندرے کا غلام بن رہا ہے۔

امریکی اکابرین اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے ناراض تھے۔ ایک حاکم نے کہا "یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہے۔ ہماری آلہ کار ماؤ للی ان بابا صاحب کے ادارے کے دو جوانوں سے مل گئی۔ وہ تعداد میں صرف تین تھے۔ ہمارے درجنوں فوجی جوان جسمانی طور پر وہاں موجود تھے۔ ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے ہمیں یقین دلا رہے تھے کہ ان سے مائیکرو فلم چھین کر لے آئیں گے لیکن خالی ہاتھ واپس آگئے۔"

دوسرے حاکم نے کہا "ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے ہمیشہ ناکامیوں کا ریکارڈ قائم کرتے رہتے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل کرلیتے ہیں اور ہمیں تسلیاں دیتے رہتے ہیں کہ آئندہ بڑی کامیابی حاصل ہوگی۔"

لیزی گارڈ نے کہا "پلیز ہمیں طعنے نہ دیں۔ ہم نے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ ہم دشمنوں سے لڑ سکتے ہیں۔ مقدر سے نہیں لڑسکتے۔ مقدر نے ان کا ساتھ دیا۔ اس لیے ہم مائیکرو فلم حاصل نہ کرسکے۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مقدر ہمیشہ ان کا ساتھ دیتا ہے؟ مقدر ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتا۔"

ایک فوجی افسر نے کہا "تم ٹیلی پیتھی جاننے والے ہم سے بہت سی اہم باتیں چھپاتے رہتے ہو۔ تم لوگوں نے یہ اہم بات چھپائی کہ الپا یہاں سے ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ چرا کر لے گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں اس مشین کے ماہر مکینک جیکی ہنٹر کو بھی اغوا کرکے لے گئی ہے۔ اتنی بڑی بات ہمیشہ چھپ نہیں سکتی تھی لیکن تم چھپانے کی غلطی کرتے رہے۔"

کینی ہال نے کہا "ہم الپا سے اس نقشے کو اور جیکی ہنٹر

کو واپس حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کررہے ہیں اگر ایسا نہ کرسکے تو ہم الپا کو کبھی ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے کے خواب دیکھتی رہے گی۔"

ایک لیڈی سیکریٹری نے کہا "میں الپا بول رہی ہوں۔ تمہارے ٹیلی پیتھی جاننے والے کھوکھلے دعوے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے باپ بھی ٹیلی پیتھی سیکھ کر آجائیں تو مجھے ٹرانسفارمر مشین تیار کرانے سے نہیں روک سکیں گے۔"

لیزی گارڈ نے غصے سے کہا "الپا! زبان سنبھال کے بولو۔ ہمارے باپ تک نہ پہنچو۔ تمہارے لیے ہم کافی ہیں۔"

"میں امریکی اکابرین سے پوچھتی ہوں کیا وہ جانتے ہیں کہ جو مائیکرو فلم چین پہنچائی گئی ہے۔ اس میں ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ ہے۔ آئندہ چین میں بھی ٹیلی پیتھی جاننے والے پیدا ہوں گے۔ تمہارے ٹیلی پیتھی جاننے والے اس مائیکرو فلم کو یا اس نقشے کو چین جانے سے نہ روک سکے اور جو نقشہ میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس کے لیے کھوکھلے دعوے کررہے ہیں کہ مجھے مشین تیار نہیں کرنے دیں گے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر ایک اعلیٰ حاکم نے کہا "دنیا کا سب سے خطرناک ہتھیار ٹیلی پیتھی ہے۔ یہ ہتھیار تیار کرنے والی مشین کا نقشہ ہمارے سب سے بڑے دشمن چین کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والے اپنے ملک کو اس سے بڑا نقصان اور کیا پہنچائیں گے؟"

لیزی گارڈ نے کہا "ہم نے قسم کھائی ہے، چین میں اور اسرائیل میں یہ مشین تیار نہیں ہونے دیں گے۔"

الپا نے کہا "قسمیں کھانے سے مشینوں کو شرم نہیں آئے گی۔ وہ تیار ہونے سے باز نہیں آئیں گی۔ شرم تم لوگوں کو آنی چاہیے۔ تم ٹیلی پیتھی جاننے والے اپنے اکابرین کو اہم معاملات میں دھوکا دیتے رہتے ہو۔"

"ہمارے اکابرین کو ہمارے خلاف نہ بھڑکاؤ۔ ہم نے ان کے اعتماد کو کبھی دھوکا نہیں دیا ہے۔"

"کیا اپنے اکابرین کو بتایا ہے کہ تم لوگوں نے بڑی رازداری سے ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کی ہے۔"

اس بات پر تمام اکابرین چونک گئے۔ فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے ڈینی سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟ آپ آرمی انٹیلی جنس کے چیف ہیں۔ آپ کو ہمارے ملک میں ہونے والی خفیہ مصروفیات کا علم ہونا چاہیے۔"

الپا نے کہا "آپ چور سے پوچھ رہے ہیں کہ یہاں چوری کیوں ہورہی ہے۔" آرمی کے یہ افسران ڈینی جانسن، مارک فورڈ اور مارٹن کریس اس موجودہ نئی مشین سے ٹیلی پیتھی کا علم حاصل کرچکے ہیں۔ ٹرانسفارمر مشین کے ماہرین جیکی ہنٹر اور وائزمین کو بھی اسی مشین کے ذریعے ٹیلی پیتھی سکھائی گئی ہے۔ میں جیکی ہنٹر کے چور خیالات پڑھ کر یہ خفیہ معلومات حاصل کرچکی ہوں۔"

فوج کے اعلیٰ افسر نے پوچھا "مسٹر ڈینی! یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟"

ڈینی نے کہا "درست سن رہے ہیں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔ ہم نے مصلحتاً آپ تمام اکابرین سے یہ بات چھپائی تھی اگر آپ لوگوں کو مشین کے بارے میں معلوم ہوتا تو ہمارے دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے آپ کے دماغوں میں آکر ہماری مشین کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرتے رہتے۔ انہوں نے دوبار ہماری مشینوں کو تباہ کیا۔ اس بار بھی یہی کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے مشین کو غیروں سے ہی نہیں اپنوں سے بھی چھپایا ہے۔"

فوج کے اعلیٰ افسر نے کہا "تم نے احتیاطی تدابیر اختیار کی۔ بے شک تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا۔ یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ ہمارے پاس ایک ٹرانسفارمر مشین ہے لیکن خوشی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشین کا فائدہ کیا ہے؟ ہماری مشین سے ناکام ہوتے رہنے والے افراد کب تک ٹیلی پیتھی سیکھتے رہیں گے۔ مسٹر ڈینی! تم اور دوسرے افراد نے موجودہ مشین سے ٹیلی پیتھی سیکھی۔ تمہارے پاس فوجی قوت بھی تھی لامحدود ذرائع بھی تھے۔ اس کے باوجود صرف تین افراد تمہاری گرفت میں نہ آسکے۔ تم ان سے مائیکرو فلم چھین نہ سکے۔ جواب دو کہ ایسی ٹرانسفارمر مشین کا اور ناکام ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی تعداد بڑھانے کا فائدہ کیا ہے؟"

ڈینی نے کہا "میں پچھلی تمام ناکامیوں کے سلسلے میں جواب دہ نہیں ہوں۔ مجھے ٹیلی پیتھی سیکھنے کے بعد پہلی بار ناکامی ہوئی ہے۔ اس ناکامی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آئندہ آپ تمام اکابرین دیکھیں گے کہ اسرائیل اور چین میں یہ مشین تیار نہیں ہوسکے گی۔ میں ایسی حکمت عملی اختیار کررہا ہوں، جسے الپا خوب سمجھ رہی ہے۔"

دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے فوجی افسر مارک فورڈ نے کہا "ہم نے جیکی ہنٹر کی بیٹی ڈانکا کو اسرائیل پہنچایا ہے۔ ہم اس کے ذریعے اس کے باپ کو اور اس کے محبوب بوبی ا ٹھمتھ کو ٹریپ کرنے والے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے

ہمارا ہوم ڈینٹسٹ
دانتوں میں درد، منہ کا آنا یا دانتوں کی دیگر تکالیف میں میڈی کیم ڈینٹل کریم تکالیف سے نجات دلاتا ہے اور آپ کہیں گے "سلام میڈی کیم"
میڈی کیم ڈینٹل کریم کی ایک ٹیوب گھر میں موجود ہے تو سمجھ لیجیے آپ کا ہوم ڈینٹسٹ گھر میں موجود ہے۔
میڈی کیم ڈینٹل کریم۔ روزمرہ استعمال کا ٹوتھ پیسٹ اور دانتوں کا اسپیشل علاج۔
اب نیا ہیلی برش پیک میں بھی دستیاب ہے
MEDICAM
MEDICAM
میڈی کیم ڈینٹل کریم
سلام میڈی کیم

میڈی کیم شیمپو بالوں کی شان
ہر دن لمبے لہراتے بال
اگر آپ بالوں کے مسائل سے پریشان ہیں اور لمبے لہراتے بال چاہتے ہیں تو میڈی کیم شیمپو استعمال کیجیے۔
میڈی کیم شیمپو کی نگہبان میں بالوں کی خوبصورتی دوبالا ہوجائے گی۔ آملہ، ریٹھا، سکاکائی کی طاقت، خوبی کی بڑھاتے اور خشکی کی روک تھام۔
میڈی کیم شیمپو بالوں کی شان، ہر دن استعمال ہر دن لمبے لہراتے بال۔
میڈی کیم شیمپو۔ بالوں کا مخصوص قدرتی علاج۔
MEDICAM
SHAMPOO
سلام میڈی کیم

Reach
LASERDOT

کہ ڈائنا کے سلسلے میں ایک اخباری خبر پڑھ کر پارس وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ بھی اسرائیل میں مشین تیار نہیں ہونے دے گا کیوں الپا! خاموش کیوں ہو؟ اب ہمارے اکابرین کے سامنے اعتراف گیوں نہیں کرتیں کہ ہم ڈائنا کو وہاں پہنچا کر تمہاری مشین کی تیاری میں کیسی رکاوٹیں پیدا کررہے ہیں؟"

الپا نے جواب نہیں دیا۔ وہ دماغی طور پر حاضر ہو کر سوچ رہی تھی۔ یہ تسلیم کررہی تھی کہ ڈائنا کے ذریعے پارس کو اس کی تیار ہونے والی مشین کا علم ہو گیا ہے۔ ڈائنا اور پارس دونوں ہی اس کے لیے مسئلہ بن گئے ہیں اور آئندہ بھی مسائل پیدا کرنے والے ہیں۔

وہ چاہتی تھی کہ پارس اسرائیل میں نہ رہے۔ وہاں رہے گا تو مشین کی بُو سونگھ کر اس خفیہ اڈے میں پہنچ جائے گا۔ امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے ڈینی اور مارک فورڈ وغیرہ ڈائنا کے ذریعے جیکی ہنٹر کو ٹریپ کرسکتے تھے اور الپا کے لیے جیکی ہنٹر دنیا کا سب سے اہم شخص تھا۔ وہ اپنی جان پارس کے اور امریکا کے حوالے کرسکتی تھی مگر جیکی ہنٹر کو کسی کے حوالے نہیں کرسکتی تھی۔

وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ ڈائنا کو اسرائیل چھوڑ کر جانے پر مجبور کردے گی اگر وہ نہیں جائے گی تو اسے ختم کردے گی۔ اسے اسرائیل سے تو کیا، دنیا سے نابود کردے گی۔ پارس کے متعلق یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ اسرائیل میں ہے یا یورپ کے کسی شہر میں؟

اس کے بیان کے مطابق وہ پیرس میں تھا اور الپا اس کی کسی بات کا یقین نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے جیکب رابن سے کہا تھا کہ وہ کالے عمل کے ذریعے پارس کا سراغ لگائے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دو گھنٹے کے اندر پورے یقین کے ساتھ بتا دے گا کہ پارس اسرائیل میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کس ملک کے کس شہر اور علاقے میں ہے؟

وہ اپنے بیڈ روم میں بوبی کے ساتھ تھی۔ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ بوبی نے کہا "تم خوا مخواہ اپنے ذہن کو الجھا رہی ہو۔ میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ دو ہی باتوں کو پیش نظر رکھو۔ ایک بات یہ کہ پارس اسرائیل میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اسرائیل میں ہے۔ ایسی صورت میں اس کے خلاف کیسے اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟"

"میں یہی سوچ رہی ہوں، وہ دشمن یہاں ہوگا تو میں اس پر کیسے قابو پاسکوں گی؟"

"یوں بے چینی سے ٹہلتی رہو گی تو مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

وہ اس کے پاس آکر بولی "یہ لو آرام سے بیٹھ گئی ہوں مگر مجھے نہیں لگتا کہ اس شیطان پر قابو پاسکوں گی۔"

وہ اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ کر بولا "آرام سے بیٹھو نہیں، پوں لیٹ جاؤ۔ دماغ سے یہ بات نکال دو کہ پارس ناقابل شکست ہے۔ دنیا میں سب کو زوال آتا ہے۔ ہم اسے زوال کی طرف لائیں گے۔"

وہ بولی "میں نے تم سے زیادہ تجربات حاصل کیے ہیں۔ مجھ سے زیادہ اس شیطان کو کوئی نہیں سمجھتا ہے پھر بھی تم درست کہہ رہے ہو۔ زوال سب کو آتا ہے۔ پارس پر بھی زوال آسکتا ہے۔"

"میری جان! آج تک پارس کو شکست دینا تمہارے لیے ناممکن سی بات رہی۔ یہ یاد رکھو کہ کوئی بات ہمیشہ ناممکن نہیں رہتی۔ مسلسل کوششوں سے ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔"

"بوبی! مجھے تمہاری باتوں سے حوصلہ مل رہا ہے۔ یو آر نائس ٹوبی۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ نائس ٹو اپچ اور ہوتے رہے پھر الپا نے کہا "یہاں ڈائنا پہنچی ہوئی ہے۔ تمہارا دل اس کے لیے مچل رہا ہوگا۔"

"تم میرے خیالات پڑھ کر میرے مزاج کو سمجھ چکی ہو۔ ڈائنا میری خواہش ہے لیکن وہ میری ضرورت نہیں بن سکے گی۔"

"یہ تمہاری ذہانت ہے کہ تم کسی کو اپنی ضرورت نہیں بناتے ہو۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گی۔ جب کہو گے ڈائنا کو کسی خفیہ اڈے میں تمہارے پاس جانے پر مجبور کردوں گی۔"

"اس طرح ڈائنا کے اندر رہنے والا پارس اور امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے میری شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔ میں ایسی احمقانہ خواہش نہیں کروں گا۔"

"اتنی سی بات میں بھی سمجھتی ہوں۔ تم ڈائنا کے قریب جاؤ گے تو دشمن تمہیں ٹریپ کریں گے لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ کسی نہ کسی طرح ڈائنا کے دماغ میں پہنچوں۔ اس کے دماغ کو لاک کیا گیا ہے۔ کسی طرح وہ لاک توڑ کر اس پر مسلط ہو کر اسے اپنی معمول بناؤں گی پھر اس کے دماغ کو لاک کروں گی تو کوئی دشمن اس کے ذریعے تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"ہمارے جاسوس اسے تلاش کررہے ہیں۔ وہ نظروں میں آئے گی تو اسے زخمی کرکے یا اعصابی کمزوری میں مبتلا کرکے اس پر مسلط ہوسکیں گے پھر اسے دشمنوں کی آلہ کار بننے نہیں دیں گے۔"



"تمام ہوٹلوں کو اور ایسے تمام مکانات کے مالکان کو چیک کیا جارہا ہے، جو اپنے مکان کا ایک پورشن کرائے پر دیتے ہیں۔ ڈائنا ایسی ہی کسی جگہ ہوگی۔"

"تم ان امریکی سراغ رسانوں کو بھول رہی ہو، جو ہمارے ملک میں ڈاکٹر، انجینئر اور بزنس مین کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ڈائنا ان میں سے کسی کی عزیزہ بن کر رہے گی۔ ہمارے سراغ رسانوں کی نظروں میں نہیں آئے گی۔"

"ایسے تمام امریکی ڈاکٹروں، انجینئروں اور بزنس مین وغیرہ کو بھی چیک کیا جارہا ہے۔ پچھلے دو دنوں میں یہاں جس امریکی فیملی میں ایک جوان لڑکی کا اضافہ ہوا ہوگا، وہی لڑکی ڈائنا ہوگی۔"

وہ گھڑی دیکھ کر بولی "دو گھنٹے گزرنے والے ہیں۔ جیکب نے کالا عمل مکمل کرلیا ہوگا۔ آؤ چلیں۔"

بیڈ روم کی دیواروں پر اس طرح آئینے لگے ہوئے تھے کہ کہیں بھی کھڑے ہو کر اپنا عکس چاروں طرف سے دیکھا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر اپنا لباس اور اپنا حلیہ درست کیا پھر وہاں سے نکل کر محل نما بنگلے کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچے، جہاں جیکب رابن کالے عمل میں مصروف تھا۔

وہ کمرے کے وسط میں فرش پر پالتھی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک بڑی سی انگیٹھی سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اس کا ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ اس نے ایک خنجر کے تیز دھار پھل کو مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ جس کے باعث ہتھیلی کٹ رہی تھی اور لہو پتلی دھار کی صورت میں ایک پُتلے پر گر رہا تھا۔

وہ ماش کے آٹے کا پُتلا پارس کے نام پر بنایا گیا تھا۔ وہ منتر پڑھتا جارہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے کوئی چیز اٹھا اٹھا کر انگیٹھی کی طرف پھینکتا جارہا تھا۔ جس کے باعث شعلے بھڑکتے جارہے تھے۔ جیکب رابن اس کالے عمل کو جیسے نچوڑ کر اپنا لہو پارس کے پتلے پر گرا رہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت ہی خطرناک ویچ ڈاکٹر تھا۔ اس کی بدبختی تھی کہ الپا نے اسے غلام بنالیا تھا۔ اس نے عمل کے دوران میں آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر الپا، بوبی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا؟ میں تیرے کالے عمل کی کامیابی چاہتی ہوں۔ ناکامی نہیں سنوں گی۔"

"میں تمہارا غلام ہوں۔ اپنا خون بہا کر یہ جان لیوا عمل کرتا رہا ہوں اور میں نے تمہارے دشمن کا سراغ لگالیا ہے۔"

وہ بے چینی سے بولی "وہ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ؟"

اس نے کوئی چیز انگیٹھی کی طرف پھینکی۔ شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ بولنے لگا "میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ آگ کے شعلوں میں صاف نظر آرہا ہے۔ پہلے عمل میں وہ بن گورین BEN GORION ائرپورٹ میں نظر آیا۔ دوسرے عمل کے شعلوں نے دکھایا کہ وہ تل ابیب کے صدر علاقے میں ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے مکان میں ایک پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتا ہے۔"

"اس بوڑھی کا مکان کہاں ہے؟"

"مکان نمبر ۱۰۔ فور تھری۔ آدم اسٹریٹ!"

"کیا وہ ابھی وہاں موجود ہے؟"

اس نے اپنی مٹھی کھولی۔ خنجر اس کی مٹھی سے نکل کر نیچے آیا اور پارس کے پتلے میں پیوست ہوگیا پھر اس نے کہا "وہ موجود ہے۔ میں نے کالے عمل کی نادیدہ زنجیروں میں اسے جکڑ دیا ہے۔ وہ اس مکان سے باہر نہیں جاسکے گا۔"

پھر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا "لیکن اسے زخمی نہ کرنا۔ اس کے دماغ پر میرا عمل مسلط ہے۔ اسے زخمی کردی گا یا کمزور بناؤ گی تو اس کا دماغ میرے عمل سے آزاد ہوجائے گا پھر اس پر قابو نہیں پاسکو گی۔"

"میں آتی دردسری مول لینا پسند نہیں کروں گی۔ ابھی میرے سراغ رساں وہاں پہنچیں گے اور ایک لمحہ بھی ضائع


عصر حاضر کی الف لیلہ۔ اردو زبان کی طویل ترین کہانی

ایک ایسا انسان کی داستان جو سورج کی انگلیوں سے دوسروں کے دماغ سنتا ہے اور لوگوں کو اپنی سوچ کے اشاروں پر نچاتا ہے

نیلی چھتری کے مایہ ناز بابا جی تیمور کی داستان حیات

کتابیات پبلی کیشنز

کیے بغیر اسے گولی مار دیں گے۔"

"گولی مارنے والوں کو حکم دو کہ وہ بچنے نہ پائے اگر نشانہ چوکے گا اور وہ زخمی ہوگا تو میری یہ جان لیوا محنت مٹی میں مل جائے گی۔"

بوبی نے کہا "خیال خوانی کرنے اور اپنے ماتحتوں کو حکم دینے سے پہلے میرا مشورہ سن لو۔ اسے گولی مارنے کا حکم نہ دو۔ وہ قسمت کا دھنی ہے اگر پہلی گولی سے ہلاک نہیں ہوا۔ صرف زخمی ہو سکا تو پھر ہمارے لیے پرابلم بن جائے گا۔"

"اگر اسے گولی نہ ماری گئی تو وہ بچ نکلے گا۔"

"کیسے بچ نکلے گا؟ تم نے سنا نہیں' جیکب نے اسے کالے عمل کی نادیدہ زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ وہ اس مکان سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ اسے گھیر کر ہتھکڑیاں پہنانے کا حکم دو۔ تم اسے قیدی بنا کر تخویفی عمل کے ذریعے اپنا معمول بنا سکو گی۔"

جیکب رابن نے کہا "اسے قیدی بنا کر یہاں لاؤ۔ میں تمہارا غلام بنانے کے لیے اس کے سر میں کیل پیوست کروں گا پھر اس کا باپ بھی اسے تمہاری غلامی سے نجات نہیں دلا سکے گا۔"

وہ خیال خوانی کے ذریعے اپنے ماتحت سراغ رسانوں کو پارس کا پتا ٹھکانا بتانے لگی۔ انہیں سختی سے کہنے لگی کہ پارس کو گھیرنے اور قیدی بنانے میں ذرا بھی کوتاہی ہوگی تو وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور یہ کہ اس وقت وہ ان کے دماغوں میں موجود رہے گی۔

وہ خیال خوانی کرتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آکر بیٹھ گئی پھر بوبی سے بولی "میں پارس کے دماغ میں جا رہی ہوں۔ مجھے ان تمام سراغ رسانوں سے زیادہ تم پر بھروسا ہے۔ تم فوراً جاؤ۔ اس مکان سے کچھ فاصلے پر رہو اگر وہ مکار فرار ہونے میں کامیاب ہونے لگے تو تم اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دو۔"

بوبی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ وہ خیال خوانی کے ذریعے پارس کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ چونک کر بولا "کون؟ کون ہے؟ جاؤ۔ میرے دماغ سے جاؤ۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی "تمہیں کیا ہو رہا ہے' میرے سابقہ لائف پارٹنر؟"

"اوہ تم؟ تم ہنس رہی ہو۔ میں سمجھ گیا کہ میرا دماغ میرے اختیار میں کیوں نہیں ہے۔ میں سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی تمہیں پہچان لیا کرتا تھا۔ ابھی تمہیں نہ پہچان سکا۔ تم بلیک بک کے ذریعے مجھ پر مسلط ہونا چاہتی ہو۔"

"جو کچھ ہو رہا ہے' تم اسے سمجھ رہے ہو۔ تم تو ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہو۔ اب ایسا نہیں کہہ رہے ہو تو اپنے باپ کو اور رشتے داروں کو مدد کے لیے پکارو۔"

"میں یہی کوشش کر رہا ہوں لیکن خیال خوانی کی پرواز نہیں کر پا رہا ہوں۔ مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھ پر قابو پا لو گی۔ میرے پاپا' میری ماما اور دوسرے تمام ٹیلی پیتھی جاننے والوں میں سے کوئی نہ کوئی میری خیریت معلوم کرنے آئے گا پھر میری یہ حالت دیکھتے ہی مجھے تمہارے وچ ڈاکٹر کے سحر سے نجات دلا دے گا۔"

"جیکب کا کالا عمل زبردست ہوتا ہے۔ آج تک کوئی میرے دماغ میں نہ آسکا۔ اب تمہارے دماغ میں بھی اپنے پرائے نہیں آسکیں گے۔"

وہ جیکب کے پاس آکر بولی "میں پارس کے دماغ میں پہنچ جاتی ہوں۔ اسی طرح اس کا باپ اور اس کے دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے اندر پہنچ کر اسے میرے شکنجے سے نکال لے جائیں گے۔"

"تو میڈم! اس کے دماغ میں پہنچا جا سکتا ہے لیکن اپنی مرضی اس کے دماغ پر مسلط نہیں کی جا سکے گی۔ تم اس کے دماغ میں جاری ہو لیکن اس کے دماغ کو متاثر نہیں کر سکو گی۔ اسی طرح اس کے اپنے اس کے اندر آکر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

اتفاق سے ثانی اپنے پارس سے باتیں کرنے کے لیے اس کے دماغ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ الپا نے واپس آکر پارس کے اندر ثانی کی باتیں سنیں پھر کہا "یہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ اب میرا غلام بننے والا ہے۔ اس کی کم بختی اسے میرے ملک میں لے آئی ہے۔"

پارس نے کہا "ثانی! تم ماما اور تیرزی صاحب سے کہو' وہ کالے جادو کا توڑ کریں گے۔"

"ماما! مراقبے میں ہیں اور تیرزی صاحب نے کہا ہے فی الحال قدرتی طور پر جو ہو رہا ہے' وہی ہوتا رہے گا۔ وہ اس وقت ان حالات اور معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔"

اس بات نے الپا کی ایک بہت بڑی کامیابی پر تصدیقی مہر لگا دی۔ وہ فاتحانہ انداز میں قہقہے لگانے لگی۔

ٹیلی پیتھی کے خود کار فرہاد علی تیمور کی اس مقبول عام سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے۔

بیگم جہانگیر کی ملاقات مسز عالمگیر سے مانچسٹر میں مسٹر اور مسز اظہیم کے گھر پر ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ بیگم جہانگیر بوسٹن سے تشریف لائی تھیں۔ جب کہ مسز عالمگیر کا دولت کدہ لیورپول میں تھا۔ بیگم جہانگیر نے طلائی کام سے مرصع جوڑے' ہار و والی عثمانی ساری زیب تن کی تھی۔ مسز عالمگیر نارنجی رنگ کے زرکار غرارے جمپر میں ملبوس تھیں۔ بیگم جہانگیر نے گہری سرخ لپ اسٹک لگائی تھی۔ مسز عالمگیر کی لپ اسٹک کا رنگ گلابی تھا۔ بیگم جہانگیر کے ہاتھوں میں سونے کی بارہ بارہ چوڑیاں اور دو دو کڑے تھے۔ مسز عالمگیر کی چوڑیوں اور کڑوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ بیگم جہانگیر کے کانوں میں بیش قیمت طلائی بندے تھے۔ مسز عالمگیر نے ٹاپس پہن رکھے تھے۔ بیگم جہانگیر کے لباس سے رات کی رانی کی نشہ انگیز خوشبو پھوٹ رہی تھی جبکہ مسز عالمگیر نے خود کو شامہ کی مسحور کن خوشبو میں بسایا تھا۔ بس ایک بات ایسی تھی جس میں مسز عالمگیر مات کھا گئی تھیں۔ اور وہ یہ کہ بیگم جہانگیر کا جڑاؤ ہار زیادہ بھاری اور خوب صورت تھا۔ مسز عالمگیر کو بڑا قلق ہوا۔ انہوں نے اپنے کم تر ہار کو چھو کر طے کیا کہ پہلی ہی فرصت میں نیا ہار خریدیں گی جو بیگم جہانگیر کے ہار سے قطعی طور پر بہتر ہوگا۔ خدشہ یہ تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو انہیں کم خوابی کی شکایت ہو جائے گی۔

تعارف کے دوران میں جب دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا تو بیگم جہانگیر کے ہونٹوں پر بڑی نفیس مسکراہٹ تھی۔ جب کہ مسز عالمگیر کے ہونٹوں پر فقط مسکراہٹ کے لیے نازک زیادہ مناسب لفظ ہے۔

بیگم جہانگیر نے کہا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

مسز عالمگیر نے جواباً کہا۔ "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی

قارئین سسپنس کے لیے ش صفیر ادیب کی دہار غیرت خصوصی سوغات

نفسیات کا دوزخ کا خیال ہے کہ احساس بری بری' احساس کمتری کی بدترین شکل ہے۔ اس احساس میں مبتلا دو عورتوں کی داستان جو اپنی بری بری کے اظہار کے لیے ہر چتن پر آمادہ تھیں اور کسی بھی معاملے میں سبکسر ہونا نہیں چاہتی تھیں مگر انہی قدیر سے کون لڑ سکا ہے۔

# اچھی گھڑی بری گھڑی

ش صفیر ادیب

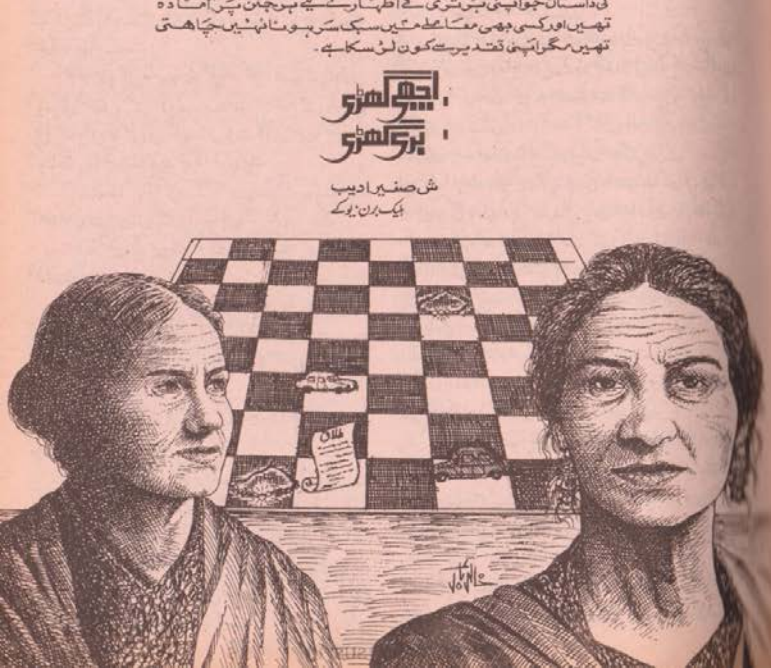

مسرت ہوئی۔"

یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم قیاس غالب ہے کہ دونوں کو واقعی مسرت ہوئی تھی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے درمیان کئی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں ہم زبان تھیں اور کافی حد تک ہم مزاج بھی۔ نیز دونوں کی پسند ناپسند میں بھی کچھ تفاوت نہیں تھا۔ بیگم جہانگیر کو عنابی، کیسری اور سفید رنگ پسند تھے مسز عالمگیر کو نارنجی، کیسری اور سفید رنگ بھاتے تھے۔ بیگم جہانگیر کو انگلستان کی سخت سردی سے چڑ تھی، مسز عالمگیر بھی جنوری، فروری کی سردی سے نفرت کرتی تھیں۔ بیگم جہانگیر کو اپنے ملک کی گندگی، مٹی، دھول اور مکھیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے گنوار، بدتہذیب لوگوں سے وحشت ہوتی تھی۔ مسز عالمگیر کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بیک ورڈ ہیں اور جینے کا سلیقہ نہیں جانتے۔ بیگم جہانگیر اہم تقریبات میں بالکل نیا لباس پہن کر ملنا ضروری خیال کرتی تھیں۔ مسز عالمگیر نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا کہ ایک لباس دوبارہ پہننے میں سبکی کا احتمال ہے۔ بیگم جہانگیر کو کڑھی بے انتہا پسند تھی۔ مسز عالمگیر نے کہا کہ ان کا بھی یہی حال ہے کہ ہفتے عشرے میں اگر کڑھی نہ ملے تو زندگی بڑی بے کیف ہوجاتی ہے۔

گفتگو مزید چلی تو یہ بات کھلی کہ کسی زمانے میں دونوں ایک ہی شہر میں تھیں اور مدرسہ بنات الاسلام میں کچھ دن دینی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس بات کا ذکر مسز عالمگیر نے کیا۔ بیگم جہانگیر نے شدید تحیر کا اظہار کیا۔

"اے ہے، کیا واقعی۔۔؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔ "بھلا کون سے سن میں تھیں آپ وہاں؟"

مسز عالمگیر نے سن بتایا تو بیگم جہانگیر کے تحیر میں مزید اضافہ ہوا۔

"ارے نہیں، کیا واقعی؟ بھئی ان دنوں تو میں بھی تھی وہاں، دینیات پڑھنے جایا کرتی تھی۔"

"تب تو ضرور وہاں آپ کو دیکھا ہوگا" مسز عالمگیر حیرت زدہ نظر آرہی تھیں۔

"ہاں، یقیناً مگر کچھ یاد نہیں آتا" بیگم جہانگیر نے جواب دیا۔

مسز عالمگیر نے ہاتھ اٹھا کر اک ذرا انداز بے نیازی سے بالوں کی لٹ درست کی، پھر بولیں "ہم مدرسے میں ضرور ایک دوسرے سے واقف رہی ہوں گی۔ مگر اتنی مدت گزر گئی۔ وقت ہمیں کہاں سے کہاں لے آیا۔ بہت سی پرانی یادیں دھندلا گئیں۔ شاید اسی لیے ہمیں ایک دوسرے کی صورتیں یاد نہیں آرہیں۔ پھر بھی یہ کیسا عجیب اور ناقابل یقین لیکن خوب صورت اتفاق ہے کہ اتنے برسوں بعد وطن سے ہزاروں میل دور یہاں انگلستان میں ہماری ملاقات ہوگئی۔ بچ جائیں، مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔"

"آپ سچ کہتی ہیں" بیگم جہانگیر نے اتفاق کیا "واقعی ناقابل یقین بات ہے" رکیں، پھر کہنے لگیں "مگر بہرحال بے حد مسرت کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ یہاں پردیس میں کوئی اپنا ہم وطن، ہم زبان مل جائے تو یوں لگتا ہے، قارون کا خزانہ مل گیا۔"

"سچ ہے۔" مسز عالمگیر نے مسکرا کر خوش دلی سے سر کو جنبش دی۔

پارٹی کے اختتام پر جب بیگم جہانگیر رخصت ہونے لگیں تو بطور خاص انہوں نے مسز عالمگیر سے اصرار کیا کہ پرسٹن ضرور تشریف لائیں اور ان کے "غریب خانے" کو رونق بخشیں۔ ورنہ انہیں حد درجہ قلق ہوگا۔ مسز عالمگیر نے گرم جوشی سے بیگم جہانگیر کو گلے لگایا اور کہا کہ لیورپول اور پرسٹن کے درمیان تو کچھ ایسا زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔ وہ ضرور بیگم جہانگیر کے دولت کدے پر حاضر ہوں گی اور ان کی مہمان نوازی کا لطف اٹھائیں گی۔

مسز عالمگیر کا اندیشہ درست نکلا۔ وہ جب سونے کے لیے اپنے ڈبل بیڈ پر دراز ہوئیں تو باوصف اس کے کہ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، وہ سونے سے قاصر رہیں۔ جب بھی آنکھیں بند کرتیں، وہ کم بخت، نامعقول ہار جو بیگم جہانگیر کے گلے میں جگ مگ کر رہا تھا، ان کے تصور میں رقص کرنے لگتا اور نیند اچاٹ ہوجاتی چنانچہ پوری رات بے آرامی کی نذر ہوگئی۔ صبح ہوئی تو دشمنوں کا مزاج ناساز تھا۔ ناشتے پر ایلمٹ کے ساتھ دو توس لیا کرتی تھیں، لیکن جی اتنا بھاری تھا کہ دو توس بھی کم بخت نہ کھائے گئے۔ تمام دن طبیعت بے زار اور بے کیف رہی۔ حتیٰ کہ ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام فیملی فارچون دیکھنے بیٹھیں تو وہ بھی نہ دیکھا گیا۔ اگرچہ انہوں نے دھیان ادھر ادھر لگانے اور دل بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وائے افسوس کہ ناکام رہیں۔ وہ نامراد بار بار بار بار تصور میں آجاتا اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔

مسز عالمگیر نے اپنی بیوی کی کیفیت کا مشاہدہ کیا اور زیر لب مسکرائے۔ ان کے سر میں جو دس بارہ بال سفید تھے، وہ انہوں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ جہاں دیدہ اور تجربہ کار تھے اور مزاج شناس بھی، کم از کم اپنی شریک حیات کے۔

مزاج سے تو بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اپنی نصف بہتر کو ٹھنڈی سانسیں بھرتے دیکھا تو فوراً سمجھ گئے۔ کہ



ہاسازی مزاج کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔ یقیناً تقریب میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو مسز عالمگیر کی طبع نازک پر گراں گزری ہے۔ مگر وہ کیا بات ہوسکتی ہے۔ انہوں نے تقریب کے مناظر اپنے ذہن میں دہرائے۔ تمام تفصیلات جزئیات کے ساتھ انہیں یاد آیا کہ مسز عالمگیر کا زیادہ وقت مسز جہانگیر کے ساتھ گزرا تھا۔ انہوں نے تصور میں دونوں کا موازنہ کیا۔ لباس، آرائش، زیورات۔۔۔ وہ چونکے۔ ہاں یقیناً یہی بات ہوسکتی ہے۔ غالباً بیگم جہانگیر کا کوئی زیور زیادہ قیمتی اور خوشنما رہا ہوگا۔ مگر کون سا زیور ہوسکتا ہے۔ چوڑیاں، بندے، انگوٹھیاں، کڑے، ہاں۔ انہیں ایک بار پھر چونکنا پڑا، یاد آیا کہ بیگم جہانگیر کا ہار زیادہ قیمتی جدید فیشن کا تھا اور اس میں چند ہیرے بھی جڑے ہوئے تھے۔ غالباً ان ہیروں کی چمکا چوندنے ہی ان کی مسز کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔

مسٹر عالمگیر نرم اور کشادہ دل آدمی تھے۔ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ برسوں پہلے جب وہ انگلستان آئے تھے، تب ان کی جیب میں صرف پانچ پونڈ تھے۔ ابتدا میں انہوں نے ایک فیکٹری میں مزدوری کی۔ پھر بس کنڈیکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر اوپن مارکیٹ میں کپڑوں کا اسٹال لگایا پھر چار پیسے بیس انداز ہوئے اور کاروبار کی باریکیوں سے واقفیت حاصل ہوئی تو گارمنٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری قائم کرلی۔ برسوں کی محنت اور جدوجہد کے نتیجے میں اب صورت حال یہ تھی کہ ان کے پاؤں اعتماد کے ساتھ زمین پر جمے ہوئے تھے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو ان کی بیوی کی پسند اور مزاج کے خلاف ہو۔ باوصف اس کے کہ ان کی بیوی نے شاید ہی کبھی کوئی ایسا کام کیا تھا جو مسٹر عالمگیر کی پسند اور مزاج کے مطابق ہو تاہم پھر بھی خوش اور مطمئن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گھریلو زندگی پرامن اور خوش گوار رکھنے کے لیے تھوڑا بہت درگزر سے کام لینا اور قربانی دینا از بس ضروری ہوتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ درگزر کا مظاہرہ عموماً ان ہی کی طرف سے ہوتا تھا اور قربانی بھی اکثر وہی دیا کرتے تھے۔

چونکہ انہیں علم تھا کہ اُس ہار کا مسئلہ حل نہ ہوا تو مسز عالمگیر کا مزاج دنوں بلکہ مہینوں ناساز رہے گا۔ جو انہیں منظور نہیں تھا۔ لہٰذا دوسرے ہی دن وہ مسز عالمگیر کو لے کر بازار گئے۔ بہانہ تھوڑی بہت شاپنگ کا تھا مگر کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد شہر کے سب سے بڑے ایشین جیولری کی دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ انداز میں ایسی بے نیازی تھی گویا دکان پر یونہی محض اتفاق رہا ہو۔ وہ ڈیزائن مختلف زیورات سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ انگوٹھیاں، بریسلٹ، بندے اور ہار۔ چند لمحے زیورات کا جائزہ لینے کے بعد اچانک انہوں نے ایک ہار کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ ہار تو بہت دل کش ہے۔"

"ہاں ہے تو۔۔" مسز عالمگیر کی آواز میں اچنبھے اور خوشی کا ملا جلا تاثر تھا۔

"پسند ہے آپ کو؟"

مسز عالمگیر زور سے چونکیں۔ حیرت سے مسٹر عالمگیر کو دیکھا پھر نگاہیں ہار پر جم گئیں۔ جدید فیشن کا حد درجہ خوب صورت ہار تھا اور قطعی طور پر بیگم جہانگیر کے ہار سے بہتر تھا۔ ڈیزائن میں دل کشی میں اور بلاشبہ قیمت میں بھی۔ مسز عالمگیر نے تصور میں اس ہار کو اپنے گلے میں دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ ہار نہ صرف ان کی شخصیت کو چار چاند لگائے گا بلکہ ان کی ہار کو جیت میں بھی بدل دے گا۔ وہ یکایک مسکرائیں۔ ذرا نزاکت اور نفاست سے گردن کو جنبش دی۔ پھر مسٹر عالمگیر کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہے تو بہت دل آویز۔"

○☆○

کوئی دو ہفتے بعد مسز عالمگیر پرسٹن تشریف لائیں۔ کچھ تو اس لیے کہ وعدہ کیا تھا اور کچھ اس لیے کہ نئے ہار کی نمائش مقصود تھی۔ بیگم جہانگیر نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اور ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ مسز عالمگیر اپنی بھاری بھرکم زردار ساری، شمامہ کی دلنواز مہک، نمائشی مسکراہٹ اور ڈھیر سارے زیورات بہ شمول ہار، چربی صوفے پر تشریف فرما ہوئیں۔ ایک نظر کمرے کے فرنیچر، وال پیپر، پردے اور قالین پر ڈالی۔ پھر مسکرا کر گویا ہوئیں۔

"بھئی ماشاءاللہ آپ کا مکان تو بہت پیارا ہے۔"

بیگم جہانگیر انکساری سے مسکرائیں "بس اللہ کا کرم ہے۔"

مسز عالمگیر نے قدرے توقف کے بعد کہا "اور سنایئے بیگم جہانگیر، آپ اچھی تو ہیں ناں، آپ کے نزلے کا کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے" بیگم جہانگیر نے مزید کسر نفسی سے کام لیا۔ "نزلہ بھی اب زیادہ پریشان نہیں کررہا۔"

"کئی دن سے آپ کا دھیان آرہا تھا" مسز عالمگیر نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا "سوچتے چلی آئی۔" اتنا کہتے کہتے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ہار کو چھوا۔

"میں بھی آپ کو کئی دن سے یاد کررہی تھی" بیگم جہانگیر نے کہا "اگر آپ نہ آتیں تو میں دو چار روز میں خود حاضر ہوتی۔"

"مجھی اب کیا کروں۔۔۔" مسز عالمگیر نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ "اس ملک میں بھانت بھانت کے چہرے نظر آتے ہیں۔ گورے، کالے، چینی، جاپانی، افریقی اور گورے تو خیر ہیں ہی۔ لیکن اپنی طرف کی صورت نظر نہیں آتی۔ میرا مطلب ہے اپنے ہم زبان اور ہم مزاج۔ اور اگر کوئی مل جائے تو یوں لگتا ہے جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو" مسز عالمگیر نے ایک بار پھر اپنے ہار کو چھوا۔

"جی ہاں۔۔۔ یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہاں کسی ہم زبان کا ملنا ایک نعمت سے کم نہیں" بیگم جہانگیر نے کہا پھر اک ذرا رک کر بولیں "اے ہے مسز عالمگیر! یہ ہار تو بہت خوب صورت ہے۔ پارٹی میں تو شاید آپ نے نہیں پہنا تھا۔"

مسز عالمگیر نے ذرا بے نیازی اختیار کی "اے بہن! اب مجھے تو زیورات کا ایسا کوئی شوق ہے نہیں۔ دو چار زیور ہیں۔ پڑے رہتے ہیں اِدھر اُدھر، کبھی کبھار پہن لیتی ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے ہار پہ ہاتھ پھیرا پھر مسکرائیں "ویسے یہ ہار خوب صورت مگر بھاری ہے۔"

"زیور کا شوق تو مجھے بھی کچھ ایسا خاص نہیں ہے" بیگم جہانگیر نے کہا "مگر دو چار زیور ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار تو ضرورت توڑتی ہے ہاں۔"

بیگم جہانگیر کی دختر نیک اختر گلشن آرا ان کی ہدایت پر کچن میں گھس گئی تھیں۔ مسز عالمگیر کی نور نظر لخت جگر آنسہ شمس النساء بیگم بھی اس کا ہاتھ بٹانے چلی گئی تھی۔ مسٹر عالمگیر اور جناب جہانگیر نے اپنی چھوٹی سی کانفرنس جمائی تھی اور سگریٹ کے مرغولوں کے درمیان وطن کی تازہ سیاسی صورت حالات پر اظہار خیال فرمانے میں مصروف تھے۔ مسٹر عالمگیر کا خیال تھا کہ ملک کی تمام تر بدحالی کی ذمے داری قطعی طور پر بدعنوان سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جس دن بھی ملک کو ان کرپٹ، بے ایمان، ظالم اور شیطان صفت سیاست دانوں اور خون چوسنے والے زمینداروں سے نجات مل گئی، اس دن سے ملک اور قوم کی قسمت بدلنا شروع ہوجائے گی۔ جناب جہانگیر کو مسٹر عالمگیر کے خیالات سے کلی اتفاق تھا۔ وہ بار بار سر ہلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمارے یہاں کی سیاست دراصل کینسر کے مرض کے مانند ہے اور اس کا علاج بہت ضروری ہے۔"

شام گئے جب مسز عالمگیر رخصت ہونے لگیں تو انہوں نے بیگم جہانگیر سے وعدہ لیا کہ جلد ہی وہ بھی مع اپنے شوہر اور بیٹی کے ان کے غریب خانے پر تشریف لائیں گی۔ ورنہ انہیں سخت رنج ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ چند ایک راتیں بے خوابی کی نذر ہوجائیں۔ بیگم جہانگیر نے وعدہ کیا کہ وہ یقیناً مسز عالمگیر کے در دولت پر حاضر ہوں گی اور ان کی میزبانی کا لطف اٹھائیں گی۔

برسوں پہلے جب جناب جہانگیر انگلستان میں وارد ہوئے تھے تو ان کی جیب میں پانچ پونڈ بھی نہیں تھے۔ ابتدا میں انہوں نے بڑی پریشانیاں اٹھائی تھیں۔ بہت بے سروسامانی میں وقت گزارہ تھا۔ اگر چند ایک واقف کاروں اور ہمدردوں کی مدد حاصل نہ ہوتی تو شاید ہمت ہی ہار جاتے۔ مگر واقف کاروں نے حوصلہ بڑھایا۔ شروع میں انہوں نے بہت ہی معمولی کام کیے تھے۔ جن میں ایک ہوٹل میں پیاز کاٹنا، برتن دھونا اور بیرا گیری بھی شامل تھی۔ مگر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا راستہ تلاش کرلیا۔ بجلی کے کام سے وہ واقف تھے۔ برسوں مشقت کرنے اور پنی پنی جوڑنے کے بعد چار پیسے جمع ہوئے تو انہوں نے بھی بجلی کے سامان کی ایک چھوٹی سی دکان قائم کی۔ جو اب ایک خاصے بڑے اسٹور روم میں تبدیل ہو چکی تھی اور جناب جہانگیر کے پاؤں زمین پر اس طرح جم چکے تھے کہ انہیں کل کا خوف زیادہ پریشان نہیں کرتا تھا۔ اس تمام عرصے میں انہوں اپنی بیوی کا بہت خیال رکھا تھا۔ ان کی خوشنودی کو ہر حال میں اولیت دی تھی۔ اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش پوری کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ ان کی بیوی نے اس تمام عرصے میں ان کا خیال رکھنے کے مظاہرہ شاذ ہی کیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ محبت کرنے اور خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے تھوڑا بہت رواداری اور تیاگ سے کام لینا از بس کہ لازمی ہوتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ رواداری بھی وہی برتتے تھے اور تیاگ کا مظاہرہ عموماً انہیں کی طرف سے ہوتا تھا۔

چنانچہ یہی سبب ہے کہ اگلے دن صبح جب انہوں نے اپنی بیگم کے چہرے پر بے زاری اور بے کیفی کا رنگ دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔ ان کے سر میں دس بارہ بال سفید تھے مگر یہ بال انہوں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ بلکہ تجربے کی آنچ میں تپ کر سفید ہوئے تھے۔ ذہین اور مزاج داں تھے۔ کم از کم بیگم جہانگیر کا مزاج کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے بیگم کو ٹھنڈی سانسیں بھرتے دیکھا تو فوراً سمجھ گئے کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جو بیگم کے طبع نازک پر گراں گزری ہے مگر وہ کیا بات ہو سکتی ہے؟

وہ چاپ چاپ بیٹھے اخبار پڑھتے رہے۔ بیگم کا جائزہ لیتے رہے اور غور کرتے رہے۔ گزشتہ شام کا پورا منظر ذہن کے پردے پر دہرایا۔ دونوں خواتین کا رویہ، بات چیت، مسز عالمگیر نے کیا کہا تھا؟ بیگم جہانگیر نے کن موضوعات پر اظہار خیال کیا تھا۔ پھر وہ مغا مسکرائے اور من ہی من میں اپنے آپ سے کہا۔

"کاں۔۔۔!"

یاد آیا کہ مسز عالمگیر کو رخصت کرتے وقت بیگم جہانگیر نے چند ایک بار نجی بی ایم ڈبلیو کو ذرا رشک سے دیکھا تھا۔ دو ایک ٹھنڈی سانسیں بھی لی تھیں اور پھر ذرا متاسفانہ نظروں سے اپنی تیرہ سو سی سی کی ڈاٹسن پر نظر ڈالی تھی۔ جناب جہانگیر مسکرائے۔ بیگم جہانگیر کو ذرا غور سے دیکھا اور اپنے آپ سے زیر لب کہا۔

"یہی بات ہو سکتی ہے۔"

شام کو جب واپس آئے اور اپنے لیے سینڈوچ اور چائے بنا کر دسترخوان کے پاس والی ٹیبل پر اطمینان سے بیٹھ چکے، تب انہوں نے مسکرا کر قدرے بے پروائی سے کہا۔

"آج میں مائیکل کی طرف گیا تھا۔"

"مائیکل کون۔۔۔؟"

"ارے بھئی وہی کار ڈیلر۔۔۔" انہوں نے مزید بے نیازی کا مظاہرہ کیا "اس سے کار کے لیے کہا تھا ناں۔ آج اس نے فون پر بتایا کہ تین چار اچھی کاریں اس کے پاس آرہی ہیں۔ مسٹو سٹی، ہنڈا ایکسس اور۔۔۔ بی ایم ڈبلیو۔"

انہوں نے کن انکھیوں سے بیگم کی طرف دیکھا۔

"اس سے کار کے لیے کب کہا تھا؟" بیگم جہانگیر نے حیرت سے پوچھا۔

"شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔ کوئی دو ماہ ہوئے، آپ ہی کی خواہش پر میں نے مائیکل سے ذکر کیا تھا۔ آج دیکھ کر آیا ہوں۔ واقعی اچھی کاریں ہیں۔"

"کیا واقعی؟" بیگم جہانگیر بدستور الجھن میں مبتلا تھیں۔

"ہاں بھئی تعجب ہے کہ آپ بھول گئیں۔"

"نہ جانے میری یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔" بیگم جہانگیر ذرا جھنجلا کر بولیں "کم بخت کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔"

"تو پھر کون سی گاڑی لیں گی؟"

بیگم جہانگیر ابھی تک صوفے پر نیم دراز تھیں، اب اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"بھئی بی ایم ڈبلیو تو مجھے بالکل پسند نہیں۔ ہاں لیکسس اچھی لگتی ہے۔ خوب صورت اور بڑی ہے اور بہت آرام دہ بھی۔"

جناب جہانگیر مسکرائے چند دن پہلے تک بیگم کو بی ایم ڈبلیو بہت پسند تھی۔ اکثر اس خواہش کا اظہار کر چکی تھیں کہ ڈاٹسن بیچ کر بی ایم ڈبلیو خریدی جائے۔ یہ ڈاٹسن بھی کم بخت کوئی کار ہے۔ بالکل صابن کی ڈبیا لگتی ہے۔ ہاں بی ایم ڈبلیو کی بات ہے۔ دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہے۔ مگر اب وہی بی ایم ڈبلیو انہیں قطعاً پسند نہیں تھی۔ اور جناب جہانگیر کو اس کا سبب بھی معلوم تھا۔ وہ چند لمحے معنی خیز نظروں سے اپنی بیگم کو دیکھتے رہے پھر مسکرا کر نرم آواز میں بولے۔

"ٹھیک ہے کل چلیں گے۔"

گہرے فیروزی رنگ کی چمکتی دمکتی لیکسس دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ بیگم جہانگیر بے حد خوش تھیں۔ ان کے چہرے پر ناچتی افسردگی بھاپ بن کر اڑ چکی تھی۔ ٹھنڈی سانسیں بھی موقوف ہو چکی تھیں۔ مگر اس خوشی میں 'اس جوش میں ایک خلش موجود تھی۔ ایک ناریدہ پھانس مستقل طور پر دل میں چبھی ہوئی تھی۔ یہ پھانس اس وقت نکلی، جب چند دن بعد وہ بہ نفس نفیس لیورپول تشریف لے گئیں۔ اور مسز عالمگیر کے ڈرائنگ روم میں اپنے زرکار غرارہ سوٹ، زیورات، رات کی رانی کی روح پرور مہک اور ہونٹوں پر بھی نمائشی مسکراہٹ سمیت صوفے پر رونق افروز ہوئیں۔ چند

منٹ اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کیں۔ پھر بے پروائی سے کار کا ذکر کیا' اور ذرا بے نیازی سے کہا۔

"بھئی' کیا کرتی اس کم بخت نامعقول ڈائٹن سے تو مجھے ہول آتا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی صابن دانی میں بیٹھی ہوں۔ اب لیکسس لی ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے تو آئی ہے۔ یہ گاڑی بڑی ہے اور مجھے پسند بھی بہت ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک طویل سانس لی اور یکایک اپنے آپ کو پھول کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

رفتہ رفتہ بیگم جہانگیر اور مسز عالمگیر کے تعلقات اور بڑھے۔ دوستانہ مراسم اور بھی گہرے ہوئے۔ گولیور پول اور پریسٹن میں فاصلہ کچھ ایسا کم نہیں پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے مستقل رابطہ رکھتیں۔ ہفتے میں دو تین بار ٹیلی فون کھڑکھڑایا جاتا اور دنیا جہاں کی ضروری اور غیر ضروری باتیں کی جاتیں۔ ملبوسات اور زیورات پر رائے زنی ہوتی۔ ہر تیسرے یا چوتھے ہفتے ملاقات کا اہتمام کیا جاتا۔ کبھی بیگم جہانگیر اپنی لیکسس پر سوار ہو کر پورے ہام جھام کے ساتھ لیورپول تشریف لے جاتیں اور کبھی مسز عالمگیر اپنی ایم ڈبلیو میں براجمان ہو کر پورے اہتمام اور احتشام کے ساتھ پریسٹن وارد ہوتیں۔ اکثر تفریحی پروگرام بھی بنتے۔ سنوڈونیا' لیک ڈسٹرکٹ اور اسکاربرو کے چکر لگائے گئے۔ حتیٰ کہ ایک بار دونوں خواتین نے شوہروں اور صاحب زادیوں سمیت گلاسگو کا سفر بھی کیا۔

گو دونوں خواتین کی دوستی قریب قریب مثالی تھی اور بظاہر مخلصانہ۔ لیکن زیریں سطح دونوں کے درمیان بہرحال ایک غیر محسوس جذبۂ رقابت بھی موجود تھا۔ اور یہ جذبہ بنیادی طور پر اپنی ذات کے اظہار کے لیے تھا۔ جس نے ایک خاموش مقابلے کو جنم دیا تھا۔ دونوں غیر ارادی طور پر بازی جیتنے کی دھن میں مبتلا رہتیں۔ اور چونکہ دونوں ہی کو سبک ہونا گوارا نہیں تھا لہٰذا ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر نظر رکھتیں۔ مسز عالمگیر اگر ایک کام کرتیں تو لازمی ٹھہرا کہ بیگم جہانگیر اس سے بڑھ کر کچھ کریں۔ مثال کے طور پر مسز عالمگیر نے سارے گھر میں نیا قالین ڈلوایا تو یکایک بیگم جہانگیر کو اپنے گھر کا قالین پرانا' بدرنگ اور بھدا نظر آنے لگا۔ حالانکہ اچھا بھلا قالین تھا۔ اور صرف ڈیڑھ سال قبل خریدا گیا تھا۔ لیکن بیگم جہانگیر کو قرار اس وقت آیا جب جناب جہانگیر انہیں لے کر کارپٹ شاپ پہنچے اور نئے قالین کا آرڈر دیا۔ مسز عالمگیر نے اپنے باورچی خانے نئے سرے سے آرائش کروائی۔ اور نیا کچن یونٹ فٹ کروایا۔ بیگم جہانگیر نے ان کا باورچی خانہ دیکھا۔ خوش دلی سے تعریف کی مگر گھر آکر سرد آہیں بھرنا شروع کر دیں اور اس وقت تک بھرتی رہیں جب تک ان کا کچن بھی نئے یونٹ اور ساز و سامان سے آراستہ نہیں ہو گیا۔ گرمیاں آئیں' بیگم جہانگیر نے ہالیڈے منانے کے لیے اٹلی جانے کا پروگرام بنایا۔ اب مسز عالمگیر کے لیے ناگزیر ٹھہرا کہ فوری طور پر ٹریول ایجنٹ سے رابطہ قائم کریں اور اسپین کے لیے ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کروائیں۔

وقت یونہی گزر رہا تھا کہ ایک دن اچانک خبر آئی کہ مسز عالمگیر نے اپنے شوہر سے طلاق کے حصول کے لیے باقاعدہ قانونی کارروائی شروع کر دی ہے۔ خبر سن کر جناب جہانگیر کو حد درجہ تعجب ہوا اور سخت صدمہ بھی۔ جہاں تک ان کے علم و قیاس کا تعلق تھا' دونوں میاں بیوی کے تعلقات نہایت خوش گوار تھے۔ پھر یہ طلاق کا مطالبہ کس لیے؟ لیکن جہاں تک بیگم جہانگیر کا تعلق ہے انہیں صدمہ تو بے شک ہوا مگر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ کم از کم یہ بات ان کے علم میں تھی کہ مسٹر اور مسز عالمگیر کے تعلقات گزشتہ کچھ عرصے سے خاصے کشیدہ ہیں۔ گو بظاہر دونوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش گوار ہے۔ آپس میں کم از کم ملنے والوں کی موجودگی میں گفتگو بھی کرتے ہیں۔ مگر اندر اندر دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ چکا ہے۔ حتیٰ کہ گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے دونوں الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں۔

بیگم جہانگیر کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ میاں بیوی کے درمیان وجۂ نزاع ان کی نور نظر لخت جگر آنہ شمس النساء بیگم ہے۔ وہ خود تو کوئی مسئلہ نہیں تھی کہ بہرحال ان کی اولاد تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ پیچھے وطن میں مسز عالمگیر کا ایک عدد سگا بھتیجا تھا' جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اگر بات اتنی بھی ہوتی تو شاید کوئی مسئلہ نہ ہوتا مگر مزید مشکل یہ تھی کہ پیچھے وطن میں مسز عالمگیر کا ایک سگا بھانجا بھی موجود تھا۔ جو اتفاق سے انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مسز عالمگیر طے کر چکی تھیں کہ وہ اپنی نور نظر اور لخت جگر کی شادی مسٹر عالمگیر کے بھانجے سے ہرگز ہرگز نہیں کریں گی کیونکہ ان کا بھانجا بالکل ہونق ہے' جاہل ہے اور سر میں کڑوا تیل ڈالتا ہے۔ (میری بیٹی کڑوے تیل کی بو سونگھ سونگھ کر مرجائے گی۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا) دوسری طرف کچھ ایسے ہی خیالات مسٹر عالمگیر کے مسز عالمگیر کے بھتیجے کے بارے میں تھے۔ ان کے قول کے مطابق مسز عالمگیر کا بھتیجا ٹھگنا ہے' دیکھنے میں بالکل جوکر نظر آتا ہے۔ اور یہ کہ اس کے دو دانت گھڑی کے دانتوں کی یاد دلاتے ہیں۔ چنانچہ آنہ شمس النساء بیگم کی شادی اس سے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی اگر ہوگی تو صرف ان کے بھانجے سے



ہوگی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ برسوں پہلے وہ اپنی بہن سے وعدہ کر چکے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر زبانی طور پر وہ منگنی طے کر چکے ہیں۔ اور چونکہ شریفوں میں زبان سے پھرنا معیوب سمجھا جاتا ہے لہٰذا وہ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے اور ہر حال میں اپنی نور نظر کی شادی اپنے بھانجے سے کریں گے۔

یہ "جنگ" گزشتہ ایک سال سے درون پردہ چل رہی تھی۔ دونوں فریق اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے اور ایک اچٹی سی پسپا ہونے پر تیار نہیں تھے۔ مسٹر عالمگیر کا کہنا تھا کہ انہوں نے مسز عالمگیر کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ ان کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کیا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر ان کی ناجائز باتیں بھی مان لی ہیں۔ ان کی اس طویل غیر مشروط فرمانبرداری کے عوض اب ان کا جائز حق ہے کہ کم از کم ان کی ایک خواہش کا احترام کیا جائے۔ انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ اور سوال ان کی عزت اور انا کا ہے لہٰذا وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اور ہر حال میں اپنی خواہش پوری کریں گے۔ اس کے برعکس مسز عالمگیر کا ارشاد تھا کہ انا جائے چولھے بھاڑ میں اور عزت کی ایسی کی تیسی' آنہ شمس النساء بیگم ان کی بیٹی ہے۔ مسز عالمگیر ہوتے کون ہیں اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے؟ اس کی شادی کہاں ہوگی' یہ فیصلہ کرنا مسز عالمگیر کا کام ہے۔ اور وہ ہر حال میں اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کریں گی۔ مسز عالمگیر چاہیں بھی تو انہیں روک نہیں سکتے۔

جب اس گنجلک مسئلے کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو مسز عالمگیر نے اچانک طلاق کا نوٹس بھجوا دیا۔

بڑا عجیب منظر تھا ناقابل یقین اور مضحک' میاں بیوی دونوں ایک ہی گھر میں موجود تھے۔ ایک ہی چھت کے نیچے۔ وکیل کی طرف سے طلاق کا نوٹس موصول ہوا۔ مسز عالمگیر نے لفافہ وصول کیا۔ مسز عالمگیر قریب ہی کھڑی' انہیں طنزیہ نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ایک مدھم سی تمسخر آمیز مسکراہٹ تھی۔ مسز عالمگیر نے لفافہ چاک کیا۔ نوٹس پر نظر ڈالی۔ پھر انتہائی شدید حیرت کے عالم میں مسز عالمگیر کی جانب دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" یہ جملہ انہوں نے جس آواز میں کہا' وہ ان کی اپنی نہیں تھی۔

"طلاق کا نوٹس ہے۔"

"مگر۔۔۔ طلاق۔۔۔ کیا مطلب' کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟"

ان کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"نہیں' یہ جوک نہیں ہے۔"

"مگر آپ وکیل کے پاس کب گئیں۔ کم از کم پہلے مجھ سے تو بات کر لیتیں۔"

"اب یہ ساری باتیں وکیل کے سامنے یا عدالت میں ہوں گی" مسز عالمگیر نے خشک لہجے میں جواب دیا اور کچن کی جانب تشریف لے گئیں۔

مسٹر عالمگیر سٹپٹائے ہوئے کھڑے رہے۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوٹس کو گھورتے رہے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زمین جس پر ان کا مکان تھا کہ ان کے پیر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں' یکایک نیچے سے سرک گئی ہے۔

جناب و بیگم جہانگیر بھاگم بھاگ لیور پول پہنچے۔ بیگم جہانگیر نے مسز عالمگیر کو اور جناب جہانگیر نے مسٹر عالمگیر کو سمجھانے اور مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی۔ تاہم انہیں شدید ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ مسٹر عالمگیر نے کہا کہ انہوں نے ساری زندگی پالتو کتوں کی طرح کام کیا ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر محنت کی ہے۔ اور یہ ساری جدوجہد انہوں نے اس لیے کی تاکہ اپنی بیوی اور بیٹی کو ایک پرسکون' پرمسرت اور پرعافیت زندگی کے تمام لوازم فراہم کر سکیں۔ انہوں نے خود اپنے لیے کبھی کچھ نہیں چاہا لیکن مسز عالمگیر کی چھوٹی سے چھوٹی اور اکثر بے جا خواہشیں بھی پوری کیں۔ ان تمام جدوجہد اور قربانیوں کے عوض اب اگر وہ اپنے بھانجے کو برطانیہ بلانا چاہتے ہیں تو مسز عالمگیر کو فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بات مان لینی چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ قطعی طے کر چکے ہیں کہ اس مسئلے پر کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے۔ اور ہر حال میں فیصلے پر عمل کرکے رہیں گے۔

مسز عالمگیر نے بیگم جہانگیر سے کہا "اے بہن' چولھے میں جائے ان کا وعدہ۔ میں پوچھتی ہوں' میں اور میری بیٹی کی منشا جانے بغیر انہوں نے وعدہ کیا کیوں؟ کیا ہے تو بھگتو بھی خود ہی۔ عزت مٹی میں ملتی ہے تو مل جائے۔ مجھے کیا! میں تو اتنا جانتی ہوں کہ بیٹی میری ہے اور اس کی شادی کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گی۔ اور اپنے بھتیجے کو انگلستان بلاؤں گی۔ اگر انہیں منظور نہیں تو ٹھینگے سے۔ میں طلاق لے لوں گی۔ مگر مسٹر عالمگیر کے آگے جھکوں گی نہیں۔ پر اتنا یاد رہے طلاق ہوئی تو ہر شے میں آدھا حصہ میرا ہوگا۔ مکان' کاروبار' بینک بیلنس' چھوڑوں گی نہیں۔"

دونوں بے نیل مرام واپس آئے۔

مسز عالمگیر نے طلاق کا تیر بہت سوچ سمجھ کر چلایا تھا۔ تیر نشانے پر لگے یا نہ لگے' دونوں ہی صورتوں میں وہ نقصان میں نہیں رہیں گی۔ اگر طلاق کی کارروائی آگے بڑھی تو غالب امکان اس بات کا ہے کہ مسز عالمگیر ڈر جائیں گے اور ان

کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا اور بات طلاق پر منتج ہوئی تو بھی وہ اپنے آپ کو ظفرمند تصور کریں گی۔ اول تو اس بنا پر کہ مسز عالمگیر کی جائیداد، کاروبار اور بینک بیلنس میں انہیں (برطانوی قانون کی رو سے) نصف حصہ ملے گا۔ اور دوم اس بنا پر کہ آنسہ شمس النساء بیگم چونکہ بیس سال کی ہے، یعنی بالغ اور خود مختار ہے، لہٰذا ماں باپ دونوں میں سے کس کے ساتھ اسے رہنا ہے، اس کا فیصلہ وہ خود کرے گی اور چونکہ برسوں کی روپردہ کوششوں کے بعد مسز عالمگیر بیٹی کو باپ کے خلاف کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ لہٰذا انہیں پورا اطمینان تھا کہ ان کی نور نظر، لخت جگر ان کے ہی ساتھ رہے گی۔ اور باپ کی بالکل پرواہ نہیں کرے گی اور تب وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کر سکیں گی۔ طلاق بھلے ہی مہذب معاشرے کی نظر میں ایک معیوب اور قبیح فعل ہو لیکن اگر بھتیجے کو انگلستان بلانا مقصود ہو تو کم از کم مسز عالمگیر کے لیے اس میں قباحت اور شرم کا پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ وہ بالکل مطمئن تھیں کہ بھتیجے کے لیے انگلستان کے ویزے کی قیمت اگر طلاق کی صورت میں چکانا پڑی تو وہ یہ قیمت ضرور چکائیں گی۔

دن سست روی سے گزرے۔ ہر تیسرے چوتھے مسز عالمگیر کا فون آتا۔ جسے بیگم جہانگیر ریسیو کرتیں اور تازہ صورت حال سے آگاہی حاصل کرتیں۔ معلوم ہوا کہ طلاق کی کارروائی دوسرے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ نیز یہ کہ ان کے وکیل نے مسز عالمگیر کے اثاثوں کی فہرست بھی بنانی شروع کر دی ہے۔ بیگم جہانگیر یہ تمام تفصیلات سنتیں اور ان کے دل میں آپ سے آپ دھکڑ پکڑ سی شروع ہو جاتی۔ کچھ ایسی کیفیت ہوتی جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ کچھ رشک کا عنصر بھی ہوتا۔

ایک بار انہوں نے پوچھا "مسز عالمگیر فرض کیجیے مسٹر عالمگیر نہ مانے تو کیا ہوگا۔ کیا آپ واقعی طلاق لے لیں گی؟"

"ہاں۔" مسز عالمگیر نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔

چوتھے ہفتے کے اختتام پر مسز عالمگیر کا فون آیا۔ شام کا وقت تھا۔ بیگم جہانگیر صوفے پر نیم دراز ایک اصلاحی معاشرتی ناول کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ جناب جہانگیر دوسرے صوفے پر بیٹھے اردو اخبار کی سرخیاں دیکھ رہے تھے۔ جب کہ ان کی دختر نیک اختر آنسہ گلشن آرا بیگم ٹیلی وژن پر پاپ میوزک کا پروگرام دیکھنے میں محو تھی اور ساتھ ہی گانے کی دھن پر اپنی گردن کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ گھنٹی بجی تو بیگم جہانگیر ذرا سیدھی ہو کر بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور چونگے میں کہا۔

"ہیلو۔!"

دوسری طرف سے مسز عالمگیر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بیگم جہانگیر، آپ اچھی تو ہیں ناں، بھئی ایک خوشخبری سنانا ہے آپ کو۔"

"کہیے" بیگم جہانگیر نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"بھئی خوش خبری یہ ہے، بہت آخر کار میری ہوئی۔ مسز عالمگیر کو ناک رگڑنی پڑی۔ انہوں نے نہ صرف میری تمام شرائط تسلیم کر لی ہیں بلکہ معافی بھی مانگی ہے۔"

"اچھا۔۔؟" بیگم جہانگیر کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں "یہ تو واقعی بڑی اچھی خبر ہے۔ مبارک ہو۔ تو کیا آپ نے طلاق کا کیس واپس لے لیا ہے؟"

"ہاں بھئی" انہوں نے جواب دیا "اب طلاق کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو مسٹر عالمگیر وہی کریں گے جو میں چاہوں گی۔"

چند ایک باتیں اور کرنے کے بعد بیگم جہانگیر نے ریسیور رکھا۔ گھوم کر جناب جہانگیر کو دیکھا۔ وہ انہی کی طرف متوجہ تھے۔ بیگم جہانگیر نے مسز عالمگیر سے ملنے والی اطلاع کے بارے میں مختصراً بتایا۔ جناب جہانگیر زور سے چونکے۔ ان کے چہرے پر ایک روشنی سی چمکی۔ جس سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر انہوں نے زور سے سانس لے کر کہا۔

"بے چارہ عالمگیر، نہ جانے اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔۔۔؟" رکے پھر سر ہلا کر اضافہ کیا "مگر بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ ایک بری گھڑی آتے آتے ٹل گئی۔ ورنہ بڑی پریشانی ہوتی اور خوا مخواہ کی جگ ہنسائی الگ۔"

وہ دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بیگم جہانگیر صوفے پر نیم دراز ہو گئیں اور اصلاحی اور معاشرتی ناول پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر دل نہ لگا۔ ان کا تصور بار بار مسز عالمگیر کی طرف جا رہا تھا اور ان کی خوشی سے چہکتی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

"مسٹر عالمگیر کو ناک رگڑنی پڑی اور وہ وہی کریں گے جو میں چاہوں گی۔"

بیگم جہانگیر نے گردن گھما کر اپنی دختر نیک اختر کو دیکھا۔ پھر جناب جہانگیر پر نظر ڈالی۔ ان کی نگاہوں میں مایوسی کا ہلکا سا عکس موجود تھا۔ جس سے شاید وہ خود بے خبر تھیں۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور افسردگی سے ایک طویل سانس لی۔ پیچھے وطن میں ان کا ایک بھائی موجود تھا اور ایک بھتیجا بھی مگر افسوس کہ جناب جہانگیر کی نہ کوئی بہن تھی نہ بھانجا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہی خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ پرندے بے چینی سے پرواز کر رہے تھے اور اپنے آشیانوں کے گرد منڈلا رہے تھے۔ اچانک گلی میں بچوں کا شور گونجا "اللہ میاں بارش دو۔۔۔ اللہ میاں بارش دو۔"

آندھی کے پہلے ہی دھکے نے حویلی کے بیرونی دروازے کے پٹ آپس میں اس طرح ٹکرائے گویا تھری ناٹ تھری کی گولی چل گئی ہو۔

پیر سائیں چونک کر گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ کمرے میں تاریکی دیکھ کر پہل بھر کے لیے الجھ کر رہ گیا کہ دن ہے یا رات۔ ہوا تیز جھونکا، بارش کی بوچھاڑ اور مٹی کی خوشبو کے ساتھ پردے اڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو اسے یاد آیا کہ گھر کے تمام افراد باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کی تو راجی دوڑتے ہوئے آئی اور اس نے کھڑکیاں بند کر دیں۔ ہوا سے بکھرنے والی چیزیں سمیٹ کر اپنی اپنی جگہ پر رکھیں، بتی جلائی اور پیر سائیں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہوئے بولی "بابا سائیں، بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔"

وہ اسے آنکھیں پھاڑے گھورتا رہا۔

اس سے پہلے وہ اسے اتنی خوب صورت کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ یہ سوچ کر وہ الجھ گیا۔ راجی گزشتہ سال اس حویلی میں باندی بن کر آئی تھی۔ "آخر کس طرح یہ سڈول اور بھرا بھرا جسم، رسیلے ہونٹ اب تک اس کی نظروں سے اوجھل رہے؟"

وہ پلنگ کے قریب رکھی ٹیبل کو صاف کرنے کے لیے جھکی تو پیر صاحب کو گویا بجلی کا جھٹکا سا لگا۔

"بابا سائیں! چائے بنا لاؤں آپ کے لیے؟" راجی نے پوچھا۔

ایک ملحاق خلعملی جس کو جمیازہ عمر بھر کہ عذاب بھرا، سندھی ادب کا انتخاب

اُنسئے نازک ہاتھوں کی کہانی جو جبر اور ظلم کے خلاف مزاحمت پر آمادہ تھی۔ انسانی لبادے میں ملبوس ایک شیطان صفت پیر پر فتوت کا قصہ جو اپنی ابلیسانہ خواہش کی تکمیل کی راہ میں حیوان بن گیا۔

فہمی شہباز
محمد ابراہیم جمالی

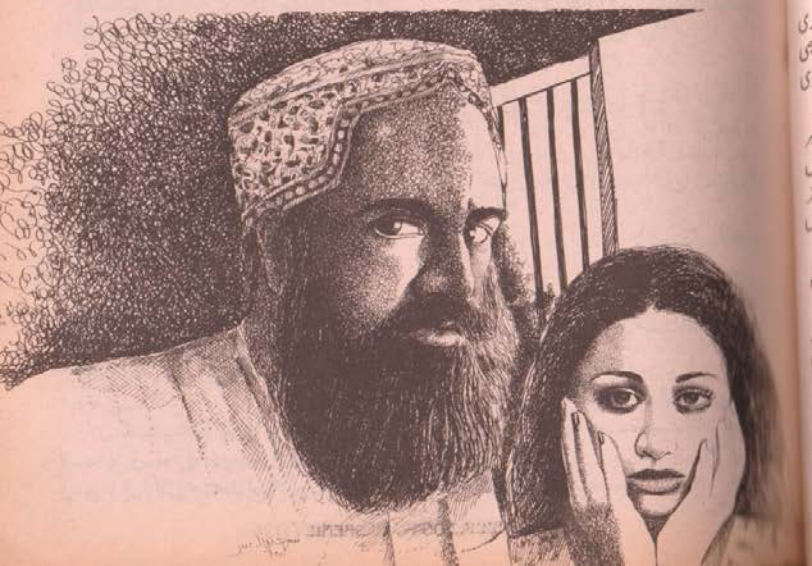

وہ جواب کیسے دیتا۔ اس کے ذہن میں تو انگارے چیخ رہے تھے۔

"بابا سائیں! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

پیر سائیں نے لرزتا ہوا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلی پیشانی پر آنے والے پسینے سے بھیگ گئی۔ راجی پریشان ہو گئی "سر میں درد ہے بابا سائیں؟ سر دبا دوں؟"

تب اچانک زور سے بجلی چمکی۔ بادل گرجے، آسمان میں گویا دراڑ سی پڑ گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" راجی چیخی "م۔۔۔ میرا ہاتھ چھوڑیے بابا سائیں!"

بادلوں کی گھن گرج اور طوفان کی سیٹیوں میں حویلی کی آواز دب گئی۔ بجلی کی چمک میں سائے تڑپ اٹھے۔ گلی میں بچوں کا شور اٹھا "اللہ میاں بارش دو۔ اللہ میاں بارش دو۔"

اوطاق سے کسی نوکر کا نعرہ گونجا "بھیج بھنائی۔۔۔ بھیج!"

راجی خود کو چھڑانے کے لیے چیختی رہی "میں آپ کی بچی ہوں بابا سائیں! تمہاری بیٹی کے برابر ہوں۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔ خدا کے واسطے۔۔۔ رسول کے واسطے۔۔۔ سائیں بادشاہ! آپ کو پیران پیر دستگیر کا واسطہ!"

کمرے میں چرر۔۔۔ کی آواز گونجی۔ راجی سینے پر دونوں ہاتھ باندھے سسکتی رہی۔ اچانک وہ آگے بڑھی اور پیر سائیں کے پیروں میں گر گئی "میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔۔۔ ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ رحم کرو۔"

اس نے جھک کر راجی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ تب اچانک حویلی کے پرنالے بہہ نکلے۔ گویا کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ بارش ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اس نے راجی کا جوان ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد ہوتا محسوس کیا پھر اس نے اپنی قمیص پھٹنے کی آواز سنی۔ خوف، چڑ اور اشتعال سے پیر سائیں نے دایاں ہاتھ بڑھا کر راجی کے لمبے بالوں کو مضبوطی سے پکڑا اور زوردار جھٹکا دے کر اس کی گردن نیچے پر جھکا دی اور اس کے گلے پر گھٹنا رکھ دیا۔ اس کا بایاں ہاتھ تیزی سے گھوما اور ایک زوردار چانٹا راجی کے گال پر پڑا۔

راجی تکلیف سے دہری ہو گئی۔ ناک سے خون کی باریک لکیر بہہ نکلی۔ گھٹی گھٹی آواز میں وہ منت کرنے لگی "بخش دو مرشد سائیں! بخش دو مجھ غریب کو۔۔۔ مجھے معاف کر دو سائیں۔۔۔!"

اس کے گلے پر گھٹنے کا دباؤ بڑھ گیا۔ بالوں کی ایک لٹ جڑ سے اکھڑ گئی۔ وہ تڑپی اور پورا زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ پیر سائیں لڑکھڑایا اور سنبھلا اور ٹیبل پر رکھا ہوا شیشے کا گلدان اٹھا کر پوری قوت سے راجی کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ شیشہ تھا، چور چور ہو گیا۔ تازہ خون کے دو قطرے فرش پر ٹپکے۔ راجی کے ہونٹوں سے نکلنے والا جھاگ تکیے پر پھیل گیا۔ تھوڑی دیر پہلے پیر سائیں کے گریبان پر اٹھنے والا ہاتھ بے جان ہو کر پلنگ سے لٹک گیا۔

تیز ہوا کھڑکیوں سے سر پٹخ رہی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ، ایک جھٹکے سے کھل گئے۔ بجلی کی چمک میں سائیں کو راجی کی صرف پھٹی پھٹی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ ہانپتا ہوا اٹھا اور ٹانگوں کی کپکپاہٹ کے باعث لڑکھڑا گیا۔ کچھ دیر تک وہ پلنگ کے پائے پر سر رکھ کر راجی کے بے جان جسم کو گھورتا رہا۔ وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، شیشے کی کرچیوں اور خون کی دو بوندوں کو دیکھتا رہا۔ ہوا کا شور، بارش کی ٹپ ٹپ اور پرنالوں سے گرتے پانی کی آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ وہ جھرجھری لے کر اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا اوطاق کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دروازے کی بالائی چوکھٹ پر رکھے اور خوف و ہراس اور بے یقینی سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اچانک طوفان کے شور میں نورے کی آواز گونجی "بھیج مولا کالا گر سولا۔"

اس کی جان میں جان آ گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر وہ لرزتی آواز میں چیخا "نورا!"

○☆○

چھوٹے تھانے دار نے دودھ پتی چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ کو ٹیبل پر رکھی پرچ پر رکھا اور گولڈ لیف کی سگریٹ جلا کر تیلی کو ہوا میں لہرا کر بجھایا پھر اسے خالی کپ میں پھینک کر نتھنوں سے دھواں نکالتا ہوا بولا "ہاں اب بولو نورا! کیسے آنا ہوا۔"

نورا دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "بابا سائیں نے آپ کو سلام کہا ہے۔"

چھوٹے تھانے دار نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ کپ میں جھاڑی اور بولا "بابا سائیں کی چوکھٹ کے غلام ہیں۔ کیا حکم ہے ہمارے لیے؟"

نورے نے قریب کھڑے ساون کی طرف اشارہ کرتے کہا "ساون کی گھر والی کل رات سے غائب ہے؟"

"نام؟"

"راجی۔" نورے نے جواب دیا۔

"عمر؟"

"بیس سال۔"

چھوٹے تھانے دار کے چہرے پر شریر مسکراہٹ کھیل گئی "کسی پر شک ہے؟"

نورے نے خود جواب نہیں دیا۔ ساون کی طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا "صاحب پوچھ رہے ہیں کسی پر شک ہے؟"

ساون کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔ اجرک سے آنسو پونچھ کر، ہاتھ جوڑتا ہوا دکھی آواز میں بولا "حاکم! ہم غریبوں کا کسی پر کیا شک ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی۔" چھوٹا تھانے دار مسکرا کر بولا "پاس پڑوس کے کسی آدمی پر؟ یار دوست کسی لپے لٹنگے دشمن پر؟"

"جی نہیں۔" ساون نے جواب دیا۔

"سوچ لو۔" چھوٹے تھانے دار نے جواب دیا "تجربہ کہتا ہے کہ جوان بیوی خود اپنی دشمن ہوتی ہے۔"

نورے نے اپنائیت سے کہا "ساون! اگر کچھ معلوم ہے تو بے خوف ہو کر بتا دو۔ آپس میں بیٹھے ہیں۔ پولیس کو بھی کوئی راہ نہ سجھائی جائے تو ایسا ہی ہے جیسے پانی میں مندھانی چلانا۔"

ساون سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ نورے کی آواز پر چونکا "شرماؤ مت۔ عورت ذات پر کیا بھروسا۔ کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔"

"راجی ایسی نہیں ہے۔" ساون نے جواب دیا۔

چھوٹے تھانے دار نے قہقہہ لگایا "مردوں کو یہی خوش فہمی مروا دیتی ہے۔ شوہر کے سامنے بیوی اپنے یار سے ملتی ہے اور وہ پھر بھی اسے ستی ساوتری ہی سمجھتا ہے۔" اس نے قہقہے کے درمیان کہا۔

ساون نے گردن اٹھا کر پہلی بار چھوٹے تھانے دار سے آنکھیں ملائیں پھر وہ تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں بولا "میری راجی ایسی نہیں ہے صاحب!"

چھوٹے تھانے دار کے چہرے پر سیاہی پھیل گئی۔ سگریٹ کو کپ میں مسلتے ہوئے وہ غصے سے بولا "تم باہر جا کر غیور مند! مجھے نورے سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

ساون اٹھا اور گردن جھکا کر باہر نکل گیا۔

چھوٹے تھانے دار نے دوسری سگریٹ جلائی اور ناک سے دھواں نکالتے ہوئے نورے سے پوچھا "اب بتاؤ حقیقت کیا ہے؟"

نورا کرسی گھسیٹ کر چھوٹے تھانے دار کے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اپنائیت بھرے انداز میں بولا "حقیقت



# نذرانہ

رات گئے مولوی صاحب کے حجرے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک جوڑے کو سامنے کھڑے پایا۔ لڑکی برقعے میں تھی۔

"مولوی صاحب! ہمارا نکاح پڑھوا دیجیے۔" نوجوان نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

مولوی صاحب نے جلدی جلدی انتظامات کیے اور نکاح پڑھوا دیا۔ نوجوان رخصت ہونے سے پہلے بولا "کیا نذرانہ پیش کروں؟"

مولوی صاحب کو ایسے موقعوں پر فراخدلانہ نذرانہ وصول کرنے کا ایک گر معلوم تھا جو شادی کے امیدواروں پر گراں بھی نہیں گزرتا تھا۔ وہ بولے "بیٹا! تمہاری نظر میں تمہاری بیوی جتنی حسین ہے اسی حساب سے نذرانہ دے دو۔"

نوجوان ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور پھر اس نے ایک روپیا نکال کر مولوی صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جوڑا رخصت ہونے لگا تو ہوا سے ایک لمحے کے لیے لڑکی کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا۔ مولوی صاحب کی بھی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے جاتے ہوئے نوجوان کو روکا اور بولے "بیٹا! اپنا بقایا تو لیتے جاؤ۔"

---

اور کیا ہونی ہے، جناب! ساون، بابا سائیں کا آدمی ہے اور کھیتی باڑی کرتا ہے۔ راجی حویلی میں کام کرتی ہے۔ صبح کو یہ خود اسے حویلی میں چھوڑ جاتا ہے اور تقریباً عشا کے وقت لے جاتا ہے۔ بابا سائیں کا تو آپ کو معلوم ہے۔ اللہ لوک، درویش انسان ہیں۔ کسی کو دکھی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کھانا پینا، کپڑا لتا اور نقدی۔ جو بھی ان سے ہو سکتا ہے اللہ کی راہ میں غریب غربا میں بانٹتے رہتے ہیں۔ راجی تو چھوٹی بی بی کی خاص خدمت گار ہے۔"

"شکل صورت کی کیسی ہے؟"

"غریب ہونے کے باوجود شکل صورت سے شہزادی لگتی ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ لاکھوں میں ایک ہے۔"

"نوکر چاکر سے کچھ ربط ضبط... کوئی واسطہ؟"

"نہیں جناب... بالکل نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔"

"چھوڑو یار۔" چھوٹے تھانے دار نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرا کر کہا "جو سچی بات ہے' وہ بتاؤ۔"

"آپ قسم لے لیں جناب۔" نورے نے کہا "قیامت کے دن منہ کالا ہو جو جھوٹ بولوں۔"

"کسی کی طرف سے کوئی تحفہ' کوئی پیغام وغیرہ۔"

"ان گناہ گار کانوں اور آنکھوں نے سنا نہ دیکھا۔ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اسے حویلی میں..."

"اچھا آگے بڑھو پھر کیا ہوا؟" تھانے دار نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"کل حویلی کی تمام پاک خواتین ایک شادی میں غوث پور گئی تھیں۔ چھوٹی بی بی بھی بڑی اماں کے ساتھ تھیں۔ اس لیے سہ پہر کو ہی بابا سائیں نے مجھے حکم دیا کہ راجی کو گھر چھوڑ آؤں۔ میں نے پگڑی باندھی اور کلہاڑی اٹھا کر تیار ہوا لیکن راجی نے منع کر دیا اور کہا کہ میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ موسم ٹھیک نہیں ہے کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی ہے لیکن وہ نہ مانی اور اکیلی ہی چلی گئی۔ عشا کے وقت ساون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ گھر نہیں پہنچی۔

"میں نے کہا' یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہاں سے گئے تو اسے کافی وقت ہو گیا ہے۔ اس نے پوچھا کہ پھر کہاں گئی؟ میں نے اسے تسلی دی کہ ہو گی کسی سکھی سہیلی کے گھر' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

"جناب! پوری رات بارش میں در در بھٹکتے رہے لیکن راجی کا کوئی پتا نہیں چلا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ صبح بابا سائیں کو پورا ماجرا بتایا تو وہ گویا بجھ کر رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ چھوٹے تھانے دار کو فوراً جا کر میرا سلام کہو۔ بابا سائیں کے حکم پر ہم حاضر ہو گئے اور سب خیر ہے۔"

چھوٹا تھانے دار سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا "یہ سب کچھ طوفان سے پہلے ہوا؟"

"جی ہاں۔ بارش اور طوفان تو بہت بعد میں آیا۔"

"یقین سے کہتے ہو؟" تھانے دار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"سو فی صد یقین سے کہہ رہا ہوں جناب!"

"علاقے کے کسی لچے لوفر پر شک جاتا ہے؟"

"ملک بھرا پڑا ہے ایسے لوگوں سے۔" نورے نے ک

"لیکن کسی کی مجال ہے کہ سائیں کے آدمی پر ہاتھ ڈالے۔"

"کوئی وڈیرا یا اس کا بگڑا ہوا بیٹا' بھتیجا یا سالا جس نے حرکت کی ہو؟" تھانے دار نے پوچھا۔

نورے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "صاحب! آپ کو یہاں پورے دو سال ہو گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ با سائیں کی مرضی کے خلاف پتا بھی نہیں ہلتا۔"

نورے کی بات درست تھی۔ پیر بچل شاہ سرکار متولی' پیر' زمیندار' ایم پی اے اور نہ جانے کیا کیا۔ ملک کے صدر اور وزیر اعظم تک براہِ راست رسائی وقت کے حاکم سے تعلق داری۔ صبح سے شام تک صرف دیدار کے لیے مریدوں اور مداحوں کا جمگھٹا۔ دعا اور تعویذ کے لیے الگ۔ ڈی سی اور کمشنر کی کیا مجال کہ ان کی بھیجی ہوئی چٹھی کو نظر انداز کر دیں۔ پیر سائیں کے ایک فون پر تبادلہ... ایسے آدمی کے در سے اس کی خادمہ اٹھ جائے۔ یہ بات چھوٹے تھانے دار کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔

"میاں بیوی میں کوئی ناچاقی؟" چھوٹے تھانے دار نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔"

"رشتے داروں میں کوئی دشمنی وغیرہ؟"

"خدا جانے' ویسے ہم نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔" نورے نے جواب دیا۔

چھوٹا تھانے دار اٹھ کھڑا ہوا "ٹھیک ہے۔" اس نے کہا "تم جاؤ فی الحال رپورٹ نہیں لکھتا۔ پیر سائیں کا معاملہ ہے خوا مخواہ بدنامی ہو گی۔ علاقے میں اپنے آدمی دوڑاتا ہوں۔ امید ہے کہ اچھی خبر ملے گی۔ دوسری صورت میں بھی بات اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔"

○☆○

دوپہر کے وقت نورے کو طلب کیا گیا۔

وہ دروازے پر جوتے اتار کر ہاتھ جوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پیر سائیں صوفے پر نیم دراز تھا۔ نورے نے اس کے پاؤں چھو کر کہا "سلام بابا سائیں!" اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پیر سائیں نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں کہا "بیٹھو۔"

نورا زمین پر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

پیر سائیں نے تسبیح اٹھائی اور دانے گھماتا ہوا بولا "کیا

خیر ہے؟"

"خیر ہے بابا سائیں۔" نورے نے جواب دیا "چھوٹے تھانے دار سے مل آئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"کیا کہنا تھا اس نے؟ آپ کا سلام کہا تو بھیگی بلی بن گیا۔ اس نے کہا کہ بابا سائیں کے خاص آدمی کا معاملہ ہے اس لیے رپورٹ نہیں لکھتا۔ چھوری مل گئی تو ٹھیک ورنہ کاغذی کارروائی کرلیں گے۔"

"ساون بھی تمہارے ساتھ تھا؟" پیر سائیں نے پوچھا۔

"جی ہاں بابا سائیں! چھوٹے تھانے دار نے اس سے سوال جواب کیے تھے لیکن وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے سکا۔" نورے نے بتایا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' ساون کچھ بک تو نہیں دے گا؟" پیر سائیں کا خدشہ زبان پر آ ہی گیا۔

"آپ کی دعا چاہیے مرشد! روپیٹ کے خاموش ہوجائے گا۔"

پیر سائیں کی تسبیح رک گئی۔ اس نے نورے سے سرگوشی میں پوچھا "لاش تو ٹھکانے لگادی تھی نا؟"

نورے نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہا "بختاور! آپ بے فکر ہوجائیں۔ سو سال بعد بھی لاش ظاہر ہوگی تو آپ کی جوتی اور میرا سر۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں بابا سائیں۔ آپ آرام سے سوجائیں۔ سمجھیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ پولیس کی طرف سے بھی مطمئن رہیں۔ ہم خود فریادی ہیں۔"

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ تسبیح دوبارہ گھومنے لگی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نورے نے کہا "بابا سائیں کچھ اداس معلوم ہوتے ہیں۔"

پیر سائیں نے گہری سانس لے کر کہا "ہم نے ایسا ہرگز نہیں چاہا تھا نورا' جس طرح ہوگیا ہے۔ چھوری مان جاتی تو شاید۔۔۔"

"بھول جاؤ بابا سائیں جو کچھ ہوا۔ اس میں بھلا آپ کا کیا قصور؟ بے وقوف عورت نے مرشد کو بھی رنج پہنچایا اور اپنی جان بھی گنوائی۔ عقل سے کام لیتی تو کندن بن جاتی۔ بہرحال آپ اپنے دل پر بوجھ نہ ڈالیں بابا!"

پیر سائیں نے بے دلی سے تسبیح ٹیبل پر رکھ دی۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا "ایک بات اور بھی ہے نورا۔"

"وہ کیا بابا سائیں؟"

"وہ چھوٹی بی بی کی خاص خدمت گار تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں۔ ہم عمر تو تھیں ہی۔ راجی' چھوٹی بی بی کا خیال بھی بہت رکھتی تھی۔ کپڑا لتا' کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا۔۔۔ مطلب یہ کہ چھوٹی بی بی کا ہر کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ وہ واپس آکر راجی کے بارے میں سنے گی تو اسے بہت دکھ پہنچے گا۔"

"بابا سائیں! آپ تو چھوٹی سی بات کو دل پر لے کر بیٹھ گئے۔" نورے نے کہا "مرشد زادی کے لیے خادماؤں کی کیا کمی۔ حکم ہو تو آج ہی دس لاکر حاضر کرتا ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے نورا۔۔۔ ہر انسان ایک سا نہیں ہوتا۔"

"کہہ دیجیے گا کہ وہ یہاں سے چلے گئے' مجبوری تھی۔" نورے نے مشورہ دیا۔

"راجی کے گم ہونے کی خبر بھلا چھپ سکتی ہے؟ پولیس شہر میں ڈھنڈا گھمائے گی تو سب کو معلوم ہوجائے گا۔" پیر سائیں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ بات تو ہے۔" نورے نے سوچتے ہوئے کہا "پاک پتنوں کو آنے دیجیے' تب تو کچھ سوچ لیں گے۔"

پیر سائیں نے دوبارہ تسبیح اٹھالی۔ نورے کو جانے کا اشارہ کیا اور خود گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ جب خاص خدمت گار نے آکر بتیاں جلائیں تو وہ بری طرح چونک گیا۔ کیا وقت ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"رات ہوگئی ہے بابا سائیں!"

اس نے صوفے پر نیم دراز ہوکر کلمہ پڑھا لیکن اٹھا نہیں۔

"مرید باہر انتظار میں بیٹھے ہیں سرکار!"

"انہیں کہہ دو کہ واپس چلے جائیں۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"پارش میں وہ دن بھر انتظار کرتے رہے ہیں بابا سائیں۔ کچھ تو بہت دور سے آئے ہیں۔" خادم نے کہا۔

"جو لوگ دور سے آئے ہیں۔ ان کی رہائش کا بندوبست کردو۔ آج میں باہر نہیں نکل سکتا۔" پیر سائیں نے کہا۔

"ساون کے لیے کیا حکم ہے؟ وہ رات سے ایک طرف پڑا رو رہا ہے۔"

"اسے یہاں لے آؤ۔" پیر سائیں نے حکم دیا۔

"یہاں حویلی میں بابا سائیں؟" خادم نے حیرت سے پوچھا۔



"ہاں۔" پیر سائیں نے مختصر جواب دیا۔

○☆○

ساون اجرک میں منہ سر لپیٹے' زار و قطار روتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پیر سائیں کے دونوں پیر مضبوطی سے تھام کر ہچکیوں کے درمیان بولا "میری راجی کا کچھ پتا نہیں چلا ۱۱ سائیں!"

پیر سائیں نے جلدی سے پیر کھینچ لیے اور بولا "مل جائے گی بابا۔ اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟"

ساون نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اٹھ پہر گزر گئے ہیں سائیں! مجھ سے تو ایک پل بھی دور نہیں رہتی تھی۔ دل میں طرح طرح کے گمان جاگتے ہیں۔ وہ زندہ بھی ہے یا مرگئی۔۔۔ یہ کہہ کر اس کی آواز رندھ گئی۔

پیر سائیں اٹھ کر کھڑکی سے باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھ کر بولا "ایسا پانی پہلے کبھی نہ برسا ہوگا۔"

ساون نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ اور رندھی ہوئی آواز میں بولا "وہ نہ جانے کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ بابا سائیں آپ کے ہاتھ لمبے ہیں۔ میری وارثی کریں۔"

نہ جانے کیوں پیر سائیں نے گھور کر اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ کھڑکی بند کرکے وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ساون نے روتے ہوئے کہا "تمہارے در کا کتا ہوں بابا سائیں۔ میری مالکی کرو۔ بے بیچ ہوں۔ اللہ اور تم مرشد کے سوا میرا اور ہے بھی کون؟"

پیر سائیں اسی طرح بیٹھا رہا "سب ٹھیک ہوجائے گا ساون۔ حوصلہ رکھو۔" آنکھیں کھول کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ ساون کی طرف بڑھایا۔ ساون نے ہاتھ چوم کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں پر رکھا۔ پیر سائیں کے پیروں پر دونوں ہاتھ رکھ کر تقریباً سجدے کی حالت میں جھک گیا پھر اس نے اجرک کے پلو سے چہرہ پونچھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اجرک کو بغل میں دبا کر' دونوں ہاتھ باندھے الٹے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

○☆○

طوفان رک گیا لیکن بارش جاری رہی۔ پرنالے بہتے رہے۔

وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا رہا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی کی سسکیوں کی آواز سن کر چونک کر اٹھ بیٹھا "کون ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا البتہ سسکیوں کی آواز بند ہوگئی۔ لپک کر اس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ وہ اٹھا اور کمرے کا کونا کونا چھان مارا لیکن کوئی ہوتا تو نظر آتا۔

وہ مایوس ہوکر دوبارہ پلنگ پر لیٹنے ہی والا تھا کہ سسکیاں دوبارہ جاگ اٹھیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ حوصلہ مجتمع کرکے وہ چیخا "میں پوچھتا ہوں کون ہے؟"

اسے جواب پھر بھی نہ ملا۔ اس نے سوچا۔ یہ میرا وہم ہے' وسوسہ ہے میرا دل کا' گمان ہے میرے اندر کا۔ بھلا میرے کمرے میں میرے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ سر تا پا لرز کر رہ گیا۔ اس نے پوری قوت مجتمع کرکے پوچھا "کون ہو تم؟"

دروازہ کھلا اور نورا اندر داخل ہوا۔

تب گویا اس کی جان میں جان آگئی۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "نورا! تم۔"

نورے نے ہاتھ باندھ کر کہا "چھوٹا تھانے دار آیا ہے بابا سائیں۔"

وہ چند لمحوں تک کھڑا نورے کو گھورتا رہا پھر آہستہ سے پوچھا "کہاں دفنایا تھا اسے؟"

نورا زمین پر بیٹھ گیا۔ دائیں ہاتھ کی پشت کو مونچھ پر پھیر کر بولا "وہاں' جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

"یقین سے کہتے ہو کہ تمہیں کسی نے نہیں دیکھا؟"

"کوئی نورے کی دھول بھی پا سکے' یہ کسی میں مجال ہے سائیں؟"

"گاڑی کے نشان؟"

"بڑی کرامت والے مرشد ہو۔ بارش نے ہر جگہ تالاب بنادیے ہیں۔"

"پھر تھانے دار کیوں آیا ہے؟"

"بابا سائیں کو سلام کرنے کے لیے۔" نورے نے جواب دیا۔

"اسے شک تو نہیں ہوا؟"

"کتے میں سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ ہڈی پھینکیے' خاموش ہوجائے گا۔"

"اگر میں اسے ہڈی نہ دو تو۔۔۔؟"

"پتھر مار دیجیے گا۔"

ٹیبل پر سے تسبیح اٹھا کر پیر سائیں نے کہا۔ "اندر بھیج دو اسے۔"

○☆○

چھوٹے تھانے دار نے چوکھٹ پر جوتے اتارے، چھڑی کو بغل میں دبایا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر بولا "بابا سائیں کی بادشاہی سلامت رہے۔"

ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہہ کر پیر صاحب نے تسبیح ٹیبل پر رکھ دی۔ تھانے دار احترام سے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "ایسی بارش میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا ہے۔"

پیر سائیں نے مسکرا کر کہا "یہ سب مولا کے رنگ ہیں تھانے دار صاحب!"

چھوٹے تھانے دار کی نظریں کمرے میں بھٹکنے لگیں۔ بے خیالی میں اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ جلانے ہی والا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ پیر سائیں کے سامنے بیٹھا ہے۔ وہ بغیر سلگائی سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر انگلیوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔

"راجی کا کچھ معلوم ہوا؟" پیر سائیں نے پوچھا۔

"آپ کے علاوہ اور کے معلوم ہو گا بابا سائیں۔" تھانے دار نے بغیر جلی سگریٹ ہونٹوں تک لاتے ہوئے کہا۔

اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی "کیا مطلب؟"

تھانے دار نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی خیالی راکھ جھاڑی۔ چھڑی کو دھیرے دھیرے اپنی ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولا "آپ دلوں کے حال جانتے ہیں، غیبی چیزوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، روحانیت کے مالک ہیں آپ... بھلا آپ سے کوئی بات پوشیدہ رہ سکتی ہے بابا سائیں۔"

پیر سائیں چند لمحے تھانے دار کی بات پر غور کرتا رہا پھر بولا "ساون بہت پریشان ہے۔"

تھانے دار اٹھ کر کھڑکی تک گیا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور بولا "ظاہر ہے، وہ پریشان تو ہو گا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اچانک تھانے دار نے پوچھا "بہت خوب صورت تھی؟"

پیر سائیں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ جواب کا انتظار کیے بغیر تھانے دار بولا "خیر، آپ کے لیے تو اولاد کی طرح تھی، خدمت گار، بچوں کا درجہ رکھتے ہیں بابا سائیں۔" جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مزید کہا "لیکن نوکروں کیا بھروسا۔"

پیر سائیں سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کیا جواب دے۔

تھانے دار پردہ برابر کر کے سیدھا پیر سائیں کے سامنے آ کھڑا ہوا... "تورے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"تورا میرا خاص آدمی ہے۔"

"خاص آدمی ہی تو جرم کر بیٹھتے ہیں بابا سائیں۔"

"وہ ہمارے پاس بچپن سے رہ رہا ہے۔ میرے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔" پیر سائیں نے کہا۔

"کل شام بھی آپ کے ساتھ تھا؟" تھانے دار نے سوال کیا۔

"وہ میرے حکم کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔"

"آپ کو یقین ہے بابا سائیں؟"

"کیا تم اس پر شک کر رہے ہو جمعہ خان؟" پیر سائیں نے پہلی بار تھانے دار کا نام لے کر پوچھا۔

"نہیں بابا سائیں۔" تھانے دار نے جلدی سے کہا "آپ کے آدمی پر شک کر کے اپنی آخرت کالی کرانی ہے کیا۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

پیر سائیں کھڑا ہو گیا۔ مصافحے کے لیے دایاں ہاتھ بڑھا کر بولا "راجی کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو مجھے فوراً اطلاع کر دینا، خدا حافظ۔"

○☆○

چوڑیوں کی کھنک پر پیر سائیں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کروٹ بدلنے ہی والا تھا کہ اسے یاد آیا کہ وہ کمرے میں تنہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ پائنتی کے پاس کوئی بیٹھا ہے۔ مارے خوف کے اس کے لبے چھوٹ گئے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی، اس سے پہلے راجی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی "بابا سائیں؟"

وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھا اور دور کھڑا ہو گیا۔ سسکیاں اس کے قریب آنے لگیں "بابا سائیں۔"

کسی نے گویا اس کے سینے میں بھالا اتار دیا ہو۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے پوچھا "تلک... کون ہے؟"

"راجی ہوں بابا سائیں۔" سسکیوں میں جواب ملا۔

"راجی!" وہ چیخ پڑا۔

"ہاں۔ راجی بابا سائیں۔"

"نل... نلیکن..." وہ اس سے زیادہ بول نہ سکا۔ اس کے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ پیشانی پر پسینہ دھاریں بنا کر بہنے لگا۔

"بابا سائیں، میں مری نہیں ہوں، زندہ ہوں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ چیخا۔

"یہ سچ ہے بابا سائیں۔"

"تم مر چکی ہو۔ تم مر چکی ہو۔"

"میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ غور سے دیکھیے۔"



"کہاں ہو تم؟ سامنے کیوں نہیں آتیں؟ جواب دو..."

سائیں کا پورا وجود کپکپانے لگا۔ سسکیاں قریب آنے لگیں۔ وہ گھسٹتا ہوا دیوار سے جا لگا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ کسی کے گرم سانس اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ وہ حلق کے بل چیخا "میرے قریب مت آؤ... دور رہو مجھ سے۔" کسی وجود کی گرمی اس کے جسم کو جھلسانے لگی۔ پوری قوت مجتمع کر کے وہ چیخا "دور رہو، مجھ سے دور رہو۔"

سسکیاں پھر بھی بند نہ ہوئیں۔ وہ بے بس ہو گیا۔ وہ منت کرنے لگا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ خدا کے واسطے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

کسی کا سرد ہاتھ اس کی پیشانی کو چھو گیا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز نہ نکل سکی۔ وہ دیوار سے رگڑ کھاتا، دھیرے دھیرے نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔

○☆○

"بابا سائیں۔" میلوں دور سے آتی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ بے ہوشی میں بھی چونک گیا۔

"آنکھیں کھولیے بابا سائیں۔"

اس نے پوری قوت سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی نکلی "مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"میں آپ کی بیٹی ہوں بابا سائیں! آپ کی بیٹی۔" اس نے آواز سنی لیکن اسے یقین نہ آیا۔

"ہم واپس آ گئے ہیں بابا سائیں۔ دیکھیے ہم سب آ گئے ہیں۔"

اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے پلنگ کے گرد گھر کے تمام افراد پریشان کھڑے نظر آئے۔ سرہانے کھڑی بڑی بی بی نے کہا "سائیں ہوش میں آ گئے ہیں۔"

چھوٹی بی بی نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اسے محبت سے چوم کر کہا "شکر ہے پروردگار کا۔ ہم تو بہت مایوس ہو گئے تھے بابا سائیں۔"

اس نے دل میں کانٹا سا چبھتا محسوس کیا "کیا ہو گیا تھا مجھے؟"

بڑی بی بی نے خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "سائیں کو کئی بار کہا ہے کہ دوسروں کی مصیبتیں اپنے گلے میں نہ ڈالا کریں لیکن سائیں مانتے ہی نہیں۔ دو ٹکے کی باندی کیا بھاگ گئی ہے، سائیں نے اپنی طبیعت خراب کر لی ہے۔ بے حیا عورتوں کی خاطر کوئی اس قدر پریشان ہوتا ہے؟"

چھوٹی بی بی نے ماں کو شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "امی جان! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ بابا سائیں کو ٹھیک ہونے دیجیے پھر سب معلوم ہو جائے گا۔ ویسے بھی میرے خیال سے راجی ایسی نہیں ہے۔ بے چاری پر نہ جانے کیا گزری ہے۔"

پیر سائیں کو ایک خیال نے کچھ بے چین کر دیا۔ اس نے پوچھا "کب میں غنیمہ میں کچھ بول رہا تھا۔"

"غنیمہ؟" بڑی بی بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیسی غنیمہ؟ سائیں تو ہوش میں ہی نہیں تھے۔ دشمن وہاں... زمین پر پڑے تھے۔"

"راجی کا کچھ معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

بڑی بی بی کو گویا آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے کہا "جہنم میں گئی وہ بدمعاش عورت، جہاں کی تھی وہیں دفعان ہو گئی۔ پولیس اسے تلاش کر کے گھسیٹ کر لے آئے گی۔ خدا کے واسطے آپ پریشان نہ ہوں۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی "چھوٹی بی بی کے بال نوچتے ہوئے کہا "زہرہ بی بی اب تم لوگ آئے ہو تو سمجھو سب دکھ درد دور ہو گئے۔ ہم خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے


## عیسائی ڈاکٹر کا حیرت انگیز کمال

پاکستان بننے سے پہلے دہلی میں ایک عیسائی ڈاکٹر نے میرے مطب کے چند کامیاب نسخوں کو اپنے مریضوں پر آزما کر انکا کامیاب علاج کیا۔ تو وہ میرا اور بھی گہرا دوست بن گیا پھر وہ برٹیئر ہو کر انگلستان چلا گیا۔ یہ دوستی پھر خط و کتابت کی صورت میں جاری رہی وہ میرے بہت سے نسخے اپنے ساتھ لے گیا لیکن اپنی دواؤں کی ہولناک زہریلگی دی۔ آخر انتقال سے ایک سال قبل ڈاکٹر ولیم نے اپنا ایک مشہور نسخہ مجھے تفصیل سے لکھ کر بھیج دیا۔ جو کہ کمزور نوجوانوں کو بہت کم دنوں میں قابل رشک صحت کا مالک بنا دیتی تھیں میں نے خاص بیماریوں کا نسخہ پاتے ہی فوراً دوائیں تیار کر کے اپنے مطب میں آنے والے بالکل گئے گذرے کمزور نوجوانوں کو استعمال کرائیں خدا نے میرے مریضوں کو مکمل شفاء عطا فرمائی اور ساتھ ہی میرے مطب کو ایسی شہرت بخشی جیسی ولیم کو اپنے ملک میں حاصل تھی۔ اس نسخہ کے استعمال کے فوراً بعد ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سدا نوجوانی کا زمانہ پایا ہو۔ مایوس مریض وہ ایسا اشتہار نہیں بلکہ حقیقت ہے اگر خدانخواستہ آپ بھی کسی ایسی ہی شکایت میں مبتلا ہوں تو آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافہ کے ہمراہ روزانہ کر دیں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائیگا۔

حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

تھے۔"

○☆○

کچھ دن پیر سائیں نے مکمل آرام کیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ سائیں کو لوگوں کی آمدورفت، غرض داروں کی وقت بے وقت ملاقاتوں اور مریدوں کے لشکر نے بے آرام کر دیا تھا۔ سکون ملے گا تو سائیں دوبارہ تندرست ہو جائیں گے۔ اس لیے باہر کی ملاقاتوں پر مکمل بندش عائد کر دی گئی۔ حویلی کے اندرون کی تیمارداری اور دیکھ بھال کا خاص انتظام کیا گیا۔ چھوٹی بی بی تو ایک پل کے لیے اس سے دور نہ ہوتی تھی۔ اپنوں کے درمیان رہ کر پیر سائیں خود کو کسی حد تک محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی گزشتہ واقعات کو یاد کر کے چونک کر اٹھ جاتا تھا۔ خوف سے اس پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ ناپسندیدہ یادوں کی پھانس اس کے دل کی گہرائی میں اتر چکی تھی۔ اسے نکال کر پھینکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو نورے نے اسے حویلی کے درمیانی دروازے سے سہارا دے کر اوطاق میں صوفے پر بٹھایا۔ پیر سائیں نے پوچھا "نورا! سب خیریت ہے نا؟"

نورا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ کا سر سلامت رہے بابا سائیں! ہم تو آپ کے سائے میں جی رہے ہیں۔"

"کوئی خیر خبر؟"

"سب خیر ہے سائیں!" نورے نے کہا "چھوٹا تھانے دار دو تین بار آیا تھا۔ آپ کی طبیعت کی خرابی کا سن کر واپس چلا گیا۔"

"کچھ کہہ رہا تھا؟"

"اسے کیا کہنا ہے سائیں! کچھ کارروائی تو دکھانی ہوتی ہے۔"

"اور ساون؟" پیر سائیں نے اس کی بات کاٹی۔

"باہر مہمان خانے میں بیٹھا ہے۔ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے۔ کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔ ہر وقت گردن جھکائے راجی کو یاد کر کے روتا رہتا ہے۔ سچ پوچھیے تو بابا سائیں، اب اس مسکین کے حال پر رحم آتا ہے۔"

"لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جتنے منہ اتنی باتیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ بھاگ گئی۔ کچھ کہتے ہیں اٹھ گئی اور کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس نے کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا لی ہے۔"

پیر سائیں خاموش ہو گئے۔ گزشتہ ایک ہفتے کی وارداتوں نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ راجی کی روح نے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کسی سجن کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر دے لیکن ہر بار خوف نے ایسا کرنے نہیں دیا۔

نورا کھنکھتا ہوا اس کے پیروں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگا "بابا سائیں! آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے تھے۔"

"مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ نورا!" پیر سائیں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی بہت حسین، بابا سائیں! شاہی شکار تھی۔ ہم تو آپ کے خوف سے آنکھیں بچی کر کے چلتے تھے۔"

پیر سائیں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "بس نورا! ہو گئی ہو گئی۔"

"اسے بھول جائیے بابا سائیں۔" نورے نے کہا "اللہ اور دے گا۔"

"دل پر بہت بوجھ ہے نورا۔" سائیں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔"

○☆○

رات کو نیند میں پہلو بدلتے ہوئے پیر سائیں کو، کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ پھیرنے سے ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا اسے ملا۔ مزید تلاش کرنے پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چار ٹکڑے اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ بے دم ہو کر پلنگ پر گر گیا۔ تب سسکیاں دوبارہ جاگ اٹھیں۔ "بابا سائیں۔" دل اچھل کر گویا اس کے حلق میں آ گیا۔ "میں آپ کی بیٹی کی طرح ہوں بابا سائیں۔"

"کوئی ہے؟" اس کے وجود کے اندر چیخ گونجی۔

"مجھ پر رحم کرو بابا سائیں۔"

"کوئی ہے؟ جو مجھے اس عذاب سے نجات دلائے۔" بے آواز لفظ اس کے ذہن میں کسی بھنور کی طرح چکرانے لگے۔

"مجھے مت مارو بابا سائیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔" لرزتے ہاتھوں سے اس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ سسکیاں بند ہو گئیں۔ اس نے چادر پر سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے ہٹانے چاہے لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بے حال ہو کر دیوار سے سر ٹکراتے ہوئے چیخا۔ "یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

○☆○

اگلے دن شام کے وقت چھوٹا تھانے دار دو سپاہیوں کے ہمراہ اوطاق میں حاضر ہوا۔ مریدوں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ [illegible] پیر سائیں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کمزوری کے [illegible] اٹھ نہ سکا۔ "معاف کرنا جمعہ خان! اٹھنے کے قابل [illegible] ہوں۔"

تھانے دار نے ہاتھ جوڑ کر کہا "آپ تکلیف نہ کریں بابا [illegible]!"

"کوئی خیر خبر؟" پیر سائیں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" تھانے دار نے جواب دیا "تفتیش [illegible] ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے گہری واردات ہے۔"

"کیا مطلب؟" پیر سائیں نے پوچھا۔

"فرش کا پانی سوکھ گیا ہے بابا سائیں۔ سپاہیوں کو نہر [illegible] طرف جیب کے نشانات ملے ہیں۔"

پیر سائیں نے کن انکھیوں سے نورے کی طرف دیکھا۔ "جھاڑیوں کی طرف زمین کا ٹکڑا بیٹھ گیا ہے۔" تھانے دار نے کہا "ہم آپ سے کھدائی کی اجازت لینے آئے ہیں۔"

پیر سائیں کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ہکلاتے ہوئے اس نے کہا "ہماری زمین کھودو گے؟"

تھانے دار نے مسکرا کر پیر سائیں کی طرف دیکھا "ہاتھوں کے نشانات آپ کی جیب کے ہیں، بابا سائیں۔"

اوطاق میں خاموشی چھا گئی۔

"قتل کی واردات ہے؟" الفاظ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔

"سپاہیوں کا یہی خیال ہے بابا سائیں۔ ایک شخص نے [illegible] والی رات نورے کو اس طرف جاتے ہوئے بھی [illegible]۔"

نورا تڑپ کر اٹھا اور چیخ کر بولا "یہ جھوٹ ہے۔ بابا سائیں گواہ ہیں کہ میں ان کے قدموں سے ہلا بھی نہیں تھا۔"

تھانے دار نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "سپاہیوں کو [illegible] سے باہر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور ٹوٹے ہوئے گلدان کے [illegible] بھی ملے ہیں۔"

وہاں بیٹھے تمام افراد دم بہ خود رہ گئے۔ ہر نظر پیر سائیں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ پیر سائیں سے رہا نہ گیا اور جلال میں [illegible] ہوئے اس نے کہا۔

"جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو جمعہ خان؟"

"وہ دیکھا اور جو سنا ہے، وہی دہرا رہا ہوں بابا سائیں۔ [illegible] حالت کو کرنا ہے۔"

پیر سائیں غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں [illegible] اندھیرا سا چھا گیا۔ سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اس نے کہا "تو پھر۔۔۔ میرا فیصلہ بھی سن لو۔۔۔ راجی بدکار تھی۔۔۔ خراب تھی۔۔۔ بھاگ گئی۔۔۔ کسی یار کے ساتھ۔"

تب اس نے دھندلی آنکھوں سے حویلی کا درمیانی دروازہ کھلتا ہوا دیکھا۔ دوسرے لمحے کھلے دروازے پر چھوٹی بی بی زہرہ نمودار ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اوطاق میں آ گئی۔ پیر سائیں کا منہ حیرت سے بھٹے کا پھٹا رہ گیا۔ کپکپاتی ہوئی انگلی سیدھی کر کے وہ بولا "تم؟"

پیر سائیں نے محسوس کیا کہ سب نظریں چھوٹی بی بی پر گڑ گئی ہیں۔ وہ غضب ناک ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح چیختے ہوئے بولا "کیوں آئی ہو یہاں؟"

چھوٹی بی بی مزید چند قدم آگے بڑھ آئی۔ پیر سائیں کی آنکھوں میں خون اتر آیا "واپس چلی جاؤ۔۔۔ میں کہتا ہوں واپس چلی جاؤ۔"

"بابا سائیں۔" چھوٹی بی بی کی معصوم آواز ابھری۔

وہ آگے بڑھتی رہی "بابا سائیں، میں راجی ہوں۔" چھوٹی بی بی نے کہا۔

"راجی؟"

"میں آپ کی بیٹی ہوں بابا سائیں۔"

پیر سائیں نے اپنے سینے پر ساتوں آسمانوں کا بوجھ محسوس کیا "راجی مر چکی ہے۔"

"میں زندہ ہوں بابا سائیں۔" وہ پیر سائیں کے سامنے بالکل آ کر کھڑی ہو گئی۔ چرر رر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ پیر سائیں گویا زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ چھوٹی بی بی نے قمیص پھاڑ کر پھینک دی اور صوفے پر لیٹ گئی۔ "میں راجی ہوں بابا سائیں۔"

اسے محسوس ہوا کہ حویلی کی چھت اس پر گر گئی ہے۔ اس نے پوری قوت سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پیٹنے لگا۔ "ارے کوئی ہے۔۔۔ اس کا سر تڑوا دو۔۔۔ میری پگڑی پر کپڑا ڈالو۔۔۔ خدا کے لیے چھوٹی بی بی کی برہنگی پر پردہ ڈالو۔"

نوکر چاکر، مرید، ملاقاتی، پولیس والے چھوٹا تھانے دار حیرت سے آنکھیں اور منہ پھاڑے بھی دیوانوں کی طرح چیختے اور دھاڑیں مار کر روتے ہوئے پیر سائیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی خالی صوفے کی طرف۔

نفرت بغض اور کینہ پروری سے جنم لینے والے واقعہ کا احوال بیگ صاحب کی ڈائری سے انتخاب

# الٰہی تدبیر

مرزا امجد بیگ

انسانی خواہشات اور تمناؤں کا جنگل ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ ہر نئی خواہش کی کونپل بہت جلد تناور درخت میں تبدیل ہو کر انسان کی آنکھوں پر حرص و ہوس کی پٹی باندھ دیتی ہے اور وہ نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر اسے پورا کرنے کے لیے ہر حد تدبیر آزمانے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر بھول جاتا ہے کہ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔

نفرت بغض اور کینہ پروری سے جنم لینے والے واقعہ کا احوال بیگ صاحب کی

دولت بڑی عجیب شے ہے!

اس دنیا کا ہر کھیل اسی پر کشش قوت سے کھیلا جاتا ہے جو جتنا بڑا دولت مند ہے' وہ اتنا ہی بڑا کھلاڑی ہے... اور بڑا کھلاڑی ہمیشہ اپنی مرضی کے قواعد و ضوابط سے کھیلتا ہے۔ جس طرح دولت کی طلب اور دولت کی ہوس دو مختلف چیزیں ہیں' اسی طرح حصول دولت کے ذرائع بھی علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں ہر طرح کی دولت ایک جیسی نظر آتی ہے لیکن اس کے اثرات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایک دولت وہ ہے جس سے خدا اپنے بندے کو نوازتا ہے۔ یہ دولت انسان کے لیے باعث رحمت ہوتی ہے۔ عزت و تکریم کا ذریعہ اور سکون و شادمانی کا وسیلہ ہوتی ہے مگر جو دولت شیطان کی خوشنودی سے حاصل کی جاتی ہے' وہ اپنے جلو میں تباہی و بربادی لے کر آتی ہے' ہلاکت و بے سکونی کا سبب بنتی ہے اور انسان کی عاقبت کا سوا ستیاناس کر ڈالتی ہے کیونکہ شیطان' انسان کا ازلی دشمن ہے۔ وہ سدا بری نیت سے انسان کے کام آتا ہے۔ چنانچہ صرف آتی ہوئی دولت کو ہی نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دینے والے کی حیثیت کا تعین کیا جائے' اس کی نیت کو بھانپنے کی کوشش کی جائے پھر دولت کی جانب ہاتھ بڑھایا جائے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز عدالت کے احاطے میں ایک شناسا کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔ میں اس وقت عدالتی مصروفیات سے فارغ ہو چکا تھا اور دفتر جانے کے لیے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

"السلام علیکم بیگ صاحب!" آنے والے نے بہ آواز بلند مجھے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر پوچھا "کہاں ہو مسٹر سلمان۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے؟"

"دنوں کے بعد نہیں سر بلکہ کئی سالوں کے بعد۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائیدی لہجے میں کہا "میں نے تمہیں کافی عرصے کے بعد دیکھا ہے۔"

"بیگ صاحب! میں آج کل تائیوان میں ہوتا ہوں۔" سلمان نے بتایا "گزشتہ پانچ سال سے وہیں پر قیام ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک سیٹ ہوں وہاں۔"

"ماشاء اللہ' ماشاء اللہ۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا "تائیوان میں کیا کر رہے ہو؟"

"ماربل ڈیکوریشن کا کام ہے۔" سلمان نے بتایا "میں وہاں کے ایک معروف انٹیریر ڈیکوریٹر سے منسلک ہوں۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ ملک سے باہر نکل گئے۔" میں نے کہا "انسان کو مقدر آزمانے کے لیے بہتر سے بہتر کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اگر تم آج بھی میرے پاس ہوتے تو یقیناً اتنی ترقی نہیں کر سکتے تھے۔"

سلمان ماضی میں کچھ عرصے میرے دفتر میں آفس بوائے کے طور پر کام کر چکا تھا۔ بعد ازاں اس نے دفتر چھوڑ کر کار ائرکنڈیشننگ کا کام سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی خبر نہیں تھی اور اب وہ خود ہی بتا رہا تھا کہ گزشتہ پانچ سال سے وہ تائیوان میں ملازمت کر رہا تھا۔

سلمان نے کہا "بیگ صاحب! انسان دنیا کی ہر قوت سے لڑ سکتا ہے مگر مقدر کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ پانچ سال قبل میرے ساتھ کچھ ایسے حالات پیش آ گئے تھے کہ مجبوراً مجھے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ خیر' جو کچھ بھی ہوا' وہ میرے حق میں بہتری ثابت ہوا۔ اب میں معاشی اور معاشرتی طور پر خاصی مضبوط پوزیشن میں ہوں۔"

میں نے پوچھا "کتنی چھٹی پر آئے ہو؟"

"تین ماہ کی۔"

"ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا "شادی تو ہے۔ یہاں عدالت کے احاطے میں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "عدالت' تھانے اور اسپتال میں کوئی خیریت سے نہیں جاتا بیگ صاحب۔"

"کیا کوئی مقدمہ وغیرہ چل رہا ہے؟"

سلمان نے احاطے کی ایک جانب اشارہ کیا۔ وہاں جیل کی گاڑی کے پاس ایک عمر رسیدہ اور ایک جوان عورت کھڑی تھی۔ جوان عورت کے ہاتھ میں ہتھکڑی موجود تھی جس کا دوسرا سرا ایک باوردی پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔

"بیگ صاحب! جس عورت کے ہاتھ میں آپ ہتھکڑی دیکھ رہے ہیں نا۔" سلمان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میری چچا زاد عمرانہ ہے۔ عمرانہ کے ساتھ میری چچی صبیحہ خاتون ہیں۔ عمرانہ گزشتہ تین سال سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا ... شاید میں غلط کہہ گیا ہوں۔ سزا تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کسی مقدمے کا

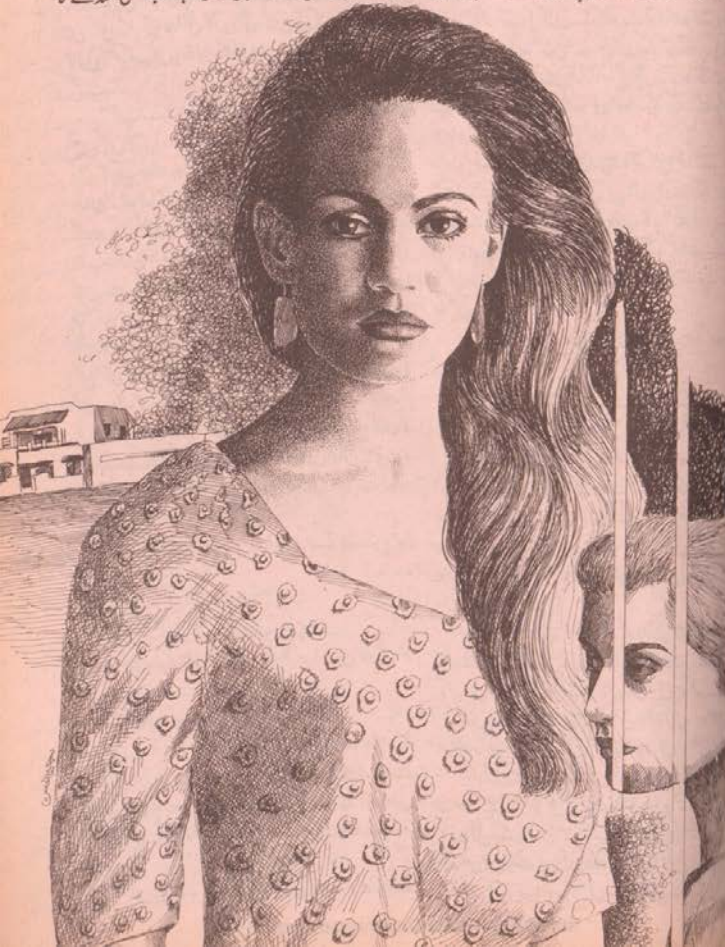

باقاعدہ فیصلہ سنادیا جائے۔ عمرانہ کے کیس کی تو ابھی عدالتی کارروائی ہی شروع نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" میں نے افسوس ناک انداز میں سرہلایا۔

سلمان کے انکشاف سے مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے ملک کی جیلوں میں آج بھی ایسے قیدی موجود ہیں جو دس دس سال سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کررہے ہیں مگر ان پر عائد الزامات کے مقدمات کے سلسلے میں کسی کیس کی عدالتی کارروائی نہیں کی گئی۔ آپ اسے قانونی سقم کہہ لیں یا قانون کا اندھاپن۔ بہرحال حقیقت بڑی تلخ ہے۔

"آپ نے اس سلسلے میں کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں؟"

"بیگ صاحب! میں تو چند روز پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔" سلمان نے وضاحتی لہجے میں بتایا "عمرانہ کی پتا کے بارے میں مجھے دو روز قبل ہی معلوم ہوا ہے۔ یہ بہت ہی مظلوم لڑکی ہے جناب۔ اس کا باپ فوت ہوچکا ہے۔ ماں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق جو وکیل کیا تھا، آج میں نے اسے فارغ کردیا ہے۔ اس کی کارکردگی غیر اطمینان بخش تھی۔ تین سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب میں اپنی جیب سے رقم خرچ کرکے کوئی قابل وکیل کروں گا اور اپنی بے گناہ کزن کو انصاف دلانے کی کوشش کروں گا۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میری نظر میں آپ سے زیادہ قابل وکیل بھلا اور کون ہوسکتا ہے۔"

میں نے اپنی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

"عمرانہ پر قتل کا الزام ہے۔"

"کس کا قتل؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

سلمان نے بتایا "عمرانہ کے شوہر احسان لودھی کا قتل۔"

"تفصیلات کیا ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "بیگ صاحب! میں ذاتی طور پر اس کیس کے بارے میں زیادہ تفصیلات سے واقف نہیں ہوں۔ اگر آپ یہ کیس لینے کے لیے آمادہ ہوں تو میں اپنی چچی صبیحہ خاتون سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔"

"کیس لینے یا نہ لینے کا فیصلہ تو میں تمام حالات جاننے کے بعد ہی کروں گا۔" میں نے محتاط انداز میں کہا "تم ایسا کرو، چار بجے کے بعد اپنی چچی کو لے کر میرے دفتر آجاؤ۔"

وہ پُرامید نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "بیگ صاحب! عمرانہ کے تمام مسائل کی ذمے داری اب میں نے اپنے کندھوں پر لے لی ہے اور میری خواہش ہے کہ میری تین دن کی چھٹی ختم ہونے سے پہلے پہلے کم از کم عمرانہ کی ضمانت ضرور ہوجائے۔"

"اگر آپ کی کزن بے گناہ ہے تو انشاء اللہ وہ باعزت بری ہوجائے گی۔" میں نے سلمان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا "تم اپنی چچی کے ساتھ میرے دفتر چلے آؤ۔" پھر میں نے الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

سلمان نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، بیگ صاحب! میں آپ کی ہدایت کے مطابق چار بجے کے بعد آپ کے پاس آجاؤں گا۔" پھر اس نے ایک فائل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "یہ عمرانہ کے کیس کی فائل ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

میں وہ فائل لے کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

○☆○

چچی بھتیجے سے تفصیلی ملاقات، عمرانہ کے کیس کی فائل کے بھرپور مطالعے اور دیگر حقائق کے پیش نظر میں نے اس کیس کی پیروی کا فیصلہ کرلیا۔ سلمان نے میری مطلوبہ فیس ادا کی اور دیگر قانونی اخراجات کے سلسلے میں بھی اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ آئندہ پیشی دو ہفتے بعد تھی۔ میرے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں اس دوران میں بڑی سہولت اور آسانی سے اس کیس کی اسٹڈی کرسکتا تھا۔

اپنے دفتر سے رخصت کرتے وقت، میں نے سلمان کو ہدایت کردی تھی کہ تین چار روز بعد وہ میرے پاس آئے تاکہ اس کے ساتھ جاکر میں جیل میں اپنی موکلہ سے ملاقات کرسکوں۔ میرے ذہن مین جن ضروری سوالات نے سر ابھارا تھا ان کی تصدیق یا تردید عمرانہ ہی کرسکتی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کا پس منظر آپ کی خدمت میں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ عدالت کی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب اور تسلسل کے خیال سے انہیں پہلے بیان



کررہا ہوں۔ اسی طرح بہت سی باتیں میں دانستہ آپ سے چھپا رہا ہوں جن کا ذکر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔

عمرانہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ تعلیم یافتہ، پراعتماد اور خوب صورت۔ اس کے والد مبین اختر ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ تھے اور وہ اختر کالونی میں رہتے تھے۔ ان کی شہرت ایک دیانت دار سرکاری ملازم کی تھی۔ عمرانہ نے گریجویشن کرنے کے ساتھ ساتھ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی سیکھ لی تھی۔ وہ مختلف کمرشل اداروں اور کاروباری دفتروں میں کام کرنے کے بعد بالآخر احسان لودھی کی فیکٹری میں پہنچ گئی "لودھی سوپ انڈسٹری" سائٹ کے علاقے میں واقع تھی۔ احسان لودھی نے اسے اپنی سیکریٹری منتخب کرلیا۔

عمرانہ عام لڑکیوں کی طرح اپنی شادی کو کوئی مسئلہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے کئی رشتے آچکے تھے اور آتے رہتے تھے۔ اس جیسی خوب صورت لڑکی کو اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر عمرانہ کسی ایسے جیون ساتھی کی تلاش میں تھی جو اسے مضبوط اور مستقل تحفظ فراہم کرسکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، دکھ اور تکالیف ہی دیکھی تھیں۔ عمرانہ جب اہلِ ثروت لوگوں کے گھروں میں دولت کی ریل پیل دیکھتی تو چھپ چھپ کر روتی تھی اور خدا سے ان الفاظ میں شکوہ بھی کرتی۔ اللہ تعالیٰ! کیا تمہاری ساری عنایتیں، رحمتیں اور نوازشیں صرف امیروں کے لیے ہیں۔ ہم جیسے غریب تمہیں نظر نہیں آتے؟

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ مبین اختر کے گھر میں کوئی فاقوں جیسی نوبت تھی۔ بس محدود مگر جائز آمدنی میں وہ آسائشیں حاصل نہیں ہوسکتی تھیں جو عمرانہ کے دل میں خواہش بن کر پل رہی تھیں۔ مبین اختر اسی بات کو بہت کچھ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کسی نہ کسی طرح عمرانہ کو بی اے کروادیا تھا۔ تعلیم انسان کے اندر شعور پیدا کرتی ہے اور باشعور انسان کے احساسات بہت نازک ہوجاتے ہیں۔ عمرانہ بھی ایک حساس اور جذباتی لڑکی تھی۔

احسان لودھی پہلی ہی نظر میں عمرانہ پر مرمٹا تھا۔ دوسری جانب عمرانہ کو بھی احسان کی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ احسان پرکشش شخصیت کا مالک ایک دولت مند انسان تھا۔ اس کی عمر پچاس سے متجاوز تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا مگر کم وبیش بیس سالہ ازدواجی رفاقت کے باوجود بھی شازیہ، احسان کے لیے کوئی اولاد پیدا نہیں کرسکی تھی۔

عمرانہ کو احسان کے یہاں کام کرتے ہوئے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ اس نے ایک روز صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عمرانہ کو پرپوز کردیا۔ احسان کی جس بات نے عمرانہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اس کی راست گوئی تھی۔ احسان نے اپنے بارے میں کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عمرانہ کی محرومیوں اور ناآسودگیوں نے اس کے ذہن میں زندگی کے ساتھی کا جو تصور قائم کردیا تھا، احسان اس پر صد فی صد پورا اترتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک ہفتے کی سوچ وبچار کے بعد عمرانہ نے اپنی عمر کے دگنے سے بھی زیادہ عمر کے مرد کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ عمرانہ نے عزت کی جوان رفاقت پر ایک بوڑھے دولت مند کی رفاقت کو ترجیح دی تھی۔

بات جب مبین اور صبیحہ تک پہنچی تو دونوں نے ایک دوسرے کے بالعکس ردِعمل کا اظہار کیا۔ مبین کا خیال تھا کہ شادی ہمیشہ اپنے ہم پلّا اور ہم رتبہ لوگوں میں کرنی چاہیے لیکن صبیحہ اپنے شوہر کے نظریات کے برخلاف عمرانہ کی حامی تھی۔ گھر میں صبح وشام جب یہی موضوع زیر بحث رہنے لگا تو اڑتی اڑتی خبر سلمان تک بھی پہنچ گئی۔ سلمان بھی اختر کالونی ہی میں رہتا تھا اور ان دنوں کارائز کنڈیشننگ کا کام سیکھ رہا تھا۔ اس کی تعلیم میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

جہاں تک سلمان کا تعلق تھا، وہ عمرانہ سے والہانہ محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کی تمنا اپنے دل میں بسائے بیٹھا تھا۔ صبیحہ کے خیال میں سلمان، عمرانہ کے لیے کسی بھی طور پر مناسب اور موزوں نہیں تھا۔ اس کی تعلیم واجبی تھی، ذریعۂ معاش مستحکم نہیں تھا اور آمدنی قابل ذکر نہیں تھی جب کہ مبین اپنے دل میں بھتیجے کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور رکھتا تھا۔

سلمان کو یقین تھا کہ عمرانہ اس کی شریکِ حیات بننے سے انکار نہیں کرے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے نزدیک یہ تھی کہ دونوں خاندانوں کی مالی حیثیت تقریباً ایک سی تھی۔ وہ عمرانہ کی ملازمت کے بھی خلاف تھا اور اسے روکتا ٹوکتا رہتا تھا لیکن عمرانہ نے وہ کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ سلمان کو جب معلوم ہوا کہ عمرانہ اپنے باس احسان لودھی میں دلچسپی ظاہر کررہی ہے تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ تاہم اس نے اپنی اندرونی شکست وریخت کا اظہار نہیں کیا اور عمرانہ کو سمجھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز اسے تنہائی میں عمرانہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

سلمان نے متحمل لہجے میں کہا "عمرانہ! میں نے

تمہارے بارے میں ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے۔"

"اچھا... اڑتی اڑتی!" عمرانہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "کتنے پروں والی تھی وہ خبر؟"

"میں بے حد سنجیدہ ہوں عمرانہ۔"

"تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔"

"تم مذاق نہیں کر رہیں بلکہ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔" سلمان نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"مجھے تمہارا مذاق اڑانے کا شوق نہیں ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

سلمان نے اس کی شوخی نما شرارت کو نظرانداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر لب کشائی کی "عمرانہ! میں تو تمہارے گھر اپنی امی کو بھیجنے والا تھا لیکن میں نے سنا ہے، تم کہیں اور ہی نظر لگائے بیٹھی ہو جب کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔"

"تمہاری چاہت یک طرفہ ہے سلمان۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"کیا تم اتنی زیادہ سنگ دل ہو کہ تمہیں میرے جذبات کا احساس ہی نہیں ہے!" سلمان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"میں تمہارے جذبات کو محسوس کرنے کی پابند تو نہیں ہوں!"

سلمان، عمرانہ سے پانچ سال بڑا تھا لیکن تعلیم کے میدان میں وہ اس سے چھ سال پیچھے تھا۔ مختلف ملازمتوں کے دوران میں عمرانہ نے پرائیویٹ ایم اے بھی کر لیا تھا۔ سلمان، عمرانہ کی تعلیمی برتری کو تسلیم کرتا تھا اور عزت و احترام کے ساتھ اسے اپنانا چاہتا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ عمرانہ نے اپنے ذہن میں شوہر کا جو معیار قائم کر رکھا تھا، سلمان اس پر پورا نہیں اترتا تھا۔

سلمان نے نرم لہجے میں کہا "عمرانہ! میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میری تعلیم اگرچہ واجبی سی ہے لیکن میں جو ہنر سیکھ رہا ہوں، اس کا بڑا اسکوپ ہے۔ میں آگے جا کر کئی پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کماؤں گا۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہیں آئے گا۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں قطعاً دکھی نہیں ہوں۔" عمرانہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "اس لیے مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس شہر میں دکھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ دو چار کو تو میں بھی جانتی ہوں۔ تم کہو تو ان کے نام اور ایڈریس..."

"پلیز عمرانہ!" سلمان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "تم میرے جذبات کو بری طرح مجروح کر رہی ہو۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اگر تم حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"کیا تم مجھے مسترد کر رہی ہو؟"

"بات مسترد کرنے یا قبول کرنے کی نہیں ہے سلمان۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"اصل بات معیار اور پسند کی ہے۔" عمرانہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا "اگر میاں بیوی کے مزاج، معیار اور پسند و ناپسند میں فرق ہو تو وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں خوش نہیں رہ سکتے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دے سکتی ہوں کہ تم میری جانب سے اپنا دھیان ہٹا لو۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے دل سے میرا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دو۔"

سلمان نے آخری کوشش کے طور پر کہا "اگر میں تمہارے مزاج، تمہارے معیار اور پسند و ناپسند پر پورا اتر کر دکھا دوں تو؟"

"تو بھی کچھ نہیں۔"

عمرانہ کے دو ٹوک جواب سے سلمان کی غیرت اور رقابت کو شدید چوٹ لگی۔ عمرانہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے اپنے چچا سے بات کی۔ مبین اختر نے بیٹی اور بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش لاحاصل رہی۔ مبین اختر صرف دفتر ہی میں اسسٹنٹ نہیں تھے بلکہ گھر میں بھی وہ اسسٹنٹ ہی تھے۔ صبیحہ نے بیٹی کی حمایت میں ایسی بڑھ چڑھ کر تقریر کی کہ مبین اختر کی سٹی گم ہو گئی۔ اپنے دھواں دھار خطاب کے اختتام میں وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے تو ساری زندگی ایک کلرک کے چیتھڑوں میں سسکتے ہوئے گزار دی۔ کئی عیدیں پرانے کپڑوں میں بیت گئیں لیکن میں اپنی بیٹی کو ان حالات میں نہیں دھکیلوں گی جہاں میں نے قدم قدم پر سمجھوتا کیا ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر عمرانہ کا ہاتھ تمہارے اس مکینک بھتیجے کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ عمرانہ کی شادی وہیں ہوگی جہاں اس کا دل چاہے گا۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

مبین نے احسان لودھی کی پہلی بیوی کے حوالے سے بھی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن تھک ہار کر اسے خاموش ہو جانا پڑا چنانچہ چار ماہ بعد عمرانہ کاروں کے جلوس میں رخصت ہو کر اختر کالونی سے نارتھ ناظم آباد پہنچ گئی۔ سلمان بے بسی اور بے چارگی کے احساس کے ساتھ اپنی محبتِ یک طرفہ کے جنازے کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے برات میں شامل ہر گاڑی کے ٹائر اس کے دل کو کچلتے ہوئے جا رہے ہوں۔

سلمان نے اسی وقت اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ جس دولت کی کشش نے عمرانہ کو اس سے چھین لیا تھا' وہ اس دولت کو ضرور حاصل کرلے گا۔ اور اتنا زیادہ حاصل کرلے گا کہ۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

بہت زیادہ دولت کے حصول کے لیے کارائز کنڈیشننگ کا کام معاون ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سرتوڑ کوشش کر کے چھ ماہ کے اندر اندر ملک سے باہر جانے کا بندوبست کرلیا پھر وہ تائیوان روانہ ہو گیا۔

احسان لودھی کا شاندار اور وسیع و عریض دو منزلہ بنگلہ نارتھ ناظم آباد میں واقع تھا۔ احسان نے بنگلے کی بالائی منزل کو عمرانہ کے لیے مختص کر دیا جب کہ زیریں منزل پر اس کی پہلی بیوی شازیہ کی رہائش تھی۔ چوں کہ ان کے یہاں اولاد نہیں تھی اس لیے اس عالی شان بنگلے میں بچوں کا وجود ناپید تھا۔ پہلے شازیہ اور احسان دو عدد ملازمین کے ساتھ رہتے تھے۔ اب عمرانہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ گھریلو ملازمین میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت فریدہ تھی جو کھانا پکانے کے علاوہ صفائی ستھرائی کا کام بھی کرتی تھی۔ دوسرے ملازم کا نام افتخار احمد تھا۔ افتخار کی عمر یہ وقت وقوعہ لگ بھگ گیارہ سال تھی۔ اب وہ کم و بیش چودہ سال کا ہو چکا تھا۔ افتخار گھر کے اوپرے کاموں کے علاوہ بازار سے سودا سلف بھی لاتا تھا۔

وقوعہ کے روز مقتول احسان لودھی اور ملزمہ عمرانہ کے درمیان کسی بات پر شدید جھگڑا ہوا تھا۔ اس وقت ان کی شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ جب میاں بیوی کے درمیان بات زیادہ بڑھی تو عمرانہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنی امی صبیحہ کے پاس اختر کالونی چلی آئی۔ عمرانہ کی شادی کے ایک سال بعد اس کے والد مبین اختر کا انتقال ہو گیا تھا اور صبیحہ کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں رہا تھا۔

آدھی رات کے وقت پولیس نے صبیحہ کے گھر پر چھاپا مارا اور عمرانہ کو احسان لودھی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ دوسرے روز پولیس نے عمرانہ کو عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ پولیس کا پورا زور اس بات پر تھا کہ عمرانہ نے اپنے کسی نوجوان آشنا کے ساتھ مل کر یا اس کے تعاون سے اپنے بوڑھے شوہر کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس سلسلے میں عمرانہ کے فاروق نامی کسی آشنا کا ایک عشقیہ خط بھی بہ طور ثبوت چالان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔

عدالت نے عمرانہ کو فرد جرم پڑھ کر سنائی تو ملزمہ عمرانہ نے صحت جرم سے انکار کر دیا چنانچہ اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اس کیس کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اب تک اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں ہو سکی تھی اور عمرانہ تین سال سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے الم ناک روز و شب گزار رہی تھی۔

○☆○

چار روز تک عمرانہ کی فائل کی بھرپور اسٹڈی کرنے کے بعد میں اس سے ملنے جیل گیا۔ اس وقت عمرانہ کی ماں صبیحہ اور سلمان میرے ساتھ تھے۔ عمرانہ کو میں نے عدالت کے احاطے میں ایک نظر دیکھا تھا لیکن اچٹتی سی نظر میں دکھائی دینے والی عمرانہ اس عمرانہ سے خاصی مختلف تھی جو اس وقت میرے سامنے جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ رنگ گورا اور خدوخال جاذب نظر و پرکشش رہے ہوں گے مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں بے کیفی اور ویرانی نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ اس کا جسم خاصا لاغر ہو چکا تھا۔ سفید سوتی لباس میں وہ عجیب سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی تاہم جیل کی صعوبتوں نے تین سال میں اس کے چہرے پر کرب کی ان گنت لکیریں کھینچ دی تھیں۔

سلمان نے کن انکھیوں سے عمرانہ کو دیکھا' سرسری انداز میں سلام کیا اور کترا کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ عمرانہ نے جھکی ہوئی نظر سے سلمان کے سلام کا جواب دیا تاہم اس کے انداز میں چھپی ہوئی ندامت کو میں نے صاف محسوس کرلیا تھا۔ اس ندامت میں بے بسی اور حجاب کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی۔

عمرانہ کی ماں صبیحہ نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ یہ بہت تجربہ کار اور جانے ہوئے وکیل ہیں۔ اب تمہارا مقدمہ یہی لڑیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد رہا ہو جاؤ گی۔"

عمرانہ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر ماں سے پوچھا "اور وہ پہلے والے وکیل کا کیا ہو گا؟"

"اس کی ہم نے چھٹی کر دی ہے۔" صبیحہ نے بیٹی کو بتایا۔

"خوامخواہ وہ منحوس مقدمے کو لٹکا رہا تھا۔ تم فکر نہ کرو بیٹی۔ اب بیگ صاحب تمہیں باعزت بری کروالیں گے۔"

عمرانہ نے خالی خالی نظر سے مجھے دیکھا اور بولی "امی! بیگ صاحب اگر بہت تجربہ کار اور مشہور وکیل ہیں تو ان کی فیس بھی بہت اونچی ہو گی۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشانی نہیں ہو گی؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔" صبیحہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا پھر سائیڈ میں کھڑے ہوئے سلمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی "بیٹی' تمہارے مقدمے کا سارا خرچہ سلمان نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اسی نے بیگ صاحب کی فیس بھی ادا کی ہے۔ ہم نے سلمان کو پہچاننے میں بہت دیر کر دی۔ ماشاءاللہ' یہ بہت شریف اور نیک لڑکا ہے۔"

ماں کے منہ سے سلمان کی تعریف سن کر عمرانہ خفیف سی ہو گئی' تاہم وہ منہ سے کچھ نہیں بولی اور خاموش نظر سے اپنی کوٹھڑی کے فرش کو گھورنے لگی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دستخط کے لیے وکالت نامہ عمرانہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

میں نے کہا "عمرانہ! وقوعہ کے روز کیا واقعات پیش آئے تھے؟"

اس نے نگاہ اٹھا کر اپنی امی کو دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی "امی کو سب معلوم ہے۔"

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہم ثابت ہوتی ہیں۔"

وہ اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو گھورنے لگی۔ میں نے پوچھا "عمرانہ' مجھے معلوم ہوا ہے' وقوعہ کے روز کسی بات پر تمہارا اپنے شوہر سے جھگڑا ہو گیا تھا اور تم اس سے ناراض ہو کر اپنی امی کے گھر چلی آئی تھیں۔ مجھے بتاؤ' تمہارے درمیان کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"بہت معمولی بات تھی۔" وہ منمنائی۔

"میں وہ معمولی بات جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ پھر خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "دیکھو عمرانہ! جب تک تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گی' میں تمہارا موثر دفاع نہیں کر سکوں گا۔ ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے ورنہ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو الجھن کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ قدرے بیزار لہجے میں بولی "کیا یہ سب کچھ بتانا پڑے گا؟"

"ہاں' سب کچھ بتانا پڑے گا۔"

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "انہوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔"

"کیسا الزام؟" میں نے پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ بھی اسی طرح پیچیدہ ہوئے سوال کر رہے ہیں جیسے ریمانڈ کے دوران میں پولیس والوں نے کیے تھے۔" وہ سراسیمہ انداز میں بولی "میں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ تسلی تشفی کی باتیں سن سن کر اس کا یقین اور اعتماد متزلزل ہو چکا تھا اور اس نے جیل ہی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔

صبیحہ خاتون نے سمجھانے والے انداز میں کہا "بیٹی! بیگ صاحب پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ یہ تمہارے وکیل ہیں اور تمہاری مدد کرنے کے لیے ہم نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔ تم ان سے تعاون کرو۔"

میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی خاطر کہا "عمرانہ! میں تمہیں محض اس لیے کرید رہا ہوں کہ بعض اوقات ایک معمولی سی بات کیس کا پاسا پلٹ دیتی ہے۔ ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ عدالت میں صرف اسی بات کا ذکر کیا جائے گا جو ہمارے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ تاہم مجھے ہر بات کا علم ہونا چاہیے تاکہ میں وکیل استغاثہ کے دلائل کا توڑ کر سکوں لہٰذا تم بلا جھجک مجھے بتاؤ کہ تمہارے شوہر نے تم پر کس قسم کا الزام لگایا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "سارا فساد ٹیلی فون لائن مین کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ میں اس وقت بالائی منزل پر اکیلی ہی تھی۔ ملازم لڑکے نے آ کر بتایا کہ ٹیلی فون کے محکمے سے کوئی شخص فون چیک کرنے آیا ہے۔ میں نے اپنے فون کے سلسلے میں کوئی شکایت درج نہیں کروائی تھی تاہم احتیاطاً میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر دیکھا۔ فون ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' ممکن ہے احسان نے اس سلسلے میں کوئی شکایت کی ہو اور اسی شکایت کی بنا پر لائن مین فون چیک کرنے آیا ہو۔

"میں نے لائن مین کو اوپر بلا لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک فون کو چیک کرتا رہا۔ اس نے دو تین مرتبہ کہیں فون بھی کیا پھر مجھے فون چیک کرنے کو کہا۔ میں نے ریسیور کان سے لگا کر دیکھا۔ اب ٹون آ رہی تھی۔ گویا فون ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں نے لائن مین کا شکریہ ادا کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔

"اس کے جاتے ہی احسان آ گئے۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ عام طور پر وہ رات آٹھ بجے گھر آتے تھے مگر اس روز چھ بجے ہی آ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھ پر

گرجنا برسنا شروع کردیا۔ میں نے ان کی ناراضی کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"وہ لڑکا کون تھا؟"

میں نے استفسار کیا "آپ کس لڑکے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں اس لڑکے کی بات کررہا ہوں جو ابھی ابھی اس بنگلے سے نکل کر گیا ہے۔" وہ باؤس بوائے کو بولے۔

میں نے بتایا "وہ کوئی لائن مین تھا۔ ٹیلی فون کے محکمے سے آیا تھا۔ آپ نے شکایت درج کروائی تھی۔ وہ فون ٹھیک کرنے آیا تھا۔"

"میں نے کوئی شکایت درج نہیں کروائی تھی۔" احسان غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے بولے "تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔"

"جو سچ تھا' وہ میں نے بتادیا۔" مجھے بھی غصہ آگیا "مجھے آپ سے کوئی بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔"

احسان نے کبھی مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس روز جانے انہیں کیا ہوگیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہورہے تھے۔ میں نے لاکھ صفائی پیش کی لیکن ان کی سوئی تو ایک ہی جگہ پر جیسے رک سی گئی تھی۔ وہ ایک ہی بات کی تکرار کررہے تھے۔

"اب بھی وقت ہے عمرانہ' سچ سچ بتادو۔ وہ لڑکا تم سے ملنے کیوں آیا تھا۔ تمہارے اس سے کس قسم کے تعلقات ہیں؟"

جب وہ مسلسل الزام تراشی کرتے رہے تو میں بھی خاموش نہ رہ سکی پھر ہمارے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ جس کے نتیجے میں' میں کافی دیر تک روتی رہی کیونکہ غصے میں آکر انہوں نے مجھے ایک تھپڑ بھی مارا تھا۔ مجھے روتا چھوڑ کر وہ گھر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور پھر جھگڑا شروع کردیا۔ جب وہ کسی بھی طور میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے تو میں ان سے ناراض ہوکر اسی حالت میں گھر سے نکل گئی اور سیدھی اختر کاوئی امی کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا "عمرانہ' تم احسان لودھی کے بنگلے سے کتنے بجے نکلی تھیں؟"

"اس وقت کم وبیش رات کے نو بجے تھے۔"

"تم دونوں میاں بیوی کے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔" میں نے کہا "لیکن زیریں منزل سے کوئی شخص اوپر تمہیں جھانکنے نہیں آیا حالانکہ نیچے مقتول کی پہلی بیوی شازیہ کی رہائش تھی اور گھر میں دو ملازم بھی موجود تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

عمرانہ نے بتایا "ملازمہ فریدہ اس روز چھٹی پر تھی اور شازیہ اپنے رشتے داروں کے ہم راہ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے ملازم لڑکے افتخار احمد نے بتائی تھی اور افتخار احمد شاید اس وقت بنگلے سے باہر گیا ہوا تھا۔"

"جب تم گھر سے نکلیں' کیا اس وقت تک شازیہ واپس آچکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "شاید وہ اس وقت تک واپس نہیں آئی تھی۔ ویسے میں نے اس طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھی امی کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

"عمرانہ بی بی! اگر وہ لائن مین دوبارہ تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اسے پہچان لوگی؟" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے پھر غیر یقینی لہجے میں بولی "تین سال گزر جانے کے بعد مجھے اس کے خال وخد تو یاد نہیں رہے پھر میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا بھی نہیں تھا تاہم اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی چیز نے مجھے چونکا دیا تھا؟"

"وہ غیر معمولی چیز کیا تھی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"اس کے بائیں گال پر کسی گہرے زخم کا نشان تھا۔"

عمرانہ نے پُروثوق انداز میں بتایا "اور وہ نشان دو ڈھائی انچ سے کسی بھی طور کم نہیں تھا۔"

"بہت خوب۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا "یہ تم نے بہت کام کی بات بتائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس لائن مین کو دوبارہ دیکھتے ہی پہچان لوگی۔"

"ہاں یقیناً۔" اس نے اثبات میں سرہلایا "پہلے جواب دیتے ہوئے اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔"

میں نے پوچھا "تمہیں اپنے شوہر احسان لودھی کے ساتھ کتنا عرصہ ازدواجی زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا؟"

"کم وبیش ڈیڑھ سال۔"

"وقوعہ والے جھگڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارے درمیان اس قسم کی لڑائی وغیرہ ہوئی تھی؟"

عمرانہ نے نفی میں جواب دیا۔

"احسان نے تم پر پہلے کبھی اس نوعیت کا شک کیا تھا؟"

"کبھی بھی نہیں۔" عمرانہ نے قطعیت سے کہا "انہوں نے پہلے کبھی جھگڑا کیا اور نہ ہی کسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"میں نے پولیس کی رپورٹ میں شامل فاروق نامی شخص



کے عشقیہ خط کا حوالہ دیتے ہوئے عمرانہ سے پوچھا "یہ فاروق کا کیا چکر ہے؟"

"میں فاروق نامی کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' وہ پولیس کی اختراع ہے۔"

"صاف ظاہر ہے۔" وہ تپتین سے بولی۔

میں نے کہا "پولیس نے وقوعہ پر خانہ تلاشی کے دوران میں تمہارے سامانِ بناؤ سنگار میں سے مذکورہ خط برآمد کیا تھا۔ چالان میں بھی اس خط کا ذکر ہے۔ پولیس کا موقف یہی ہے کہ تم نے اپنے آشنا یعنی فاروق نامی اس عاشق کے تعاون سے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "عمرانہ! اگر تم فاروق یا اس خط کے بارے میں کچھ بھی جانتی ہو تو مجھے صاف صاف بتادو۔"

وہ ٹھوس لہجے میں بولی "لک از آل فکشن بیگ صاحب! پولیس تو ایک سیدھے سادے معزز شہری کی تلاشی کے دوران میں چرس برآمد کرلیتی ہے۔ ایسے خطوط اور فرضی عاشق پیدا کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس خط اور خط کے لکھنے والے کو قطعاً نہیں جانتی۔"

مزید دو چار اہم باتیں پوچھنے کے بعد میں نے اپنی نوٹ بک بند کردی۔ اس کے بعد میں نے عمرانہ کو چند ضروری ہدایات دیں' اس کی باعزت برئت کا یقین دلایا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

اب کچھ ذکر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ہوجائے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول احسان لودھی کی موت پندرہ ستمبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلۂ قتل کوئی تیز دھار چھری یا خنجر تھا جس کی مدد سے مقتول کی شہ رگ کاٹی گئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کے کیمیاوی رپورٹ کے مطابق مقتول کے معدے میں نواب آور دوا کی بھاری مقدار پائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوئی تھی کہ احسان لودھی کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا یعنی جب اس کی شہ رگ کاٹی گئی تو وہ نواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔

احسان کی خواب گاہ کی تلاشی کے دوران میں پولیس کو بلیم کی ایک شیشی بھی ملی تھی جس میں سے نصف سے زیادہ گولیاں استعمال کی جاچکی تھیں۔ ان گولیوں کی پوٹینسی دس ملی گرام تھی۔ تاہم آلۂ قتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ پولیس کے مطابق ملزمہ عمرانہ اپنے شوہر کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کرنے کے بعد آلۂ قتل اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی جسے اس نے بعد ازاں راستے میں کہیں' اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھینک دیا ہوگا۔

شاید ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ مقتول احسان لودھی کی بیوہ شازیہ نے اس واقعے کے چھ ماہ بعد "لودھی سوپ انڈسٹری" کے جنرل منیجر اور اپنے کزن رستم علی سے شادی کرلی تھی۔ وہ دونوں اسی نارتھ ناظم آباد والے بنگلے میں رہ رہے تھے جس کی بالائی منزل کی ایک خواب گاہ میں تین سال قبل اس بنگلے کے مالک کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

○☆○

آئندہ پیشی پر میں نے عدالت میں وکالت نامہ داخل کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی موکلہ اور اس کیس کی ملزمہ کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی تھی۔ میں نے پیش کار کو تاکید کردی تھی کہ مجھے اطلاع دیے بغیر وہ مقدمے کی تاریخ نہ دے ورنہ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ ہر پیشی پر تاریخ لے لی جاتی تھی یا کسی اور وجہ سے کارروائی نہیں ہوپاتی تھی۔

میں پیش کار کے پاس ہی کھڑا تھا کہ ایک جونیئر وکیل وہاں وارد ہوا۔ وہ سرکاری وکیل کا اسسٹنٹ تھا۔ شاید مجھے وہ صورت سے نہیں پہچانتا تھا اسی لیے وہ میری موجودگی میں پیش کار سے "لین دین" کی کوشش کررہا تھا۔

اس جونیئر وکیل نے دائیں ہاتھ کی بند مٹھی پیش کار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "عمرانہ بیگم والے کیس کی تاریخ دے دیں۔ نظامی صاحب آج حاضر نہیں ہوسکیں گے۔"

نظامی سرکاری وکیل کا نام تھا۔

پیش کار نے مسکراتے ہوئے جونیئر وکیل کو دیکھا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان سے ملیے۔ یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ اب عمرانہ کا کیس یہی لڑیں گے۔ پہلے والے وکیل سے کیس لے لیا گیا ہے۔"

"اوہ!" جونیئر وکیل نے اپنی بند مٹھی واپس کھینچ کر ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تو عمرانہ بیگم کے کیس کی پیروی اب آپ کریں گے!"

"آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں اس کوشش سے باز آجاتا ہوں۔" میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "نہیں صاحب! میری کیا مجال ہے اعتراض کرنے کی۔ آپ بڑے شوق سے لڑیں یہ کیس۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "لیکن اس کیس میں جان نہیں ہے۔"

"جان نہیں ہے تو جلد ہی دم توڑ دے گا۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے پھر پیش کار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "براہ مہربانی آپ ہمارے کیس کا نمبر شروع میں لگادیں۔ آج اس کی سماعت ہونا چاہیے۔"

جونیئر وکیل نے تجویز آمیز انداز میں کہا "میرا خیال ہے' آج تاریخ لے لیتے ہیں۔ نظامی صاحب بھی آج بہت مصروف ہیں۔"

"یہ کیس بھی نظامی صاحب کی مصروفیت کا ایک حصہ ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے میرے خیال میں آپ بھی بہ آسانی یہ کیس ڈیل کرسکتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے اعتماد جھلکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اندر بہترین فائٹنگ اسپرٹ موجود ہے۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے معتدل لہجے میں بولا "بیگ صاحب! اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے طور پر اس کیس کو بہت اچھی طرح ہینڈل کرسکتا ہوں مگر نظامی صاحب کی اجازت نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔ جج نے سرسری انداز میں فائل کا جائزہ لیا اور کسی کو خاص طور پر مخاطب کیے بغیر بولا۔

"بھئی' یہ کیس اتنا طول کھینچ رہا ہے۔ ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ اس کیس کے وکلا کہاں ہیں؟"

پیش کار نے مودب انداز میں کہا "جناب عالی! ملزمہ کی جانب آج مرزا امجد بیگ نے وکالت نامہ داخل کیا ہے اور ساتھ ہی ملزمہ کی ضمانت کی درخواست بھی دائر کی ہے۔"

جج نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل سے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا پھر پیش کار سے استفسار کیا "اور وکیل استغاثہ کہاں ہیں؟"

"وکیل استغاثہ کے نائب عدالت میں موجود ہیں۔" پیش کار نے بتایا۔

جج نے جونیئر وکیل کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "وکیل استغاثہ خود کیوں نہیں آئے؟"

وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ میں نے کہا۔ "جناب عالی! اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے کم وبیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک کوئی خاص کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ میری موکلہ گزشتہ تین سال سے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں بند ہے۔ وہ بے گناہ ہے اور اسے کسی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اسے انصاف مہیا کیا جائے تاکہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہوسکے۔"

جج نے کہا "بیگ صاحب! میں نے صرف ایک ماہ پہلے اس عدالت کا چارج سنبھالا ہے۔ ابھی تک تو میں پوری فائل بھی نہیں دیکھ سکا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "آپ نے ابھی تک اپنی موکلہ کی ضمانت کے لیے کوشش کیوں نہیں کی؟"

"جناب عالی! میں نے چند روز قبل ہی ملزمہ عمرانہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سے پہلے ایک دوسرا وکیل اسے ڈیل کررہا تھا۔" میں نے وضاحتی لہجے میں کہا۔

وہ خفگی آمیز انداز میں بولا "لگتا ہے' وہ وکیل تین سال سے صرف تاریخیں ہی لیتا رہا ہے۔"

میں نے کہا "جناب عالی! میں نے آج اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزمہ کی ضمانت کے کاغذات بھی داخل کردیے ہیں۔ وکیل استغاثہ کو پابند کیا جائے کہ آئندہ پیشی پر وہ باقاعدہ عدالت میں حاضر ہو۔"

"ٹھیک ہے' میں ایک ہفتے کی تاریخ دے دیتا ہوں۔" جونیئر وکیل نے کہا "جناب عالی! ایک ہفتے بعد نظامی صاحب کو ایک کیس کے سلسلے میں ہائی کورٹ میں پیش ہونا ہے لہٰذا ایک ہفتے بعد کی کوئی تاریخ دی جائے۔"

جج نے غصیلے لہجے میں کہا "اس صورت میں' میں تین روز بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔ تین روز بعد اس مقدمے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوجانا چاہیے۔ اس سلسلے میں پہلے ہی بہت تاخیر ہوچکی ہے۔"

○☆○

منظر اسی عدالت کا تھا!

میں نے عمرانہ کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا "جناب عالی! میری موکلہ بے گناہ ہے اور اسے کسی گہری سازش کے تحت ایک ناکردہ جرم میں پھنسایا گیا ہے۔

"یور آنر! میاں بیوی کے درمیان نوک جھوک زندگی کا حصہ ہے۔ وقوعہ کے روز بھی ایک غلط فہمی کی بنا پر ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ یہ جھگڑا اتنا سنگین نہیں تھا کہ جس کے نتیجے میں میری موکلہ اپنے شوہر کے خون میں ہاتھ رنگ لیتی۔ ایک عورت اتنی معمولی سی بات پر ایسا انتہائی قدم نہیں اٹھاسکتی لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری موکلہ کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس کی ہتھکڑی کھولنے کے احکامات صادر کرے۔"

وکیل استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ضمانت کے خلاف دلائل دینے لگا "جناب عالی! اس کیس کی نوعیت بہت سنگین ہے لہٰذا ملزمہ کی ضمانت انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگی۔"



جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا "آپ اس سنگینی کی وضاحت کریں گے؟"

وکیل استغاثہ نے کہنا شروع کیا "یور آنر! یہ ایک قتل کا کیس ہے اور اس کیس میں ملزمہ کے علاوہ اس کا عاشق نام دار فاروق بھی شامل ہے۔ وہ مقتول کی عدم موجودگی میں ملزمہ سے ملنے آتا تھا اور۔۔۔"

"آئی آبجیکٹ یور آنر۔" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "وکیل استغاثہ میری موکلہ کے لیے ناشائستہ الفاظ استعمال کررہے ہیں۔ اس لغو بیانی کا کوئی ثبوت بھی ہے ان کے پاس۔"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "جناب عالی! مقتول احسان لودھی کی عمر بہ وقت قتل پچپن سال سے متجاوز تھی یعنی ملزمہ کی دگنی عمر سے بھی زیادہ۔ بوڑھے دولت مند شوہر کی نوخیز بیوی کی کسی نوجوان سے آشنائی کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ ہمیں مقتول کے بیڈ روم سے' ملزمہ کے سامان میں سے ایک خط بھی ملا ہے جو فاروق نامی ایک جواں سال عاشق نے اپنی محبوبہ ملزمہ عمرانہ کے نام ارسال کیا تھا۔ اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔"

میں نے جوشیلے لہجے میں کہا "جناب عالی! یہ کوئی فارمولا نہیں ہے کہ عمر رسیدہ شوہر کی جوان بیوی ضرور کہیں عشق بھی لڑاتی ہوگی۔ بہرحال میں وہ خط دیکھنا چاہوں گا۔"

جج نے وکیل استغاثہ سے وہ خط دکھانے کو کہا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی فائل میں سے ایک خط کی فوٹو کاپی نکال کر جج کی جانب بڑھادی۔ یہ اس خط کی نقل تھی جو بقول استغاثہ فاروق نامی کسی نوجوان نے میری موکلہ کو لکھا تھا۔ میری درخواست پر جج نے وہ فوٹو کاپی دیکھنے کے لیے مجھے دے دی۔

میں نے سرسری انداز میں اس خط کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ وہ ایک محبت نامہ تھا جس کا مضمون خالصتاً عاشقانہ تھا۔ اس خط سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فاروق نامی کسی شخص نے اسے عمرانہ کے لیے لکھا تھا۔

"کیا آپ مجھے اصل خط دکھاسکتے ہیں؟" میں نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

"اصل خط اس وقت موجود نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا "اگر ضرورت پڑی تو وہ بھی بطور ثبوت عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا "اس خط کے اصل یا نقل ہونے کا فیصلہ کرنا تو دوسری بات ہے' تاہم اس خط سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میری موکلہ یا اس خط کا نام نہاد تخلیق کار' فاروق کسی بھی طور پر مقتول احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہے۔ آخر وکیل استغاثہ اس خط سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

جج نے یہی سوال وکیل استغاثہ سے کیا۔

وہ بولا "جناب عالی! مقتول احسان لودھی اپنی سیکنڈ وائف ملزمہ عمرانہ سے کم وبیش تیس سال بڑا تھا۔ عمروں کے اس فرق کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ملزمہ اپنے بوڑھے شوہر سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے ایک چاہنے والا بہترین مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔"

جج نے مستفسر نگاہ سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "جناب عالی! وکیل استغاثہ قیاسات کو بنیاد بنا کر میری موکلہ کی ضمانت رکوانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر عمروں میں بہت زیادہ فرق موجود ہو تو نوجوان بیوی لازماً اپنے شوہر سے چھٹکارا پانے کی خواہش مند ہوگی۔ میری موکلہ نے بہ قائمی حواس وہوش مقتول احسان لودھی سے نکاح کیا تھا۔ اس شادی میں احسان لودھی کی پسند اور مرضی بھی شامل تھی۔ اس سلسلے میں واقعاتی شہادت یہ ہے کہ وہ دونوں لگ بھگ ڈیڑھ سال تک خوش وخرم رہے اور ان کے درمیان کبھی کوئی ازدواجی یا معاشرتی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اگر وکیل استغاثہ کے خیال میں صورت حال اس کے بالعکس تھی تو بارِ ثبوت ان کے ذمے ہے۔ جہاں تک اس خط کا تعلق ہے تو میری موکلہ اس سے قطعی لاعلم ہے اور وہ فاروق نامی کسی شخص سے بھی واقف نہیں ہے۔ یہ سراسر ایک فرضی اور من گھڑت خط ہے جو میری موکلہ کو پھانسنے کے لیے شاملِ استغاثہ کیا گیا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! وقوعہ کو لگ بھگ تین سال گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک میری موکلہ کا فرضی عاشق سامنے نہیں آیا۔ ان حالات وواقعات کی روشنی میں معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری موکلہ کو ضمانت پر رہا کیا جائے۔ وہ گزشتہ تین سال سے جیل کسٹڈی میں ہے۔ صنف نازک ہونے کی وجہ سے وہ نرمی کی مستحق ہے۔ وہ کسی بھی طور استغاثہ کے گواہوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی لہٰذا ضمانت پر اس کی رہائی کا حکم جاری کیا جائے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا "جناب عالی! مسمی فاروق ابھی تک مفرور ہے اور پولیس اس کی گرفتاری کے لیے سرتوڑ کوشش کررہی ہے۔ وقوعہ کے روز کم از کم تین افراد نے اسے مقتول کے گھر سے نکلتے یا اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی ملزمہ کے ساتھ احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہے لہٰذا ملزمہ کی ضمانت منظور کرنا کسی بھی طور مناسب نہ

ہوگا۔"

میں نے تمسخرانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! پولیس گزشتہ تین سال سے ایک ایسے فرضی شخص کو تلاش کر رہی ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔"

وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر عمرانہ کی ضمانت رکوانے کے لیے دلائل دینا شروع کیے۔ "جناب عالی! ملزمہ نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر۔۔۔"

جج نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "آپ ایک ہی بات کو دہراتے رہیں گے یا کوئی نئی بات بھی کریں گے؟"

"جناب نئی باتیں تو بہت سی ہیں مگر ان کا اظہار میں استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کے دوران میں کروں گا..... فی الحال تو میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ملزمہ کی ضمانت انصاف کے اصولوں کے خلاف ہوگی۔"

میں نے کہا "جناب عالی! میری موکلہ کی ضمانت کسی بھی طور انصاف کے اصولوں کے منافی نہیں ہوگی۔ وہ ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں پہلے ہی تین سال کی جیل کاٹ چکی ہے۔ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں، میں بھی بہت سے سنسنی خیز انکشاف کروں گا۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میری موکلہ کسی بھی طور استغاثہ کے گواہوں پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ دیٹس آل یور آنر۔"

تھوڑی دیر بعد جج نے میری موکلہ عمرانہ کو پچاس ہزار کے ذاتی مچلکے پر رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ ضمانت سلمان کے تعاونِ خاص سے عملی شکل اختیار کر سکی تھی۔ ضمانت کی قانونی کارروائی میں چند منٹ لگے تھے۔ رہائی ملتے ہی عمرانہ نے پہلے میرا پھر سلمان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی دانست میں ہم اس کے نجات دہندہ تھے۔

جج نے پیش کار کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا "تمام گواہوں کے نام آج ہی سمن روانہ کر دیے جائیں۔ یہ کیس اب جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔"

پھر جج نے میری اور وکیل استغاثہ کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو عمرانہ بہت خوش تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ آزاد ہو چکی تھی وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جہاں اب ہتھکڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹی سلمان کے ساتھ رخصت ہو گئیں اور میں ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

برآمدے میں چلتے ہوئے عقب سے کسی نے مجھے پکارا تو میں رک گیا اور مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔

سرمئی سوٹ میں ملبوس ایک شخص تیز قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر پہلے اسے عدالت کے کمرے میں اسے دیکھ چکا تھا۔

"بیگ صاحب!" اس نے قریب آنے پر مصافحہ کرنے کے بعد کہا "آپ کے طرزِ استدلال نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ آپ نے اپنی موکلہ کی ضمانت کرانے کے لیے جو نکات اٹھائے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ میں آپ کی مہارت اور تجربہ کا معترف ہو گیا ہوں۔ میرے ذہن پر قائم ہونے والے آپ کے اسی تاثر کے پیشِ نظر میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے ان ماں بیٹی کے ساتھ خاصا وقت صرف کر دیا اور میں انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ خیر، اب اگر آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں تو نوازش ہوگی۔"

"اس وقت تو ایک دوسری عدالت میں مجھے حاضر ہونا ہے۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اگر بات انتہائی مختصر ہو تو جلدی جلدی کر لیں۔ ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ شاید پہلے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔"

"شاید نہیں بلکہ یقیناً۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "آج ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں اس لیے پہچاننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "آپ کی تعریف؟"

"مجھے رستم علی کہتے ہیں۔"

"اوہ!" میں چونک اٹھا پھر پوچھا "کون سے رستم علی؟"

رستم علی کا نام سنتے ہی فوراً میرا دھیان مقتول احسان لودھی کے سابق منیجر اور اس کی بیوہ کے حالیہ شوہر کی جانب چلا گیا تھا پھر رستم کے جواب نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

"میں وہی رستم علی ہوں جو تین سال قبل مقتول احسان لودھی کا منیجر ہوا کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے، "لودھی سوپ انڈسٹری" کا جنرل منیجر۔" وہ اپنی بات ختم کر کے زیرِ لب مسکرایا۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "اور اب آپ اپنے باس کی بیوہ محترمہ شازیہ کے شوہرِ نامدار ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" وہ خوش دلی سے بولا "احسان

صاحب کے قتل کے چھ ماہ بعد میں نے شازیہ کی رضامندی سے اس سے شادی کرلی تھی۔ بے چاری شوہر کی زندگی ہی میں بہت دکھی تھی اور اس کے قتل کے بعد تو وہ بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ سوکن کی وجہ سے احسان صاحب سے اس کے گھریلو تعلقات بس واجبی سے ہی رہ گئے تھے۔ شازیہ کی مشکلات کا اندازہ مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ دوسری شادی بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے۔" میں نے مبہم سا جواب دیا پھر کہا۔ "آپ تو غالباً شازیہ کے کزن بھی ہیں۔"

"غالباً نہیں' یقیناً۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا "رستم صاحب! مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ آپ نے اپنی کزن کو سہارا دے کر یقیناً بہت نیک کام کیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "ابھی تک آپ نے بتایا نہیں کہ مجھ سے آپ کو کیا کام ہے؟"

"آپ میرے باس کی قاتلہ کی پیروی کررہے ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "بہرحال یہ تو ہونا ہی ہے لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ پہلے آپ سے ملاقات نہ ہوسکی ورنہ میں آپ ہی کو وکیل استغاثہ مقرر کرتا مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔"

"ہاں' اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا "ملزمہ کی ضمانت ہوچکی ہے اور آیندہ۔۔۔"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ رستم نے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور معتدل لہجے میں بولا "یہ کارڈ رکھ لیں۔ کبھی فرصت نکال کر میرے دفتر یا گھر تشریف لائیں۔ میں آپ کی خدمت میں اس کیس کے بارے میں چند سنسنی خیز حقائق پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے رستم کافور کلر پر شیڈ تعارفی کارڈ ہاتھ میں لے کر اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی پھر اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "رستم صاحب' میں آپ کے اندازے سے زیادہ مصروف آدمی ہوں۔ اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ آپ کو جو بھی انکشاف کرنا ہے وہ یہیں کردیں۔"

"میں جانتا ہوں بیگ صاحب!" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ایک کامیاب وکیل بہت مصروف ہوتا ہے لیکن میں آپ کو جو بتانا چاہتا ہوں وہ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر فرصت ہی سے بتایا جاسکتا ہے۔ یوں سرراہ چلتے پھرتے نہیں۔"

وہ اپنے انداز گفتگو سے میرے اندر تجسس کو ابھارنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اسے چکر دینے کے لیے کہا "اچھا ٹھیک ہے' میں آپ سے ملاقات کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے ایک بات آپ اچھی طرح ذہن میں بٹھالیں۔ آپ مجھ سے کسی قسم کی کوئی غلط توقع نہ باندھ لیجیے گا۔ میں اپنے موکل کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کا قائل ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا "پھر تو آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اگر آپ کو فرصت نہ مل سکی تو میں آپ کے دفتر حاضر ہوجاؤں گا۔ اگر زحمت نہ ہو تو مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ عنایت کردیں۔ آج کل انصاف کرنے اور اپنے موکل کو انصاف دلانے والے وکیل ناپید ہوتے جارہے ہیں۔"

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ وہ مجھے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ میں کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ وہ کیوں تنہائی میں مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور اس ملاقات میں وہ کس قسم کے سنسنی خیز انکشافات کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں اپنے ذہن کو زیادہ تھکانا مناسب نہ سمجھا اور خود کو عدالتی ذمے داریوں میں مصروف کرلیا۔

○☆○

استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کے نام پیش کیے گئے جن میں تین گھر کے مکین اور تین محلے کے افراد شامل تھے۔ محلے داروں میں ایک مقتول کا پڑوسی طارق محمود تھا۔ طارق محمود نے وقوعہ کے روز یعنی تین سال قبل پندرہ ستمبر کو ایک نوجوان کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو میری موکلہ کے مطابق فرضی ٹیلی فون لائن مین اور استغاثہ کے مطابق ملزمہ کا آشنا فاروق تھا۔ دوسرے دونوں محلے دار گواہوں میں ایک مولانا امیر الدین اور دوسرا ملک قدیر تھا۔ ان دونوں نے وقوعہ کے روز مذکورہ بالا شخص کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

گھریلو مکینوں میں مقتول کی بیوہ شازیہ' مقتول کا جنرل منیجر رستم علی اور ملازم افتخار احمد شامل تھے۔

استغاثہ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ملزمہ عمرانہ اور مفرور عاشق فاروق ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ملزمہ نے اپنے بوڑھے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لہٰذا اس نے اپنے محبوب کی اعانت سے اپنے بوڑھے شوہر کو ٹھکانے لگا دیا تھا جو بعد ازاں فرار ہوگیا تھا۔

استغاثہ میں مجھے کچھ ایسے رخنے نظر آرہے تھے جو آگے چل کر جرح کے دوران میں میرے لیے معاون ثابت ہوسکتے



تھے۔ میں نے ابھی تک اس پہلو کو زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی تھی مبادا وکیل استغاثہ چوکنا ہوجاتا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے استغاثہ کی جانب سے مولانا امیر الدین بیان دینے کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے گواہوں والے کٹہرے میں آکر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر وہی مختصر بیان ریکارڈ کروایا جو وہ پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کے سلسلے میں صرف ایک سوال کیا "مولانا امیر الدین صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے جس نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا' کیا وہ اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے ٹیلی فون لائن مین دکھائی دیتا تھا؟"

مولانا نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

اس کے بعد میری جرح کی باری آئی۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کٹہرے کے پاس آیا اور مولانا امیر الدین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "مولانا امیر الدین صاحب! کیا میں آپ کو اپنی آسانی کے لیے صرف مولانا کہہ کر مخاطب کرسکتا ہوں؟"

مولانا نے جواب دیا "اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مولانا! ابھی آپ نے وکیل استغاثہ کے اکلوتے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے جس نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا' وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ٹیلی فون لائن مین نظر نہیں آتا تھا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "جی ہاں' میں نے یہی کہا تھا۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں ٹیلی فون لائن مین کسی مخصوص وضع قطع اور صورت و شکل کے مالک ہوتے ہیں؟"

مولانا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "دیکھیں صاحب! یہ تو سامنے کی بات ہے' آدمی جس پیشے سے منسلک ہوتا ہے اس کی جھلک اس شخص میں بھی نظر آنے لگتی ہے لیکن میں نے جس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ نوجوان ٹیلی فون لائن مین نہیں ہوسکتا تھا وہ دوسری بات تھی۔"

"اور وہ کیا بات تھی؟"

مولانا امیر الدین نے جواب دیا "مجھے اس نوجوان کے پاس ٹیننگ ٹیلی فون ہینڈ سیٹ دکھائی نہیں دیا تھا۔"

یہ بات عمرانہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی تاہم میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔ میں نے کہا "مولانا! ممکن ہے ٹیلی فون ٹیننگ ہینڈ سیٹ لائن مین کی کٹ کے اندر رکھا ہو؟"

اس نے جلدی سے جواب دیا "اس کے پاس ٹول کٹ بھی نہیں تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔"

"اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ نوجوان ٹیلی فون کے محکمے سے تعلق نہیں رکھتا تھا؟" میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"بالکل' میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا انداز سرسری سا تھا۔

وہ میرے جملے کی گہرائی تک پہنچے بغیر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں بے نیازی سے استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"مولانا!" میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے مولانا امیر الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جب آپ نے مذکورہ مفرور نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ کیا کررہے تھے؟"

"میں اس وقت نماز پڑھنے مسجد کی جانب جارہا تھا۔"

"کون سی نماز؟"

"نماز عصر۔"

میں نے پوچھا "اس کا مطلب ہے' وہ مغرب سے پہلے کا وقت تھا؟"

روحانی سائنس اور ہومیو پیتھک علاج کا مرکز
الفراز آسٹرو ہومیو سروسز
زیر نگرانی: سید انور فراز
ہر قسم کے جسمانی' نفسیاتی اور روحانی علاج کے لئے مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ فون نمبر 5897126
اوقات ملاقات شام 5 بجے تا رات 10 بجے
(گولڈ میڈلسٹ)
ڈاکٹر امبر امروز
پتا: C-73 ڈیون کمرشل اسٹریٹ فیز نمبر D.H.A EXT
مین کورنگی روڈ نزد بس اسٹاپ کھیر کالونی۔ کراچی

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس وقت کم و بیش چھ بجے تھے۔"

میں نے پوچھا "وہ نوجوان مقتول کے گھر سے نکل کر کس طرف گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا آپ نے اس روز کے بعد پھر کبھی اس نوجوان کو دیکھا؟"

مولانا امیرالدین کا جواب نفی میں تھا۔

میں نے پوچھا "مولانا! اگر وہ نوجوان آپ کے سامنے آجائے تو کیا آپ اسے پہچان لیں گے؟"

"میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا "اب اس بات کو خاصا عرصہ گزر چکا ہے۔"

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

استغاثہ کا اگلا گواہ ملک قدیر تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اس کے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔

"ملک صاحب!" اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے مقتول کے گھر سے ایک نوجوان کو پراسرار انداز میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟"

اس نے جواب دیا "ہنڈریڈ پرسنٹ سچ ہے۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا "کیا اس کے ہاتھ میں آپ نے کوئی تھیلا یا اوزاروں والی کٹ بھی دیکھی تھی؟"

تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کا گواہ مولانا امیرالدین معزز عدالت کو بتا چکا تھا کہ اس نے مذکورہ نوجوان کے پاس اوزاروں والی کٹ دیکھی تھی اور نہ ہی کوئی ٹیلی فون ٹیننگ ہینڈ سیٹ لیکن مولانا کے اس بیان سے ملک قدیر واقف نہیں تھا۔

ایک بات کی وضاحت کردوں کہ عدالت میں، ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو ہی بیان اور جرح کے لیے بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے جوابات سے دوسرے گواہوں کی شہادت متاثر نہ ہوسکے۔ پہلے جس کٹہرے میں مولانا امیر الدین گواہی دے کر گیا تھا، اب وہاں ملک قدیر کھڑا تھا۔

ملک قدیر نے وکیلِ استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "میں نے اس نوجوان کے ہاتھ میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔"

وکیلِ استغاثہ نے پوچھا "کوئی ٹیلی فون ٹیننگ ہینڈ سیٹ؟"

"نہیں جناب۔"

وکیلِ استغاثہ نے دو چار رسمی سوالوں کے بعد جرح ختم کردی۔

اپنی باری پر میں گواہ کے کٹہرے کے نزدیک آیا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا "ملک قدیر صاحب! آپ کا شغل کیا ہے؟"

"میں ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔"

"آپ کس محکمے سے اور کب ریٹائر ہوئے ہیں؟"

اس نے ایک سرکاری محکمے کا نام لیا اور بتایا "میں پچھلے سال ہی ریٹائر ہوا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے، وقوعہ کے وقت آپ آن جاب تھے؟"

"بالکل درست۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

میں دانستہ اس سے غیر متعلق سوال کررہا تھا۔ میں نے پوچھا "ملک صاحب! ریٹائرمنٹ کی زندگی کیسی لگ رہی ہے؟"

"اچھی ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا "کیا آپ کو یاد ہے، وقوعہ کس تاریخ کو پیش آیا تھا؟"

"نہ صرف تاریخ بلکہ مجھے دن بھی یاد ہے۔" وہ جلدی سے بولا پھر بتایا "پندرہ ستمبر روز بدھ۔"

"بہت خوب۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"ایکسیلنٹ۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ملک صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں "ہنڈریڈ پرسنٹ" کے الفاظ ادا کیے تھے۔ کیا آپ کو وہ سوال یاد ہے۔ یہ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہے؟"

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر جواب دیا "وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز میں نے مقتول کے گھر سے ایک نوجوان کو پراسرار انداز میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"اور آپ کا جواب ہاں میں تھا!"

"جی ہاں۔"

"آپ پُراسرار انداز کی وضاحت کریں گے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔



"وہ نوجوان خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔" ملک قدیر نے جواب دیا۔

"کیا آپ اس نوجوان کو جانتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"اس روز کے بعد آپ نے کبھی اسے دوبارہ دیکھا؟"

"پھر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر نظر آجائے تو اسے پہچان لیں گے؟"

"میرا خیال ہے، میں اسے پہچان لوں گا۔"

"اپنی یادداشت پر بہت اعتماد ہے آپ کو؟"

"آئی ایم اینسولوٹلی کانفیڈنٹ۔"

"تھینک یو ملک صاحب۔"

میں نے استغاثہ کے گواہ ملک قدیر پر اپنی جرح ختم کی تو جج کی اجازت سے تیسرا گواہ طارق محمود کٹہرے میں آکر کھڑا ہوا۔ حلف برداری کے مراحل سے گزرنے کے بعد اس نے اپنا مختصر سا بیان دہرایا۔

وکیلِ استغاثہ نے اس پر سرسری سی جرح کی۔ اس کے تمام سوالات کا مقصد صرف یہ باور کروانا تھا کہ وقوعہ کے روز گواہ نے ایک اجنبی نوجوان کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا "طارق محمود صاحب! آپ نے مذکورہ اجنبی نوجوان کو وقوعہ کے روز کتنے بجے مقتول احسان لودھی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میرا خیال ہے، اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔"

"یعنی آپ کو یقین نہیں ہے؟"

وہ بولا "اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے اگلا سوال کیا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مذکورہ نوجوان مقتول کے گھر سے کتنے بجے رخصت ہوا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں معذرت چاہوں گا۔" وہ دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلاتے ہوئے بولا "میں نے جب اس نوجوان کو احسان لودھی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس وقت میں اپنے گھر سے گاڑی میں نکل رہا تھا۔ اس رات میری واپسی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی۔ واپسی گھر پہنچ کر ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ احسان لودھی کو قتل کردیا گیا تھا۔"

"طارق صاحب! آپ مقتول کے پڑوسی ہیں۔" میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا "آپ مقتول کے پڑوس میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں؟"

"کم و بیش دس سال سے۔" اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"پھر تو آپ انہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے؟"

"خاصی حد تک۔"

"وہ مزاج کے کیسے تھے؟"

"بہت اچھے تھے۔"

"ان کی دوسری شادی پر گھر میں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا تھا؟"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"شاید آپ میرا سوال نہیں سمجھے۔" میں نے وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ جب مقتول نے ملزمہ عمرانہ سے شادی کی تو اس کی پہلی بیوی شازیہ نے کوئی طوفان تو کھڑا نہیں کیا تھا؟"

"درونِ خانہ کچھ ہوا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔" طارق محمود نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا "لیکن منظرِ عام پر ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔"

"کیا آپ نے کوئی ایسی خبر سنی تھی کہ مقتول اپنی دوسری بیوی ملزمہ عمرانہ سے جھگڑا کرتا رہتا تھا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا "ملزمہ عمرانہ، مقتول کی دوسری بیوی کی حیثیت سے کم و بیش ڈیڑھ سال تک آپ کے پڑوس میں آباد رہی تھی۔ آپ نے اس کا رویہ کیسا پایا؟"

"وہ انتہائی ملن سار اور شائستہ عورت تھی۔"

"اس کے کردار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"میں نے اس کے کردار میں کوئی جھول نہیں پایا۔"

میں نے پوچھا "طارق صاحب! آپ نے وقوعہ کے روز جس نوجوان کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں جناب، میں اسے بالکل نہیں جانتا۔"

"اس سے پہلے یا بعد میں آپ نے اسے کہیں دیکھا؟"

"قطعی نہیں۔"

"اگر کبھی نظر آجائے تو پہچان لیں گے؟"

"میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ الجھن آمیز انداز میں بولا "کیونکہ میں نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اب تو مجھے اس کی شبیہ بھی یاد نہیں ہے۔"

میں نے اس کے ساتھ ہی اپنی جرح ختم کردی۔

اگلا گواہ مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد تھا۔ اس کی عمر

لگ بھگ چودہ سال تھی۔ وہ مقتول کے گھر میں اوپری کام کرتا تھا اور بازار سے سودا سلف لاتا تھا۔ اس وقت وہ خاصا نروس ہو رہا تھا حالانکہ صورت سے وہ اچھا خاصا تیز نظر آتا تھا۔

افتخار احمد اپنا حلفیہ بیان دے چکا تو وکیلِ استغاثہ نے گھما پھرا کر دو چار سوالات کیے پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور افتخار والے کٹہرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاصا سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی جرح شروع کی۔

"افتخار احمد! کیا اس سے پہلے بھی کبھی عدالت میں آئے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہ کبھی عدالت میں آیا ہوں اور نہ ہی کبھی تھانے گیا ہوں۔"

"مقتول احسان لودھی کے پاس کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟"

"اب تو جی میں رستم صاحب کے پاس کام کرتا ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی پھر کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ تم اس بنگلے پر کب سے کام کر رہے ہو؟"

"پوری زندگی یہیں گزری ہے جناب۔" اس نے جواب دیا "مجھے تو یاد بھی نہیں، کب یہاں آیا تھا۔"

"تمہارے والدین کہاں رہتے ہیں؟"

"میں اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے پوچھا "بنگلے سے تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"مجھے تنخواہ نہیں ملتی جناب۔"

"کیا مطلب؟"

"صاحب میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔" افتخار احمد نے جواب دیا "وہ میری ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ مجھے جیب خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر تنخواہ کا کیا سوال۔"

میں نے محسوس کیا کہ اب وہ خوف و ہراس کی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

"افتخار احمد! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز جو نوجوان ٹیلی فون ٹھیک کرنے آیا تھا، اس کے لیے دروازہ تم نے ہی کھولا تھا؟"

"جی ہاں، یہ سچ ہے۔"

"پھر تم نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے اوپر جا کر چھوٹی بیگم صاحبہ کو اس کی اطلاع دی تھی۔" افتخار نے بتایا "حالانکہ یہ میرا کام نہیں تھا۔"

"کیا مطلب، تمہارا کام نہیں تھا؟"

وہ بولا "بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب کہ میں نچلی منزل پر بڑی بیگم صاحبہ کے کام کرتا تھا اور اوپری منزل کے کام دوسری ملازمہ فریدہ کرتی تھی لیکن اس روز فریدہ چھٹی پر تھی اس لیے مجھے اوپر جانا پڑا۔"

"اچھا، اچھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو تم لوگوں نے اوپر اور نیچے کے کام آپس میں بانٹ رکھے ہیں۔"

"جی ہاں، مگر یہ پہلے کی بات ہے جب احسان صاحب زندہ تھے۔" افتخار احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تو اوپر اور نیچے کا سلسلہ ہی نہیں رہا۔ میں کسی بھی وقت اوپر جا سکتا ہوں اور فریدہ بھی میرے ساتھ نیچے ہی رہتی ہے۔"

میں نے اگلا سوال کیا "جب تم نے بالائی منزل پر جا کر چھوٹی بیگم صاحبہ کو اس لائن مین کی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے کیا کہا تھا؟"

"انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا؟"

"تم لائن مین کو اوپر چھوڑ کر واپس نیچے آ گئے تھے یا وہیں اوپر ہی رہے تھے؟"

"میں فوراً نیچے آ گیا تھا۔"

میں نے پوچھا "جب وہ لائن مین واپس گیا، اس وقت تم کہاں تھے؟ کیا تم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میں اس وقت کوئی سودا لینے بنگلے سے باہر گیا ہوا تھا۔" افتخار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اس لیے میں اسے دیکھ نہ سکا۔ میرے واپس آنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔"

میں نے اچانک پوچھا "اس لائن مین کا نام کیا تھا؟"

"جی!" افتخار نے حیرت سے پوچھا "مجھے کیا معلوم، اس کا نام کیا تھا؟"

"کیا وہ لائن مین پہلے کبھی فون ٹھیک کرنے بنگلے پر نہیں آیا تھا؟" میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

"بعد میں بھی کبھی نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا "پولیس تو تین سال سے اسے تلاش کر رہی ہے لیکن خدا جانے اسے زمین نے نگل لیا ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔"

"افتخار احمد!" میں نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے نو

عمر استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا "تم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ تم بڑی بیگم شازیہ کی خدمت کے لیے زیریں منزل پر رہتے تھے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا' میں نے پوچھا "جس وقت وہ اجنبی لائن مین بالائی منزل کا ٹیلی فون چیک کرنے آیا تھا اس وقت تمہاری بڑی بیگم صاحبہ کیا کر رہی تھیں؟"

"وہ اس وقت بنگلے میں موجود نہیں تھیں۔"

"کہاں گئی ہوئی تھیں وہ؟"

"وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھیں۔"

میں نے پوچھا "وہ کتنے بجے بنگلے سے نکلی تھیں؟"

"تقریباً پانچ بجے۔"

"اور واپس کب آئی تھیں؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے' وہ نو بجے کے بعد ہی واپس لوٹی تھیں۔ مجھے اس وقت بہت زور کی نیند آرہی تھی اس لیے صحیح وقت یاد نہیں رہا۔ اس دن چونکہ فریدہ چھٹی پر تھی اس لیے اس کے حصے کا کام بھی مجھے ہی کرنا پڑا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔"

میں نے پوچھا "ذرا سوچ کر بتاؤ' وقوعہ کے روز تمہارے صاحب کتنے بجے گھر آئے تھے؟"

"میں جب سودا لے کر واپس آرہا تھا تو ان کی گاڑی بھی وہاں پہنچی تھی۔ میں نے خود ان کے لیے گیٹ کھولا تھا۔" افتخار احمد نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے' اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔"

"کیا مقتول احسان لودھی روزانہ چھ بجے ہی گھر آتے تھے؟"

"نہیں جی' وہ تو عموماً آٹھ بجے تک آتے تھے۔"

"وقوعہ کے روز تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی؟"

"کس قسم کی خاص بات؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔

میں نے کہا "مثلاً بالائی منزل سے تمہیں کسی قسم کے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آئی تھیں؟"

"نہیں جناب' میں نے ایسی آوازیں نہیں سنی تھیں۔ میں اس وقت بنگلے کے اندرونی حصے میں تھا۔ ویسے میں ایک بات آپ کو بتا دوں کہ چھوٹی بیگم صاحبہ اور صاحب جی کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔"

میں نے پوچھا "افتخار احمد! وقوعہ کے روز تمہارے صاحب گھر آنے کے بعد دوبارہ گھر سے باہر نکلے تھے؟"

"جی ہاں' وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔"

"اس وقت ان کا موڈ کیسا تھا؟"

"میں نے غور نہیں کیا۔"

میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا "افتخار احمد! تمہیں کب اور کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے صاحب احسان لودھی کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "مجھے تقریباً آدھی رات کو یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ گھر میں شور کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ بڑی بیگم صاحبہ کے واپس لوٹنے کے بعد میں فوراً سو گیا تھا۔ جب میں اٹھا تو رستم صاحب فون پر پولیس والوں کو واردات کی اطلاع دے رہے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر مجھے بتایا گیا کہ چھوٹی بیگم صاحبہ صاحب جی کو قتل کر کے گھر سے فرار ہو گئی ہیں۔"

"تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی؟"

"بڑی بیگم صاحبہ نے۔"

میں نے کہا "افتخار احمد! کیا تمہیں اس خبر پر یقین آگیا تھا؟"

"فوری طور پر تو یقین نہیں آیا تھا جناب۔" اس نے جواب دیا "لیکن تھوڑی دیر بعد جب پولیس والے وہاں پہنچ گئے تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔"

"ایک آخری سوال۔" میں نے افتخار احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اگر کبھی دوبارہ تمہیں وہ لائن مین نظر آجائے تو کیا تم اسے پہچان لو گے؟"

"بہت اچھی طرح پہچان لوں گا جناب۔" وہ پر وثوق لہجے میں بولا "اس کی صورت میرے ذہن میں نقش ہے۔"

"بہت خوب!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جرح کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد' جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

میں نے کہا "جناب عالی! استغاثہ کے دو گواہوں کی شہادت باقی رہ گئی ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ آئندہ پیشی پر انہیں ہر صورت عدالت میں حاضر کیا جائے۔ میں جلد از جلد گواہوں پر جرح ختم کر کے دلائل کی طرف آنا چاہتا ہوں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کو آگاہ کی "وکیل صاحب! یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ آئندہ پیشی پر باقی دونوں گواہ عدالت میں موجود ہونا چاہئیں۔"

"آل رائٹ یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے گردن تسلیم خم کرتے ہوئے کہا پھر معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔



میں وکیل مخالف کی نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے عدالت کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

○☆○

دو روز بعد دوپہر میں میرے دفتری فون کی گھنٹی بجی۔ اس روز میری سیکریٹری چھٹی پر تھی لہٰذا فون براہِ راست مجھے ہی ریسیو کرنا پڑا۔ میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔

"ہیلو!"

"مرزا امجد بیگ سے بات کروائیں۔" دوسری جانب سے نسوانی آواز میں کہا گیا۔ بولنے والی کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا۔

میں نے کہا "بات کر رہا ہوں۔"

"یہ آپ نے قاتلوں کی وکالت کب سے شروع کر دی مسٹر صاحب؟" اس کے لہجے سے غصے کا اظہار ہوتا تھا۔

میں قدرے سنبھل کر بیٹھ گیا اور محتاط لہجے میں کہا۔ "آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا؟"

وہ بدستور جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی "میں نہ تو آپ کی کوئی پرستار ہوں اور نہ ہی کسی کیس کے سلسلے میں آپ کو وکیل کرنا چاہتی ہوں۔"

"پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ قاتلوں کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوششوں سے باز آجائیں۔"

وہ عجیب جھکی عورت تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ اس کے ساتھ مغزماری کرنے سے بہتر ہے کہ میں فون بند کر دوں لیکن میں نے پھر اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کہا "محترمہ! جب تک کوئی کیس عدالت میں زیرِ سماعت ہوتا ہے اس وقت تک مقدمے میں ماخوذ شخص ملزم کہلاتا ہے یعنی از روئے قانون وہ یقینی طور پر مجرم نہیں ہوتا لیکن جب اس پر جرم ثابت ہو جاتا ہے اور عدالت اسے سزا سنا دیتی ہے تو پھر وکیل کا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔"

"آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے' تو پھر بات ختم ہوئی۔ اللہ حافظ۔"

میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دوسری جانب وہ جلدی سے بولی "میں شازیہ رستم بات کر رہی ہوں۔"

"کون شازیہ رستم؟" بے اختیار میں نے پوچھا۔

"وہی جس کے شوہر کی قاتلہ کو آپ باعزت بری کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"اوہ! تو یہ آپ ہیں۔" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "مجھ سے کوئی غلط توقع مت رکھیے گا۔ میں اوّل آخر اپنے موکل کو انصاف دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ تیز لہجے میں بولی "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کی قاتلہ کو بچانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟"

"آپ کے سابق شوہر کے قتل میں ماخوذ ملزمہ عمرانہ!" میں نے تصحیح کی "آپ کے موجودہ شوہر تو رستم علی ہیں' جو کبھی "لودھی سوپ انڈسٹری" کے جنرل منیجر ہوا کرتے تھے!"

وہ بولی "چلیں یہی سمجھ لیں۔ اب میرے سوال کا جواب دیں۔"

"آپ کے سوال کا سیدھا اور سچا جواب یہ ہے کہ میں اپنے پیشے کے تقاضے نبھا رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پیشے کے تقاضے نبھا رہے ہیں یا تائیوان کی کمائی سمیٹ رہے ہیں؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

مجھے اس کی بات سن کر غصہ آگیا تاہم میں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا "آپ کے اس فضول سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اور اب میں فون بند کر رہا ہوں۔"

"بڑے شوق سے ریسیور رکھیں۔" وہ بے نیازی سے بولی "لیکن ایسا کرنے سے پہلے میری یہ بات نوٹ کر لیں کہ وہ منحوس عمرانہ میرے سابق شوہر کی قاتلہ ہے اور یہی صداقت ہے' یہی حقیقت ہے۔"

میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "خاتون! بات یہ ہے کہ قانون زبانی کلامی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ صداقت کو پرکھنے کا عدالت کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔"

"اور وہ طریقہ کیا ہے؟" اس کے سوال میں طنز کی آمیزش واضح محسوس ہو رہی تھی "کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے؟"

میں نے کہا "وہ طریقہ آپ کو عدالت کے کمرے میں معلوم ہو جائے گا۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ بات کو مزید بڑھاتی' میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

دوبارہ فون کی گھنٹی بجنے کی توقع کرتے ہوئے میں شازیہ

کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کا یوں فون کرنا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے اس کے شوہر رستم علی نے بھی مجھے گھر آنے کی دعوت دی تھی اور وہ کچھ حقائق میرے علم میں لانا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رستم علی نے کہا تھا' اگر میں اس سے ملاقات کے لیے وقت نہ نکال سکا تو وہ خود مجھ سے ملنے میرے دفتر آجائے گا لیکن ابھی تک اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ خدا جانے' یہ دونوں میاں بیوی مجھ سے کس قسم کی توقعات وابستہ کیے بیٹھے تھے یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ مجھے اپنی بے سروپا باتوں میں الجھا کر کیس سے میری توجہ ہٹانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر واقعی الجھ رہا تھا۔

جب میری توقع کے برخلاف کافی دیر تک فون کی گھنٹی نہیں بجی تو میں اس جوڑے کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا۔

○☆○

گواہوں کے کٹہرے میں مسز رستم خاموش کھڑی تھی!

تھوڑی دیر پہلے وہ معزز عدالت کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروا چکی تھی۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ پولیس کو بتایا تھا' وہی کچھ عدالت کو بھی بیان دیا تھا۔ وکیل استغاثہ نے واجبی سے سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی تو میں اپنے حصے کے کام کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر شازیہ والے کٹہرے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ مخالفانہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن خاموش تھی۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا "محترمہ! میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں۔ مسز رستم یا مسز شازیہ؟"

"آپ کوئی بھی نام استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔"

"شکریہ مسز شازیہ۔" میں نے کہا پھر پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا موجودہ شوہر رشتے میں آپ کا کزن ہوتا ہے۔"

"ہاں' یہ سچ ہے۔"

"آپ سے شادی سے پہلے وہ آپ کے سابق شوہر مقتول احسان لودھی کی فیکٹری میں جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا؟"

"جی ہاں' ایسا ہی تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے پوچھا "اور یہ ملازمت رستم علی کو آپ کی سفارش پر دی گئی تھی؟"

"وہ اس پوسٹ کا اہل تھا۔" وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی "کسی کی جائز سفارش کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ کیا آپ کو میرے ماضی کے اس عمل پر کوئی اعتراض ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" پھر میں نے اگلا سوال کیا "میکر رستم علی! کیا یہ سچ ہے کہ رستم علی کسی زمانے میں آپ کو پسند کرتا تھا اور آپ سے شادی کا خواہاں بھی تھا۔" ایک لمحے کو رک کر میں وضاحت کی "میرا مطلب ہے اس دور سے ہے جب مقتول احسان لودھی سے آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے مداخلت کی "وکیل صفائی خوا مخواہ معزز گواہ کی نجی زندگی زیر بحث لا رہے ہیں۔"

میں نے وکیل مخالف کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست! اگر گواہ میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہے تو میں اس کے لیے دباؤ نہیں ڈالوں گا۔"

وکیل استغاثہ نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بیزاری سے بولی "میں رستم علی کی' ماضی کی ایسی کسی خواہش سے واقف نہیں ہوں۔ اگر وہ دل میں ایسا خیال رکھتا تھا تو آپ کے سوال کا جواب بھی وہی دے گا۔"

"ٹھیک ہے' ان سے بھی پوچھ لیا جائے گا۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا "فی الحال آپ یہ بتائیں کہ آپ سے شادی سے پہلے رستم علی آپ کے گھر آتے جاتے تھے؟"

"سب ہی رشتے دار مجھ سے ملنے آتے رہتے ہیں۔"

"میں نے آپ کے کزن رستم علی کے بارے میں پوچھا ہے؟"

وہ بولی "اس کا تو ہمارے گھر سے دہرا تعلق تھا۔ ایک طرف وہ میرا کزن تھا تو دوسری جانب وہ میرے شوہر کا جنرل منیجر بھی تھا اس لیے رستم علی کی ہمارے گھر میں آمد و شد کوئی اچنبھے کی نہیں بلکہ عین ممکن قدرتی بات ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا وقوعہ کے روز بھی رستم علی آپ کے گھر میں موجود تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "وقوعہ کے وقت وہ گھر میں موجود نہیں تھا بلکہ بعد میں آیا تھا۔"

"اور وقوعہ کے وقت آپ بھی گھر پر نہیں تھیں؟"

"جی ہاں' میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔"

"کون سے رشتے دار؟"

"میری چھوٹی بہن اور اس کے سسرالی رشتے دار۔"



"وقوعہ کے روز آپ گھر سے فلم دیکھنے کے لیے کتنے بجے نکلی تھیں؟"

"تقریباً پانچ بجے۔"

"آپ کون سا شو دیکھنے کا ارادہ رکھتی تھیں؟"

"اس نے جواب دیا "فرسٹ شو۔ یعنی چھ سے نو والا۔"

"اس شو کی مناسبت سے آپ کچھ زیادہ ہی جلدی گھر سے نہیں نکل پڑی تھیں۔" میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا "مذکورہ شو غالباً ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"مجھے حیدری سے اپنی بہن اور اس کے سسرالی رشتے داروں کو بھی لینا تھا۔" شازیہ نے بتایا "اس لیے میں تھوڑا مارجن رکھ کر گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ وہ تو خیریت گزری کہ فلم کی پیشگی بکنگ کروالی گئی تھی ورنہ حیدری سے روانہ ہوتے ہوتے چھ بج چکے تھے۔ اگر ہمارے پاس ایڈوانس ٹکٹ موجود نہ ہوتے تو شاید ہمیں فلم دیکھے بغیر ہی واپس آنا پڑتا کیونکہ وہ فلم خاصا رش لے رہی تھی۔"

"مسز شازیہ!" میں نے استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "وقوعہ کے روز جب آپ فلم دیکھنے کی غرض سے گھر سے روانہ ہوئیں تو کیا اس وقت تک آپ کے سابق مقتول شوہر احسان لودھی گھر آچکے تھے؟"

"نہیں' وہ میرے جانے کے بعد آئے تھے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"پھر تو آپ نے ٹیلی فون والے لائن مین کو نہیں دیکھا ہو گا؟"

"میں نے اس کے بارے میں واپس آنے کے بعد سنا تھا۔"

میں نے پوچھا "آپ سینما ہاؤس سے کس وقت واپس آئی تھیں؟"

"نگ بھگ ساڑھے نو بجے۔"

"آپ کو احسان لودھی کے قتل کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تھا؟"

"شاید مجھے دوسری صبح تک اس سانحے کے بارے میں معلوم نہ ہوتا اگر رستم علی وہ سنسنی خیز اطلاع نہ لے کر آتا۔" شازیہ نے پُرخیال انداز میں کہا "رستم کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد ہی ہم نے بالائی منزل پر جا کر دیکھا تھا اور احسان کو بیڈ روم میں مردہ پایا تھا۔ اس کی گردن شہ رگ سے کٹی ہوئی تھی۔"

میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا "محترمہ شازیہ رستم! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ کا کزن کون سی سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا تھا؟"

"رستم علی نے بتایا تھا کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے عمرانہ کو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر افراتفری کے عالم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" شازیہ نے بتایا "رستم کا خیال تھا کہ بالائی منزل پر یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور بعد ازاں اس کا خیال درست ثابت ہوا۔"

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا "مسز رستم! جب آپ کے مقتول شوہر احسان لودھی نے عمرانہ سے شادی کی تو آپ کے احساسات کیا تھے؟"

"وہی ہو کسی عورت کے ہونے چاہئیں۔"

"یعنی آپ مقتول کے اس عمل سے خوش نہیں تھیں؟"

"کیا مجھے خوش ہونا چاہیے تھا؟" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

میں نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

وہ بیزار کن انداز میں بولی "پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟"

میں نے کہا "میں صرف آپ کے احساسات اور جذبات جاننا چاہتا تھا۔"

"تمام مشرقی عورتوں کے جذبات و احساسات ایک سے ہوتے ہیں۔" شازیہ نے کہا "لیکن مردوں کو ہمارے معاشرے میں دوسری شادی سے روکنا خاصا دشوار کام ہے۔ وہ اس نیک کام کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "دوسری شادی کے بعد مقتول کا آپ سے رویہ کیسا تھا؟"

"رویہ۔۔۔ اونہہ!"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ناخوشگواری کے تاثرات نمایاں نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "اسے اوپر والی سے فرصت ملتی تو مجھ سے کسی رویے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ اچھے یا برے رویے کا فیصلہ کرنا تو بعد کی بات ہے۔"

اوپر والی سے شازیہ کی مراد اس مقدمے کی ملزمہ اور میری موکلہ عمرانہ سے تھی کیونکہ اس کی رہائش بنگلے کی بالائی منزل پر تھی۔

میں نے اگلا سوال کیا "عمرانہ کا رویہ آپ سے کیسا تھا؟"

"معلوم نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

میں نے پوچھا "معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتیں؟"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" وہ بے پروائی سے بولی "میں صرف اتنا کہوں گی کہ ہمارے درمیان خوش گوار ماحول میں ایک مرتبہ بھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا "مسز رستم! دوسری شادی سے پہلے مقتول احسان لودھی آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے؟"

"آپ اس سلوک کو غیر انسانی تو نہیں کہہ سکتے تاہم اس کا رویہ میرے ساتھ محبت آمیز نہیں تھا۔" شازیہ نے جواب دیا "اور اس کی وجہ یہی ڈائن ملزمہ عمرانہ ہی تھی۔ جب سے اس منحوس نے احسان کو اپنے جال میں پھانسا تھا، وہ بدلے بدلے سے نظر آنے لگے تھے۔ پہلے اس آفت کی پرکالا نے مجھ سے میرا شوہر چھینا پھر اس کی زندگی چھین لی۔"

بات کے اختتام پر شازیہ کی آواز روہانسی ہوگئی تھی اور وہ کٹہرے کی ریلنگ کو پکڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی تھی۔ وہ جذبات کے ریلے سے باہر نکلی تو میں نے اپنی جرح کے اختتام کا اعلان کردیا۔ شازیہ خاموشی سے گردن جھکا کر عدالت کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

استغاثہ کا آخری گواہ شازیہ کا شوہر رستم علی تھا۔

اپنی باری پر میں آگے بڑھا اور سوالات کا آغاز کیا۔

"رستم صاحب، کیا آپ پہلوانی بھی کرتے ہیں؟"

"نہیں جناب، مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"اوہ!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور کہا "میں سمجھا تھا، جیسے رستم زماں، رستم ہند، رستم پاکستان وغیرہ ہوا کرتے تھے اسی طرح آپ بھی....."

وہ میری بات کاٹ کر اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"افسوس کہ میں آپ کی سمجھ میں نہیں آسکا۔"

"مجھے بھی ایک بات کا افسوس ہے رستم صاحب!" میں نے تفریحی انداز میں کہا "ہزار کوشش کے باوجود بھی آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ شاید آپ کوئی سنسنی خیز انکشافات کرنا چاہتے تھے مگر ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع نہ میسر آسکا۔ کیا آپ معزز عدالت کے سامنے ان حقائق سے پردہ اٹھا سکتے ہیں؟"

"اب وقت گزر چکا ہے۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"مقتول کی بیوہ شازیہ سے شادی کرنے سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے؟"

"گولی مارمیں۔"

"شازیہ کا میکا بھی وہیں ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا "اگر اس سوال کا تعلق میرے اور شازیہ کے ماضی سے ہے تو میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی جواب دوں کہ ہاں، میں کسی زمانے میں شازیہ کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا بھی خواہاں تھا لیکن بدقسمتی سے اس کی شادی احسان لودھی سے ہوگئی۔"

"کیا آپ کو ٹیلی پیتھی بھی آتی ہے؟"

"نہیں تو!" وہ چونکا۔

میں نے کہا "میں واقعی یہی سوال پوچھنے والا تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "خیر، آپ کی وہ بدقسمتی اب خوش قسمتی میں بدل چکی ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ "رستم صاحب! آپ شازیہ کے کزن اور "لودھی سوپ انڈسٹری" کے جنرل منیجر ہونے کے ناتے اکثر و بیشتر ان کے بنگلے پر جاتے رہتے تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں، یہ بالکل صحیح ہے۔"

میں نے کہا "مجھے علم ہوا چلا ہے کہ میری موکلہ سے شادی سے کچھ عرصے قبل مقتول کا اپنی بیوی شازیہ سے رویہ خاصا بدل گیا تھا اور عمرانہ سے شادی کے بعد تو ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔ کیا آپ کو اپنی کزن کے ان حالات پر افسوس نہیں ہوتا تھا۔"

"جناب، یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے واقعی شازیہ سے بہت ہمدردی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے ناموافق حالات تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ صرف میری کزن ہی نہیں بلکہ ماضی کی محبت بھی تھی۔"

"چنانچہ احسان لودھی کے قتل کے بعد آپ نے اپنی دیرینہ محبت کو بکھرنے سے بچالیا اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی خاطر آپ نے فوراً اس سے شادی کرلی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے اس عمل پر فخر ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا "مشکل وقت میں کسی کے کام آنا اور گرتوں کو تھام لینا انسانیت کی معراج ہے۔"

میں نے سوال کیا "رستم صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ میری موکلہ کے فرار کی اطلاع آپ ہی نے شازیہ تک پہنچائی

تھی؟"

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

"آپ نے میری موکلہ کو کہاں سے اور کہاں فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر نارتھ سے ساؤتھ کی طرف جا رہی تھی۔"

"آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ نارتھ سے ساؤتھ کی طرف سفر کرے گی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "میں نے ٹیکسی کے رخ کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کیا تھا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا تھا۔ ملزمہ سیدھی اپنی ماں کے پاس اختر کالونی پہنچی تھی۔"

میں نے کہا "میری موکلہ جب ٹیکسی میں سوار ہو رہی تھی تو آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی؟"

"اس کی اضطراری حرکات و سکنات سے۔"

"وہ کس جگہ سے ٹیکسی میں بیٹھی تھی؟"

"اپنے بنگلے سے چند گز دور مین روڈ سے۔" رستم نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "آپ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں اپنی گاڑی میں احسان صاحب سے ملنے آ رہا تھا۔" اس نے بتایا "مجھے ایک ضروری چیک پر دستخط کروانا تھے۔"

"آپ کو کچھ یاد ہے' اس وقت رات کا کیا بجا تھا؟"

ایک لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا "میرے اندازے کے مطابق وہ ساڑھے نو اور دس بجے کا کوئی درمیانی وقت تھا۔"

"مجھے اور کوئی سوال نہیں کرنا جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! استغاثہ کے گواہ بھگت چکے۔ اب آئندہ پیشی پر میں ملزمہ پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے اس سلسلے میں مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب عالی!"

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

○☆○

کہتے ہیں' جن لوگوں کا مشاہدہ طاقت ور ہوتا ہے' ان کی آنکھ معمولی سے معمولی منظر کو بھی اپنی تہلی میں محفوظ کر لیتی ہے۔ میں اپنے مشاہدے کے بارے میں کوئی دعویٰ تو نہیں کروں گا تاہم مجھے اپنی اس صلاحیت پر ناز ہے۔

آئندہ پیشی میں ابھی چار روز باقی تھے۔ میں ایک ضروری کام سے میٹرو ول گیا۔ واپسی میں سائٹ کے علاقے سے گزرنا ہوا۔ ایک روڈ پر ٹریفک جام تھا۔ کسی بڑے ٹرالر کے پھنس جانے کی وجہ سے ٹریفک میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں اس لیے جب تک میرے آگے والی ویگن نہ چلتی' میں اپنی گاڑی کو روکے رکھنے پر مجبور تھا۔ میں راستہ کھلنے کے انتظار میں گردوخواح کا جائزہ لینے لگا پھر میری نگاہ ایک بورڈ پر جم کر رہ گئی۔

اس سڑک کے دائیں بائیں چھوٹی بڑی فیکٹریاں تھیں جس بورڈ نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی اس پر مجھے "ودھی سوپ انڈسٹری" کے الفاظ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ابھی میں اس فیکٹری کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔

فیکٹری کا گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک موٹر سائیکل سوار شخص برآمد ہوا۔ میں چونکہ فیکٹری کے گیٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے موٹر سائیکل سوار کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال تھی اور اس کے بائیں گال پر زخم کے نمایاں نشان نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ زخم کا وہ نشان کم و بیش ڈھائی انچ کا تھا۔

اگر وہ شخص "ودھی سوپ انڈسٹری" کے علاوہ مجھے اور کہیں ملا ہوتا تو ممکن تھا' میں اس پر اتنی توجہ نہ دیتا۔ اس وقت چونکہ میں فیکٹری کا بورڈ دیکھ کر اپنے زیر سماعت کیس کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور اس مقدمے کے ایک ایک کردار کی تصویر میرے ذہن میں گھومنے لگی تھی اس لیے اس شخص کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال اس ٹیلی فون لائن مین کے بارے میں ابھرا تھا۔ عمرانہ نے اس کی واضح نشانی گال کا یہی زخم بتائی تھی۔

اسی وقت ٹریفک آگے بڑھنے لگا۔ میں نے کسی طرح اپنی گاڑی ایک سائیڈ میں نکالی اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس موٹر سائیکل سوار کا تعاقب کرنے لگا۔ میرے اندر اس وقت تجسس کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اگر اس موٹر سائیکل سوار کا تعلق رستم علی سے تھا اور اسی نے ٹیلی لائن مین کا کردار ادا کیا تھا تو پھر رستم علی بالواسطہ یا بلاواسطہ احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہو سکتا تھا کیونکہ آج کل فیکٹری کا انتظام انصرام اسی کے ہاتھ میں تھا۔



میں نے اس شخص کو تعاقب کا احساس نہیں ہونے دیا اور محتاط ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاک کالونی میں اس کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے اس علاقے کے دو چار دکان داروں سے بھی اس شخص کے بارے میں دریافت کیا پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے اس کا نام عارفی معلوم ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بے فاش کا انسان تھا۔

اس قسم کی معلومات سے میرے تجسس کو اور ہوا ملی۔ میں نے عارفی کا ٹھکانا جزئیات کے ساتھ ذہن میں نقش کیا اور اسی وقت واپس آ کر اپنے دفتر سے سلمان کو فون کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد سلمان میرے دفتر میں موجود تھا۔

میں نے سلمان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا پھر کہا۔ "مجھے عارفی نامی اس شخص کی چند تصویریں چاہئیں لیکن کلوز اپ میں۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "شام کے ایک اخبار کا فوٹو گرافر میرا جگری یار ہے۔ وہ میرے لیے یہ کام کر سکتا ہے۔"

"فوٹو گرافر۔ اور وہ بھی شام کے اخبار کا۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میں ایک خاص وقت تک اس معاملے کی کسی کو بھی نہیں لگنے دینا چاہتا۔"

سلمان نے کہا "آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! میں اس بات کا خاص خیال رکھوں گا۔ یہ راز ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ اپنے دوست نواز دانش سے میں یہ کام کس طرح لوں گا' اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں یہ کام ہو جائے گا۔ میں ابھی جا کر نواز سے ملتا ہوں۔"

میں نے سلمان کو عارفی کے ٹھکانے کا پتا اچھی طرح سمجھانے کے بعد رخصت کر دیا۔ احتیاطاً میں نے اسے وہ ایڈریس ایک پرچے پر لکھ کر بھی دے دیا تھا۔

دو روز بعد سلمان میرے دفتر میں آیا اور ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "لیں بیگ صاحب' آپ کا کام ہو گیا۔ چیک کر لیں۔"

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے کے اندر پوسٹ کارڈ سائز کی چھ تصویریں موجود تھیں۔ وہ سب عارفی نامی اس شخص کے کلوز اپ تھے۔

"ونڈر فل۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "کیا تمہارا فوٹو گرافر دوست کسی شک میں مبتلا تو نہیں ہوا؟" میں نے سلمان سے پوچھا۔

"بالکل نہیں جناب۔" وہ مطمئن انداز میں بولا۔

دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں سلمان کے ساتھ عمرانہ کے گھر اختر کالونی پہنچ گیا اور وہ تمام تصویریں عمرانہ کے سامنے رکھ دیں۔ وہ ان تصویروں کو دیکھتے ہی چونک اٹھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک واضح طور پر دیکھی تھی۔

وہ جذبات سے لب ریز لہجے میں بولی "یہ اسی شخص کی تصویریں ہیں جو دو قدم کے روز ٹیلی فون لائن مین بن کر بنگلے پر پہنچا تھا۔ اسی کی وجہ سے احسان کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی اور ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔"

میں نے وہ تمام تصویریں سمیٹ کر لفافے میں ڈالیں اور لفافہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں مکمل رازداری برتنے کی ضرورت ہے۔" میں بہ یک وقت سلمان' عمرانہ اور صبیحہ خاتون سے مخاطب تھا۔

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے ہونٹ سی لیں گے۔ میں مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اتفاق سے ایک نہایت ہی اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

○☆○

آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ نے میری موکلہ پر بھرپور جرح کی۔

عمرانہ' وکیل استغاثہ کے نکیلے' ترش اور کٹیلے سوالات کے سامنے پامردی سے ڈٹی رہی۔ وہ اپنے موقف سے ایک سُوت بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹی تھی۔ اس نے عدالت میں وہی بیان دیا تھا جو اس سے پہلے وہ مجھے تفصیلاً بتا چکی تھی۔ اس سے ملتا جلتا بیان اس نے تین سال قبل پولیس کو بھی دیا تھا۔

وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "بیگ صاحب! آپ نے صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل نہیں کی۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں اپنے دلائل ہی سے اپنی موکلہ عمرانہ کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں' میں صفائی کے گواہوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم معزز عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔"

"کیسی درخواست بیگ صاحب!"

میں نے کہا "میں یہ چاہتا ہوں کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ

کے گواہان مسمی ملک قدیر اور مسمی افتخار احمد کو دوبارہ یہاں بلایا جائے۔ میں ان دونوں حضرات سے مشترکہ طور پر کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا "ان گواہوں پر وکیلِ صفائی اپنی جرح مکمل کر چکے ہیں۔"

"میں نے اس بات سے کب انکار کیا ہے۔" میں نے وکیل مخالف کو گھورتے ہوئے کہا "کیا انہیں دوبارہ بلانے میں کوئی قباحت ہے یا یہ عمل قانون کے خلاف ہے؟"

وکیلِ استغاثہ میرے اس وار سے بوکھلا گیا۔ جج نے اس سے پوچھا "وکیل صاحب! آپ متردد کیوں ہیں؟"

وہ بولا "آخر وکیل صفائی کرنا کیا چاہتے ہیں؟" اس کے انداز میں جھنجلاہٹ شامل تھی۔

میں نے کہا "یہ تو اسی وقت پتا چلے گا جب میں کچھ کروں گا۔"

"جج نے مجھ سے پوچھا "بیگ صاحب! آپ کے ذہن میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "جناب عالی! میں استغاثہ کے ان دونوں گواہان کو ایک ٹرائل سے گزارنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا ٹرائل؟"

"میں معذرت خواہ ہوں جناب عالی!" میں نے مودبانہ لہجے میں کہا "قبل از وقت اس ٹرائل کا ذکر مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے زیر سماعت کیس متاثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جج میری تجویز نما درخواست میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے اثبات میں سر ہلاتا رہا پھر اس نے وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ آئندہ پیشی پر وہ دونوں مطلوبہ افراد کو عدالت میں حاضر کرے۔

وکیلِ استغاثہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ اگر وہ اس وقت عدالت کے کمرے میں نہ ہوتا تو مجھے خوب کھری کھری سناتا۔

جج نے پانچ روز بعد کی تاریخ دینا چاہی لیکن وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کی "یور آنر! پانچ دن بہت کم ہیں۔ گواہان سے رابطہ کرنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔ انہی دنوں ہائی کورٹ میں میرا ایک اہم کیس بھی چل رہا ہے۔"

جج نے وکیل استغاثہ کی پرابلم کو مدنظر رکھتے ہوئے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

○☆○

منظر اسی عدالت کا تھا اور میں اپنی موکلہ کی بے گناہی کے سلسلے میں بھرپور دلائل کا آغاز کرنے والا تھا۔ میرے مطلوبہ افراد یعنی ملک قدیر اور مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ آج عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ کیس اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دلائل دینا شروع کیے۔ "جناب عالی! استغاثہ میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ میری موکلہ اپنے عمر رسیدہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے آشنا فاروق نامی ایک نوجوان کے توسط سے مقتول احسان لودھی کو ٹھکانے لگا دیا۔

"جناب عالی! یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ پولیس تاحال اس فرضی آشنا کا سراغ نہیں لگا سکی اور لگا بھی کیسے سکتی ہے۔ استغاثہ کا دعویٰ من گھڑت اور مبنی بر دروغ ہے۔ میں آگے چل کر اپنی اس بات کو دلائل سے ثابت کروں گا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "جناب عالی! استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ میری موکلہ چوری چھپے اپنے آشنا سے ملتی رہتی تھی اور شادی شدہ ہونے کے ناتے اس کی یہ حرکت بے وفائی کے زمرے میں آتی ہے۔ جناب عالی! استغاثہ کی یہ بات سراسر کھوکھلی اور بے بنیاد ہے اور استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اس کی تردید کرتے ہیں۔ چھ میں سے صرف چار گواہوں نے میری موکلہ کے فرضی آشنا کو دیکھا تھا اور وہ بھی صرف ایک بار۔ نہ اس سے پہلے کبھی ان کا اس شخص سے واسطہ رہا اور نہ ہی بعد میں کبھی اس کی صورت نظر آئی۔ ان چار گواہوں میں مولانا امیر الدین، ملک قدیر، طارق محمود اور مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد شامل ہیں۔ ان چاروں کے کے بیانات اور جرح کے سلسلے میں دیے گئے جوابات معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں جس سے میری دلیل کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

"جناب عالی! میری موکلہ بے قصور ہے اور اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔"

وکیلِ استغاثہ بیچ میں بول پڑا "ملزمہ سے ایسی دشمنی کون کر سکتا ہے؟"

"اس سوال کا جواب اصولاً تو آپ کو تلاش کرنا چاہیے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "لیکن میرے فاضل

دوست، آپ نے مجھ سے پوچھا ہے تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا مگر اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے دلائل کا دھارا اسی رخ پر آگے بڑھ رہا ہے۔"

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "جناب عالی! میری موکلہ بے گناہ ہے۔ استغاثہ کے معزز گواہ طارق محمود کے بیان کے مطابق وہ مضبوط کردار کی مالک ایک انتہائی ملنسار اور شائستہ خاتون ہے۔ جناب عالی! یہ ایک پڑوسی کی دوسرے پڑوسی کے بارے میں رائے ہے اور پڑوسیوں کی رائے بہت اہم ہوا کرتی ہے۔ میری موکلہ سے منسوب کرکے استغاثہ میں جو نام نہاد عشقیہ خط شامل کیا گیا ہے وہ سراسر بوگس اور بے معنی ہے بلکہ میں اسے اپنی موکلہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔

"جناب عالی! استغاثہ کے گواہان کے بیانات کو اگر فلٹر کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وقوعہ کے روز جو نوجوان معقول کے بنگلے میں داخل ہوا تھا اس کا تعلق ٹیلی فون کے محکمے سے نہیں تھا جس کا واضح مطلب یہی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہاں بھیجا گیا تھا تاکہ میری موکلہ اپنے شوہر کی نظر میں مشکوک ہوجائے اور ایسا ہوا بھی۔ چھ بجے سے رات نو بجے تک وقفے وقفے سے میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہا۔ اس دوران میں معقول نے ایک مرتبہ میری موکلہ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ بالآخر وہ ناراض ہو کر گھر سے نکلی اور اپنی ماں کے پاس آگئی۔ گواہوں کے بیانات سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ وہ اجنبی اور پُراسرار نوجوان کم و بیش ساڑھے پانچ بجے وہاں آیا اور لگ بھگ چھ بجے واپس چلا گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر میری موکلہ کو اس کے ساتھ کس طرح ملوث کیا جاسکتا ہے؟"

میں نے ایک لمحے کو رک کر سانس درست کی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے دلائل جاری رکھے "جناب عالی! اب میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی جانب معزز عدالت کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ مقتول کی موت رات نو اور دس بجے کے دوران میں واقع ہوئی تھی جبکہ میری موکلہ ٹھیک نو بجے گھر سے نکل گئی تھی۔ علاوہ ازیں کیمیائی تجزیے کی رپورٹ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مقتول کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا کیونکہ اس نے خواب آور گولیوں کی بھاری مقدار استعمال کرلی تھی۔ مقتول کی خواب گاہ سے "ویلیم ٹین" کی استعمال شدہ شیشی بھی برآمد ہوئی تھی۔ مقتول نے میری موکلہ کے رخصت ہونے کے بعد یقیناً خواب آور گولیاں نگلی ہوں گی اور بعد ازاں بے ہوشی کی حالت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پولیس ہنوز آلۂ قتل تلاش کرنے میں بھی ناکامیاب رہی ہے جیسا کہ میری موکلہ کے فرضی عاشق کو تلاش کرنے میں۔

"جناب عالی! ان حالات و واقعات اور حقائق و شواہد کی روشنی میں معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری موکلہ کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور آنر۔"

"اور انہیں کس مقصد کے لیے بلایا گیا ہے؟" وکیل استغاثہ نے عدالت میں موجود ملک قدیر اور افتخار احمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

اپنے دلائل کے دوران میں، میں نے کئی مرتبہ وکیل استغاثہ کو متذکرہ افراد کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا اور اب تو اس کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا تھا۔

جج نے بھی تشویش ناک لہجے میں پوچھا "بیک صاحب! غالباً آپ کوئی ٹرائل کرنا چاہتے تھے!"

"ٹرائل ہوگا اور ضرور ہوگا جناب۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ بولا "اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ اس شخص کی نشان دہی کریں گے جس نے آپ کی موکلہ کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا تھا۔ کیا آپ اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں میرے فاضل دوست۔" میں نے انگشت شہادت کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا "جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے استغاثہ کے گواہان ملک قدیر اور افتخار احمد کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔"

جج نے اجازت مرحمت فرمادی۔

میرے مطلوبہ افراد کٹہرے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے تھوڑی دیر تک انہیں خاموشی سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس دوران میں عدالت کا کمرا کامل سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے پہلے ملک قدیر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "ملک صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ آپ پر جرح کے دوران میں آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی یادداشت بڑی غضب کی ہے۔ آپ نے اپنی یادداشت کے لیے ایک مخصوص لفظ "ایکسیلنٹ" بھی استعمال کیا تھا۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ پُراسرار نوجوان آپ کو دوبارہ نظر آجائے تو آپ اسے پہچان لیں گے؟"



"میں اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"ویری گڈ۔" میں نے مختصر تبصرہ کیا پھر افتخار احمد کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"مسٹر افتخار! تم نے بھی بڑے وثوق سے کہا تھا کہ اگر کبھی دوبارہ کہیں وہ لائن مین نظر آجائے تو تم اسے پہچان لو گے بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور معزز عدالت کے ریکارڈ پر بھی یہ ثبوت موجود ہے کہ تم نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس کی صورت میرے ذہن میں نقش ہے۔ تم نے یہی کہا تھا نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "جی ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔"

میں نے اپنی فائل میں سے عارنی کی تصویروں والا لفافہ برآمد کیا اور اسے کھول کر ایک ایک تصویر کٹہرے میں کھڑے ہوئے دونوں گواہان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ان تصویروں کو دیکھ کر کچھ یاد آرہا ہے؟"

ملک قدیر نے ایک بھرپور نظر عارنی کی تصویر پر ڈالی اور پھر سانس خارج کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں بولا "یہ اسی نوجوان کی تصویر ہے وکیل صاحب۔"

"شور؟"

"یس۔"

"کانفیڈنٹ؟"

"ہنڈرڈ پرسنٹ۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظر سے افتخار احمد کو دیکھا۔ وہ جوشیلے انداز میں گویا ہوا "میں اس شکل کو نہیں بھول سکتا۔ یہ وہی لائن مین ہے۔"

میں نے ایک تصویر جج کی جانب بڑھادی۔ وکیل استغاثہ نے اپنے گواہوں کے نزدیک سرک گیا تھا اور جھانک کر اس نے دونوں تصویریں ملاحظہ کرلی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دونوں تصویریں واپس لے لیں۔

وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا "یہ سراسر دھوکا ہے۔ اگر وکیل صفائی کو مبینہ ٹیلی فون لائن مین کی اصلیت معلوم تھی تو اپنی بات کو صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا؟"

میں نے تصحیح کی "مبینہ ٹیلی فون لائن مین نہیں میرے دوست بلکہ آپ کے دعوے کے مطابق میری موکلہ کا آشنا!"

وہ جل کٹ کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

جج نے مجھ سے پوچھا "بیک صاحب! یہ شخص کون ہے؟"

"اس کا نام عارنی ہے یور آنر۔"

"کیا آپ اسے پہلے سے جانتے تھے؟"

"ناٹ ایٹ آل یور آنر۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "چند روز قبل ہی اس کا 'دیدار' ہوا ہے۔"

"یہ اس وقت کہاں ہے؟" پولیس کا نمائندہ، انکوائری افسر بے تابی سے بولا "ہم اسے تین سال سے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

میں نے متحمل لہجے میں کہا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ عارنی اس وقت کہاں پایا جائے گا لیکن میں آپ کو اس کے ٹھکانے کا پتا بتا سکتا ہوں وہ بھی اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو!"

انکوائری افسر نے خوشامدانہ نظر سے جج کو دیکھا۔ جج وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟"


کیا آپ مقبول سنگر بننا چاہتے ہیں؟

موسیقی کا شوق رکھنے والوں کے لئے ایک زبردست پیشکش

☆ ہمارے ایسے کرم فرما جو موسیقی کا شوق رکھتے ہیں اور اپنے ٹیلنٹ کو لوگوں کے سامنے لانا چاہتے ہیں تو اپنے گانوں کی آڈیو اور ویڈیو ہم سے بنوائیں۔ ☆ کم بجٹ میں معیاری کام این جے آڈیو کریشن کا وعدہ۔ ایک بااعتماد ادارہ، آپ کی خدمت میں ہمہ تن مصروف۔ ☆ ریلیز نگ اسٹیشن، ریڈیو، پی ٹی وی اور بیرون ممالک میں آپ کا راہلہ نہایت آسانی سے ممکن۔

این جے انٹرپرائزز

آج ہی رابطہ کریں 4315060

"مجھے تو یہ سب کچھ ایک ناٹک لگ رہا ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "آزمائش شرط ہے۔ ناٹک اور حقیقت کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔"

جج نے اسی وقت عارفی کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کردیے اور اس کی ایک تصویر انکوائری افسر کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا "اس شخص کو فوری طور پر گرفتار کرکے شامل تفتیش کیا جائے۔"

انکوائری افسر نے وہ تصویر لینے کے بعد امداد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی نظر میں پوشیدہ ضرورت کو سمجھ گیا اور میں نے ایک پرچے پر عارفی کا مفصل ایڈریس لکھ کر اسے تھمادیا۔

○☆○

پولیس نے غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چھاپا مار کر عارفی کو اس کے ٹھکانے سے گرفتار کرلیا۔ جب کوئی پراپر آدمی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر وہ حقیقت کی تہ میں پہنچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔ پولیس کی تحویل میں عارفی نے اچھی خاصی "خاطر مدارات" کروانے کے بعد جو اقبالی بیان دیا وہ خاصا ہولناک اور سنسنی خیز تھا۔

اس کے بیان کے مطابق احسان لودھی کو اس نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ میاں بیوی کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے رستم علی نے اسے وہاں بھجوایا تھا' عارفی کی نشان دہی پر رستم کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور پولیس کی "مہمان نوازی" میں ایک ہی رات میں اس کے "مزاج" ٹھکانے آگئے۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا اس لیے پولیس کے "بٹن" دبانے پر وہ کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔

رستم اپنی محبت یعنی شازیہ کو کھو کر بہت اداس تھا چنانچہ اس نے شازیہ کے قریب رہنے کے لیے "لودھی سوپ انڈسٹری" میں ملازمت کرلی۔ شازیہ واقعی اس کی والہانہ محبت سے واقف نہیں تھی کیونکہ اس نے کبھی کھل کر اپنے جذبات کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔

پھر جب احسان لودھی نے شازیہ کو نظر انداز کرکے عمرانہ میں دلچسپی لینا شروع کی اور بعد ازاں اس سے شادی کرکے شازیہ کو بالکل ہی بھلا بیٹھا تو رستم کی ہمدردانہ اور پر خلوص باتوں نے شازیہ کو اس کی جانب مائل کردیا پھر یہ قربت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ دونوں نے باہمی مشاورت سے احسان لودھی اور عمرانہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کا منصوبہ بنالیا۔ منصوبے کے پہلے حصے میں وہ صرف میاں بیوی کے درمیان شک کا بیج بونا چاہتے تھے لیکن پہلے ہی مرحلے پر ان کا کام آسان ہوگیا۔ رستم کی شان دار پلاننگ کا شکار ہو کر احسان لودھی اپنی جان سے گیا اور عمرانہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔ عمرانہ کے روٹھ کر اختر کالونی چلے جانے کے بعد احسان لودھی نے متعدد خواب آور گولیاں نگل لی تھیں اور بے ہوشی کی حالت میں رستم نے اس کا کام تمام کردیا۔ فرضی محبت نامہ شازیہ کے ذہن کی پیداوار تھا۔

بعد ازاں پولیس نے بنگلے کی تفصیلی تلاشی کے بعد پانی کے ایک غیر استعمال شدہ ٹینک سے قصابوں والی وہ چھری بھی برآمد کرلی جس سے رستم نے اپنے محسن احسان لودھی کا گلا کاٹا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکلہ کو باعزت بری کردیا۔

عارفی چونکہ وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا اس لیے عدالت نے اسے رہا کردیا۔ سیشن کورٹ نے پی پی سی کی دفعہ تین سو دو کے تحت رستم علی کو سزائے موت سنادی اور شازیہ کو اس کی شریک جرم ہونے کی حیثیت سے ایک طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا۔

جہاں اس پورے کیس میں دلچسپی کے بہت سے پہلو موجود ہیں وہیں عقل مندوں کے لیے عبرت کا سامان بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ سلمان نے عمرانہ سے محبت کی لیکن دولت نے سلمان کی محبت کو شکست دے دی اور عمرانہ کی شادی ایک دولت مند کے ساتھ ہوگئی۔ دوسری جانب رستم بھی خاموشی سے شازیہ کو چاہتا تھا لیکن وہ اسے حاصل نہ کرسکا۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا اور قدرت نے دونوں عشاق کو اپنی اپنی محبت حاصل کرنے کا ایک موقع فراہم کردیا۔ سلمان نے مثبت راہ اختیار کی اور عمرانہ اس کی کوششوں سے باعزت بری ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کی بن گئی لیکن رستم نے شازیہ کو پانے کے لیے غلط راہ کو چنا اور اس کا انجام کتنا بھیانک ہوا۔ حالانکہ وہ شازیہ کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مقتول احسان لودھی کی تمام دولت و جائیداد پر بھی تصرف حاصل کرچکا تھا۔

بری نیت پر مبنی کوئی تدبیر جب الٹتی ہے تو سب کچھ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔

ہاں' یاد آیا۔ عمرانہ اور سلمان کی شادی کا دعوت نامہ بھی مجھے موصول ہوا تھا لیکن میں ان کی شادی میں شرکت نہ کرسکا کیونکہ ان دنوں میں سالانہ عدالتی چھٹیوں کے دوران میں اسٹینس گیا ہوا تھا۔

(تحریر: حسام بلوچ)



نیویارک سٹی سے ٹورنٹو جانے والی فلائٹ کی پرواز ہموار ہو چکی تھی۔ مخصوص "بنگ ٹانگ" کی آواز کے ساتھ نشستوں پر روشن نظر آتے ہوئے نو اسموکنگ کے حروف بجھ چکے تھے اور چالیس منٹ کی اس مختصر سی پرواز کے لیے ہلکی نوالچ کے سامان سے لدی ہوئی ٹرالیاں گردش میں آچکی تھیں۔

بنٹنگ اپنی سیٹ پر بیٹھا نشستوں کے درمیان واقع راہداری میں ہونے والی اس اشتہا انگیز ہلچل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے برابر میں کھڑکی سے متصل نشست پر سرمئی بالوں والا ایک دراز قد شخص براجمان تھا۔ آگے سے اڑے ہوئے بال اور چہرے پر ظاہری کشتوں سے وہ ادھیڑ عمری کی منزل طے کرکے تقریباً بڑھاپے میں قدم رکھتا نظر آرہا تھا۔ تاہم اپنے کسرتی جسم اور رکھ رکھاؤ سے اس کی عمر کے بارے میں کوئی حتمی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔

بنٹنگ کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا اور وہ خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی مصروفیت میں گم تھا۔ یوں ہی نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنے برابر میں بیٹھے اس دراز قد شخص پر ڈالی تھی اور پھر اپنی مصروفیت میں مگن ہو گیا تھا۔ بنٹنگ کو احساس نہیں تھا کہ اس کا پڑوسی اس پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔

مغرب سے درآمدہ غیر مشروط انجام کی اچھوتی داستان

جعفر رضا

# بلائے جاں

مسافر وسیلۂ ظفر تو کتنے ہیں مگر اس کے لیے وہ سفر وسیلہ ظفر بن گیا۔ ایک معصوم مسافر کی کتھا جو جہاز کے سفر کے تھوں کھولنا بیٹھ پر مجبور ہوا۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہونے پر یقین رکھنے والوں کی کہانی۔

"میرا خیال ہے کہ تم میری اس انگوٹھی میں دلچسپی لے رہے ہو۔" اچانک اس شخص نے بشنگ کو مخاطب کیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دونوں کافی دیر سے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف رہے ہوں اور ایک دوسرے سے بخوبی واقفیت حاصل کرچکے ہوں "واقعی یہ فوراً اپنی طرف توجہ مبذول کرالیتی ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟"

بشنگ نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا....؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ تم میری اس انگوٹھی میں دلچسپی لے رہے ہو۔" اس نے اپنا سیدھا ہاتھ بشنگ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا جس کی درمیانی انگلی میں اس نے شمد کی مکھی جیسی ساخت کی ایک عجیب سی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ انگوٹھی بنانے والے نے بڑی محنت سے اس مکھی کی تمام جزئیات اس چھوٹی سی انگوٹھی میں بھی ابھار دی تھیں "مگر یہ مجھے بہت عزیز ہے اور میں اسے کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کروں گا۔"

بشنگ نے عدم توجہی سے اس کی بات سنی اور "اچھی ہے" کا دو لفظی تبصرہ کرکے اگلی سیٹ میں نصب پاکٹ سے ایک اخبار نکال کر اس کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔ اخبار کی سب سے اہم خبر کینیڈا اور البانیہ کے درمیان، جزیرہ ایڈریانک پر قبضے سے متعلق تھی۔ البانیہ کا کہنا تھا کہ اس پر کینیڈا نے غاصبانہ قبضہ جمار کھا ہے جسے وہ ہر قیمت پر واگزار کرالیں گے۔ کینیڈا کا کہنا تھا کہ وہ جزیرہ ایڈریانک پر سے اپنا قبضہ قطعاً ختم نہیں کریں گے اور انہوں نے دھمکی دی تھی کہ وہ جزیرے کے اطراف میں موجود شاہی بحریہ کے بیڑے کی تعداد اور استعداد کار میں مزید اضافہ کردیں گے۔ بشنگ نے عدم دلچسپی سے خبر پڑھی اور پھر اشتہار دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے کوئی انگوٹھی نہیں پہن رکھی۔" اس شخص نے بشنگ کی عدم توجہی پر کوئی توجہ دیے بغیر اسے مخاطب کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"نہیں۔" اس بار بشنگ نے بغیر سر اٹھائے مختصر سا جواب دیا اور اپنے مشغلے میں مصروف ہوگیا۔

"ویسے یہ مردانہ انگوٹھی نہیں ہے۔" وہ شخص بشنگ کی تمام تر بے رخی بلکہ بے زاری کے باوجود اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششوں میں لگا رہا "اور عورتیں بھی شاید اسے شوق سے نہیں پہنیں گی۔ میرا خیال ہے کہ تیری جنس اسے بصد شوق پہنے گی۔ کیونکہ انہیں منفرد نظر آنے کا بہت ارمان ہوتا ہے اور یہ انگوٹھی بے حد انفرادیت کی حامل ہے۔"

اس بار بشنگ نے کوئی لفظ منہ سے ادا کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔ اس کی پوری توجہ ہاتھ میں تھامے رسالے پر مرکوز تھی۔

بشنگ کی بے رغبتی اور بیزاری سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ انگوٹھی اور ممکن ہے انگوٹھی پہننے والوں سے ہی نفرت کرتا ہے یہ سوچ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔ "فوج کے بہت سے سپاہی بھی انگوٹھی پہننا پسند کرتے ہیں۔ اب تم محض اس بنا پر کہ وہ انگوٹھی پہنتے ہیں، تمام امریکا کے سپاہیوں کو تو برطرف نہیں کرسکتے۔"

بشنگ نے اس کی بک بک سے اکتا کر میگزین کو بند کردیا۔ نور نو پہنچنے میں ابھی کافی وقت تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نیم پڑھے لکھے یہ یک طرفہ بکواس اسی طرح جاری رہی تو وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کے سر میں درد ہوجائے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اسے دو چار کھری کھری سنا کر چپ ہونے پر مجبور کردے گا۔ اسی خیال کے تحت اس نے آخری جملے سے اپنی گفتگو کی ابتدا کی۔

"تو تمہارا تعلق فوج سے ہے؟"

"اس فوج سے نہیں جو وردی میں ملبوس، دفاعِ وطن کے لیے ہمہ وقت چوکس رہتی ہے!"

"تو پھر....؟"

"تمہارا کیا خیال ہے...." اس شخص نے قدرے جھک کر رازدارانہ انداز میں پوچھا "فوجی صرف وہی ہوتے ہیں۔ جو وردیوں میں ملبوس ہوتے ہیں، دراز قد، چوڑی چھاتی، چھوٹے بال اور چہرے پر رعب داب....؟"

بشنگ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اس کی بات کی گہرائی کو سمجھنا چاہ رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر اس شخص نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

"نہیں۔ نوجوان! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ فوجیوں اور وطن کے لیے جان نچھاور کرنے والوں کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور بشنگ کی آنکھوں میں اپنی بات کا اثر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بشنگ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوچکا تھا اور اس کا احساس اس شخص کو تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لہجے میں ڈرامائی انداز پیدا کرتے ہوئے کہا "وہ جو غیر مرئی روشنائی استعمال کرتے ہیں، حلیے بدل بدل کر لوگوں سے ملتے ہیں، ہر وقت جیب میں خفیہ پیغامات اور ان کو پڑھنے والی کوڈ بکس لیے پھرتے ہیں اور شاید جنہیں کبھی وردی نصیب نہیں ہوتی۔"

بشنگ کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے چوڑی ہوگئیں "تت.... تم.... ایک جاسوس ہو؟" غیر ارادی طور پر اس کا انداز بھی سرگوشیانہ ہوچکا تھا اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے برآمد ہورہے تھے۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" اس شخص نے احتجاجی لہجے میں سرزنش کی۔

"مگر میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہے بھی تب بھی تم اس کا قطعاً اقرار نہیں کرو گے۔" بشنگ نے تبصرہ کیا "میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟"

اس نے بھی حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور تحسین آمیز انداز میں بشنگ کو دیکھ کر کہا "شاید.... ویسے میرا خیال ہے میں نے اپنی انگوٹھی کے بارے میں تمہاری نفرت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔" وہ گفتگو کو پھر انگوٹھی پر لے آیا۔

"بس مجھے مکھیاں ذرا اچھی نہیں لگتیں۔" بشنگ نے سادگی سے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر اس شخص نے سرہلایا اور قدرے حیرت سے بولا "تمہارا مطلب ہے کہ تم شہد کی مکھیوں سے نفرت کرتے ہو....؟ شہد کی مکھی محنت اور لگن کی علامت ہے۔ عظیم فاتح اور شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کی اپنے لیے پسند کردہ علامت، وہی نپولین جو اپنی جسمانی معذوری کے باوجود فرانس کا سب سے لائق بادشاہ تھا، فرانس جسے مغربی ثقافت کی آغوش کہا جاتا ہے.... اتم...." اس نے تاسف اور تعجب سے بشنگ کو دیکھا پھر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"میں ذرا جذباتی ہونے پر معذرت چاہتا ہوں مگر میں اس معاملے میں بہت حساس واقع ہوا ہوں اور میں اشیا و دیگر معاملات کو گہرائی تک دیکھتا ہوں۔ اس کے برعکس...." وہ ذرا سانس لینے کو اور خود پر قابو پانے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ "تم اور تمہاری عمر کے نوجوان اس کی قدر و قیمت جان ہی نہیں سکتے۔ ان کے لیے تو یہ ایک فضول سی چیز ہے۔ آؤٹ آف فیشن!" وہ دھیرے سے ہنسا "اور ابھی گزشتہ دنوں ہی میں ایک مصیبت سے دو چار ہوچکا ہوں۔" اچانک جیسے اسے

حسین سے حسین تر بنتے گیلئے

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے

گیلسی بلوٹانی کریم

برسہابرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ۲۰ قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ ملائم داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کرکے چہرے کی رنگت نکھارتی ہے۔

اسٹاکسٹ:

- عابد شاکنگ سنٹر، راولپنڈی، لاہور، کراچی
- علی بوبو اسٹور، لاہور، ملتان
- سی بوبو اسٹور، فیصل آباد، گوجرانوالہ
- بابر شاہنواز بیگ اینڈ کمپنی، کراچی
- ایشیا بوبو اسٹور، سرگودھا
- بلوچ بوبو اسٹور، کراچی
- ایشیا بوبو اسٹور، راولپنڈی
- ایشیا بوبو اسٹور، حیدرآباد
- ایشیا بوبو اسٹور، کوئٹہ
- ایشیا بوبو اسٹور، بہاولپور
- ایشیا بوبو اسٹور، ڈیرہ غازی خان
- ایشیا بوبو اسٹور، ڈیرہ اسماعیل خان
- ایشیا بوبو اسٹور، سکھر
- ایشیا بوبو اسٹور، سبی
- ایشیا بوبو اسٹور، ژوب
- ایشیا بوبو اسٹور، لورالائی
- ایشیا بوبو اسٹور، مظفر گڑھ
- ایشیا بوبو اسٹور، ڈیرہ اسماعیل خان
- ایشیا بوبو اسٹور، میرپور خاص
- ایشیا بوبو اسٹور، ٹنڈو الہ یار
- ایشیا بوبو اسٹور، ٹنڈو محمد خان
- ایشیا بوبو اسٹور، حیدرآباد
- ایشیا بوبو اسٹور، نواب شاہ
- ایشیا بوبو اسٹور، خیرپور
- ایشیا بوبو اسٹور، شکارپور
- ایشیا بوبو اسٹور، جیکب آباد
- ایشیا بوبو اسٹور، لاڑکانہ
- ایشیا بوبو اسٹور، سکھر
- ایشیا بوبو اسٹور، میرپور خاص
- ایشیا بوبو اسٹور، حیدرآباد

کوئی خیال آیا اور اس نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی سے اتاری اور چٹکی میں پکڑ کر لہراتے ہوئے بولا "تم سوچ سکتے ہو کہ اس انگوٹھی کی وجہ سے کسی انسان کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔۔۔" بشنگ نے جواب دیا۔

"گڈ۔۔۔" اس شخص نے تحسین آمیز انداز میں کہا اور بشنگ کی کلائی پکڑ کر اوپر اٹھائی پھر ہاتھ کی درمیانی انگلی میں اس انگوٹھی کو پہنا دیا۔ انگوٹھی قدرے تنگ تھی مگر اس نے زور لگا کر اسے بشنگ کی انگلی میں پھنسا ہی دیا۔

بشنگ کے منہ سے سسکی نکلی اور بڑی مشکل سے اس نے اپنے دانتوں پر دانت جما کر بے اختیار نکلنے والی اذیت ناک کراہ کو روکا "یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟" اس نے حیرت سے کہا۔

اس شخص نے بشنگ کی آہ و زاری پر کوئی توجہ دیے بغیر کہا "اچھی لگ رہی ہے۔۔۔ ہے ناں! اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میں اس انگوٹھی کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر کوئی مجھے مجبور کرے تو شاید میں۔۔۔"

"سنو۔۔۔!" بشنگ نے اذیت بھرے لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "مجھے تمہاری اس بے ہودہ انگوٹھی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور میں اسے قطعاً خریدنا نہیں چاہتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے جدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہا تھا "اب اسے اتارنے میں میری مدد کرو۔" اس نے اپنا ہاتھ انگوٹھی پہنانے والے شخص کی طرف بڑھایا۔

اس شخص نے بشنگ کے ہاتھ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور کہا "ویسے میں تمہیں اس انگوٹھی کی مختصر تاریخ بتا دیتا ہوں۔۔۔" پھر وہ پُرسوچ انداز میں بولنے لگا "یہ سترہویں صدی کے ایک سنار ابراہام آف فیریر نے کاؤنٹس آف آئیور نورجیا کی فرمائش پر بنائی تھی، جو۔۔۔"

"سنو۔۔۔!" بشنگ نے اپنے قریب سے گزرنے والی ائر ہوسٹس کو پکارا "تم ذرا اس انگوٹھی کو اتارنے میں میری مدد کرو۔ یہ اس "شریف" آدمی نے غلطی سے مجھے پہنا دی ہے۔" اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ اس نے انگوٹھی کی تاریخ میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ ائر ہوسٹس خوش خلقی سے مسکرائی اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

چند منٹوں کے بعد بشنگ دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ انگوٹھی بدستور اس کی انگلی میں موجود تھی۔

"کیا اس نے اسے اتارنے کے لیے صابن استعمال کیا تھا؟" انگوٹھی کے مالک نے بشنگ سے پوچھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر بولا "ہاں یہاں نارتھ امریکا میں ہر مشکل کا حل صابن کو سمجھا جاتا ہے لیکن دیکھو تمہاری انگلی پر ورم آ گیا ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم اسے ذرا آرام دو اور اتنی دیر میں اس انگوٹھی سے منسلک داستان سن لو۔"

بشنگ بے چارگی سے سر ہلا کر رہ گیا اور اس شخص نے "داستانِ انگوٹھی" وہیں سے سنانا شروع کر دی جہاں سے وہ پہلے سنا رہا تھا "۔۔۔ جو اپنے شوہر کاؤنٹ ڈی لور نیغرو کی بے وفائی اور اس پر پڑنے والے پاگل پن کے دوروں سے پریشان تھی۔ ان دوروں کی وجہ سے کاؤنٹ بڑی اذیت میں تھا۔ اس کی اس بے خوابی کو دور کرنے کے لیے شہزادی نے ایک کبڑے سنار ابراہام ڈی فریدو کو اس انگوٹھی کا آرڈر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ اس میں ایک چھوٹا سا خانہ بنایا جائے جس میں وہ کاؤنٹ کی بے خوابی دور کرنے کی دواشاہی طبیب سے بنوا کر محفوظ رکھے گی اور بڑے پیار محبت سے کاؤنٹ کو پلانے کی کوشش کرے گی۔ چونکہ کاؤنٹ شاہی طبیب اور دوا کے نام سے ہی چڑ جاتا تھا اس لیے شہزادی کو اسے دوا دینے کے لیے یہ تردد کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اس کبڑے سنار نے انگوٹھی تیار کرنے کی ہامی بھر لی مگر پتا ہے اس نے شہزادی سے اس کام کا کیا معاوضہ طلب کیا تھا؟" اچانک اس شخص نے بشنگ سے پوچھا جو اپنی انگلی میں تکلیف کے باوجود اس داستان کو سن رہا تھا۔

"کیا معاوضہ طلب کیا؟" بشنگ نے بے اختیار پوچھا۔

وہ شخص بشنگ کی دلچسپی کو محسوس کر کے مسکرایا اور بولا "اس نے شہزادی کو ہی طلب کر لیا۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" بشنگ نے مداخلت کی "کیا وہ شہزادی سے شادی کی خواہش مند تھا؟"

"نہیں بھئی۔" اس شخص نے بشنگ کی مداخلت کا ذرا بھی برا نہیں منایا اور خوش دلی سے جواب دیا "وہ صرف اس کے ساتھ مکمل تنہائی میں انتہائی خوشگوار لمحات گزارنا چاہتا تھا۔ وہ شہزادی پر عاشق ہو گیا تھا اور انگوٹھی کا معاوضہ وصال کی صورت میں طلب کر رہا تھا۔"

"اوہ۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر۔" بشنگ نے تبصرہ کیا "ویسے کیا شہزادی نے وہ معاوضہ ادا کر دیا تھا؟" بشنگ نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ اور یہیں سے اس انگوٹھی سے وابستہ اصل کہانی میں گڑبڑ کا آغاز ہوا۔" اس شخص نے جواب دیا "شہزادی نے سنار کی اس بے ہودہ اور مکروہ خواہش کو پورا



کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد وہ سنار انتقام اور بے عزتی کے احساس سے جلتا ہوا کاؤنٹ ڈی لور نیغرو کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ اس کی محبوب بیوی اس انگوٹھی کے ذریعے اسے زہر دینے کا ارادہ رکھتی تھی اس لیے اس نے اسے رازداری سے اس خاص خانے والی انگوٹھی بنانے کا حکم دیا تھا۔

کاؤنٹ یہ سنتے ہی غیض و غضب سے دیوانہ ہو گیا اور اس نے سنار کو حکم دے کر اس انگوٹھی کے میکنزم میں تبدیلی کرالی۔ اب جونہی اس انگوٹھی کے خانے کو کھولنے والے بٹن کو دبایا جاتا اس میں سے ایک زہر آلود سوئی انگلی میں پیوست ہو کر اس انگوٹھی کے پہننے والے کو ہلاک کر دیتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شہزادی ہلاک ہو گئی۔ تاہم زہر آلود سوئی کے پیوست ہونے کے بعد کاؤنٹ نے شہزادی کو بتایا کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کروایا ہے۔ جواب میں اپنی زندگی کے آخری لمحات میں شہزادی نے اپنی خواہش اور اس کبڑے سنار کی مکاری اور دغابازی کی کہانی اسے سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس سے کس معاوضے کا طلب گار تھا۔

کاؤنٹ کو جب حقیقت کا علم ہوا تو اسے خود پر، اپنی جلد بازی پر اور سب سے بڑھ کر اس سنار پر بے حد غصہ آیا جس کی وجہ سے اس نے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سامان کیا تھا۔

چنانچہ سنار کو تو عبرت ناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ کاؤنٹ نے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر چیل، کوؤں اور گدھوں کو کھلا دیے۔ مگر خود اس کا دل اسے بے چین کر رہا تھا وہ اپنی محبوب بیوی کے لیے بے حد غم زدہ تھا۔ اسی احساسِ جرم اور دل گرفتگی میں اس نے خود کو مرنے والی بیوی کے بھائیوں کے حوالے کر دیا اور انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ اپنی بہن کے قاتل کو انہوں نے دوسری دنیا پہنچانے میں کوئی تاخیر نہیں کی اس طرح ان دونوں کا اختتام ہوا۔" اتنا کہہ کر وہ شخص خاموش ہوا اور پھر چند لمحات کے بعد بولنے لگا "میرا خیال ہے کہ اس کہانی کی بنیاد پر بنائے گئے اوپرا "مونی ریوینج" سے تو تم واقف ہی ہو گے؟"

بشنگ تکلیف زدہ انداز میں مسکرایا "یہ اس وقت بھری ہوئی تو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس وقت تو مجھے اس انگوٹھی سے کوئی خطرہ تو لاحق نہیں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اس کی وہ زہر آلود سوئی باہر آ جائے اور میرا کام تمام ہو جائے؟"

وہ شخص کچھ کہنے سے پہلے پُراسرار انداز میں مسکرایا "اس سے پہلے کہ میں تمہارے پہلے سوال کا جواب دوں تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا کبھی انسان پر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر نظر آئے۔"

"میں تو اس وقت بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" بشنگ نے احمقانہ انداز میں کہا "مجھے اس انگوٹھی سے نجات دلاؤ یا مجھے موت دے دو۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" اس شخص نے ڈانٹتے ہوئے کہا "اور اس بات کو مذاق میں مت لو۔ سنجیدگی سے میری بات کا جواب دو۔ کیا عزت سے مر جانے کے بجائے ذلت سے زندہ رہنا بہتر ہو سکتا ہے؟"

"کیا مطلب۔۔۔" بشنگ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"صحیح بات تو یہ ہے کہ تمہاری یہ بات پوری طرح میرے پلے نہیں پڑ سکی۔"

"بہت سادہ سی بات ہے اور مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا ذہین نوجوان اسے سمجھ نہیں پا رہا۔" اس شخص نے تاسف اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا مظاہرہ کیا پھر کہا "اچھا یوں سمجھو کہ جیسے۔۔۔ جیسے۔" یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی مثال ذہن میں ترتیب دینے کی کوشش کر رہا ہو "ہاں۔۔۔ جیسے خواتین کے لیے موٹاپے پر موت کو ترجیح دینا اور ہاں۔۔۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اپنے ملک کی سلامتی اور عزت اور خود اپنے لیے مصائب، قید اور تشدد میں سے کسی ایک کا انتخاب وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لہٰذا تمہارے پہلے سوال کا جواب اثبات میں ہے کہ واقعی یہ انگوٹھی اس وقت اپنے پہننے والے کے لیے موت کا پیغام ہے لیکن یہ بھی فی الوقت حادثاتی طور پر اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے بشنگ کی کلائی کو دوبارہ تھاما اور کہا "دیکھو۔۔۔!" اس نے انگوٹھی پر کندہ شدہ کی نکھی کے بائیں پر کو آہستگی سے چھوا "یہ اس انگوٹھی کا حفاظتی بٹن ہے۔ جب تک یہ اوپر اٹھا ہوا ہے یہ انگوٹھی اپنے پہننے والے کے لیے قطعاً بے ضرر ہے، مگر۔۔۔" اس نے اپنی انگلی کو ذرا سا دبایا اور ایک ہلکی سی چٹ کی آواز انگوٹھی سے برآمد ہوئی "۔۔۔ اب یہ ایک انتہائی مہلک ہتھیار میں تبدیل ہو چکی ہے۔"

بشنگ اپنی جگہ خوف سے ساکت ہو گیا۔ اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی "یہ۔۔۔ یہ تت۔۔۔ تم نے۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا۔" اس نے اٹک اٹک کر بمشکل کہا۔

اس کی حالت دیکھ کر وہ شخص مسکرایا "اگر تم واقعی وہ ہو جو تم کہہ رہے ہو تو تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس شخص نے عجیب پُراسرار لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" بشنگ نے احتجاجی لہجے میں کہا "میں وہی ہوں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میرا نام بشنگ ہے اور میں نیویارک سے سستی اشیا خرید کر ذرا مہنگے داموں ٹورنٹو میں اور اسی طرح ٹورنٹو سے خرید کر نیویارک میں فروخت کرنے کا سیدھا سادہ کام کرتا ہوں۔"

"بہت خوب۔" اس نے ستائشی انداز میں کہا "مگر فرض کرو کہ حقیقت میں تم کینیڈین انٹیلی جنس کے ڈیژنڈ ذکی چالاک اور شاطر چیف انسپکٹر بخشنگم ہو جو دنیا بھر کی جاسوسی اور خفیہ ایجنسیوں میں بکی بیور کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ بھی فرض کرلو۔" وہ دھیرے دھیرے سے مسکرایا "کہ میں تمہارا ازلی دشمن کرنل مارکو ہوں۔ البانیہ کا سب سے تیز اور ماسٹر جاسوس جسے سب بیڈ ہیڈ وولف کے نام سے پکارتے ہیں۔۔۔ اس کے بعد یہ بھی فرض کرلو کہ یہ جو تم منقش برتن ٹورنٹو لے کر جارہے ہو ان کے نقش و نگار میں کینیڈین شاہی بحریہ کے لیے خفیہ منصوبوں کے نقشے چھپائے گئے ہیں' تاکہ کینیڈین 'ایڈریاٹک پر اپنا ظالمانہ تسلط برقرار رکھ سکیں۔"

بشنگ کھسیانی ہنسی کے درمیان بولا "یہ تو تمیں کی دھائی کے کسی جاسوسی ناول کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

خود کو فرضی کرنل مارکو کہنے والا شخص خوش خلقی سے مسکرایا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "بظاہر سیدھا سادہ نرم خو' بے ضرر اور عام سا نوجوان مگر اندر سے سفاک شاطر اور بے رحم لیکن بے حد فرض شناس سیکرٹ ایجنٹ۔" اس نے احتیاط سے انگوٹھی کے حلقے کو تھپتھپایا "کیا ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟" اس نے بشنگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

بشنگ کے چہرے پر خجالت پھیل گئی "ممکن تو ہے مگر میرے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ یہ انگوٹھی اپنا زہریلا ڈنک مجھے نہیں مارے گی۔"

"شاید نہیں۔" وہ آہستگی سے بولا "مگر اسی صورت میں جب تم تسلیم کرلو کہ تم بشنگ نہیں بلکہ بکی بیور ہو اور وہ جو تم نے کینیڈین شاہی بحریہ کے رازیہاں سے لیے ہیں وہ خاموشی سے میرے سپرد کردو۔" پھر وہ دھمکی آمیز لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "ورنہ زہریلی مکھی اپنا ڈنک تمہاری انگلی میں اتارنے کے لیے بالکل تیار ہے۔"

بشنگ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اچانک وہ اپنی نشست سے اچھلا اور واش روم کی طرف دوڑ گیا۔ خود کو کرنل مارکو کہنے والا شخص بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی چھوٹے سے واش روم میں داخل ہو گیا۔ وہ دونوں اس ننھی سی جگہ میں بمشکل پھنسے کھڑے تھے۔

بشنگ نے پانی کا نل کھولا اور اپنی ورم زدہ انگلی پر پانی بہانا شروع کردیا۔

"شاباش۔۔۔ ش۔" کرنل مارکو نے پرستائش لہجے میں کہا۔ "اگر چہ فزکس میرا باقاعدہ مضمون کبھی نہیں رہا اور اسی لیے مجھے صحیح طور پر یہ یاد نہیں آرہا کہ ٹھنڈا پانی یا گرم پانی۔۔۔ ان میں کون سا پانی دھات کو پھیلاتا ہے۔ لیکن بہرحال پھیلاتا ضرور ہے۔"

خوف سے بشنگ کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ وہ مکھی کے بائیں پر کو چھوئے بغیر انگوٹھی کو اپنی انگلی سے جدا کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ کرنل مارکو کی اس بات پر جھلا اٹھا "سنو۔" وہ تیز لہجے میں بولا "میں بکی بیور نہیں ہوں۔" پھر وہ التجائیہ انداز میں بولا "تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ میں ایک سیدھا سادہ کاروباری آدمی ہوں بس!"

"تم۔۔۔!" کرنل مارکو نے قہقہہ لگایا "واقعی تم بکی بیور نہیں ہو۔۔۔؟ تمہارا گول مٹول چہرہ' بھرے بھرے گال اور یہ نرم و نازک ہتھیلیاں۔۔۔! اس کے برعکس۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ بشنگ کے سامنے پھیلا دیے "انہوں نے بے شمار سختیاں جھیلیں۔ ان ہاتھوں سے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ان ہاتھوں نے ایک مرتبہ پنسل کے ایک مضبوط دان کی مدد سے چالیس فٹ لمبی سرنگ کھودی تھی تاکہ وہاں سے فرار حاصل کیا جاسکے اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کی جاسکے۔ اسی لیے تم دیکھو کہ یہ ہاتھ کیسے ہیں اور میں اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے گم نام سرفروش تم اور تمہاری نسلوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور بشنگ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جو اس کی جذباتی تقریر سے بے حد متاثر نظر آرہا تھا "اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں کبھی ہم پر وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ جب ہمیں ناموس وطن کی خاطر اپنی جان دینی پڑ جائے۔ ایسے ہی وقت کے لیے ہمارے پاس ایسی انگوٹھی کا ہونا ضروری ہوتا ہے جس کی مدد سے ہم دشمنوں کے نرغے میں اپنی مرضی سے اپنی جان قربان کرسکیں۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ چپ ہوا اور پھر تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے بولا "مسئلہ یہ ہے کہ کسی غلط فہمی کے باعث ہی سہی' مگر میں اپنی یہ انمول انگوٹھی تمہیں پہنا چکا ہوں۔۔۔ اور مجھے ہر صورت میں یہ انگوٹھی واپس چاہیے۔"

بشنگ نے اپنی انگلی کی طرف دیکھا جو انگوٹھی کے دباؤ کے سبب دوران خون متاثر ہونے کی وجہ سے جامنی رنگ اختیار کرتی جارہی تھی اور سوج کر عجیب سی نظر آنے لگی تھی



"ہمم۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ٹورنٹو پہنچتے ہی اسے کٹوا کر تمہارے سپرد کردوں گا۔" وہ یقین دلانے والے انداز میں کرنل مارکو سے مخاطب ہوا۔

"میں کس طرح مان لوں کہ ٹورنٹو میں اترنے کے بعد تم وہاں کے ہجوم سے فائدہ اٹھا کر فرار نہیں ہو جاؤ گے؟" اس شخص نے بے یقینی سے کہا "اگرچہ میرے پاس تمہیں وہاں روکنے کے بہت سارے طریقے ہیں مگر ان میں قباحت یہ ہے کہ وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور سب لوگ میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ یہ میرے لیے بہت نقصان دہ ہوگا۔ لہٰذا اس مسئلے کو یہیں حل کیے لیتے ہیں اور اس کے لیے میرے پاس یہ علاج موجود ہے۔" اس نے اپنی جیب سے تیز دھار چاقو نکالا جس کا پھل واش روم کی روشنی میں جھلملا رہا تھا "میں اس کی مدد سے اس انگلی کو ہی کاٹ لیتا ہوں۔۔۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" بشنگ نے چلاتے ہوئے کہا "یہ۔۔۔ تم۔۔۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خوف سے بکلا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور آنکھیں پھیل کر چوڑی ہو گئیں جن میں سے دہشت جھلک رہی تھی کیونکہ اسی وقت اس شخص نے اس کی انگلی کو انگوٹھے اور انگشت شہادت کے تھام کر چاقو اس کی طرف بڑھانا شروع کردیا تھا۔

"تم بے فکر رہو۔" اس شخص نے تشفی آمیز انداز میں کہا "تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ چاقو بہت تیز ہے اور میں اپنے کام میں بہت ماہر۔۔۔ ہاں بعد میں تمہیں ذرا کچھ اذیت محسوس ہوگی۔ اور اگر تم جلد ہی کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچ سکے تو مجھے امید واثق ہے کہ وہ تمہاری انگلی کو دوبارہ جوڑ کر دے گا۔۔۔ ٹھیک۔۔۔"

"میں اسے خریدے لیتا ہوں۔" اچانک بشنگ نے کہا۔ انگلی کٹوانے کے خیال سے ہی اس کا دم نکلا جارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کتنا سفاک ہے کہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی انگلی کاٹنے پر تیار بیٹھا ہے۔

"لک۔۔۔ کیا!" اس شخص نے حیرت سے کہا "تم اسے خریدو گے؟ مگر تمہیں تو یہ ایسی چیز پسند ہی نہیں ہے۔"

"پھر بھی میں اسے خریدنا چاہوں گا۔" بشنگ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" اس شخص نے سر ہلایا تاہم بشنگ کی انگلی ابھی تک اس کی گرفت میں تھی "تمہاری اس انگلی کی قیمت چالیس ہزار ڈالر ہے اور میرے خیال میں تمہارے لیے یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔۔۔ کیوں؟"

"مجھے منظور ہے۔" بشنگ نے جلدی سے کہا "میں تمہیں اس رقم کا چیک دیے دیتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ کوئی چیک نہیں۔ سودا نقد ہوگا۔" اس شخص نے نفی میں گردن ہلائی اور بشنگ کی انگلی پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کردیا "میں چیک کے سلسلے میں ایک دفعہ دھوکا کھا چکا ہوں۔ ایک مرتبہ برٹش سیکرٹ سروس کے میجر نے زیادہ دیر تک حلقوں میں ہاتھ پھنسا کر لٹکے رہنے کی شرط لگائی تھی اور مجھ سے ہار گیا تھا۔ اس نے مجھے جیتی ہوئی رقم کا چیک دیا مگر بعد میں اس کی حکومت نے اس چیک کی ادائیگی رکوا دی اور میں شرط جیت کر بھی جیت نہ سکا۔ تب سے میں نے چیک قبول کرنے سے توبہ کرلی ہے۔ اگرچہ بعد میں مجھے یہ بھی علم ہوا کہ اس وقت اس میجر نے جو بیلٹ اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی اس کے اندر خالص سونے کی بیس نکیاں جڑی ہوئی تھیں جس پر میرا دھیان اور بھی بڑھ گیا تھا۔ خیر بہرحال۔۔۔"

"مگر میرے پاس صرف تین سو بیس ڈالر ہیں۔"

بشنگ نے اس کی بات کاٹ دی "تم یقین کرو میں صحیح کہہ رہا ہوں اور میری بیلٹ میں بھی ایسی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے بیلٹ کا بکل کھولا اور بیلٹ کھینچ کر اس شخص کی طرف بڑھا دی۔ اس نے بشنگ کا ہاتھ چھوڑ کر بیلٹ پکڑی اور تیز دھار چاقو سے بیلٹ کے کئی ٹکڑے کردیے اور کہا "واقعی اس میں تو کچھ نہیں ہے۔"

"یہ گھڑی بھی لے لو۔" بشنگ نے جلدی سے پیشکش کی "یہ میں نے چار سو ڈالرز میں خریدی تھی۔" اس نے بشنگل اپنی دھلکتی ہوئی پینٹ کو ایک ہاتھ سے سنبھالا ہوا تھا۔

اس شخص نے گھڑی کی طرف دیکھا "آہ۔۔۔ کیا بات ہے یہ الباکھڑی ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہیں بے وقوف بنایا گیا ہے۔ یہ گھڑیاں اب سرنٹر لینڈ کے بجائے البانیہ میں بن رہی ہیں اور ان پر سوئس ساختہ کا لیبل لگا کر دنیا بھر میں اسمگل کردیا جاتا ہے' اس جعل سازی سے ملنے والی رقم کو البانوی دوسرے ملکوں میں جاسوسی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا "کتنا اچھا ہو تا کہ تم بگ بیڈ وولف بن جاتے اور میں انسپکٹر بخشنگم مگر یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور تم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کیوں کپکپا رہے ہو اپنے اوسان برقرار رکھو۔ یہ صحیح ہے کہ کرنل مارکو واقعی دہشت کی علامت ہے مگر میں نے کبھی ایسا کوئی تاثر دینے کی کوشش نہیں کی لہٰذا۔۔۔!"

"میرے دادا کے قیمتی کف لنکس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ یقیناً بہت قیمتی ہیں۔" بشنگ نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹی اور اپنی جیب سے کف لنکس کی جوڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی "یہ دیکھو! یہ خالص

اور ٹھوس چاندی کے بنے ہوئے ہیں اور ان میں ہیرے بھی جڑے ہوئے ہیں۔"

اس شخص نے صدمے کی سی حالت میں بشنگ کو دیکھا "یہ تمہارے دادا کی نشانی ہے اور تم محض اپنی ایک انگلی بچانے کی خاطر انہیں قربان کرنے پر آمادہ ہو..... چچ چچ۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا "واقعی آج کی نسل کے نوجوان اپنے اسلاف کی اشیا کی قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری اس حرکت سے تمہارے دادا کو کتنی تکلیف پہنچے گی؟" اس نے بشنگ سے پوچھا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں لہٰذا کسی تکلیف....." بشنگ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر اس شخص نے بشنگ کو اس کا موقع نہیں دیا۔

"یہ تو اور بھی شرم کی بات ہے آنجہانی دادا کے قیمتی ورثے کو نوجوان پوتا اپنی ایک انگلی پر قربان کر رہا ہے۔ واقعی آج کل کے نوجوان بزرگوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔"

پھر وہ ذرا جھکا ہو کر بولا "بہرحال مجھے کیا..... یہ تمہارا اور تمہارے آنجہانی دادا کا معاملہ ہے..... چلو ٹھیک ہے، سودا ہوگیا۔ یہ تین سو بیس ڈالر، جعلی الماکڑی اور یہ کف لنکس میرے ہوئے اور یہ سترہویں صدی کی قیمتی اور انمول انگوٹھی تمہاری ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تینوں چیزیں اور چاقو بند کرکے اپنی جیب میں ڈال لیا پھر بشنگ کے شانے کو تھپکتا ہوا بولا "تم خوش قسمت ہو کہ تم نے ایک بہت بڑے جاسوس سے معاملہ طے کرلیا ہے۔"

بشنگ کے لیے یہ جملے بے حد خوشگوار ثابت ہوئے اور اس نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو قدرے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تاہم وہ اب بھی اس انگلی کی طرف سے ہر ممکن احتیاط برت رہا تھا کہ اسے کوئی ٹھیس نہ لگے اور نہ ہی شدید کی نمی کا پر کسی چیز سے ٹکرا سکے۔

اس شخص نے جیب کو بند کیا اور کہا "اب جبکہ یہ انگوٹھی تمہاری ہو چکی ہے تو میں تمہیں بتا دوں کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" بشنگ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ اور اپنا ہاتھ اس شخص سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ "مجھے نہیں دیکھنا اور مجھے کچھ نہیں سیکھنا۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم اسے سیکھنا نہیں چاہو گے۔" اس شخص نے طمانیت سے کہا "بہرحال اب ہمیں اپنی نشستوں پر چلے جانا چاہیے۔ وہاں....."

"نہیں..... !" بشنگ نے اس مرتبہ بھی انکار میں گردن ہلائی "میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا اور اگر کسی نے میرے ساتھ زبردستی کی کوشش کی تو میں مرنے میں قطعاً تاخیر نہیں کروں گا۔"

"مگر یہ ایک پبلک واش روم ہے۔" اس نے قدرے خفگی سے کہا "اور تم صرف اپنے بارے میں سوچنا بند کرو اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" پھر اس نے بشنگ کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کہا "میں یہاں سے باہر نکلنے میں تمہاری ایک مدد کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے واش روم کے دروازے سے اپنا سر باہر نکالا اور گزرنے والی ایئر ہوسٹس کو کچھ ہدایات دیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایئر ہوسٹس نے وہیں سے تنگ دہانے والی ایک چھوٹی سی بوتل اور سرجری ٹیپ کا ایک رول اسے تھما دیا۔

اس شخص نے احتیاط سے وہ بوتل بشنگ کی ورم زدہ انگلی پر چڑھائی اور پھر بوتل کو ٹیپ کی مدد سے اچھی طرح بشنگ کی کلائی سے باندھ دیا "یہ کوئی بہت اچھا بندوبست تو نہیں ہوسکا مگر بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔"

بشنگ نے ناخوشگوار نظروں سے بوتل کو دیکھا تو اس شخص نے مزید اضافہ کیا "میں نے تمہیں بقیہ تمام زندگی اس واش روم میں گزارنے سے بچالیا ہے مگر بدلے میں تم میرا شکریہ ادا نہیں کرو گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" بشنگ نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

اس شخص نے واش روم کا دروازہ کھولا اور خود باہر نکل گیا۔ بشنگ کو باہر آنے کا اشارہ کیا "اب آجاؤ اور نارمل طریقے سے میرے ساتھ چلو۔ آؤ شاباش..... دیکھو کوئی واہیات حرکت نہ کرنا۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

بشنگ واش روم سے نکلا اور بوتل میں محفوظ انگلی اپنی کمر کے پیچھے چھپائے اور دوسرے ہاتھ سے بمشکل اپنی پینٹ کو سنبھالے ہوئے سیٹ تک پہنچا۔

اس مرتبہ وہ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا۔ اس نے بدستور اس انگلی کو اپنی ہتھیلی سے چھپا رکھا تھا۔

"اگر تم کہو تو میں تمہیں کوئی رسالہ دے دوں؟" اس شخص نے بشنگ سے پوچھا۔ جواب میں بشنگ نے انکار کردیا۔

اسی وقت سیٹ بیلٹ باندھنے اور نو اسموکنگ کی ہدایات روشن ہوگئیں۔ جہاز ٹورنٹو کے ایئرپورٹ پر اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس شخص نے بشنگ کی سیٹ بیلٹ باندھ دی پھر قدرے فکرمندانہ لہجے میں کہا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم کسٹم کے مرحلے سے کس طرح گزرو گے؟"



بشنگ کا منہ حیرت سے کھل گیا "کسٹم؟" اس نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے تعجب سے دہرایا۔

"تمہاری کلائی سے بندھی ہوئی یہ بوتل ان کی توجہ کا مرکز بن جائے گی اور اگر تم ان کو کوئی اچھی سی کہانی سنا کر قائل نہیں کرسکے تو وہ تمہاری جان قطعاً نہیں چھوڑیں گے۔ لہٰذا یہ بھی کہہ گیا کہ اگر ایک مرتبہ یہ بوتل تمہاری انگلی سے جدا ہوگئی تو وہ اس انگوٹھی سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر نہیں رہیں گے جس کا نتیجہ تم خود جانتے ہو۔"

بشنگ کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی "کہانی..... کیسی کہانی؟" وہ پھنسے پھنسے لہجے میں بولا۔

"اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس شخص نے بے پروائی سے کہا پھر گویا بشنگ کی حالت دیکھ کر اس پر رحم کھاتے ہوئے بولا "اچھا سوچتے ہیں..... مگر..... مسئلہ یہ ہے کہ اپنے پیشے کے دوران میں، میں نے اس ملک و قوم کے لیے اتنی کہانیاں گھڑی ہیں کہ اب میرے ذہن کے سوتے خشک ہو چکے ہیں..... لیکن....." وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگا "اب تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا....." اچانک جیسے اسے کچھ خیال آیا "ہاں ایک بات ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ تم تھوڑی دیر کے لیے ایک باہر حیاتیات بن جاؤ جو خلائے ضرر رساں بیکٹیریا وغیرہ پر تحقیق کررہے ہوتے ہیں۔ تم انہیں بتانا کہ تمہاری انگلی کے اندر اس انگوٹھی میں ایسے جراثیم ہیں جو اگر آزاد فضا میں چھوڑ دیے گئے تو پورے شہر کو تباہ کرسکتے ہیں اور تم ان پر تحقیق کرنے کے لیے انہیں کسی لیبارٹری سے لے کر آئے ہو۔ کیونکہ تم ان کی حفاظت کے بارے میں بہت حساس ہو اس لیے تم نے انہیں اپنے سامان میں بھی رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی انگلی کے ساتھ ہی ان کو بھی منسلک کرلیا تاکہ یہ محفوظ طریقے سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہوسکیں۔ میرا خیال ہے کہ ان تباہ کن جراثیموں کا خوف انہیں تمہاری انگلی سے دور رکھنے میں کامیاب ہوجائے گا۔"

بشنگ نے بے چارگی سے سر کو ہلایا اور یاسیت بھرے لہجے میں کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ویسے تم تو میرے ساتھ چل رہے ہو نا....."

"نہیں۔ نہیں۔" اس شخص نے تیزی سے کہا "میں تمہارے ساتھ نظر آنا قطعاً پسند نہیں کروں گا اور ویسے بھی تمہارا اکیلا ہی تمہارے لیے مشکلات ہی پیدا کرے گی۔ اس لیے میں اور تم علیحدہ علیحدہ ایئرپورٹ سے باہر نکلیں گے پھر اس ہمارے قصے کے نمٹنے کی خوشی میں ایک ایک جام پئیں گے۔"

"اچھا! اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔" جہاز لینڈنگ کے بعد ٹیکسی کے مرحلے سے گزرتا ہوا اپنی مخصوص جگہ پر رک چکا تھا اور جہاز کے مسافر روایتی بے تابی کے ساتھ اپنے اپنے سامان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

○○○

چھوٹا سا کسٹم ہال اس وقت مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک طرف مسافروں کا سامان کنویئر بیلٹس پر آرہا تھا اور دوسری طرف چار کسٹم آفیسر اپنے اپنے کاؤنٹر پر مستعد کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ شخص دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ہال میں داخل ہوا اور کنویئر بیلٹ سے اپنے دو سوٹ کیس اٹھا کر ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا پھر وہ باہر جانے والوں کی سب سے طویل قطار میں کھڑا ہوگیا۔ غیر متوقع طور پر قطار تیزی سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کاؤنٹر کے قریب آکر اس نے اپنے پیچھے دو بزرگ خواتین کو احتراماً خود سے آگے بڑھنے کا موقع دیا اور بے چینی سے ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔ اسے بشنگ کا انتظار تھا۔

اچانک امیگریشن ہال کا دروازہ کھلا اور ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی بوتل پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی پینٹ کو تھامے افتاں و خیزاں بشنگ شانے پر ایک بیگ لٹکائے ہوئے برآمد ہوا اور قطار میں کھڑے ہوئے تمام افراد کو پیچھے


ہر دلعزیز شخصیت سیمیں ہانو کے قلم سے

ایک سنسنی خیز سرگزشت

جال

قیمت 50 روپے

تعداد 16 روپے

ایک ایسے شاہین کی کہانی جو شاید معلوم نہیں شکار ہے یا کون ہے اور کہاں سے آیا ہے

جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ ایک قفس میں مقید تھا

دنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں

اس پر کوئی گولی اثر نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 رضوان مینشن، بالمقابل آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی 74200

فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895313

چھوڑتا ہوا کسٹم آفیسر کے سامنے جا پہنچا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کسٹم آفیسر نے اس کی شکل دیکھتے ہی ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا اور اسی وقت بشنگ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے بیگ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر کسٹم آفیسر نے اس کا ارادہ بھانپ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے چھلانگ لگائی اور اسے کالر سے پکڑ کر گھسیٹا۔ بشنگ نے دیوانہ وار ہاتھ چلائے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ ایک کسٹم آفیسر کے قابو میں نہیں آ رہا تھا یہ دیکھ کر باقی تینوں افسران بھی اس کی طرف لپکے اور اسے قابو میں کرنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ لگتا تھا بشنگ نے اپنی ساری جھلاہٹ اور کوفت کا بدلہ اسی وقت نکالنے کا سوچ لیا تھا۔ وہ پورے ہال میں ناچتا پھر رہا تھا اور عجیب و غریب مغلظات بک رہا تھا۔ چار میں سے تین کسٹم افسران اس کے پیچھے تھے جبکہ چوتھا قانون کے محافظوں کو بلانے کے لیے اندرونی سمت لپکا۔ یہی وقت تھا جب خود کو کرنل مارکو کہنے والے شخص نے اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور اس ہڑبونگ کا فائدہ اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس اثنا میں بشنگ پر قابو پایا جاچکا تھا اور کسٹم افسران اور بشنگ کے درمیان ہونے والی آپا دھاپی کے نتیجے میں بشنگ کی کلائی سے بندھی بوتل کھل چکی تھی۔ جب اس شخص نے کسٹم ہال کا دروازہ اپنے عقب میں بند کیا اس وقت کسی طرح اس انگوٹھی کا کھٹکا دبا اور اس میں سے مہین سی گنگناتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"قدرت کا شاہکار ہے شمد کی مکھی۔"

دروازہ اس کے عقب میں بند ہوا اور وہ تیز تیز چلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک نوجوان نے سر کو خم کر کے اسے خوش آمدید کہا اور دونوں سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ وہ شخص اپنے استقبال کے لیے آنے والے نوجوان شوفر کی رہنمائی میں ایک کار تک پہنچا جس پر سفارتی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

ایک سوٹ کیس ڈکی میں رکھا گیا اور دوسرا اس نے اپنے ساتھ کار کی عقبی نشست پر رکھ لیا۔

شوفر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار کو پارکنگ سے باہر نکال لایا۔

"سفر کیسا گزرا مسٹر مارکو؟ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟" شوفر نے بغیر گردن گھمائے مارکو سے پوچھا۔

"مجھے ڈر تھا کہ مجھے یہاں یا جہاز میں پہچان نہ لیا جائے۔" مارکو نے شوفر کی بات سمجھتے ہوئے جواب دیا "اس لیے سب کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے ایک شرارت بہت ضروری تھی۔" اس نے بشنگ کی حالت یاد کر کے تصور ہی تصور میں لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "اور اس طرح مزید نو ہزار سوئس ساختہ جعلی گھڑیاں بہ آسانی یہاں تک پہنچ گئیں۔" اس نے اپنے سوٹ کیس کی نچلی سطح کو پیار سے سہلایا "اس سوٹ کیس کے خفیہ خانے میں یہ سارا مال موجود ہے۔" وہ مسکرایا' اس نے دل میں سوچا کہ اگر مزید البانوی اس کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے پر تیار ہوجائیں تو کتنا اچھا ہو۔ اس کے بعد البانویوں کا ایڈریاٹک پر قبضے کا خواب پورا ہونے میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔ تاہم اسے اطمینان تھا کہ چنہ اور البانوی اس جعل سازی کے کاروبار میں سرمایہ کاری کے لیے تیار ہوتے جا رہے تھے۔

"یانک!" اس نے شوفر کو پکارا "وہ دن دور نہیں ہے جب البانیہ' ایڈریاٹک پر قبضہ کرلے گا۔ میں نے ٹھیک کہا ناں؟"

"آپ نے صحیح کہا مسٹر مارکو۔" شوفر نے تائید کی۔

"ویسے ایک بات بتاؤ۔" مارکو نے دوبارہ شوفر کو پکارا "تو صلیبٹ کی نئی استقبالیہ کلرک جو مجھے پچھلے چکر میں ملی تھی۔ اس کا نام کیا ہے؟ وہی جو بہت خوب صورت اور شرمیلی سی تھی۔"

"نادیہ' سر!" شوفر نے جواب دیا۔

"ہاں خوب یاد رکھا۔" مارکو نے ستائشی انداز میں کہا "میں اس مرتبہ اس کے لیے ایک انگوٹھی لے کر آرہا تھا کہ وہی انگوٹھی میری شرارت میں استعمال ہوگئی۔" مارکو نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا "ویسے وہ کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔" شوفر نے جواب دیا "ہم نے پچھلے ہی ہفتے شادی کی ہے۔"

"مبارک ہو۔" مارکو نے بے دلی سے کہا اور اپنے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی پھر اس نے اپنے بارے میں سوچا۔ ٹھیک ہے اب بشنگ سے ملنے والا مال نادیہ کے پاس جانے کے بجائے کرنل مارکو کے ریزرو فنڈ میں منتقل کرنا پڑے گا۔ وہ اچانک خود کو بہت بوڑھا محسوس کرنے لگا۔ اس نے شوفر کے زردی مائل بھورے بالوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں کہا "اُف... تم لوگ ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑتے... سب چیزیں تمہارے حصے میں آجاتی ہیں۔ نوجوان اور ہنس مکھ لڑکیاں بھی..."



# محفل شعر و سخن

## انعام یافتہ شعر

محمود عالم ایڈووکیٹ ——— ایف بی ایریا۔ کراچی

حفظِ حیات کا خیال ہم کو بہت مہنگا لگا
پس بہ ہجومِ معرکہ جان کے بے سپر گئے

خالد حسن چیمہ ——— پنڈی بھٹیاں

وہ سنگ دل مزارِ وفا پر بنامِ عشق
آئی تو میرے نام کا پتھر لگا گئی

انوار محمود ——— بہاولنگر

نہ جانے کیوں ہمیں تم پہ بڑا بھروسا ہے
خیال رکھنا کہ قائم یہ اعتبار رہے

طاہر کمال محمد سلیم بٹ ——— مظفرگڑھ

تجھ سے لفظوں کا نہیں' روح کا رشتہ ہے مرا
تو تو تحلیل ہے مجھ میں میری خوشبو کی طرح

محمد اسلم ہمدم ——— مظفرگڑھ

زندگی سانس کی تسبیح کی روانی تھی
ٹوٹ جاتی ہے تو سب دانے بکھر جاتے ہیں

ایم آر ——— ضلع اٹک

میں تری بزم میں کس کس سے دشمنی کرتا
لکھا تھا نام ترا بے شمار چیزوں پر

الحاج احسان الحق ——— پھالیہ' منڈی بہاؤالدین

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

سید فیاض الرحمن ——— سرائے عالمگیر' گجرات

اب مست ہوا کے جھونکوں نے گلشن سے گزرنا چھوڑ دیا
اب باد صبا ہی روٹھ گئی پھر جشنِ بہاراں کون کرے

راجہ جاوید علی خان ——— سلطانپورہ راولپنڈی

تمام شہر ہے شائستگی کا زہر پیے
نہ جانے کیا ہو' جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

محمد نعیم واثق ——— جوئی' مظفرگڑھ

تصور میں تجھے پاکر سراپا گوش رہتا ہوں
خیال شمع جلتا ہوں مگر خاموش رہتا ہوں

ایڈیٹ بیگ ——— جہلم کینٹ

چپ تو میر ان نے ہمیں داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

شہباز احمد چوہدری ——— جھوشاہ مقیم' ضلع اوکاڑہ

یہ ہا ہے کون' تیرے دل میں اے درد
کہ بو گلاب کی آئی تیرے پسینے سے

طارق سلیم ناصر ——— اعوان ٹاؤن لاہور

تو جارہا تھا لوٹ کے مہمان کی طرح
بکھرا ہوا تھا دل ترے سامان کی طرح

خالدہ اشرف ——— لیلیانی' قصور

تسکین دل کے واسطے' وعدہ تو کیجئے
ہم جانتے ہیں آپ سے آیا نہ جائے گا

مظہر حسین ساقی ——— ذیرہ اسماعیل خان

عمر بھر میں نے بھی پھر اس سے نہ مانگا کچھ اور
اس نے بھی کچھ نہ دیا درد کی سوغات کے بعد

انوار الحق چوہدری بی اے چوہدری' جدہ سعودی عرب

رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

پونم وحید ——— محلہ رام گڑھا' شیخوپورہ

تمام دن بھی تو بانٹا ہے غیر لوگوں نے
یہ رات تیرے خیالوں میں کٹ گئی تو کیا

سنین حیدر ——— جعفر طیار' ملیر کراچی

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
ایک بار نہیں تم سے کئی بار ملیں گے

محمد معین خان ——— دلگیر کراچی

ہمارا اس کا رشتہ اب نہ پوچھو
تعلق ہے مگر ٹوٹا ہوا ہے

خرم علی خیال ——— کوالالپور ملائیشیا

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
میرا مجلس تبسم میرا ترجمان نہیں ہے

حضرت بلال خان ——— فیصل آباد

جگر ہوجائے گا چھلنی یہ آنکھیں خون روئیں گی
وصی ہے فیض لوگوں سے نباہ کر کچھ نہیں ملتا

ریحانہ علی ——— ماتلی

بنا گلاب تو کانٹے پھنا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص

جہانگیر احمد رانجھوت ——— حیدر آباد

تیری تصویر سی بن جاتی ہے ساحل کے قریب
چاند کا عکس جو پانی میں اتر آتا ہے

انعم بدر ——— ٹاؤن شپ لاہور

جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینہ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

محمد اختر فرید نعیم ——— لیاقت پور' رحیم یار خان

بک جائیے نہ ایک نگاہِ کرم کے ساتھ
خود کو کسی کی بزم میں ارزاں نہ کیجئے

عین علی قاسم خانی ——— نوکوٹ

نہ جانے کیا ہے کسی کی اداس آنکھوں میں
وہ منہ چھپاکے بھی جائے تو بے وفا نہ لگے

ندا ملک ——— مغلپورہ لاہور

وہ اپنی ایک ذات میں کل کائنات تھا
دنیا کے ہر فریب سے ملوا دیا مجھے

محمد الیاس جاوید علوی ——— بہاولپور

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

اے عرفان نواز محسن ——— جلال پور جٹاں، گجرات

اپنے تیور تو سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

احمد، رخسار، خضر حیات، عمر حیات، سکندر حیات کھنجی، گجرات

خطوں کی دھوپ سے خدا رکھے تجھے محفوظ
غبار وقت سے میلا تیرا شباب نہ ہو

فضل الٰہی پرنس ارزاء، خوشاب عبدالرزاق تحوی، ایبٹ آباد

آ کہ اب تسلیم کرلوں تو نہیں تو میں سہی
کون مانے گا کہ ہم میں بے وفا کوئی نہیں

جاوید اقبال اعوان ——— کھرانہ پیر خاذی، گجرات

زندگی آگ کے شعلوں میں گزر جاتی ہے
بعد مرنے کے یہاں تاج محل بنتے ہیں

خورشید حسن میر فنک ——— گاؤں میری

جب سے تیرے خیال کا موسم ہوا ہے دوست
دنیا کی دھوپ چھاؤں سے آگے نکل گئے

محمد عاصم فنک ——— گاؤں میری

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
ایک عمر ہوئی دن میں کہ وہ گھر نہیں دیکھا

سیف الملوک دانش ——— ضلع اٹک پاکستان

ذرا تم چل کے آجاتے ذرا ہم جھک کے مل لیتے
شراکت سے چلا کرتے ہیں کاروبار دنیا کے

ثاقب غفار تنہا ——— مرشاہ خانیوال

دے سکے شاید وہ تیری بے گناہی کا ثبوت
اے ہوا سوکھا ہوا کوئی تو پتا چھوڑ جا

جان لطیف ——— کھرڑیانوالہ، فیصل آباد

ہم تیری یاد سے بہلائے ہوئے تھے دل کو
کیا خبر تھی کہ یہ رگ رگ میں اتر جائے گی

یثرب پرویز تنہا، فند دانیال عزیز خان، میڈاوہ، وہاڑی

اب آپ کس لیے اتنے ملول ہوتے ہیں
دیا تھا رنج تو کچھ سوچ کر دیا ہوتا

فلک شیر ہمیر گنجیانوی ——— گنجیاں ضلع خوشاب

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود پہ ظاہر نہ ہوئے تھے کو چھپانے کے لیے

قمر شہزاد خالد سحر ——— پنڈی سیدپور، جہلم

مانا کہ ان سے شام کا وعدہ ہے اے قمر
کیسے وہ آسکیں گے اگر چاندنی ہوئی

ملک وسیم شہزاد ——— فیکسلا، گزھی حیات

کڑکتی دھوپ پہنچنے کا فن سکھادے گی
بہت دنوں سے مرا سائبان زخمی ہے

محمد کاشف علی ——— بتاک جاوید

کوئی قاتل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

سید نورالحسن شاہ کاظمی المشہدی ——— جھنگ

کھڑے ہیں راہ میں تیار لوٹنے والے
خدا کرے کہ اسے شہر کی ہوا نہ لگے

محمد شہزاد ساجد ——— خوشاب

ماتم سرا بھی ہوتے ہیں کچھ خود غرض قبیل
اپنے غموں پہ روتے ہیں لے کر کسی کا نام

اکبر علی خان فنک شاہانی ——— کھنڈ خیل، کوہاٹ

کتنے انسان ہیں کیا سادگی سے پوچھتے ہیں
کیسے کیا میری کسی بات پہ روتا آیا

محمد رشید سیال ——— خیرپور میرس، سندھ

جنون رہے جو سلامت تو یوں بھی ہوتا ہے
کوئی وفا نہ کرے اور بے وفا نہ لگے

شہزاد رفیق شیخ ——— خوشاب

میں فیصلے کی گھڑی سے گزر چکی ہوں مگر
کسی کا دیدہ حیراں مری تلاش میں ہے

اکرام عباس ملک ——— سیمنٹ فیکٹری، پکوال

وہ ایک شعلہ اندھیرے کو بے اثر کردے
میں انتظار میں ہوں کب کہاں سے اٹھتا ہے

بن یامین ——— پی پی ایس مظفر گڑھ

زندگی بھی کسی مفلسی کی قبا ہو جیسے
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

محمد اقبال چوہدری، محمد سرفراز، صمدی احمد، خان پور

حساب عمر کا اتنا ہی گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

امجد علی امجد ——— واپڈا کالونی، لودھراں

مقدر کی سب باتیں ہیں، یہ اپنا اپنا دامن
تم کو ملی جاہ و حشمت، ہم کو ملا کردار

عظمت نظمیر ——— ضلع وہاڑی

تھک گیا ہوں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

کشور سلطانہ ——— بھلوال

اپنے کردار کو موسم سے بچائے رکھنا
لوٹ کر آتی نہیں پھولوں میں خوشبو کبھی



طارق طارق ——— وہاڑی

کس کی سوچ کے وہ بات کہی تھی میں نے
تیرے چہرے پہ ذرا شام کا منظر دیکھوں

امین خان جعفری ——— نواں کوٹ لیہ

کل جنہیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

رفیع ——— سرگودھا

وقت ہی کو جو بدل دے وہ ہے انسان عظیم
وقت کے ساتھ بدلنا کوئی کردار نہیں

ساجد حبیب تابش ——— گاؤں بھجبا اٹک

حوصلہ ہو تو کبھی آنچ نہیں آئے گی
غم کے پگھلے ہوئے لاوے سے گزر کر دیکھو

حبیب اعوان، عبدالقیوم اعوان، بخشی آباد، وادی سون خوشاب

تم مجھ سے پوچھتے ہو وہ رسم زندگی
مجھ کو غم حیات نے جینے کہاں دیا

فضل نقوی، ارشاد نجیم، صاحب والی سیداں، ملک والی

لذت ہجر کے مزے خاور
کون کہتا ہے تجھ سے آنے کو

گل رحمان ——— جھنگ شہر

خموشی کی جھیل میں اک تم ہی نہیں
غرق ہے شہر ہی سارا دیکھو

سہیل، مرزا شہباز حیدر، سینٹرل جیل ملتان

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اقبال ساجد ——— پکوال

روتے ہیں دل کے زخم تو ہنستا نہیں کوئی
اتنا تو فائدہ مجھے تنہائیوں سے ہے

یوسف جمیل بٹ، شاہد جمیل بٹ، راولپنڈی

تیرے ان پر جو اپنے بچوں کو
ماؤں کا لہو ——— چک نمبر 64/12 ملاتے ہیں

عبدالغفار ساجد

کوئی فروزاں رہیں گے یہ چاہتوں کے چراغ
کہ جب تلک یہ دل داغ دار باقی ہے

فرحان خان ——— پشاور یونیورسٹی

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کرسکے

احسان اللہ بھٹی ——— کروڑ لعل عیسن

سوزش قلب ہی کیا کم تھی جلانے کے لیے
وہ بھی آنچل کھینچتے ہوئے رخسار کے ساتھ

ملک محمد اسلم طاہر ——— خانیوال

جاہی پہنچے تھے تو پھر چاندنی لے کر آتے
لائے بھی چاند سے کچھ لوگ تو لائے پتھر

واجد بیا سکین ——— پکوال

اے کشتی حیات، تو ساحل نہ کر تلاش
طوفان پل رہے ہیں کناروں کی گود میں

شاہی نام ——— پنڈی بھٹیاں

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھے داغوں کی بہار
آگ ایسی لگی اس گھر کو کہ جو تھا جل گیا

قرۃ العین ناصر ——— لکی مروت

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کردے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

رانا محمد اشرف ——— سبزی مارکیٹ روڈ پیرو

لوگو، میرے افکار پہ پہرے نہ بٹھاؤ
جذبے کبھی پابند سلاسل نہیں ہوتے

محمد عمران خان ——— فیصل آباد

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سر آئینہ میرا عکس ہے پس آئینہ کوئی اور ہے

عتیق العالم گرواہ ——— جھنگ

صداقتوں کے حقائق عجیب ہوتے ہیں
اسی کے لوگ اسی کے رقیب ہوتے ہیں

محمد موسیٰ حسرت ——— بیلہ، بلوچستان

میں تجھے کھوکے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تونے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

احمد ضیا نعیم ——— کاموکیٹ

نکل ہی آتی ہے کوئی نہ کوئی گنجائش
کسی کا پیار کبھی آخری نہیں ہوتا

محمد اسلم ندیم ——— ضلع گوجرانوالہ

میں خود غرض بھی بس اتنا کہ چاہوں
ہمیشہ رہیں میری منظر تیری آنکھیں

نزاکت ساقی ——— لودھراں نیک سنگھ

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

## محفلِ شعر و سخن

نام ———

پتا ———

———

نوعمر لکھاری نمبر اگست 2000

افلیم علیم

ایک نوجوان کے جنون کی داستان۔ اس نے منشیات کے عالمی اسمگلروں کے خلاف ذاتی طور پر محاذ کھولا اور پھر ملک دشمنوں کا صفایا کرنا اپنا ایمان بنا لیا۔ شہر شہر، ملک ملک اور بیرونِ ملک گھومتا رہا۔ اپنے وطن کی حکومت کے لیے خاک اڑاتا رہا۔ اس نوجوان نے کیا کیا جتن کیے، کیا کیا جنگ جوا جیتے، یہ سسپنس کا تھرلر سلسلہ، اللہ کرے نسلوں کو یاد رہے۔ فوری کارروائی کرنے والوں کی تصویریں

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

لاہور میں جانے پیدا ہوتی ہے۔ والد صاحب کی وفات اور سوتیلی ماں کے مظالم پر میں نے گھر اور شہر چھوڑ کر کراچی میں پناہ لی تو یہاں جاسوس، ڈاکو اور نادر سے میری دوستی ہوئی اور ہم چاروں نے روزگار کی تلاش میں بڑی جدوجہد کی۔ ان دنوں میں نے منشیات فروشوں کی ایک بھیانک عالمی تنظیم شی کے بارے میں سنا۔ اس تنظیم کے خاتمے کی خاطر میں نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اس کی وجہ سے میری دوستی ایک پاکستانی سائنسدان سے ہوئی جو اپنی ایجاد کو فروخت کرنے کے لیے پاکستان میں برس کا۔ عمران پیدا کر کے بیوی کو فروخت کرنے کی ایک بھیانک عالمی تنظیم شی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان لوگوں نے مشعل حارثے کو بیوی بنوں، سلطان شاہ مجھے آنکھ دیا اور بعد میں میرے دوست ثابت ہوئے۔ شی کے سربراہ جی لائیڈ کی۔ ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف ہیرو کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ان کی میرے لیے کاپیاں گیا۔ میں نے ملک میں اور ملک سے باہر ان کی خفیہ اور دہشت گردی کی کارروائیوں کو ناکام بنانا شروع کر دیا۔ میرا لگایا ہوا بم نے مجبور کر دیا جس پر مجھے الیا اضافہ کرنے تھا کہ وہ میرا بال بھی بیکا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قوی مفادات کے اہم ترین معاملات میں مجھے اول خان نے بہت مدد فراہم کی۔ وہ زندگی سے بھرپور اور دھن کے پکے جاں باز دل کی ایک ایسی پراسرار فائٹنگ ایجنسی کا سربراہ تھا۔ جسے ایکسٹرا ٹارک فورس کہا جاتا تھا۔ جی لائیڈ کی بیٹی ویرا بھی ابتدائی دشمنی کے بعد میری حلیف بن گئی۔ ویرا میری دوست تھی مگر ذرا ایک مدت سے میری محبت تھی۔ حالات کی ستم ظریفی کہ ہم دونوں کو ملکوں دونوں کو آمنے سامنے ایک پیچیدہ ماسائش کے مہاذ پر شادی پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ سری طرف امریکا میں آرمرڈ بیل ہاؤ ایک سیل پرست بیوی دہشت گرد اپنے اڈہ سوسائٹی کا ماہر فی کے بے انداز نعمالی وسائل کا مالک ہونے کے بعد میری حلیف بن گئی۔ میسوئی تنظیم کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ جی لائیڈ کو صدارتی انتخاب میں کامیابی کی مجبوری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس کی پراسرار ہلاکت کے بعد آرمرڈ ٹارک ویرا اس کی بھرپور ہیروئن کے پیداواری ذرائع پر قبضہ کرنے کے منصوبے کے علاوہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو نقصان پہنچانے کے مذموم خواب کو عملی جامہ پہنانے کی سازشوں کے ساتھ پاکستان پہنچا مگر یہاں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے انجام سے خوف زدہ ہو کر واپس امریکا فرار ہوا۔ ہم بھی اس کے تعاقب میں امریکا پہنچے جہاں ہماری کوششوں سے اس کی سازشوں کا آغاز ہوا اور وہ ڈیڈ اسٹارز اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے کیمپ کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظر میں مشتبہ ٹھہرا۔ اپنے وطن کی کامیابی کے ساتھ ہم پاکستان واپس پہنچے، یہاں مدن موہن کے ٹیلیفونک انفارمیشن سیل کے دو ممبران سے تفتیش کے نتیجے میں کنٹرول راجہ اندر کا نام سامنے آیا۔ اپنی سیاسی حیثیت کے باعث وہ ہمارے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوا اور ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلنے کی طرح پھسلنے کے بعد اسلام آباد پہنچا مگر اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے اسے واپس کراچی لایا گیا اور وہ میجی تنظیم کے نتیجے میں امریکی ایجنٹوں سمیت جہنم واصل ہوا۔ اب ہمارے سامنے امریکی تو تھلیٹ کا ملازم اور ایرانی ڈی منٹ تھا۔ میں اس سے امریکن گرین کارڈ کے لالچی کرنل جمال دستی کے روپ میں ایس ٹی الف کے غدار کی حیثیت سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ میں اپنی کو حلاش کر کے اس کے حوالے کرنے کے لیے بے وقت

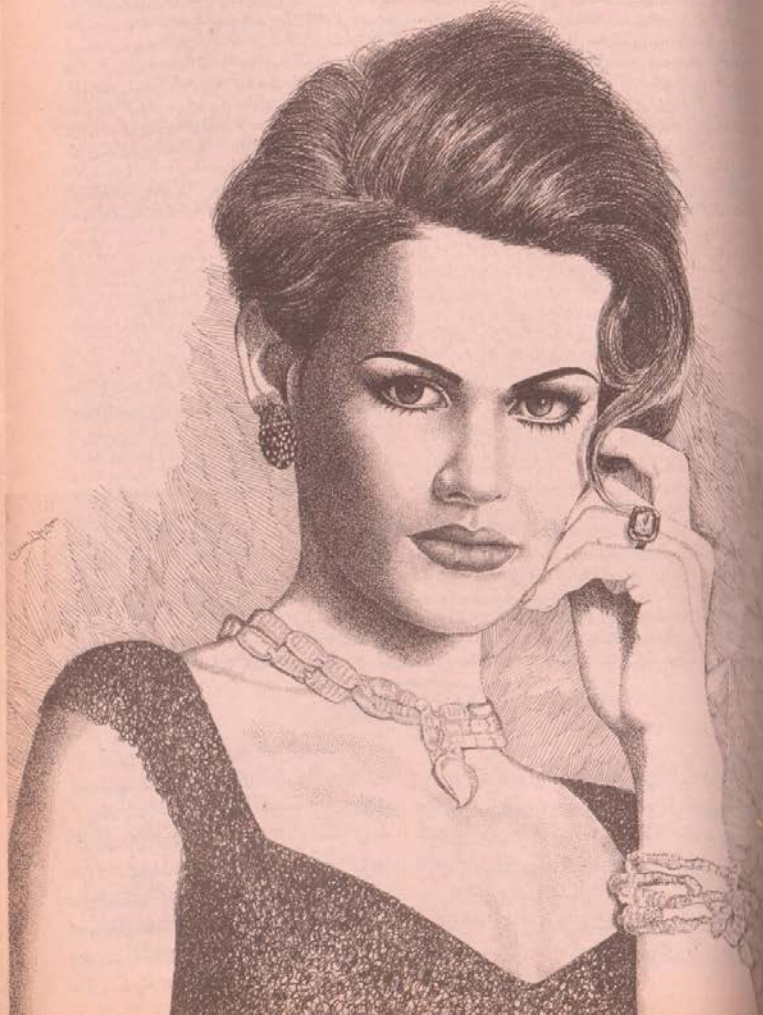

تیار ہوں۔" وہ دوسرے امریکیوں کے مقابلے میں قدرے مشکل ثابت ہو رہا تھا' اس نے میجر اور اول خان کے فگر پرنٹس بھی حاصل کرلیے۔ اس کی بدحواسی ہوئی مگر کہیں کو روکنے کے لیے اول خان نے حکام سے بات کی اور انہوں نے فیصلہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے ایوبی سے رابطہ کیا مگر وہ تین دن بھی حاصل کرلیے۔ اس کی بدحواسی ہوئی مگر کہیں کو میجر بخشی کے سپرد کردیا۔ جس نے مجھے دھمکی رابع سے بھی متعارف کروایا۔ میجر بخشی گرمل سمال دستی کافی ہنسی جانتا تھا' اس پکڑ میں اس نے مجھے ایڈیٹر توضیحات کے بھی کی تاہم بعد میں اسے کرنل سمال دستی کی حیثیت پر ترقی مل گئی۔ ایوبی ہنٹسے اپنی کارروائیاں چھپ کر کامیاب ہوتا تھا۔ اس نے مجھے ایڈیٹر توضیحات کی کامیاب کوشش کے نتیجے میں رحم اپنی ادارے ساتھ تیار ہوا پاکستان میں یہ کارروائی کے خلاف سازشوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ کرائے کے قاتل بھی فراہم کیا کرتا تھا۔ میں نے اس تک رسائی حاصل کی اور بھاری معاوضے پر ایوبی ہنٹ کے ساتھ کام کرنے کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ سب توقع اس کے ساتھیوں سمیت انسانی حقوق کے محافظ اداروں کا انکشاف کیا کہ ایوبی کے کاندانے نے جن سے پنت منوہر لال کو اسرائیلی ٹیکنیکل سپورٹ حاصل ہوا ہے اس کے گہرے مراسم ہیں جس کے بعد میں نے پنت منوہر لال کو گرفتار کرنے کی تلاش کیا اور بھاری معاوضے پر اپنی ہنٹ کے سپرد کیا گیا ہے۔ ہمیں علم ہوا کہ پنت منوہر لال نے اس کے گہرے مراسم ہیں۔ اسی دوران میں رحم اپنی طرف متوجہ ہوسکے۔ اس کا کردار محترم آکرم الٰہی تھا جو بظاہر ایک نام نہاد میں الاقوامی این جی او فرینڈز انٹرنیشنل کے پاکستان میں انسانی حقوق کے حوالے سے نمائندہ تھا۔ اس نے جواب میں پنت منوہر لال کو گرفتار کرلیا۔ ہمیں پتا چلا کہ اسے مقبل چوہدری کی محبوبہ نے پنت منوہر لال کے ساتھ ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے مقبل چوہدری کے ایڈیٹر ہونے کا علم ہوا کہ پنت منوہر لال اور اپنی منظور نظر طوائف کے گھر جا پہنچا۔ فرینڈز انٹرنیشنل کے رفتہ رفتہ ہوسکے۔ اس کا کردار محترم آکرم الٰہی تھا جو بظاہر ایک نام نہاد میں الاقوامی این جی او فرینڈز انٹرنیشنل کے پاکستان میں انسانی حقوق کے محافظ اداروں کی نگرانی کرنے والے ایک ادارے کا سربراہ تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے مقبل چوہدری کی محبوبہ نے پنت منوہر لال کے ساتھ ہونے کی اطلاع دی تھی

تو شاید میں بھی زندہ رہ سکوں۔"

"ہمیں ان سے جو کچھ اگلوانا تھا' وہ گرین فارم میں اگلوالیا تھا۔" اول خان نے سلطان شاہ کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "وہ دونوں ایف بی آئی کے ایجنٹ تھے۔ ہم اس وقت دو محاذوں پر لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان کو اسی ویرانے میں چھوڑ دیا گیا۔"

"میں تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرسکتا' ڈینی اور ویرا کے اصل دشمن وہی تھے۔ میں تو انعام کی رقم لے کر ان کا انفارمر بننا چاہ رہا تھا۔ اب تک تم بھی جان چکے ہوگے کہ وہ سارے معاملات طے کرنے کے لیے میرے پاس آئے تھے۔"

"ان سے تم موبائل فون پر سب معاملات طے کرسکتے تھے۔ اس کے لیے انہیں میمن گوٹھ جانے کی کیا ضرورت تھی؟" اس بار سلطان شاہ اس سے بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

"وہ را کے ایجنٹ سے نہیں' ایک انفارمر سے ملنے آئے تھے۔" اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ فخر کے اظہار کے جذبے پر قابو نہ پاسکا۔ "پیشگی رقم لے کر ایک انفارمر سے مذاکرات کرنے آئے تھے۔ رقم فون کے ریسیور سے باہر نہیں آسکتی تھی اس لیے مجھے ان کو گرین فارم بلانا پڑا اور تم لوگ ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے۔"

"وہ دونوں ہماری تحویل میں نہیں ہیں۔" میں نے فرش پر پڑے ہوئے سفید نیولے کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس ہماری کہی ہوئی ہر بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"وہ نہیں ہیں تو مراد ظریف ہی کو لے آؤ۔ اسے تم لوگوں نے اغوا کیا تھا۔" اس نے مطالبہ کیا۔

"تم اپنی اور صرف اپنی بات کرو۔" میں نے درشتی سے کہا۔ "ہمارا واحد دشمن زندگی کی بھیک مانگ سکتا ہے۔ اس کے سوا اسے کوئی اور حق حاصل نہیں ہوتا۔ تم کھیل کا یہ اصول نہیں جانتے تو بہ ترین موت کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"ہر بات چھپانے پر تلے ہوئے ہو تو مجھے صرف ایک بات بتادو۔ صرف ایک بات!" وہ قدرے توقف کے بعد گڑگڑایا۔

"جلدی پوچھ ڈالو مگر ضروری نہیں کہ تمہیں اس کا جواب بھی دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"تم گرین فارم میری تلاش میں آئے تھے یا امریکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے؟"

"ہمیں صرف اور صرف تمہاری تلاش تھی۔ آج کل امریکیوں سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

"تمہیں میمن گوٹھ کا سراغ کیسے ملا؟" اس نے کراہتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تمہارا دوسرا سوال ہے۔" سلطان شاہ بول پڑا "تمہیں صرف ایک سوال کی اجازت دی گئی تھی۔"

"نہیں۔۔۔ تمہیں اس سوال کا جواب بھی ملنا چاہیے۔ تمہارے ٹھکانے کی نشان دہی ایک ایسی ہندو عورت نے کی تھی جسے مسلمان مرد بہت پسند ہیں۔" میں نے اس کے دل میں بغض و حسد کی آگ بھڑکانے کی نیت سے کہا۔

وہ کتنا ہی گھاگ' مضبوط اور اپنے مشن سے مخلص رہا ہو مگر آخر کار ایک انسان بلکہ جنونی ہندو تھا۔ میرے الفاظ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا اور وہ اپنی بے ساختہ کراہوں کو ضبط کرکے غصے اور بے بسی سے بولا "یہ وہی کتیا ماروتی ہوگی' اسی کو مسلمان مرد بہت مرغوب ہیں۔ اس نے اپنی ضرورت کی حد تک روی کو بھی مسلمان بنایا ہوا ہے۔ روی پر اعتماد کرتے ہوئے میں یہ نکتہ بالکل بھول گیا تھا کہ وہ ماروتی کا زن مرید شوہر ہے اور راز کی ہر بات اسے ضرور بتا دیتا ہے۔"

"مگر ماروتی اتنی شوہر پرست نہیں ہے۔" ویرا نے اپنی دانست میں اسے ایک اور چرکا لگایا "وہ اپنے رازوں میں روی کو شریک نہیں کرتی۔" ویرا نے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوکر مجھے آنکھ ماری اور پھر اپنی بات جاری رکھی "ڈینی نے اسے اچھی طرح پرکھا اور برتا ہے۔ تم چاہو تو اس سے ماروتی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرسکتے ہو۔ تم اس کے گرویدہ نیولے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ تم لوگوں کے ہاتھوں سے بچ کر اسے ایسی موت ماروں گا کہ آئندہ ہماری کوئی عورت کسی مسلمان مرد کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کانپ اٹھے گی۔" وہ شدتِ اور جنون میں چند لمحوں کے لیے اپنی تکلیف کو بھول گیا۔

"ایسی ناممکن باتیں سوچ کر اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔ تمہارا وقت پورا ہونے والا ہے۔" ویرا بولی۔

"جو بات مجھے پہلے سے معلوم ہے اسے بار بار دہرا کر مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم مجھے مار دو' میں دوسرے جنم میں آکر تم سے انتقام لوں گا۔"

"دوسرا جنم!" ویرا نے استہزائیہ قہقہہ لگایا "آواگون کے نظریے میں ذرا سی بھی جان ہے تو تم اپنے دوسرے جنم میں چھپکلیاں مارتی ہوئی چھچھوندر یا نیولے کے روپ میں پیدا ہوگے۔ تمہیں دم سے پھرا کر فرش پر مار دیا جائے گا۔"

"مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔" کرشن کمار نے فرش سے اٹھنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد فریاد کی۔

"اس کے حلق میں اس سمندر کا کھارا پانی اتارنا چاہیے جہاں اس کے اکھنڈ بھارت کی دوسری سرحد ختم ہوتی ہے۔" ویرا نے یکایک گہری سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے تجویز پیش کی پھر کہا "اب تم سب باہر چلے جاؤ۔"

"کہاں؟" سلطان شاہ ویرا کی اس انوکھی ہدایت پر حیران ہوکر بولا۔

"کہیں بھی۔" ویرا نے کہا "کچھ دیر کے لیے تم چاروں کہیں بھی چلے جاؤ۔ میں اس تخلیے میں اس سفید نیولے سے اپنا حساب بے باق کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس کے لیے ہمیں کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟" سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' اس پر عمل کرو۔" ویرا براہِ راست اسی سے مخاطب ہوکر سختی سے بولی "یہ ہندو ہے اور میں لبرل کرسچین۔ یہ میرا مجرم ہے۔ اس نے میرے گھر میں گھس کر میری توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سے جو انتقام لوں گی' وہ شاید تمہاری طبیعتوں کو مکدر کردے۔ تم چاروں مسلمان ہو' خاموشی سے باہر چلے جاؤ۔"

پتا نہیں وہ کیا کہنا اور کر گزرنا چاہ رہی تھی۔ اس کا لب و لہجہ یکایک اتنا تند ہوگیا تھا کہ میں مذاہب کے حوالے سے اس سے کوئی سوال نہیں کرسکا۔ اس کا کوئی ٹیڑھا جواب ہمارے درمیان بدمزگی پیدا کرسکتا تھا۔

"کچھ معلوم تو ہو کہ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہ رہی ہو!" اول خان نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"واپس آؤ گے تو تمہیں خود علم ہوجائے گا۔" ویرا نے تلخی سے کہا "اب وقت برباد نہ کرو۔"

ویرا کے ذہن میں یقیناً کوئی شیطانی خیال سما چکا تھا۔ اول خان کی استفسار طلب نگاہیں میرے چہرے کی طرف اٹھیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اور پھر ہم چاروں سر جھکا کر وہاں سے نکل گئے مگر اس گارڈ روم سے زیادہ دور نہیں گئے۔

"اس وقت وہ زخمی اور بے بس ہے' اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ ویرا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" اول خان نے قدرے بلند آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھایا۔

اچانک کمرے سے ایسی آوازیں ابھرنے لگیں جیسے کرشن کمار کے پیٹ میں شدید ضربات لگائی جارہی ہوں یا اسے زور سے ابکائی آرہی ہو۔

"میں اپنے دشمن کو کبھی پیاسا نہیں مارتی۔" وہ ویرا کی غراتی ہوئی' وحشیانہ سرگوشی تھی۔ شاید جوشِ انتقام میں اسے اندازہ نہیں رہا تھا کہ اس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

پھر اندر سے اٹھاپٹخ اور ہڑبونگ کی آوازیں آئیں جو کرشن کمار کی ایک بے ساختہ اور لرزہ خیز چیخ میں بدل گئی۔

چند ثانیوں بعد ویرا کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے' داہنے ہاتھ میں خون سے لتھڑا ہوا چاقو تھا۔ وہ اپنے دوپٹے سے ہاتھ اور چاقو کا پھل یوں صاف کرتی ہوئی برآمد ہوئی تھی جیسے وہ بہت گندا خون ہو۔

کرشن کمار کی گالیاں اور چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ فرش پر اس کے بدن کے اچھلنے اور گرنے کی آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ ویرا کی دی ہوئی نئی سزا نے اسے ٹوٹی ہوئی کمر کا درد بھول جانے پر مجبور کردیا تھا۔

"اب وہ تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں خود ہی ٹھنڈا ہوجائے گا۔" ویرا نے سرد اور سپاٹ آواز میں اعلان کیا۔

رات کے گھور اندھیرے اور گہرے سناٹے میں دور دور تک گونجتی ہوئی ان چیخوں میں چند منٹ بعد ہی نقاہت غالب

آنے لگی۔ ہم پانچوں گارڈ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی کے انعکاس میں' تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھڑے رہے۔ ویرا نے اپنے ہاتھ اچھی طرح صاف کرکے چاقو بند کیا اور اپنے بیگ کی اگلی جیب میں ڈال لیا۔ خون آلود دستانے اس نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔

میں آہستگی سے گارڈ روم کی طرف بڑھا تو ویرا نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

کمرے کے فرش پر کرشن کمار کسی گٹھڑی کی طرح سمٹا ہوا پڑا تھا۔ اس کے گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے' ہاتھ ان کے درمیان تھے اور چہرہ گھٹنوں میں گھسا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر پنچ کی سی کیفیت طاری تھی' حلق سے خود کار انداز میں نقاہت زدہ کراہیں آزاد ہو رہی تھیں اور اس کے جسم کے گرد' دور تک خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جسم سے بہت تیزی کے ساتھ خون بہنے کی وجہ سے وہ کسی بھی لمحے زندگی کی ہر کشمکش اور بازپرس کے جھمیلوں سے آزاد ہونے والا تھا۔ اس کے بدن کی مڑی تڑی ہوئی حالت دیکھنے کے بعد میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ ویرا نے اپنے تیز دھار چاقو سے اس کے جسم کے کس حصے کو نشانہ بنایا ہوگا۔

ویرا نے کرشن کمار کو موت کے کھاٹ اتارتے ہوئے درندگی کی انتہا کردی تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ مرجانے کے بعد ہر مخبر محض ایک لاش ہوتا ہے اور کوئی لاش دوسروں کو اپنے آخری لمحوں کی کہانی سنانے کے قابل نہیں رہتی جسے سن کر دوسرے عبرت حاصل کرسکیں۔

فورڈ فاؤنڈیشن کے چار چہیتوں کے علاوہ کرشن کمار کے بقیہ ساتھی ایک ایک کرکے منظرعام سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوتے چلے آئے تھے۔ ان میں اکرام الٰہی اور مقبول چوہدری کے بعد تیسرا اہم شکار مراد ظریف تھا لیکن کرشن کمار کی موت کا منظرعام پر آنا ضروری تھا۔

وہ متحدہ طور پر را کے کمانڈو گروپ سے وابستہ تھا۔ صحرائے تھر کی ریگستانی بستیوں میں شاید اس نے کچھ نیک نامی کمائی ہو ورنہ اس کی تخریبی سرگرمیاں کھلے راز کی طرح تھیں۔ سرحدی علاقے میں مسلح جتھوں کے لیے تربیتی کیمپ کا معاملہ علاقے کے باسیوں سے کسی طرح پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ میجر بخشی اور اس کے ساتھیوں کی طرح کسی سفارتی آڑ یا تحفظ کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر موجود نہیں تھا۔ وہ دہشت گردی' تخریب کاری اور سازشی مقاصد کے لیے خفیہ طور پر پاکستان آیا تھا۔

اس کی لاش کی تشہیر پر راد والے محض انگاروں پر لوٹ کر رہ جاتے' ان کی حکومت سرکاری سطح پر احتجاج کا ایک لفظ بھی بلند نہیں کرسکتی تھی۔

"وہ مرنے میں کتنا وقت لے گا۔" میرے قریب پہنچنے پر سلطان شاہ نے بے رحمی سے پوچھا۔

"اسے مرا ہوا ہی سمجھو۔ اس کا انجام یہی ہونا تھا لیکن ویرا نے اس کام میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی ہے۔" میں نے کہا "وہ اپنی ہٹ دھرمی کے باوجود باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ اگلتا جارہا تھا۔"

"یہاں تک جو کچھ ہونا تھا' ہوتا چلا گیا۔" اول خان نے زبان کھولی "اس کے مرنے کے بعد جو دشواریاں کھڑی ہوں گی' ان کو سنبھالنا میرے بس سے باہر ہوگا۔"

"کرشن کی موت سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اصل معاملہ ڈیوڈ اور جمی کا ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ ان کی موت پر امریکی کس ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔"

"ہمیں سر جوڑ کر ان پہلوؤں پر غور کرلینا چاہیے۔" اول خان نے قدرے تشویش سے رائے دی "میرا خیال ہے کہ کرشن کمار کے بارے میں اپنے اسٹاف کو بریف کیے دیتا ہوں تاکہ ہم دفتر میں بیٹھ کر سارے پہلوؤں کا جائزہ لے سکیں۔"

"دفتر نہیں' اب گھر چلنا چاہیے۔" ویرا نے کہا "میرے ہاتھ ابھی تک اس کے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ میں جب تک گھر جاکر اس گند سے نجات حاصل نہیں کرلوں گی' مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

"اسٹیشن فور پر غسل خانوں کی سہولت موجود ہے۔ تم کئی دن یہاں رہ چکی ہو۔" اول خان نے اسے یاد دلایا۔

"مجبوری ہو تو بہت کچھ چل جاتا ہے' اس وقت گھر جانا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔"

"کرشن کمار تمہارا اکلوتا قیدی تھا۔" میں نے ویرا کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "اس کے مرجانے کے بعد یہاں ایسا کون سا اہم کام باقی رہ جائے گا جس کے لیے تمہاری موجودگی ضروری ہو؟"

اول خان لاجواب ہوگیا۔ اپنا کام پورا کرلینے کے بعد اسے بھی اپنے گھر جانا تھا۔ بہتر یہ تھا کہ ہم راستے میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے اپنے گھر چلتے اور اول خان تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا۔



ہم اپنی گاڑی سے وہاں پہنچے تھے۔ اول خان کو اپنی سرکاری لینڈ روور سے گھر لوٹنا تھا۔ میمن گوٹھ کی مہم میں اس نے سلطان شاہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ یوں وہ دونوں ہی ان واقعات کے عینی شاہد تھے۔ طے یہ ہوا کہ سلطان شاہ ہماری گاڑی میں دونوں عورتوں کو لے جائے گا' میں اول خان کے ساتھ وہ سفر طے کروں گا۔

حامد اپنے چند آدمیوں کے ساتھ قریب ہی موجود تھا۔ اول خان نے اسے بلا کر کرشن کمار کے بارے میں مختصر ہدایات دیں۔ ان لوگوں کو اس کی موت کے بعد ہماری آخری ہدایات کا انتظار کرنا تھا اور پھر ان ہی کے مطابق اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا تھا۔ مجھے درمیان کی بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا مگر پھر بھی میں اپنا ذہن بنا چکا تھا کہ کرشن کمار کی لاش کا میجر بخشی کے گھر کے آس پاس پایا جانا ہمارے وسیع تر مفاد میں ہوسکتا تھا۔ وہ لاش بھارتی قونصل خانے میں موجود را کے ایجنٹوں کے لیے موثر پیغام ثابت ہوسکتی تھی۔

واپسی کے سفر میں اول خان نے اپنی کہانی چھیڑ دی۔ اس کی بے جا ضد کی وجہ سے میں اس مہم میں شریک نہیں ہوسکا تھا اس لیے اس کی کہی ہوئی ہر بات کو ذہن نشین کرتا رہا۔ وہ خاموش ہوا تو میرے ذہن میں سوالات جمع ہوچکے تھے۔

"کیا تمہیں کرشن کمار کی اس بات پر یقین آگیا ہے کہ جمی اور ڈیوڈ اس کی اصلیت سے واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی دانست میں ایک خفیہ مخبر سے ملاقات کے لیے میمن گوٹھ پہنچے تھے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"مجبوری ہے۔" وہ ذہنی طور پر میرے اس سوال کے لیے تیار تھا "اگر کرشن کمار کے اس موقف کو رد کردیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان دونوں نے اتنی رات گئے کراچی سے نکل کر میمن گوٹھ جانے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ انہیں علم ہوتا کہ وہ را کے ایجنٹ سے کوئی سودے بازی کررہے ہیں تو وہ کسی بھی طرح دباؤ ڈال کر اسے اپنے کسی ٹھکانے پر آنے پر مجبور کردیتے۔"

"کیا تمہیں یہ بات عجیب محسوس نہیں ہوتی کہ وہ ایک اجنبی مخبر کی فون کال پر اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر میمن گوٹھ کی طرف دوڑ پڑے؟ آج بھی انہیں سرکاری طور پر بہت محتاط نقل و حرکت کی ہدایات ملی ہوئی ہیں۔"

"بات عجیب ضرور ہے مگر ناقابل فہم نہیں ہے۔" اول خان نے جواب دیا "تمہارے پہنچنے سے پہلے بھی ہم کرشن کمار سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ تمہاری اور ویرا کی ذات میں امریکیوں کی گہری دلچسپی کا کمال تھا کہ وہ ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر وہاں پہنچ گئے۔ پے در پے منہ کی کھانے کے بعد اگر وہ بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ تم دونوں کو یا تم میں سے کسی ایک کو پکڑ کر پاکستان سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوجاتے تو اندازہ لگاؤ کہ کیا پوزیشن ہوتی! بس یہی خوش گمانی انہیں لے ڈوبی۔"

"کراچی کی حدود سے نکل کر وہ سیدھے گرین فارم کیسے پہنچ گئے؟" میں صورت حال سے مطمئن نہیں تھا۔

"یہ کارنامہ ان کے خبیث شوفر کا تھا جو بعد میں دو افراد کے قتل کا اقبالی مجرم ثابت ہوا۔ وہ کراچی کے مضافاتی علاقوں سے بڑی حد تک واقف تھا۔ فون پر ڈیوڈ سے بات ہونے کے بعد کرشن کمار نے شوفر کو گرین فارم پہنچنے کا راستہ سمجھایا تھا۔"

"ڈیوڈ سے پہلے' کرشن کمار نے ہمیں بھی فون کیا تھا۔ وہ موبائل فون استعمال کررہا ہوگا۔"

"ہاں' اور ان دونوں کے پاس بھی اپنے اپنے موبائل فون تھے۔" اول خان بتانے لگا "اپنی دانست میں وہ پوری تیاری کے ساتھ گرین فارم پہنچے تھے وہاں پہلا فائر ہوتے ہی انہوں نے کراچی میں اپنے بڑوں کو حالات بگڑنے کی خبر دے دی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خطرہ شروع سے موجود تھا۔ ان دونوں کے پاس فون نہ ہوتا تب بھی مجھے معلوم تھا کہ کرشن کمار کے پاس فون کی سہولت موجود ہے۔ میں نے ابتدا سے ہی طے کرلیا تھا کہ تصادم کا آغاز ہونے کے بعد جلد از جلد بساط لپیٹنے کی کوشش کی جائے گی اور ہم اس میں کامیاب بھی رہے۔"

اول خان اپنی کامیابی پر کسی حد تک نازاں تھا مگر اس بات نے مجھے فکرمند کردیا کہ ڈیوڈ اور جمی اپنے بڑوں کو گزبز سے باخبر کرچکے تھے۔ دونوں امریکیوں میں سے کسی نے اس امر کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ کراچی میں کسی سے رابطہ کرچکے تھے مگر کرشن کمار نے اسٹیشن فور کے گارڈ روم میں پہنچنے کے بعد دھمکی دینے والے انداز میں انکشاف کیا تھا کہ امریکی اپنے افسران بالا کو اعتماد میں لے چکے تھے اور ان کے حمایتی پولیس فورس کی مدد سے کسی بھی لمحے حالات کا پانسا اپنے حق میں پلٹ سکتے تھے۔

وہ خبر باہر نکل ہی گئی تھی تو امریکیوں کی حادثے میں ہلاکت کا ڈراما بہت کمزور ہوسکتا تھا۔ فارم کے ملازمین بہت آسانی سے اگل دیتے کہ وہاں کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔ امریکیوں سے ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی ہوگی اس لیے

اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ تینوں گارڈز سے بھی اس بارے میں کسی اہم انکشاف کی توقع نہیں تھی۔

اول خان کو یہ یاد نہیں تھا کہ تیسرے گارڈ کو پہلے بے ہوش کیا گیا تھا یا اس سے پہلے امریکیوں کی باری آئی تھی۔ اگر اس اہم نکتے کو نظرانداز کردیا جاتا تھا تو کہانی میں جان پڑ سکتی تھی۔

ان تمام واقعات میں دو باتیں بہت بہتر ہوئی تھیں۔ امریکیوں کو ایسے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا کہ ان کے جسموں پر تشدد کی کوئی علامت نظر آتی اور دوسری بات یہ تھی کہ دور دور سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے کے سبب کوئی گولی کامپیج کے باہر کھڑی ہوئی امریکیوں کی گاڑی میں پیوست نہیں ہوئی تھی۔ ان کے ماہرین بھی جلی ہوئی کار کے ڈھانچے کا معائنہ کرکے گولی کا کوئی سوراخ دریافت نہیں کرسکتے تھے۔

اگر وہ تینوں نکتے درست تھے تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ نامعلوم افراد سے تصادم شروع ہونے کے بعد، کوئی نقصان اٹھانے سے پہلے، امریکیوں کو گرین فارم سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ کچا راستہ ڈرائیور کے لیے اجنبی تھا۔ اپنے آقاؤں کو اصل خطرے سے بچالے جانے کے بعد وہ دہشت اور گھبراہٹ کے باعث اپنی گاڑی پر قابو نہیں رکھ سکا اور کچے راستے پر سامنے آنے والی کسی گاڑی سے تصادم کے نتیجے میں امریکیوں کی گاڑی اپنے تینوں مسافروں سمیت کھائی میں گر کر جل اٹھی۔

تصادم کے بارے میں ایس ٹی ایف سمیت کسی ایجنسی کو کوئی ذمے داری لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ زرعی زمینوں اور فارموں پر پرانی رنجشوں کی بنا پر ایسے جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ اس "افسوس ناک" واقعے کو بھی ایسی ہی کسی شرپسندی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا تھا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کراچی کے گردونواح میں ان دنوں بدقسمتی نے امریکیوں کا گھر دیکھ لیا ہو۔ باب رافیل کے واقعے کی گرد پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ گرین فارم کا قضیہ سامنے آگیا تھا۔

امریکیوں کے لیے یہ وضاحت کسی بھی طرح آسان ثابت نہ ہوتی کہ سخت احتیاطی ہدایات کے باوجود دو امریکی اہلکار رات کی تاریکی میں اس ویرانے میں کیا کرتے پھر رہے تھے۔

باب رافیل خوش نصیب تھا کہ کراچی کے ایک بھرے پرے ہوٹل میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود مناسب سزا سے بچ گیا تھا اور اعلیٰ ترین امریکی سطح سے صدارتی معذرت یا مداخلت کے بعد رہا ہو کر اپنے ملک واپس بھیج دیا گیا تھا جبکہ ڈیوڈ اور جمی کو کوئی چھتری میسر نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں پکڑے گئے اور ذرا سی دیر میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیے گئے۔

پیشگی اطلاع دیے بغیر ایسے ویرانوں میں پراسرار سرگرمیوں کے لیے بھٹکنے والے سفارتی ملازمین کے تحفظ کے بارے میں کسی بھی پیمانے سے مقامی حکومت کو ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔

گھر پہنچنے تک، گرین فارم پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں میرا ذہن بالکل صاف ہوچکا تھا۔ مجھ سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد اول خان خود کو ہلکا اور پراعتماد محسوس کررہا تھا۔ ایسی باتوں کے اعتراف میں وہ ہمیشہ سے فراخ دل رہا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے گھر پہنچیں تو علم ہوا کہ راستے میں تبادلہ خیال کے دوران میں ویرا اور سلطان شاہ کے درمیان باقاعدہ جھڑپ کا آغاز ہوچکا تھا۔ غزالہ کی تمام تر مصالحانہ کوششوں کے باوجود ان دونوں کے منہ پھولے ہوئے تھے۔

ایک دوسرے سے ناراض بلکہ برہم نظر آنے کے باوجود ان دونوں میں سے کسی نے اپنے کمرے کا رخ نہیں کیا۔ وہ پانچوں ہی ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور اول خان نے حسب معمول فوراً چائے کی فرمائش کردی۔ ویرا نے اپنے ہاتھ اتنے صاف کرلیے تھے کہ اسے ہاتھ دھونے بھی یاد نہیں رہے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ سب کو صرف تمہاری بنائی ہوئی چائے پسند آتی ہے۔" ویرا نے مسکرا کر غزالہ سے کہا "یہ فرض تم ہی کو انجام دینا ہوگا۔" غزالہ کوئی اعتراض کیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔

"اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں کا مقدر یاور رہا اور ان کی پوری مہم بہت کامیاب رہی۔" ویرا سگریٹ سلگانے کے بعد بولی "لیکن یہ فیصلہ بہت غلط تھا کہ ہم میں سے صرف سلطان شاہ کو اول خان کے ساتھ بھیجا گیا۔"

"صرف اس لیے کہ تم بلاوجہ مجھ سے حسد کرتی ہو۔" سلطان شاہ نے فوراً ہی لقمہ دیا۔

"کیا بات ہے؟ تم دونوں کے درمیان موسم کچھ ناسازگار نظر آرہا ہے۔" اول خان نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہاری کامیابی سے سلطان شاہ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سب کچھ اسی نے کیا ہے۔" ویرا نے

سامنہ بنا کر بولی "تم اور تمہارے آدمی گرین فارم پر جھک مارتے رہے تھے۔"

"یہ بالکل غلط ہے، میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" سلطان شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے احتجاج کیا "تم چاہو تو غزالہ کو بلا کر اس سے تصدیق کر سکتے ہو کہ ویرا غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔"

"تم نے یہ الفاظ نہیں کہے لیکن تمہارا رویہ یہی ظاہر کر رہا تھا۔" ویرا نے بے پروائی سے کہا۔

"اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم دونوں نے ہر قدم باہمی مشورے سے اٹھایا تھا۔" اول خان نے ان کی بحث میں دخل انداز ہونے کی کوشش کی "وہاں ہر شخص اپنا اپنا کام کر رہا تھا۔ اگر سلطان شاہ اپنی کارکردگی پر خوش ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے۔"

"تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے، کرشن کمار کو تم نے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل، بالکل۔" سلطان شاہ نے پر زور انداز میں سر ہلا کر میری تائید کی "وہ قریب المرگ قیدی ہی سہی مگر اس پر آخری کاری وار ویرا نے کیا ہے۔ مرے ہوئے شیر کی گردن پر پاؤں رکھ کر تصویر بنوانے کا حق اسی کا بنتا ہے۔"

ویرا نے چند ٹانیوں کے لیے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا پھر بے بسی سے مجھ سے بولی "یہ مسلسل اس قسم کی بکواس کر کے میرا خون سلگا رہا ہے۔ اس سے کہو کہ شرافت سے بات کرے ورنہ اپنے کمرے میں چلا جائے۔"

"کمرے میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اپنا خون سلگوانے کے لیے تم وہاں بھی پہنچ جاؤ گی۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آدھی رات کے بعد کس کی کال آگئی تھی۔ اول خان بھی اس بے وقت کال پر حیران نظر آرہا تھا۔ میں نے دوسری گھنٹی پر اسپیکر فون آن کر دیا۔

فون پر جلال کی آواز سن کر مجھے خیال آیا کہ اپنی مصروفیات میں الجھ کر ہم اسے بالکل ہی بھول بیٹھے تھے۔ حد یہ تھی کہ گرین فارم پر خاموشی سے چڑھائی کرنے کے سلسلے میں، میں نے صرف کے دن سے مشورے پر اکتفا کیا تھا۔ جلال سے اس کی توثیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وقت کی کمی کے سبب مجھے وہ فیصلہ کرنا پڑا تھا مگر میں چاہتا تو بعد میں اسے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی میرے ذہن میں پچھلے چند گھنٹوں کی مختصر سی فلم چلنے لگی اور میں اس کے کسی متوقع شکوے کا جواب سوچتا ہوا فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سناؤ یہ کہ تم نے اپنے شکار پر کامیابی سے ہاتھ ڈال دیا ہے؟" میری آواز سنتے ہی جلال کی طرف سے سوال کیا گیا۔

"یہ کارنامہ اول خان اور سلطان شاہ نے سرانجام دیا ہے۔ اس بارے میں میرا کے دین سے رابطہ رہا تھا۔"

"مجھے رپورٹ مل گئی تھی۔" اس نے میری بات درمیان سے ہی کاٹ دی "میرے آدمی اس معاملے سے دور رہنے پر مجبور تھے، ہم کسی واضح پالیسی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تم نے بروقت اور صحیح فیصلہ کیا۔ اگر کسی وجہ سے وہ دونوں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو مجھے بڑا قلق ہوتا۔ ان لوگوں کی سرکوبی ان ہی کے ہتھکنڈوں سے کی جا سکتی ہے۔"

"تمہارے تینوں آدمی اب کہاں ہیں؟ ان کی اطلاعات کیا ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ میمن گوٹھ میں ہیں۔ گرین فارم میں ہونے والے تصادم کے بعد ایک کھائی سے بھڑکنے والے بلند شعلوں نے انہیں وہاں رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس ویرانے میں آگ بجھانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے اس لیے ابھی تک کوئی کار کے قریب نہیں جا سکا تھا۔ ہیلی کاپٹر سے وہاں پہنچنے والی امدادی ٹیم کسی حادثے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بھی بے بس ہیں۔"

"امدادی ٹیم؟" میں نے چونک کر اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"کراچی میں مقیم امریکی قونصل جنرل نے پرونوکول سے ہٹ کر براہِ راست آرمی کے کیریئر کمانڈر سے رابطہ کیا تھا کہ دو امریکی افسران راستہ بھٹک کر میمن گوٹھ کی طرف نکل گئے ہیں اور وہاں غنڈوں کے نرغے میں پھنس گئے ہیں۔ ان کے لیے فوری مدد کی درخواست کی گئی تھی۔"

"اور وہاں سے امدادی ٹیم روانہ کر دی گئی؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔ ایک چھوٹے ہیلی کاپٹر میں تین مسلح آرمی کمانڈوز کے ساتھ قونصل خانے کا ایک سینیئر افسر بھی وہاں گیا ہے۔ دراصل وہ کوئی امدادی ٹیم نہیں ہے۔ وہ لوگ کسی مسلح مقابلے کی تیاری کے ساتھ گئے ہیں۔"

میں لمحہ بھر کے لیے اندر ہی اندر کانپ اٹھا۔ امریکی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہر حربہ آزمانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اگر ہیلی کاپٹر سے جانے والی ٹیم کچھ پہلے



اس طرف میں پہنچ جاتی تو زمین پر مصروفِ کار، اسپیشل ایک فورس والوں پر مکمل بے خبری میں آسمان سے موت کی برسات ہو سکتی تھی۔ یہ بہت غنیمت ہوا کہ ہیلی کاپٹر پہنچنے سے پہلے وہ لوگ سرپٹائی دے پر کافی دور نکل چکے تھے۔

"آگ کے شعلے میلوں دور سے نظر آرہے تھے۔" جلال بتا رہا تھا "گرین فارم کی تلاش سے پہلے ان کی توجہ اسی طرف مرکوز ہو گئی اور پھر ہیلی کاپٹر پر کمانڈوز کے ساتھ موجود امریکی افسر نے کھائی میں جلتی ہوئی سیاہ کار پہچان لی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ ہیلی کاپٹر کی طاقت ور سرچ لائٹس نے پورا علاقہ منور کر دیا تھا۔ وہ وہیں لینڈ کر گئے اور اب تک وہاں آگ سرد ہونے کے منتظر ہیں۔"

"تمہیں یہ سب اطلاعات کہاں سے ملی ہیں؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"وہ آگ دور تک دیکھی گئی تھی۔ میرے تینوں آدمی، مقامیوں میں مل کر جائے حادثہ پر موجود ہیں اور وقفے وقفے سے مجھے رپورٹ دے رہے ہیں۔ میری یہ چوتھی فون کال ہے۔ اسٹیشن فور سے معلوم ہوا کہ تم لوگ گھر کے لیے نکل چکے ہو۔ یہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ رابطے میں مسلسل ناکامی پر مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔"

"گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ہم چند منٹ پہلے یہاں پہنچے ہیں۔" وضاحت کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا "کیا کے ون کا ایئر پیس اتنا طاقت ور ہے کہ وہ اس پر تم سے اسلام آباد میں بھی رابطہ برقرار رکھے ہوئے ہے؟"

"ایئر پیس کی اتنی رینج نہیں ہے۔ کے ون موبائل فون استعمال کر رہا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ان کی گاڑی کو حادثہ کیسے پیش آیا۔"

"ان سے گلو خلاصی کا کوئی دوسرا محفوظ راستہ نہیں تھا۔ ان کو زندہ گرفتار کرنا ہے سود تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان لوگوں نے حادثے کے روپ میں اپنے دشمنوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔"

"گاڑی میں کتنے افراد موجود تھے؟" جلال اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"صرف تین! دونوں امریکی اور ان کا مقامی ڈرائیور۔ دھماکہ کر گرتی ہوئی کار ان تینوں کی چتا بن گئی ہو۔"

"ہاں!" اس کی آواز پُر تشویش ہو گئی "دھماکوں اور بھڑکتے ہوئے دروازہ کھلنے کے باعث کوئی دور گر کر زندہ رہ گیا تو خاصی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں امریکی اس واقعے کی تفتیش میں بال کی کھال نکالیں گے۔"

"بے فکر رہو۔ کار کھائی میں گرانے سے پہلے تینوں کی گردنیں توڑ دی گئی تھیں۔ ہر کام صاف ستھرے طریقے سے ہوا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ تصادم کے جھٹکے سے ان کی گردنیں ٹوٹنے کی کہانی سنائے گی۔ کار کی باڈی بھی شاید بالکل بے داغ نکلے گی۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں فائرنگ کا زبردست تبادلہ ہوا تھا۔" جلال کی آواز میں حیرت تھی۔

گرین فارم اور اس کے آس پاس پیش آنے والے واقعات کی کڑیوں سے وہ یکسر بے خبر تھا جبکہ اس علاقے میں ہونے والی تازہ ترین کارروائیوں کے بارے میں اس کے پاس بھرپور معلومات تھیں۔ ہماری وہ گفتگو دیر تک چلتی رہی۔ اس دوران میں غزالہ چائے تیار کر کے لے آئی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ اسے براہِ راست اول خان سے بات کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس وقت تک اسے یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ اول خان میرے ساتھ بیٹھا ہوا ساری گفتگو سن رہا تھا۔

"ہاں جلال! میں بول رہا ہوں۔" میرے اشارے پر اول خان نے دھیرے سے کہا۔

"یہ پورا آپریشن تمہارا تھا۔ اس بارے میں تمہاری رپورٹ کیا ہوگی؟" دوسری طرف سے جلال کی آواز آئی۔

"جو کچھ ہوا، وہ رپورٹ کر دیا جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ ایس ٹی ایف کی صرف ایک پالیسی ہے۔ دشمن کو تلاش کر کے ہر قیمت پر نمٹنا نہیں کرنا۔ پالیسی کی عارضی تبدیلیوں سے ہمارے اس مشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

"تم اپنی جگہ ٹھیک ہو لیکن ہماری کچھ مجبوریاں ہیں جن کے بارے میں ڈینی نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میمن گوٹھ اور گرین فارم کی نشان دہی کے سلسلے میں میرے آدمیوں کا ذکر آئے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اول خان نے بے فکری سے کہا۔ "یہ نشان دہی صرف تمہارے آدمیوں نے نہیں کی تھی۔ ڈینی نے ایک زنانہ ذریعہ بھی استعمال کیا تھا۔ دہری تصدیق کے بعد ہی ہم نے تیزی سے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"زنانہ ذریعہ؟" وہ نئی اصطلاح جلال کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

"ہاں، ڈینی ایک خاتون پر کام کر رہا تھا۔ اسی نے گرین فارم کے بارے میں بتایا تھا۔"

"بس تو تم اسی پر اکتفا کرنا۔" جلال کی آواز سے اطمینان مترشح تھا "میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سارا کام تمہارا تھا۔

اب اندازہ ہو رہا ہے کہ ڈینی نے بھی پس پردہ رہ کر بہت کچھ کیا ہے۔"

"ہم نے صرف ایکشن کیا ورنہ ساری محنت ڈینی کی ہے۔ اس نے خاصے پاپڑ بیلے ہیں۔"

"سراغ تم ہی سے ملا تھا۔" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اسپیکر فون پر جلال سے کہا "تم نے میرپور خاص کے رہنے والے ہندوؤں کی فرم موہن اینڈ موہن کا ذکر کیا تھا۔ کرشن کمار ان کے پاس نہیں تھا لیکن ان ہی کی مدد سے کرین فارم پہنچا تھا۔"

"میں ان لوگوں کو بھول گیا تھا۔ میرے آدمیوں نے موہن اینڈ موہن پرائیویٹ لمیٹڈ کے دفتر، گودام اور گھر کو چیک کرنے کے بعد کلیر کردیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم کام کے ہر اس نکتے کو پکڑ لیتے ہو جسے دوسرے نظر انداز کردیتے ہیں۔"

"ہماری اصل لڑائی کرشن کمار سے تھی۔ اس کے چکر میں ڈیوڈ اور جمی مفت میں مارے گئے۔" میں نے رسماً کہا۔

"مجھے ان دونوں کے ڈرائیور کے بارے میں افسوس ہے۔ وہ بے چارہ بلاوجہ مارا گیا۔"

"اول خان میں ایک بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ بے گناہوں کا بے دریغ خون نہیں بہاتا۔ اس کے مقدر کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے ڈرائیور سے اگلوا لیا تھا کہ وہ اپنے گورے آقاؤں کے اشارے پر دو افراد کو قتل کرچکا تھا۔"

"تم نے میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ اب میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔"

"الجھن کو پی جانے کے بجائے اس پر گفتگو ہمیشہ مفید رہتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اب یہ خیال رکھنا کہ کرشن کمار اور امریکیوں کے درمیان کوئی تعلق سامنے نہ آسکے بلکہ کرشن کمار کی لاش غائب ہی ہوجائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ وہ ویسے بھی یہاں لاوارث تھا۔ ساری فکرمندی کے باوجود بھارتی اس کے لیے آواز نہیں اٹھا سکیں گے۔"

"اسی لیے اس کی لاش کا منظرِ عام پر آنا ضروری ہے۔ راو والے صرف تشدد اور خون ریزی کی زبان سمجھتے ہیں۔"

میں نے اسے کرشن کمار کی لاش کے بارے میں اپنی تجویز سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہوگیا۔ اس نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ میجر بخشی کے گھر کے قرب وجوار سے راے کے ایک سینیر کمانڈو کی لاش ملنے کے بعد اور کچھ ہو یا نہ ہو، بخشی کی آدھی جان ضرور نکل جائے گی۔

"کرشن کی دور رس سرگرمیوں کا جال سامنے آجانے کے بعد اب یہ بات کھل چکی ہے کہ راو والوں نے یہاں اپنی سرکاری سرگرمیاں بہت کم کردی ہیں وہ جانتے ہیں کہ مختلف عہدوں کی آڑ میں ان کے سفارتی دفاتر میں کام کرنے والے ایجنٹ ہماری ایجنسیوں کی نگاہ میں ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا "اب وہ براہِ راست، کرشن کمار جیسے آدمی یہاں بھیج رہے ہیں۔ موہن اینڈ موہن والوں پر اپنا کام جاری رکھو۔ ان کے ذریعے کچھ اور نام بھی سامنے آسکتے ہیں۔ کیا ان کے خاندان کی کوئی عورت کرشن کمار کے لیے کام کررہی تھی؟"

"کرشن کمار اس پر ڈورے ڈالنے کی کوششیں کرتا رہا لیکن وہ اس سے متنفر تھی۔" میں نے تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا "یوں سمجھو کہ وہ اپنے گھر والوں کے سلوک کی وجہ سے خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح ہمارے دامن میں آگری۔ میں دیکھوں گا کہ وہ ہمارے لیے مزید کیا کچھ کرسکتی ہے۔ کرشن کمار کی نشان دہی کے صلے میں، میں اسے اور اس کے شوہر کو معافی دے چکا ہوں۔"

"تمہیں کوئی اخلاقی مجبوری درپیش ہے تو مجھے بریف کردو۔ میں اپنے آدمیوں کو اس کے پیچھے لگا دوں گا۔ کسی کے خلاف کھلے شواہد سامنے آجائیں تو میرے آدمی اس کے لیے بہت سفاک ثابت ہوتے ہیں۔"

"ابھی یہ باتیں قبل از وقت ہیں۔ پہلے میں خود اسے ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔"

مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد فون کا وہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

"ماروتی نے ڈینی کو نہیں چھوڑا تو جلال کے آدمی کس گنتی میں ہیں۔" فون بند ہوتے ہی ویرا نے اپنی زبان پر رکھا ہوا زہریلا فقرہ ادا کردالا "چند ہی دنوں میں وہ اس مسلمان پسند عورت کے گن گاتے ہوئے نظر آئیں گے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہوٹل میں میرے اور اس کے درمیان گفتگو ایک حد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔" میں نے سختی سے کہا۔

"تمہیں بار بار یہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی کہانی سنا چکے ہو، میری اپنی ایک رائے ہے۔ حد چھوڑو اور یہ سوچو کہ اس نے تمہیں ملنے کے لیے ہوٹل آنے پر مجبور کردیا تھا۔ اب تم اپنی مرضی سے اس سے ملے جاؤ گے تو اسے بہت خوشی ہوگی۔"

"میری رائے ہے کہ آپ ماروتی کو آئی بی والوں کے حوالے کردیں۔" غزالہ نے سنجیدگی سے کہا "کچھ ہو یا نہ ہو،



ایسی آزاد خیال عورتوں کے اسکینڈل بہت تیزی سے شہرت پاتے ہیں۔ نہ جانے روی کیسا آدمی ہے کہ اپنی بیوی کو بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے۔"

غزالہ کو اپنا ہم خیال پاکر ویرا کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ شوخی سے بولی "وہ خود روی ہے اس لیے اس نے سراپا بے راہ روی سے شادی کی ہوگی ہے۔ غزالہ نے اس کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔"

"تم لوگ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہو۔ دماغوں کے ساتھ ساتھ تمہاری زبانیں بھی چل پڑی ہیں۔ مجھے اپنے گھر جانا چاہیے۔" اول خان نے مسکراتے ہوئے مربیانہ انداز میں کہا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"کرشن کمار کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟" اس کے اٹھنے اٹھتے میں نے سوال کیا۔

"جب فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو اس پر جلد از جلد عمل ہوجانا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"آج کل موسم خاصا خوشگوار ہے۔ کیوں نہ اسے ایک دو دن کے لیے محفوظ کرلیا جائے؟"

"بے سود ہوگا۔ اس کی لاش دس دن بعد بھی دستیاب ہوگی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کے موت کے صحیح وقت کا تعین کردے گی۔ اس وقت ہمارے دشمنوں کو یہ سوچنے کا موقع مل جائے گا کہ کرشن کمار کی لاش کو اتنی مدت تک کہاں چھپایا گیا۔"

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر کہا "حامد کو ہدایات دے دو۔ زیادہ دیر ہوگئی تو یہ خبر صبح کے اخبارات میں جگہ نہیں پاسکے گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں گھر جاتے ہی اس سے بات کرلوں گا۔ ذرا سی دیر میں پولیس لاش تک پہنچ جائے گی۔"

سلطان شاہ ہمارے ساتھ تھا، باہر سے اول خان کو رخصت کرکے ہم دونوں اندر لوٹ آئے۔

ویرا اور غزالہ دبی دبی آوازوں میں کسی پرجوش بحث میں مصروف تھیں۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سنتے ہی انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ماروتی ہی ان کا موضوعِ سخن ہوسکتی تھی مگر میں اس بارے میں کوئی چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنی خواب گاہ کی طرف ہولیا۔ میرے لباس تبدیل کرنے کے دوران ہی غزالہ بھی کمرے میں آگئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بولٹ کرلیا تھا۔

میں بے پروائی سے بستر پر دراز ہوا تو وہ سنجیدگی سے میرے قریب آبیٹھی۔ میں نے اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اس نے بہت آسودہ انداز میں اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی مسکتی ہوئی دراز زلفوں کو تھام کر اسے خود سے اور قریب کرلیا۔

"سچ سچ بتائیں کہ ویرا کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے!" غزالہ نے دھیمی آواز میں بہت نرمی سے پوچھا۔

"آج برسوں بعد تمہیں یہ خیال کیسے آگیا؟" میں نے حیرت سے سوال کرڈالا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ مجھے اکثر اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔"

"ہمارے حساب سے تو وہ بالکل ہی گئی گزری لڑکی ہے لیکن مغربی تہذیب کے مطابق اسے صرف آزاد خیال اور بے پروا قرار دیا جاسکتا ہے۔" میں نے بہت محتاط الفاظ میں اپنی رائے دے دی۔

غزالہ نے میرے سینے سے سر اٹھائے بغیر خفگی سے میری طرف دیکھا اور گھنیری پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی "اس کے بارے میں آپ مجھے اتنا بتا چکے ہیں کہ میں اب کچھ اور جاننے کی خواہش نہیں رکھتی۔ میرا سوال صرف اتنا تھا کہ وہ ہم دونوں کے لیے کیا جذبات رکھتی ہے۔"

"ہمارے ساتھ وہ مخلص ہے۔ میری اور تمہاری شادی کو تسلیم کرچکی ہے ورنہ اس چھت کے نیچے گزارہ نہ کرپاتی۔"

"میں بھی اکثر یہی محسوس کرتی ہوں لیکن کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ مجھے آپ کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے ہولے سے اس کے گال پر چپت لگائی اور کہا "یہ اس کی شرارتیں ہوتی ہیں۔ اس کے مزاج میں اتنا تحمل ہے کہ وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتی، ہر لمحے کوئی نہ کوئی تبدیلی چاہتی ہے۔ وہ ہمارے درمیان چھوٹی موٹی غلط فہمیاں پھیلا کر ہماری جھڑپوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔"

"شاید اس وقت بھی وہ یہی چاہ رہی تھی۔" غزالہ بھی میری ہنسی میں شامل ہوگئی۔

"کیا کہہ رہی تھی وہ؟" میں نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔ "صبح میں اس کی خبر لوں گا۔"

"آپ اس سے کوئی بات نہ کریں۔ بے چاری مایوس ہو کر اپنی اس تفریح کا سلسلہ ترک کردے گی۔ اس وقت وہ ماروتی کے بارے میں میرے کان بھر رہی تھی۔ وہ بولنا شروع کرتی ہے تو اس کی ہر بات سچ معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ ہر جھوٹے کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جھوٹ کو عارضی طور پر سچ بنا دیتا ہے مگر پھر یہ ملمع اتر جاتا ہے۔" میں نے ماروتی کا نام لیے بغیر ایک عام سی بات کہہ کر وہ موضوع وہیں ختم کرنا چاہا مگر غزالہ بہلاوے میں نہ آسکی۔

"یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے صرف چند باتیں طے کرنے کے لیے آپ کو ہوٹل کے پرتعیش کمرے میں بلایا تھا!"

"خوب! تو اب تم بھی ویرا کی زبان بول رہی ہو!" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ اس سے پہلے ہی میری نرم گرفت سے پھسل کر نکل گئی اور سیدھی غسل خانے میں جا گھسی۔

○☆○

اگلی صبح کے اخبارات میں زیادہ تفصیلات نہیں آسکی تھیں مگر دونوں خبریں بہت واضح تھیں۔

کرشن کمار کی لاش عضو بریدہ تھی۔ اسٹیشن فورپر اس کی جامہ تلاشی میں کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جس سے اس کی شناخت ہوتی مگر حامد نے اس کی ایک جیب میں اس کے نام کا ایک کاغذ ڈال دیا تھا جس کے نتیجے میں اسے کرشن کمار سمجھ لیا گیا تھا۔ اخبار میں تصویر کی اشاعت کے ساتھ، لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔

پولیس نے اس قتل کو ابتدائی طور پر رقابت اور انتقام کا شاخسانہ قرار دیا تھا۔ لاش کی ادھڑی ہوئی حالت کے پیش نظر صرف وہی کہانی قرین قیاس ہوسکتی تھی۔ مقتول کے بارے میں مزید معلومات کے حصول کے لیے تفتیش جاری تھی۔

میمن گوٹھ والے واقعے کی خبریں قدرے تفصیلی، دلچسپ اور سنسنی خیز تھیں۔

کرشن کمار کی تلاش کی مہم میں وہ دونوں امریکی اچانک ہی راستے کے پتھروں کی طرح سامنے آئے تھے اور کسی تفصیلی چھان بین کے بغیر مار دیے گئے تھے۔ ان کے بارے میں اول خان نے کرشن کمار کے سامنے صرف اتنی قیاس آرائی کی تھی کہ اور وہ امریکا کی فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن کے کارندے تھے۔ حقیقت بھی وہی نکلی تھی۔ جمی ایف بی آئی کا سینیر کلرک تھا، بھورے بالوں والا دراز قامت ڈیوڈ اس کا مددگار تھا۔ ان دونوں کے عہدوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا تعلق فیلڈ اسٹاف کے بجائے دفتری عملے سے تھا مگر وہ امریکا کا معاملہ تھا۔ وہاں عہدوں وغیرہ کی تقسیم کا کام بھی دنیا سے نرالا تھا۔ وہ دونوں جو کچھ بھی تھے، ایف بی آئی کے اہلکار ضرور تھے اور آنجہانی ہو چکے تھے۔

کار کھڈ میں گرنے کی وجہ سے تینوں جلے ہوئے ڈھانچوں میں کافی ٹوٹ پھوٹ پائی گئی تھی۔ گاڑی میں لگنے والی آگ اس قدر ہولناک تھی کہ لاشیں بری طرح مسخ ہو کر رہ گئی تھیں۔ فوری طور پر یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ تینوں گاڑی کے آگ پکڑنے سے پہلے مر چکے تھے یا زندہ ہی جل گئے تھے۔

امریکی ذرائع نے اپنے معمول کے مطابق الزام تراشی کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ ایف بی آئی والوں نے اپنے آخری پیغام میں بتایا تھا کہ وہ کسی دور افتادہ، میمن گوٹھ نامی مقام پر فائرنگ میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کی موت کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گھیر کر مارا گیا تھا۔

ان کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا کہ پاکستان میں امریکیوں کی جان و مال کو لاحق، مفروضہ خطرات کی روشنی میں امریکی حکومت نے اپنے تمام ملازمین اور شہریوں کو اپنی آمد و رفت لازمی ضروریات تک محدود رکھنے کی جو سخت ہدایات جاری کی ہوئی تھیں، ان کے ہوتے ہوئے ڈیوڈ اور جمی میمن گوٹھ میں کیا کر رہے تھے؟ کیا انہوں نے اپنے افسران بالا سے اس سفر کی اجازت لی تھی؟ وہ بھٹک کر اس علاقے میں پہنچے تھے تو ان کا اصل مقصد کہاں کا تھا؟ انہیں اس ویرانے میں کیسے پتا چلا کہ وہ میمن گوٹھ پہنچ چکے تھے؟

پچھلے واقعات کے مقابلے میں اس بار صرف ایک بات غنیمت تھی کہ ایف بی آئی والوں کی ہلاکت کے سلسلے میں مقامی حکومت یا اہلکاروں پر براہِ راست کوئی الزام نہیں لگایا گیا تھا۔

گیارہ بجے اول خان کا فون آیا۔ اس کے پاس کچھ تازہ ترین خبریں تھیں۔

لاشیں بری طرح جل جانے کی وجہ سے ان تینوں کی موت کے اسباب کے تعین میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف امریکیوں نے اپنے تین افسروں کو ساتھیوں کی طرح تفتیشی ٹیم کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ ان میں سے دو امریکی نژاد تھے جو بظاہر پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے ملازم تھے لیکن اپنے طور طریقوں سے منجھے ہوئے سراغ رساں معلوم ہو رہے تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی پاکستانی نژاد امریکی تھا جو ان کے لیے ترجمان کا کام کر رہا تھا۔ ان تینوں نے گزشتہ رات ہی گرین فارم میں اپنا کیمپ لگا لیا تھا۔



گرین فارم میں جو کچھ ہوا، اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ وہاں کام کرنے والے مزدور اس بات کے عینی شاہد تھے کہ وہاں چھپے ہوئے شخص سے ملنے کے لیے دو امریکی فارم پر آئے تھے۔ اس کے بعد ہی کچھ لوگوں نے فارم کو گھیر کر اندر گھسنے کی کوشش کی جسے ناکام بنانے کے لیے گارڈز نے فائرنگ کی ابتدا کی اور پھر فضا بارود کی بو سے بھرتی چلی گئی۔

واقعات بہت بے رحمی سے کریدے جا رہے تھے اور آدھا دن گزرنے سے پہلے تفتیشی جماعت اور اس کے ساتھ لگے ہوئے امریکیوں کو بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ بس کرشن کمار کا نام پردے میں تھا۔ وہ گرین فارم کے مالک کا ذاتی دوست نہیں تھا، روی موہن کی سفارش پر وہاں پناہ لینے آیا تھا۔ اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے شیرو کا نام اختیار کیا تھا۔ فارم کے مالک نے انہیں وہی نام بتایا تھا۔

"حالات بہت تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں۔ اس رفتار پر مجھے تشویش ہو رہی ہے۔" اول خان سب کچھ بتانے کے بعد کہہ رہا تھا۔

"مجھے حیرت ہے۔" میں نے کہا "پوشیدہ باتوں سے روے اٹھنے کے ساتھ امریکی دلدل میں پھنستے چلے جائیں گے۔"

"تم ہمیشہ دور کی باتیں سوچتے ہو، میں سامنے کی باتوں سے پریشان ہو رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم تو ہو کہ تم کس وجہ سے پریشان ہو رہے ہو۔ مجھے ایسی تیزی کی توقع نہیں تھی مگر یہ تیزی بھی پریشان کن نہیں ہے۔ مجھے اس میں ایک سنہری موقع نظر آرہا ہے۔ تم یہ سمجھو کہ۔۔۔"

"شیرو یعنی کرشن کمار کا نام کھل چکا ہے۔" اس نے اضطراری لہجے میں میری بات کاٹ دی "اخباروں میں اس کی لاش کے کلوز اپ چھپ چکے ہیں۔ فارم کے مزدوروں نے تفتیشی افسروں کو کرشن کمار کا حلیہ بتایا ہوگا۔"

"سب کچھ درست ہے مگر اخبار کی تصویروں میں اس کا چہرہ سوجا ہوا ہے۔ اس تصویر کو آسانی سے شیرو کے طور پر نہیں پہچانا جا سکے گا۔ اسٹیشن فورپر ویرا نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا تھا۔"

"یہ مفروضے کاغذ کی ناؤ ثابت ہوں گے۔ اب روی خان کا نام ریکارڈ پر آگیا ہے۔ کسی بھی لمحے اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے گا۔ وہ اس ابہام کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے ہاتھ آتے ہی سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ اس نے تو پہلی نظر میں کرشن کمار کی لاش کو شناخت کر لیا ہوگا۔ اس وقت میں اپنی


## مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

**روشنی کے مینار**
اسلام کے خاتون مبلغوں، اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات
ضیاء تصدق چغتائی کے قلم سے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**عظمت کے مینار**
ضیاء تصدق چغتائی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**ایمان کا سفر**
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ
"وہ نفس پارسے" جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**کچرا گھر**
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**آدھا چہرہ**
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے جو زندگی کے میدان میں اپنا مکمل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**کالی کہانیاں**
جرائم، جادو، شیطان، رزم، ارواح، طلسم و مزاح، پراسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۳۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

**نک ویلوٹ کی چوریاں**
مشہور چور نک ویلوٹ کی عجیب و غریب چوریوں پر مشتمل ایک مقبول معاشرتی ناول
قیمت جلد اول ۵۰/- جلد دوم ۵۰/- ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

**کتابیات پبلی کیشنز**
پوسٹ بکس ۲۳ سعید منزل نیو میوا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۱

خواہش کے باوجود روی کو گرفتاری سے نہ بچا سکوں گا۔ تم نے اسے معافی دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ پولیس اس کے دروازے پر پہنچے گی تو ماروتی اودھم مچادے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے ملاقات کا کچا چٹھا کھول دے۔"

"ماروتی کے کردار سے ہم لوگ واقف ہیں۔ جگدیش موہن اسے دوسروں کے سامنے نہیں لائے گا۔ روی بھی اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ اخباروں میں کرشن کمار کے قتل کی خبر پڑھتے ہی خوشی سے ناچتا ہوا اپنے گھر لوٹ آئے۔ وہ آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"امریکیوں کی موت کے حوالے سے روی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ محکمہ اس کی گرفتاری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ اس کے ہاتھ آتے ہی ہر بات کھل جائے گی۔"

"ابھی تک تم معاملے کے ایک رخ پر سوچ رہے ہو۔ یہ غور کرو کہ کرشن کمار کا نام کھلنے کے بعد امریکیوں اور بھارتیوں کے درمیان کیسی کشیدگی پیدا ہوگی۔ اس نے کسی فرضی نام سے یا شاید شیروبن کرڈیوڈ اور جمی کو گرین فارم پر بلایا تھا۔ وہ ان سے سودے بازی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی دغا بازی کی وجہ سے وہ دونوں مارے گئے۔ راوالوں کے لیے جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔"

"وہ ان کا اور امریکیوں کا معاملہ ہے۔ ہمارے لیے نئی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے انہیں یہ بتانا ہوگا کہ پاکستان میں غیر قانونی طور پر چھپے ہوئے 'را' کے ایک دہشت گرد سے ڈیوڈ اور جمی کے کیا روابط تھے۔ وہ اس کے ساتھ مل کر کن سازشوں میں مصروف تھے۔"

اول خان کی طرف سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔ لائن پر خاموشی چھائی رہی۔ خاصے طویل سکوت کے بعد اس کی تھکی ہوئی آواز ابھری "خدا کرے کہ ویسا ہی ہو جو تم سوچ رہے ہو۔ میں نے تمہیں اپنے خدشات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ ماروتی ہمیں چوہوں سے بچانتی ہے۔ وہ یا اس کا بھائی جی ہمارے نام اور پتوں سے واقف نہیں ہے۔ روی سے ہمارا سامنا تک نہیں ہوا۔ ان کی کہی ہوئی باتوں کو کون ثابت کرے گا؟ تم ایس ٹی ایف کے ایک ذمے دار افسر ہو۔ کون سوچ سکتا ہے کہ اس مہم میں تم شریک تھے؟ کسی کا دھیان ادھر چلا بھی جائے تو کون تم سے پوچھنے کی ہمت کرے گا؟"

"جلال کے کم از کم تین آدمی بہت کچھ جانتے ہیں۔ انہیں مخدوش حالات کا علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دانستہ ایک لفظ بھی نہیں اگلیں گے لیکن وہ انسان ہیں۔ ان سے کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔"

"تم نے اپنے خدشات بیان کر دیے، اب تم بے فکر رہو۔ کوئی نئی بات سامنے آئے تو مجھے ضرور آگاہ کر دینا۔"

"کیا تمہیں اچانک کوئی بات یاد آگئی ہے؟ کچھ عجلت میں معلوم ہو رہے ہو۔" اول خان نے پوچھا۔

"ہاں، ماروتی کو ذرا فون پر ہوشیار کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراسم برقرار رہ سکیں۔" میں نے آس پاس میدان صاف دیکھ کر بے تکلفی سے کہہ ڈالا "جلال نے اس کے بارے میں صحیح مشورہ دیا تھا۔"

اول خان اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر چکا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

میں نے وقت ضائع کیے بغیر ماروتی کا ڈائریکٹ نمبر ملا لیا۔ فون پر وہ خود موجود تھی اور اس کی آواز کچھ مخمور سی تھی۔

"میں مظہر بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟ تمہاری آواز کچھ بھاری بھاری سی لگ رہی ہے۔"

"اوہ! مظہر! ارلنگ!" میری آواز سن کر وہ خوش ہو گئی "میں ابھی ابھی سو کر اٹھی ہوں۔ تم یقین کرو کہ تمہارے ساتھ گزارہ ہوا وقت رات بھر مجھے خواب میں نظر آتا رہا۔ شاید تم بھی اسی کیفیت سے گزرے ہو۔"

"مجھے کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملی کہ میں ان رنگین لمحوں کے بارے میں زیادہ سوچ سکوں۔"

"رات بھر کیا کام کرتے رہے؟" میری بات کاٹ کر اس نے میٹھی آواز میں پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آج کا کوئی اخبار نہیں دیکھا ورنہ مجھ سے یہ سوال نہ کرتیں۔"

"میں اخبار نہیں دیکھتی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بتایا "اس میں ڈکیتیوں، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟ سیاست سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نیچے سے اخبار منگوا کر دیکھ لوں گی۔ اپنے کام کے بارے میں کچھ تم ہی بتا دو۔"

"رات کو ہم نے سفید نیولے کو شکار کیا۔" میں نے دانستہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو۔ وہ تمہارے لیے بہت اہم تھا۔ اب یہ نہ ہو کہ تم مجھے بھول جاؤ۔"

"تم بھولنے والی شے نہیں ہو لیکن ابھی ستارے گردش



میں ہیں۔ روی کو گھر سے دور ہی رکھنا۔"

"کیوں؟ تم نے تو انہیں معاف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔" میری توقع کے مطابق اس نے احتجاج کیا۔

میں نے اسے بتایا کہ کرشن کمار کے پاس دو امریکی بھی پہنچے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں بھگا کر کرشن کمار کو مار ڈالا۔ اس کی لاش کے ساتھ لوٹتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ امریکیوں کی کار ایک کھڈ میں پڑی جل رہی تھی۔ پولیس ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے ملا رہی تھی اور فارم کے مالک کے بیان پر کسی بھی وقت روی کی تلاش میں اس کے گھر پہنچ سکتی تھی۔

"تو کیا اب پولیس والے ایجنسیوں سے بھی زیادہ طاقت ور ہو گئے ہیں؟" اس کی آواز میں طنز اور تشویش کا امتزاج تھا۔

"مرنے والے امریکی سفارتی افسر تھے۔ اس وجہ سے بات ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔"

"وہ حرام زادے کرشن کمار کے پاس کیا کرنے گئے تھے؟" ماروتی کی بے ساختہ آواز ابھری۔

"پتا نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا "روی کو مزید چند روز گھر سے دور رہنا چاہیے۔"

"میں انہیں ابھی گھر آنے سے منع کیے دیتی ہوں۔ ویسے بھی وہ مجھے فون کیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔"

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ ملبر میں روی کے پاس فون نہیں ہے۔"

"وہ بات پرانی ہو گئی۔ کل شام ان کے دوست نے موبائل فون اور کنکشن لے لیا ہے۔" میری توقع کے عین مطابق ماروتی کا ردِعمل زیادہ شدید نہیں رہا تھا۔ وہ ابتدائی جھٹکے سے بہت تیزی کے ساتھ سنبھل گئی تھی۔

"تم لوگ سادہ کپڑوں میں خاصی شرافت سے ہمارے گھر آئے تھے۔ پاس پڑوس والوں کو شبہ تک نہ ہوا ہوگا کہ ہمارے گھر میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے مگر پولیس والے وردیوں میں دندناتے ہوئے آئیں گے۔ سب کو علم ہو جائے گا کہ پولیس، روی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ بھابی جی گوشت کا ایک ناکارہ لوتھڑا ہے وہ پھر مجھے ان کے سامنے کر دے گا۔ ایسی بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں بھی گھر سے نکل جاؤں۔"

اگر جگدیش موہن اس قدر بے غیرت تھا تو پھر ماروتی کی فکر مندی بے جا تھی۔ میں نے اپنے دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے ہمدردی کی ہلکی سی رمق محسوس کی اور نرمی سے پوچھا۔ "گھر چھوڑ کر تم کہاں جاؤ گی؟"

سدا بہار فلمی گیتوں کا نوٹیشن

سُر سنگ گیت

اپنے طرز کی پہلی کتاب

شائع ہو گئی ہے

صفحات 208

قیمت 200/=

ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 رضوان چیمبرز، ظہور پلازہ اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

Email: kitabiat@usa.net

کا بھائی تھا۔

اول خان اسے فوری طور پر گرفتار کروانا چاہتا تھا مگر میں نے موہن اینڈ موہن کے مالکان کے ہوشیار ہونے کے خدشے کے تحت اسے روک دیا تھا۔ بعد میں واقعات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ہم ہری چند کا نام ہی بھول بیٹھے۔ میجر بخشی سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کا نام اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنے ابتدائی فقروں کا کیسے ازالہ کروں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ میری ابتدائی تلخ نوائی کے باوجود، ہری چند کا نام سننے کے بعد، میجر بخشی کا رویہ خاصی معقولیت پر مبنی تھا۔ میں اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو اس سے میری گفتگو آگے بڑھ سکتی تھی۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم میری باتوں کا برا مان جاؤ گے۔ آدمی کو جب ہر طرف موت ہی موت نظر آنے لگتی ہے تو اس کا دماغ الٹ جاتا ہے اور وہ اول فول بکنے لگتا ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت میں کتنا پریشان ہوں۔" ذہنی طور پر ایک فیصلہ کرلینے کے بعد میری زبان روانی سے خود بخود چل پڑی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمیوں کے دل بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میری خطا معاف کردو اور مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔"

"تمہارا دماغ الٹ چکا ہے تو پھر تمہیں میرا نام اور نمبر کیسے یاد رہا؟ سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو۔"

"سرکار! میں کرشن کمار کا نمک خوار ہری چند ہوں۔" میں نے رو دینے والی آواز میں اسے یقین دلانا چاہا۔

"تم کان کھول کر سن لو کہ میرا کسی کرشن کمار سے کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ کسی شخص نے تمہیں میرے گھر اور دفتر کے فون نمبر دے کر کیوں بہکایا ہے اور ہاں، تم بتا رہے تھے کہ کرشن کمار بھی مرچکا ہے۔"

"پولیس میرے گھر پہنچی تو مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، میں بس یہ جانتا تھا کہ میں کرشن کمار کے لیے بہت خطرناک کام کررہا ہوں۔ پولیس کے نام سے میرا دم نکل گیا اور صبح سویرے کے ملگجے اندھیرے میں اپنے گھر کی پچھلی دیوار پھاند کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے بس اسٹینڈ پر اخباروں سے معلوم ہوا کہ وہ مارا جاچکا ہے۔ اس کا فوٹو بگڑا ہوا ہے، چہرہ خون میں لتھڑا ہوا ہے مگر میں نے اسے پہچان لیا۔ تم اخبار دیکھو گے تو اسے پہچان لوگے۔"

دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ شاید وہ میری باتوں پر غور کررہا تھا اور اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ میں کس حد تک سچ بول رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس کی آواز آئی "نام سے تم بھی ہندو لگتے ہو، یوں تم میرے بھائی ہو۔ اس ملک میں ہم کسی امتیاز کے بغیر اپنے سب بھائیوں کی خدمت کرتے ہیں مگر تم یقین کرو کہ کرشن کمار سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ تمہیں کوئی سنگین غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں تمہارا نام جانتا ہوں، میرے پاس تمہارے دونوں فون نمبر ہیں۔ یہ غلط فہمی کیسے ہوسکتی ہے؟ کرشن نے مجھے بتایا تھا کہ ہم سب مل کر یہاں اپنے دھرم اور ملک کی بہت بڑی خدمت کررہے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھی اور ساجھی ہیں۔ اب مجھ پر برا وقت آن پڑا ہے تو تم مجھ سے اپنا دامن بچا رہے ہو، مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔ شاید یہاں کی پولیس سے مار کھا کر مرنا ہی میرا مقدر ہے۔"

"تمہیں آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کرشن سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا، نہ اس سے میرا کوئی گٹھ جوڑ تھا مگر پھر بھی مجھے معلوم ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی یہاں رہ کر اپنے دھرم اور دھرتی کے لیے بہت بڑا کام کررہے تھے۔ اخبار میں اس کے انجام کے بارے میں پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا کوئی قریبی عزیز مارا گیا ہو۔ نہ جانے اس نے تمہیں میرے فون نمبر کیوں دیے تھے۔ تم پولیس والوں سے چھپ کر آج کا دن گزار لو۔ میں سوچتا ہوں کہ تمہارے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ تم کل اسی وقت مجھے دوبارہ فون کرلینا۔"

مجھے اپنی گفتگو آگے بڑھانے کے لیے اس کے جوابوں سے سہارا مل رہا تھا۔ مجھے دہری خوشی ہوئی کہ اسے مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا تھا اور وہ میری باتوں کے جال میں پھنس رہا تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت تک سی ایس ڈی خاموش تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میجر بخشی نے میری کال ریکارڈ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ محض نام اور مذہب کے دھوکے میں میری صداکاری پر بھروسا کررہا تھا۔

"کل تک نہ جانے کیا ہوجائے۔" میں نے گہری مایوسی سے کہا "پولیس والوں سے اپنی ہڈیاں پسلیاں تڑوا کر قسطوں میں سچ اگلنے اور پھر سسک سسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں خود کو مارلوں۔"

"نہیں نہیں۔ بھول کر بھی اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرنا۔ یہاں پولیس اور ایجنسیوں والے پہلے ہی ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ ہم نے خود بھی اپنے آپ کو مارنا شروع کردیا تو ہماری تعداد بہت تیزی سے گھٹتی چلی جائے گی۔ یہ ہماری

نقصان ہم برداشت نہیں کرسکتے۔"

"مجھے اپنے اوپر یہ زمین تنگ ہوتی نظر آرہی ہے۔ مجھ پر ایک ایک پل بھاری گزر رہا ہے۔" وہ میری ہمدردی میں جوں جوں نرمی اختیار کرتا جارہا تھا' میں نے اپنی بڑھتی ہوئی مایوسی کے حوالے سے پھیلنا شروع کردیا تھا۔

"تم نے بہت ہمت اور حوصلے سے آدھا دن گزار لیا ہے۔ صبح تک میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔"

میں نے کسی فوری خیال کے تحت جو تنکے کی صدا کاری کرتے ہوئے کہا "کیوں نہ میں تمہارے گھر آجاؤں۔ پولیس کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہوسکے گا کہ میں تمہارے گھر میں چھپا ہوا ہوں۔"

میری تجویز پر وہ بری طرح بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا.... "ہرگز نہیں۔ بھول کر بھی میری طرف آنے کی غلطی نہ کرنا۔ جب تک کوئی مضبوط وجہ نہ ہو' پولیس تم جیسے عام شہریوں کے پیچھے نہیں لگتی لیکن ہم ہروقت مشکل میں رہتے ہیں۔ جو ہیں گھنٹے ہماری کڑی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ تم پولیس کی نظروں میں آئے ہوئے ہو۔ ادھر آئے تو تمہاری وجہ سے میں بھی مارا جاؤں گا۔ میرے اور تمہارے لیے یہی سب سے بہتر ہے کہ تم بھی بھول کر بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ انتہائی سخت ضرورت کے وقت فون پر بات چیت کافی رہے گی۔"

اس کی بوکھلاہٹ پر میں دل ہی دل میں محظوظ ہو کر رہ گیا۔ نادانستگی میں وہ میرے لیے ایک مستقل راہ کھول رہا تھا۔ میں ہری چند بن کر اسے اعتماد میں لینے میں کامیاب ہوگیا تھا' وہ خود مجھ سے ملنے سے گریزاں تھا۔ میرے لیے شناخت کرلیے جانے کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ میں جب چاہتا' ہری چند کی آواز میں اس سے راز و نیاز کی باتیں کرکے معلومات حاصل کرسکتا تھا۔

"تو کیا ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے؟" میں نے اپنی خوشی کے بجائے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"موجودہ حالات میں شاید کبھی نہیں۔" اس کی آواز میں تفکر آمیز گہرائی پیدا ہوگئی "ہاں' جس دن کرشن کمار کا خون رنگ لایا اور اس کا خواب پورا ہوگیا تو ہم پوری آزادی کے ساتھ مل جل کر یہاں اپنی کامیابی کا جشن منائیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب اکھنڈ بھارت بننے کا وقت قریب آگیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"شش! یہ فون پر اس کی تادیبی آواز ابھری "اب لیا ہے' دوبارہ یہ نام نہ لینا۔ یہاں یہ نام لینے والوں کی گردنیں بہت بے رحمی سے کاٹ دی جاتی ہیں۔ بے چارے کرشن کا انجام تمہارے سامنے ہے۔"

"ہم اسی طرح ڈرتے رہے تو کرشن کمار کا خواب شاید کبھی پورا نہیں ہوسکے گا۔"

"اسے ڈر نہیں' ہماری زبان میں مصلحت کہتے ہیں۔ چھری بغل میں چھپا کر رکھو اور منہ سے رام کے نام کی مالا جپتے رہو۔ دشمن تمہیں گیان دھیان میں مصروف دیکھ کر غافل ہوجائے تو پھرتی اور خاموشی سے چھری کا تیز دھار پھل اس کے دل میں اتار دو۔ اس وقت ہمیں' تمہیں اور ہمارے سب ساتھیوں کو یہی کرنا ہے۔ جو اس راستے سے ہٹا' وہ مارا جائے گا۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو۔ اتنی احتیاط تو کرشن نے بھی نہیں برتی تھی۔ اس طرح میرا دم گھٹنے لگے گا۔"

"کرشن نے وقت کے مطابق احتیاط نہیں کی اور مارا گیا۔ میں محتاط ہوں اور زندہ ہوں۔ تم سے بہت باتیں ہوگئیں۔ اپنی پناہ گاہ میں چھپ کر ان پر غور و فکر کرو گے تو تمہیں میری باتوں میں تجربے کا نچوڑ نظر آئے گا۔ اب تم سے کل بات ہوگی۔"

میجر بخشی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کی کہی ہوئی بہت سی باتیں بے انتہا اہمیت کی حامل تھیں۔ اکھنڈ بھارت کا دیو مالائی کھیل پورے زور و شور سے جاری تھا۔ اس کے جنم و اصل ہوجانے والے کردار آواگون کے نظریے کے تحت روپ' جسم اور چہرے بدل بدل کر سامنے آرہے تھے۔ کوئی چھپ کر اور کوئی برسرِ عام مصروفِ کار تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ میجر بخشی نے ہمارے قائم کیے ہوئے اس نظریے کی تصدیق کردی تھی کہ کرشن کمار نئی دہلی میں بیٹھے ہوئے منصوبہ سازوں کے اشارے پر براہِ راست کام کررہا تھا۔ اس کا سفارتی عملے میں چھپے ہوئے راکے اہل کاروں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

وہ سب سوچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں مسہری پر نیم دراز رہا۔ غزالہ اپنے معمول کے مطابق کچن میں مصروف تھی۔ میری محویت کا سلسلہ ویرا کی مداخلت سے ختم ہوا۔ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی' بے دھڑک کمرے میں گھس آئی تھی۔

"سنا ہے کہ آج تم مسلسل فون پر مصروف ہو۔ یہاں چھپ کر کس سے باتیں کررہے تھے؟" اس نے آتے ہی کہا۔

"میمن گوٹھ کے گردو نواح میں واقعات کو ایک خاص رنگ دینے کے لیے جو محنت کی گئی تھی' وہ مطلوبہ نتائج سامنے نہیں لاسکی۔ امریکی تفتیش میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں اور اصل واقعات کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے نظر آرہے



ہیں۔"

ویرا بے تکلفی سے مسہری کے سرے پر آبیٹھی تھی۔ میں فوراً ہی کنارے سے دور سرک کر نیم دراز ہوگیا۔

"حصہ کیا لے رہے ہوں گے' وہ تفتیشی افسران کے سروں پر سوار ہوں گے۔ چھوٹے ملکوں میں مامور ہر امریکی سفارتی افسر خود کو اعلیٰ ترین مقامی حکام سے بھی برتر سمجھتا ہے اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔"

"وہاں بھی شاید یہی ہورہا ہے۔" میں نے اعتراف کیا "اصل خرابی یہ ہے کہ ایس ٹی ایف والے اپنا کام مکمل کرکے میمن گوٹھ سے بالکل الگ تھلگ ہوچکے ہیں اور وہ پولیس کیس بن چکا ہے۔ پولیس والوں کو ان واقعات کے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ روایتی انداز میں کام آگے بڑھا رہے ہیں۔ امریکیوں کی شمولیت کی وجہ سے آئی بی یا ایس ٹی ایف والے دخل اندازی نہیں کرسکتے۔"

"اب تک کے نتائج کیا ہیں؟" ویرا نے سگریٹ سلگانے کے بعد سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہاں ہونے والے واقعات ان کے سامنے آچکے ہیں۔ صرف کرشن کمار کی تلاش جاری ہے۔ وہ وہاں شیرو کے نام سے روپوش تھا۔ اول خان نے بتایا ہے کہ پولیس پارٹی روی کی تلاش میں کسی بھی وقت موہن ہاؤس پر دستک دے سکتی ہے۔"

"تمہیں فوری طور پر ماروتی کو ہوشیار کردینا چاہیے۔" اس نے بے ساختہ تجویز پیش کی۔

"یہ کارِ خیر میں پہلے ہی کرچکا ہوں۔" میں نے اسے آگاہ کیا "ابھی وہ شیرو کی تلاش میں ہیں۔ روی ہاتھ آگیا تو کرشن کمار کا نام کھل جائے گا' شیرو کی تلاش ختم کردی جائے گی۔ وہ ہاتھ نہ آیا تب بھی دیر سویر کے بعد کرشن کمار اور شیرو کا معاملہ حل ہوجائے گا۔"

اس بارے میں ویرا پوری طرح میری ہم خیال تھی۔ کرشن کمار اور شیرو کے نام سے امریکیوں کی کمزور پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ جی اور ڈیوڈ کی ہلاکتوں پر کسی قسم کا احتجاج کرنے سے پہلے انہیں اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کرنا تھا کہ وہ دونوں شیرو یا کرشن کمار سے کیوں ملنے گئے تھے۔ اس نے اول خان کے تمام اندیشوں کو خود ساختہ اور چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق قرار دے کر مسترد کردیا تھا۔

ویرا کی دوسری اور سوچی سمجھی رائے تھی کہ روی موہن اپنی روپوشی کو طول دے کر بلاوجہ اپنے خلاف شکوک و شبہات کو ہوا دیتا۔ اسے روپوشی ترک کرکے پولیس کے سامنے اپنا بیانِ قلم بند کرا دینا چاہیے تھا تاکہ الجھنیں ختم ہوسکیں۔ اس نکتے پر میں اس سے متفق نہیں تھا۔ کرشن کمار کے بارے میں یہ بات زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ وہ غیر قانونی طور پر پاکستان میں مقیم تھا اور تھر کے علاقے میں انتہائی مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اس کا گہرا دوست ہونے کی وجہ سے روی سنگین مشکلات میں پڑسکتا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ڈور بیل بجی۔ چند منٹ بعد سلطان شاہ نے کمرے کے دروازے پر آکر اول خان کی آمد کی اطلاع دی۔ ہم دونوں اس کے ساتھ فوراً ہی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ اول خان تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر نیم دراز تھا۔

رسمی مزاج پرسی کے بعد ویرا نے اس سے متجسس لہجے میں پوچھا "میمن گوٹھ کی کیا خبریں ہیں؟"

"صوبائی ہیڈ کوارٹرز میں بریفنگ کے بعد اعلیٰ پولیس افسران نے فوری طور پر سارے معاملات اپنی نگرانی میں لے لیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شام تک ہر بات بالکل واضح ہو جائے۔"

"میمن گوٹھ سے شیرو نامی ایک ملزم غائب ہے اور کراچی میں کرشن کمار نامی کسی شخص کی لاوارث لاش ملی ہے۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "پولیس والے ان دونوں واقعات کو یک جا کریں تو انہیں روی کی ضرورت ہاتی نہیں رہے گی۔"

"یہی کیا جارہا ہے۔" اس نے سرہلا کر کہا "لاش کی کئی زاویوں سے لی گئی رنگین تصاویر گرین فارم کے مزدوروں اور گارڈز کو دکھانے کے لیے تیار کی جارہی ہیں۔ اخبارات میں چھپنے والی اکلوتی تصویر سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ روی کی تلاش میں جانے والی پولیس پارٹی بھی ناکام لوٹی ہے۔"

"وہی نہیں' اب تک ماروتی بھی اپنے گھر سے غائب ہوچکی ہوگی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"امید ہے کہ کل تک وہاں کے حالات قابو میں آجائیں گے۔ امریکیوں کے جارحانہ تیور رم توڑ رہے ہیں۔ حقائق سامنے آنے کے ساتھ ساتھ وہ مدافعانہ پوزیشن میں پسپا ہورہے ہیں۔ آئی جی اور ڈی آئی جی کی دخل اندازی سے بہت فرق پڑا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل تک روی کی گرفتاری

کے وارنٹ واپس لے لیے جائیں۔ مجھے اس کے بارے میں فکر ہے۔"

"کیوں؟ تمہیں اس سے کیا ہمدردی ہوگئی؟" ویرا نے بھویں چڑھا کر استہزائیہ انداز میں پوچھا "ماروتی سے بند کمرے کے تخلیے میں ڈینی کی ملاقات ہوئی تھی اور ساری فکر مندی تمہارے سر پر سوار ہے۔"

"احمقانہ باتیں مت کیا کرو۔" اول خان نے برا سا منہ بنا کر خشک لہجے میں کہا "حیدر آباد سے ہری چند غائب ہو چکا ہے۔ روی یا ماروتی سے ہی اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہو سکیں گی۔"

"اوہ! اسے تو ہم بھول ہی بیٹھے تھے۔" سلطان شاہ بولا۔ "روی کے بعد ہمیں اس کا رخ کرنا چاہیے تھا۔"

"زیادہ نہیں' بس تھوڑی سی تاخیر ہوئی اور وہ نکل گیا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم لوگ روی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔" اول خان نے وضاحت کی "اب کرشن کمار کے قریبی ساتھیوں میں سے وہی ہمارے سامنے رہ گیا ہے۔ دوسروں کے بارے میں روی سے معلومات حاصل ہونے کی امید ہے۔ اسی وجہ سے میں اس کے بارے میں فکر مند ہوں۔"

"تم صحیح سمت میں سوچ رہے ہو۔" میں نے اس کی تائید کی "میرے پاس روی اور ماروتی کا موبائل فون نمبر موجود ہے مگر ان سے کیا ہوا پہلا وعدہ وفا کیے بغیر میں ان سے کوئی توقع وابستہ نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے پاس اس کا فون نمبر کہاں سے آگیا؟ روی کے پاس تو فون نہیں تھا۔" سلطان شاہ نے اشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"تھوڑی دیر پہلے میری ماروتی سے بات ہوئی تھی۔ آدمی کی جیب میں پیسے اور شناختی کاغذات موجود ہوں تو موبائل فون کنکشن ذرا سی دیر میں مل جاتا ہے۔ ماروتی ابھی تک مجھ سے بد ظن نہیں ہوئی ہے۔"

"عورت جب خود کسی کو پسند کرتی ہے تو اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کر پاتی۔" ویرا کو اپنا فلسفہ بگھارنے کا موقع مل گیا "اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ خود فریبی اس کی ضرورت اور کبھی کبھی مجبوری بن جاتی ہے۔"

"تم نے اول خان کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ ہم بند گلی کے سرے کے بہت قریب ہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا "اس سے آگے نکلنے کے لیے ہمیں روی اور ماروتی کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کرشن کمار کے ساتھیوں کے بارے میں جگدیش کچھ نہیں جانتا۔"

"ابھی ہمارے سامنے ہری چند کا نام بھی ہے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" ویرا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تھوڑی دیر پہلے میں خود ہری چند بنا ہوا تھا۔" موضوع بدلنے کے لیے میں نے ہنس کر کہا "میں میجر بخشی سے بات کر رہا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں بخشی کو ہری چند کے بارے میں جو مفروضہ باتیں بتا رہا تھا' اول خان نے انہیں حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے۔"

"میرا اندازہ یہی تھا کہ تم نے ایک سے زیادہ فون کیے ہیں۔" ویرا بولی اٹھی "وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"آج کل وہ فعال نہیں ہے لیکن کرشن کمار کی سرگرمیوں سے باخبر تھا۔ دوسرے انتہا پسند بھارتیوں کی طرح وہ بھی اکھنڈ بھارت کے بارے میں بہت پر امید ہے۔ اس نے مجھے ہری چند سمجھ کر چند قیمتی مشوروں سے بھی نوازا ہے۔"

"آج کل وہ پر سکون ہے اور اس کے سر سے تمہارا اور ویرا کا بھوت اترا ہوا ہے۔" میجر بخشی سے ہونے والی گفتگو سن کر اول خان نے کہا۔

"تم یہ بھول رہے ہو کہ وہ اس وقت ڈینی سے نہیں' ہری چند سے بات کر رہا تھا۔" ویرا نے ٹوکا "وہ سابق فوجی ہونے کے باوجود ناقابلِ یقین حد تک ڈرپوک ہے۔ اسے علم ہو جاتا کہ وہ ڈینی سے بات کر رہا ہے تو شاید اس کے ہاتھ سے ریسیور ہی نکل جاتا۔"

"اس کا کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔" سلطان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا "وہ بہت دنوں سے یہاں پل رہا ہے۔"

"جب تک کرشن کمار کی باقیات کا صفایا نہیں ہو جاتا' ہم کوئی نیا محاذ نہیں کھولیں گے۔" ویرا نے اس سے اختلاف کیا۔

گفتگو کا وہ سلسلہ وہیں موقوف ہو گیا۔ غزالہ نے سب کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تھی۔

آدمی کسی کام میں ہمہ تن مصروف ہو تو وقتی طور پر اپنی بھوک پیاس کو بالکل بھولا رہتا ہے۔ فرصت اور فراغت میسر ہو تو اسے اس کی ذاتی ضروریات وقفے وقفے سے ستاتی رہتی ہیں۔ میں نے میز پر کھانے کا آغاز ہونے کے بعد محسوس کیا کہ غزالہ کے سوا سب ہی کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ غزالہ کے تیار کیے ہوئے تازہ کھانوں کی تیز خوشبوؤں نے اس اشتہا میں اضافہ کر دیا تھا۔



کھانے کے دوران میں میرا ذہن ماضی قریب کے واقعات کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔

ہمارے حصے میں جہاں بہت سی کامیابیاں آتی رہیں وہاں کچھ ناکامیوں کے داغ بھی موجود تھے۔ عارضی طور پر ان ناکامیوں پر ہمیں صدمہ ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے اسباب خود بخود سمجھ میں آجاتے تھے۔ دشمنوں سے ہونے والی خوں ریز لڑائیوں میں لغزش اور بے خبری کی کوئی معافی نہیں تھی۔ ہر چوک کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی شکست ہمارے سامنے آئی تھی۔ ہم نے جسمانی نقصانات بھی اٹھائے تھے مگر یہ غنیمت تھا کہ اپنی محدود تعداد کے باوجود ہم جانی نقصان سے ہمیشہ محفوظ رہے تھے اور خدا کی نصرت و تائید سے ہماری نظری برقرار تھی۔

کرشن کمار سے ہونے والی لڑائی کے بارے میں غور کرتے ہوئے ایک نکتے پر میرا ذہن الجھ گیا۔

کرشن کمار نے مجھ سے پہلی اور آخری مرتبہ فون پر بات کرتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ ہم نے مراد ظریف کو آزاد یا اس کے حوالے نہ کیا تو وہ امریکیوں سے ہمارا سودا کر لے گا۔ گرین فارم پر جی اور ڈیوڈ کی موجودگی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ کرشن کمار نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی لعوس کارروائی شروع کر دی تھی اور گرین فارم پر آپریشن شروع ہونے سے پہلے اسے امریکیوں سے مذاکرات کے لیے کافی وقت مل چکا تھا۔

کرشن کمار حیدر آباد سے واپس آنے والی ہماری گاڑی کے تعاقب کے نتیجے میں ہمارے پتے سے واقف ہو چکا تھا۔ اپنے تین آدمیوں کا مشن ناکام ہونے کے بعد وہ خود اسلحے کے بل پر ہمارے گھر میں گھس آیا تھا۔ پھر اول خان کے ذریعے جگدیش' ماروتی اور روی سے ہوتا ہوا' ہمارا فون نمبر بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔ نہیں معلوم کہ اس نے امریکیوں سے کیا مذاکرات کیے تھے اور انہیں ان معلومات میں کس حد تک شریک کیا تھا۔

اگر کرشن کمار نے مرنے سے پہلے امریکیوں کو ہمارے پتے یا فون نمبر سے آگاہ کر دیا تھا تو ہم اس گھر میں ایک لمحے کے لیے بھی محفوظ نہیں تھے۔ امریکیوں کو سراغ رسانی اور تباہ کاری پھیلانے کے سلسلے میں ابتدا سے ہی ایسے جدید ترین وسائل دستیاب رہے تھے جن کا توڑ کرنا ممکن تھا۔

کرشن کمار اور امریکیوں کے مذاکرات کہاں تک پہنچے تھے اور اس نے ہمارے بارے میں انہیں کیا بتایا تھا۔ اس وقت ان دو سوالوں بلکہ عملی طور پر ایک سوال کا جواب ہماری بقا کے لیے اہم تھا۔ صحیح جواب اور صحیح فیصلہ ہماری زندگیوں کا ضامن تھا۔ فیصلے کی ذرا سی بھی غلطی ہم چاروں کے لیے ہولناک پیغام اجل ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا رہا' وہ نکتہ اسی قدر گمبھیر ہوتا چلا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ اس بار غزالہ بھی ہمارے درمیان موجود تھی۔

جب اول خان نے بند کھول کر اپنے جوتے اتارنے شروع کیے تو ویرا بولے بغیر نہ رہ سکی "معلوم ہوتا ہے کہ تم میسن گوشہ کے معاملات سے بالکل ہی بے فکر یا فارغ ہو گئے ہو۔ اب تمہارے لیے وہاں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔"

"اگر تمہیں میری موجودگی گراں گزر رہی ہے تو میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"سوال تمہاری موجودگی کا نہیں' وہاں ہونے والے واقعات سے باخبر رہنے کا ہے۔"

"کرشن کمار کو لانے کے بعد میں نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ آئی بی والوں کی طرح میرے آدمی بھی موجود ہیں۔ وہ مجھے یہیں رپورٹ دیں گے۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر محکموں کے اعلیٰ حکام مجھ سے واقف ہیں۔ کراچی میں میری طویل پوسٹنگ کی وجہ سے ہر جگہ کوئی نہ کوئی مجھے پہچان لیتا ہے۔ ہم نے اپنے طور پر ایک بڑی کارروائی کر ڈالی ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ اس معاملے میں غیر ضروری طور پر ایس ٹی ایف کا نام لیا جائے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سلطان شاہ نے اس سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا "یہ واقعات نامعلوم لوگوں سے منسوب رہیں تو بہتر ہوگا۔ تمہیں ہدف سے غرض تھی جو حاصل کر لیا گیا۔"

"اب اجازت ہو تو دوسرا جوتا بھی اتار دوں۔" اول خان نے ویرا سے پوچھا۔

ویرا ایک ڈھیٹ لڑکی تھی مگر اس وقت شرمندہ ہو گئی "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم نے میری بات کا غلط مطلب لیا ہے۔" اس کے بعد اپنی طرف سے سب کی توجہ ہٹانے کے لیے فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گئی "تم کیوں بقراط بنے بیٹھے ہو؟"

"ہاں' میجر بھی تم بالکل خاموش تھے۔" اول خان' ویرا کے جھانسے میں آکر مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

"ایک سنگین مسئلہ ذہن سے چپکا ہوا ہے۔" میں نے انہیں اپنی تشویش میں شامل کرتے ہوئے کہا "کرشن کمار

ہمارے پتے اور فون نمبر سے واقف تھا۔ اس نے جمی اور ڈیوڈ کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتادیا تھا؟"

"جو کچھ بھی بتایا ہو' وہ ان کے ساتھ' ان کے سینوں میں جنم واصل ہو گیا۔" ویرا نے جواب دیا۔

"تم بھول رہی ہو کہ مرنے سے پہلے انہوں نے موبائل فون پر اپنے بڑے افسران سے رابطہ کر کے گڑبڑ کی خبر دی تھی۔ ہمارے بارے میں انہیں کچھ معلوم ہوا ہو گا تو انہوں نے فون پر معلومات بھی آگے بڑھادی ہوں گی۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اول خان کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی۔

"امریکی ہماری اس کمین گاہ سے واقف ہو چکے ہیں تو ہم یہاں ہرگز محفوظ ہیں۔"

"کرشن کمار انعام کی خطیر رقم حاصل کرنے کے لیے ایک مخبر کے روپ میں ان سے ملا تھا۔ ان سے سودا ہوئے اور رقم وصول کیے بغیر وہ یہ باتیں بتا کر اپنے ہاتھ پیر نہیں کٹوا سکتا تھا۔" غزالہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ ابتدائی ملاقات تھی۔" سلطان شاہ نے اپنی رائے دی "وہ خالی ہاتھ آئے ہوں گے۔ انہوں نے اتنی بڑی رقم کرشن کمار کو دی ہوتی تو وہ اس کے قبضے سے یا کابینہ سے برآمد ہوتی۔ رقم لیے بغیر وہ انہیں کچھ بتانے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہاں کوئی رقم نہیں پائی گئی۔"

"اس کے پاس کچھ نہیں تھا' کابینہ کی تلاشی لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔" اول خان نے اس کی تصحیح کی۔

"ہم سب تجلت میں بولے جا رہے ہیں۔ ڈینی کا یہ سوال زیادہ توجہ کا طلب گار ہے۔" ویرا کو بھی معاملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔

"اس نے انہیں کچھ بتایا ہوتا تو وہ پوچھ گچھ کے دوران میں اس حوالے سے کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔" اول خان نے سوچتے ہوئے کہا "وہ ہمیں بددعائیں ضرور دے رہا تھا مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔"

"وہ احمق نہیں بہت چالاک تھا۔" ویرا نے موقف بدل لیا "اسے اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ کچھ بتا دیتا تو ہم ہوشیار ہو کر اپنا ٹھکانا بدل لیتے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اچھا ہے' ہم بے خبری میں مارے یا پکڑے جائیں۔"

"امریکیوں کو اگر رات کو کچھ معلوم ہو گیا تھا تو وہ اب تک ہاتھ پر ہاتھ کیوں دھرے بیٹھے ہیں؟" اول خان نے پوچھا۔

"ابھی وہ میمن گوٹھ میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہاں سے نمٹ کر ہمارے بارے میں سوچیں گے۔" ویرا نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"وہاں ان کے صرف تین آدمی ہیں۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا مسئلہ تم دونوں ہو۔ انہیں کوئی بھنک بھی مل گئی ہوتی تو وہ پوری طاقت سے تمہارے خلاف حرکت میں آ چکے ہوتے۔"

"کچھ بھی ہو۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" ویرا نے جواب دیا۔

"ایسا ہے تو تم چاروں مائیکرو سینٹر منتقل ہو جاؤ۔ وہاں ساری آسائشیں موجود ہیں۔" اول خان نے تجویز پیش کی۔

مجھے اس تجویز سے شدید اختلاف تھا۔ وہ جگہ فرنٹیئر انٹرنیشنل اور مقبول چوہدری کی وجہ ابتدا سے ہی فساد کا گڑھ بنی رہی تھی۔ مراد ظریف نے وہاں فائرنگ کی تھی۔ وہ جانے ہوئے امریکی سی آئی اے کے مقامی چیف سے ملا تھا اور شاید اسی ملاقات کی وجہ سے یہ شبہات ظاہر کیے گئے تھے کہ مائیکرو سینٹر سے فریڈم انٹرنیشنل کے اہم ترین عہدے داروں کو اغوا کرنے کے بعد کسی ایجنسی کے اہلکار اس عمارت پر قابض ہو چکے تھے۔

امریکیوں کو کچھ بتایا گیا ہوتا یا نہ بتایا گیا ہوتا' وہ عمارت ہر حال میں مخدوش تھی۔

"پھر تمہارے پاس فوری طور پر صرف اشیشن فور رہ جاتا ہے۔" اول خان نے میری پوری بات سننے کے بعد کہا "اس وقت ہم ایک فی صد خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔ وہم تمہارے ذہن میں آیا ہے' ویرا تم سے متفق ہے۔ اسی وقت یہاں سے چل دو۔"

"تم چھت پر چلے جاؤ اور آس پاس نگاہ رکھو۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا "ہمیں بوکھلانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔ وہ سڑک راستے ہی آئیں گے اور مزہ چکھ لیں گے۔"

"خطرے کا احساس ہو جانے کے باوجود تم یہاں رہنے پر مصر ہو؟" اول خان نے حیرت سے پوچھا۔ سلطان شاہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم سے جا چکا تھا۔

"یہ گنجان آبادی ہے۔ یہاں وہ کوئی بڑی کارروائی نہیں کر سکتے۔ آئیں گے اور چوروں کی طرح گھر میں گھسنے کی کوشش کریں گے یا پھر وہ دو چار دستی بم پھینک کر نکلیں گے۔ ہم ان کے استقبال کے لیے اب تیار ہیں۔ ان کے لیے تم اپنے دو آدمی بھیج دینا۔"



"دو نہیں' میں دس آدمی بھیج دوں گا لیکن یہ کوئی دانش مندانہ فیصلہ نہیں ہے۔"

"اب ان سے براہِ راست دو دو ہاتھ کرنے کا موقع آ گیا ہے۔ ان کے خوف سے ہم کب تک ٹھکانے بدلتے رہیں گے۔"

"کبھی کبھی تم میرے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہو جاتے ہو۔" اول خان اپنا سر جھٹک کر بولا۔

وہ موضوع اس قدر سنگین تھا کہ دیر تک اسی کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوتی رہی۔ غزالہ مصر تھی کہ اس کی رائے درست تھی۔ ویرا کو خطرہ سر پر منڈلاتا ہوا نظر آ رہا تھا اور میں بدستور اپنے فیصلے پر قائم تھا۔

پانچ بجے اول خان کے ایک آدمی کا فون آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ کراچی میں ملنے والی' کرشن کمار کی لاش کی رنگین تصاویر کو شناخت کرایا گیا تھا۔ شاید امریکیوں کو کرشن کمار کے اصل کردار کا علم تھا۔ شناخت کے بعد ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے جسے دن بھر کی شدید تکان کا نام دے کر وہ میمن گوٹھ سے واپس کراچی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

"اب کل تک روی کے حق میں کوئی فیصلہ جاری ہو جائے گا۔" اول خان نے اپنے آدمی کی رپورٹ سے مطلع کرتے ہوئے کہا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سب ہی کے لیے انتظار کے لمحات صبر آزما تھے۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے اول خان کے طلب کیے ہوئے دونوں آدمی اپنی پوری تیاری کے ساتھ آ گئے۔ وہ اندھیرے میں دور تک دیکھنے والی انفرا ریڈ دوربینوں' رائفلوں' مسلک گنوں اور دوسرے ضروری سامان سے لیس تھے۔

میں نے اول خان کے ساتھ چھت پر جا کر ان دونوں کو ممکنہ خطرات اور ان کی ذمے داریوں کے بارے میں بریف کیا اور اپنی حفاظت کا ذمہ ان دونوں پر چھوڑ کر ہم تینوں نیچے آ گئے۔

اول خان نے ہمارے ساتھ کافی وقت گزار لیا تھا۔ اس کے فون کا انتظار تھا' وہ آ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی رخصت ہو گیا۔

"اب بھی وقت ہے۔" اول خان کو رخصت کرنے کے لیے اٹھتے ہوئے اس نے کہا "اسٹیشن فور چل دو۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جائے گی' ان کی طرف سے حملے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ ہم میں سے کسی کو زخم بھی آیا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"سب کی نہیں' صرف اپنی بات کرو۔" سلطان شاہ چڑ کر بولا "میں ڈینی کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔"

"میں نے بھی کبھی پشت نہیں دکھائی۔ اس وقت حالات مختلف ہیں۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے!"

"وہ غیر ملکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو چار آدمی آئیں گے' کوئی لشکر دھاوا نہیں بولے گا۔ تمہارا دم کیوں نکلا جا رہا ہے۔ اس وقت ہم چھ افراد ہیں۔ کیا ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟"

"بھاڑ میں جاؤ اور میری بات لکھ لو۔" وہ بھنا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی "آج رات کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ پے در پے ناکامیوں کے بعد وہ کوئی قدم ضرور اٹھائیں گے۔ میری رگوں میں امریکی خون دوڑ رہا ہے۔ میں انہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔"

"یہ تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے امریکی خون کی خرابی ہے کہ تم پر خوف سوار ہو رہا ہے۔"

"اب مجھے ڈسٹرب نہ کرنا' میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" اس نے مڑ کر ہم تینوں سے کہا "جب بھوک لگے گی' خود کچن سے کھانا لے کر کھالوں گی۔ میں یہاں بیٹھ کر اپنی شام برباد نہیں کر سکتی۔"

"تمہارے ہم وطن آ گئے تو ہم انہیں تمہارے کمرے میں ہی بھیج دیں گے۔" سلطان شاہ نے ہانک لگائی۔

اس بار ویرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غزالہ اس نوک جھوک پر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

ہم نے وقت گزاری کے لیے ٹیلی ویژن کھول لیا۔ اس رنگین ڈبے پر نظر آنے والے پروگراموں سے ہم میں سے کسی کو رغبت نہیں تھی۔ بس مشینی انداز میں کبھی کبھار اسے دیکھ لیا جاتا تھا۔ کچھ پروگراموں کے بعد خبرنامہ شروع ہوا تو اس میں چوتھی خبر میمن گوٹھ میں ہونے والے پراسرار حادثے کے بارے میں تھی۔ ابتدائی تین خبریں درجہ بدرجہ عائدین سلطنت کی مصروفیات اور بیانات پر مشتمل تھیں۔

شاید اوپر کی ہدایات پر نشریات کی وزارت نے میمن گوٹھ کے واقعات کو زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس خبر میں سب کچھ وہی تھا جو ہمیں اول خان سے معلوم ہو چکا تھا۔ اضافی بات یہ تھی کہ حکام نے پاکستان میں کرشن کمار کی غیر قانونی موجودگی کو بہت سرعت سے بے نقاب کر دیا تھا۔ خبر کے آخر میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ساری توجہ اس مجبوری پر مرکوز کر دی گئی تھی جو مرنے والے امریکیوں کو ایک غیر قانونی

تارک وطن کے در پر لے گئی تھی۔

امریکیوں کے تازہ زخم پر نمک پاشی کے لیے وہ آخری اعلان بہت ضروری تھا۔

کھانے کے بعد ہم خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ویرا اپنے کمرے میں بیٹھی، غزلوں کی لے پر اسکاچ سے شغل کر رہی ہوگی۔ اس وقت اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں تھی۔

بستر پر پہنچنے کے نصف گھنٹے بعد غزالہ گہری نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔ وہ دن بھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھکی ہاری تھی پھر اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔ اس نے خطرے کے ہر امکان کو یکسر مسترد کر دیا تھا اس لیے اس کی نیند میں کوئی چیز حارج نہیں ہو سکی۔ میری کیفیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ ذہنی اور اعصابی تکان کے باوجود نیند کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے اور کئی سگریٹیں ختم کرنے کے باوجود جب نیند کے آثار نمودار نہ ہوئے تو میں نے خاموشی سے بستر چھوڑا اور سلیپر پہن کر دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری میں رک کر میں نے ویرا کے بند دروازے کے پیچھے کی سن گن لینے کی کوشش کی مگر وہاں رات کے گہرے سناٹے کا راج تھا۔ کیسٹ پلیئر بند ہو چکا تھا اور ویرا اپنا کوٹہ پورا کرنے کے بعد گہری نیند سو چکی تھی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہ دو بجا رہی تھی۔

میں زینوں کی طرف ہو لیا۔ میری آہٹ پر وہ دونوں ہی بھڑکے تھے۔ اس وقت ایک بوتل سے منہ لگا کر پانی پی رہا تھا۔ دوسرا ٹرائی پوڈ پر لگی ہوئی دوربین پر جھکا گلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری آہٹ پر وہ دونوں اپنی رائفلیں سنبھال کر جھٹکے سے سیدھے ہوئے تھے پھر مجھے پہچان کر ان کے تنے ہوئے بدن ڈھیلے پڑ گئے۔ انہوں نے مجھے سلام کیا اور دوربین والا دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

وہ دونوں پوری ذمے داری سے اپنے فرض کی ادائیگی میں منہمک تھے۔ اس وقت تک انہیں سڑک پر کوئی غیر معمولی نقل و حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے کچھ دیر ان کے پاس رک کر ایک سگریٹ ختم کی، سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ کچھ تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں جذب کی اور وہاں سے لوٹ آیا۔

میری وہ بے نام بے چینی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں بدلے جا رہا تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی اور اعصابی کشیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کے تین بجے، گھر کے گہرے سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی کسی آسیبی چیخ کی طرح گونجی اور میں بری طرح چونک گیا۔ دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے میں ریسیور اٹھا کر کان سے لگا چکا تھا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تم جاگ رہے ہوگے۔" دوسری طرف سے اول خان کی آواز گمبھیر اور نیند کے خمار سے عاری تھی۔

"کیا تم نے صرف یہی جاننے کے لیے اس وقت فون کیا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری چھٹی حس بلاوجہ خطرے کی گھنٹی نہیں بجاتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مائیکرو سینٹر کو دھماکوں سے اڑا دیا۔" اول خان کے انکشاف نے لمحے بھر کے لیے مجھے ہلا دیا۔

باہمی مشوروں کے نتیجے میں اگر ہم خوف زدہ ہو کر مائیکرو سینٹر منتقل ہو گئے ہوتے تو ہماری لاشیں اسی عمارت کے ملبے میں دفن ہو کر رہ جاتیں۔ وہ کہہ رہا تھا "میرا آدمی اس حادثے میں موت کے منہ سے بال بال بچا ہے۔"

"ہوا کیا تھا؟ کیا وہاں کوئی ٹائم بم پھٹا ہے؟" میں نے اس سے اگلا سوال کیا۔

"وہ دو نقاب پوش تھے۔ سر سے پیر تک، ان کے جسم کا ہر حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پر دستانے تھے۔ وہ ایک جیپ میں توحید کمرشل پہنچے اور انہوں نے موٹے بیرل والی چھوٹی گنیں اپنے شانوں سے ٹکا کر گیراج والے حصے پر بم فائر کیے۔ بموں نے بنیادوں اور نچلے ستونوں کو توڑا اور پوری عمارت مہیب آوازوں کے ساتھ نیچے آتی چلی گئی۔"

"اور وہ دونوں بھاگ گئے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر بے تابی سے پوچھا۔

"جیپ کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی مشکل سے رکے۔ دونوں نے ایک ایک فائر کیا اور فرار ہو گئے۔"

"میں پہلی بار ایسی کسی گن کے بارے میں سن رہا ہوں۔" وہ یقیناً کوئی جنگی ہتھیار رہا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گوریلا لڑائیوں میں امریکی فوج کم فاصلے پر تباہی پھیلانے والے چھوٹے گولے فائر کرنے کے لیے ایسی گنیں استعمال کرتے رہے ہیں۔ وہ دونوں بھی امریکی

رہے ہوں گے۔ ایسے ہتھیار عام دسترس میں نہیں ہیں۔"

"تم شاید اپنے گھر سے بول رہے ہو۔ تمہیں یہ اطلاعات کیسے ملیں؟" میں نے سوال کیا۔

"مائیکرو سینٹر کی چوکیداری پر مامور' ایس ٹی ایف کا سپاہی نسوار کھانے کی عادت میں مبتلا ہے۔ اس کی ڈبیا خالی ہوگئی تھی اور اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ حملے سے چند منٹ پہلے وہ دروازہ مقفل کرکے اپنے کسی دوست سے نسوار لینے نکلا تھا۔ اس کی واپسی سے پہلے مائیکرو سینٹر ملبے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ نسوار کھانے کی بری عادت نے آج اس کی زندگی بچالی۔"

"کھوٹے سکے کی طرح کبھی کبھی بری عادتیں بھی انسان کے کام آجاتی ہیں۔ تمہارا آدمی بچ گیا مگر کوئی اور تو ہلاک یا زخمی نہیں ہوا؟" میں اول خان کی زبان سے زیادہ سے زیادہ تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"امکان نہیں ہے۔ انہوں نے گراؤنڈ فلور کو نشانہ بنایا اس لیے آس پاس کی عمارتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہوگا۔ صحیح صورت حال کچھ دیر بعد واضح ہوسکے گی۔ تم نے پچھلی شام کو بھی مائیکرو سینٹر کو سب سے زیادہ غیر محفوظ قرار دیا تھا اور اب یہ خبر آگئی۔"

"اس خبر سے ہمیں اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم کس کا حوالہ دے رہے ہو؟" اول خان نے بے ساختہ سوال کیا۔

"کرشن کمار نے انہیں ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس بارے میں غزالہ کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگالیا۔ مجھے تو دونوں باتوں میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔"

"جانی نقصان اور ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لیے انہیں کوئی مضبوط ترین ہدف درکار تھا۔ انہیں ہمارا پتا معلوم ہوتا تو وہ ادھر کا رخ کرتے۔ جان اسمتھ کو معلوم تھا کہ مقبول چوہدری کے غائب ہونے کے بعد کوئی ایجنسی مائیکرو سینٹر پر قابض ہے اور وہ ہمیں ایجنسی کا آدمی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ہم وہیں مقیم ہیں اور کرشن کمار یہ بتانے کے لیے انعامی رقم مانگ رہا تھا۔ انہوں نے وہیں حملہ کردیا۔"

"یعنی یہ حملہ مائیکرو سینٹر پر نہیں' تمہاری اور ویرا کی پناہ گاہ پر کیا گیا ہے!"

"ہاں اور اب میں وہاں کی تباہی کا منظر اپنی نگاہوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بلاوجہ اپنا وقت برباد کرو گے۔ اس عمارت سے ہماری کیا وابستگی ہے۔ اکرام الٰہی نے حرام کے پیسے سے ہوائی تھی۔ وہ اسی طرح ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ مال حرام بود' بہ جائے حرام رفت۔ ہمیں اس سے کیا لینا!"

"تمہارا آدمی وہاں ہے۔ اس کا سامان ملبے میں رہ گیا ہوگا۔" میں نے اسے آمادہ کرنے کے لیے کہا۔

"سپاہی کا سامان ہی کیا ہوتا ہے۔ ایک جوڑا اور ہتھیار۔ اس کا ہتھیار اس کے ساتھ تھا۔ ایک جوڑا میں اسے لے دوں گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ خاموشی سے اسٹیشن فورد واپس چلا جائے۔"

"انہیں جب علم ہوگا کہ عمارت میں کوئی ذی روح نہیں تھا تو وہ اپنا سر پیٹ لیں گے۔"

"انہیں بھلا کر سونے کی کوشش کرو۔ اب تمہاری بے چینی دور ہوجانی چاہیے۔ ہاں یہ بھی سن لو کہ روی کے وارنٹ واپس لے لیے گئے ہیں۔ کرشن کمار کے بارے میں بہت تیزی سے ہر بات معلوم کرلی گئی ہے۔"

"یہ تفصیل میں نے خبرنامے میں سن لی تھی۔ روی کی خوش خبری تم سنارہے ہو۔"

"تمہارے ساتھ کوئی اور بھی جاگ رہا ہے یا سب ہوئے ہیں؟"

"سب سو رہے ہیں۔ میں ابھی تمہارے آدمیوں کے پاس سے ہو کر آرہا ہوں۔ صبح انہیں واپس بھیج دوں گا۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں رہ کر بے چارے بلاوجہ بے آرام ہوتے رہیں گے۔"

"ابھی ایسی غلطی نہ کرنا۔ دو چار دن تک احتیاط ضروری ہے۔ زخمی ٹانگ پلٹ پلٹ کر وار کرتا ہے۔" اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا "صبح میں ان کو بلا کر' ان کی جگہ نئے آدمی بھیج دوں گا۔ چند دنوں تک دن اور رات میں ڈیوٹیاں بدلتی رہیں گی۔"

"تمہاری مرضی۔" میں بے بسی سے ہنس پڑا "بعض اوقات تم ہمیں ضرورت سے زیادہ نازک سمجھنے لگتے ہو۔"

"تمہاری سکون کی نیند کے لیے میں پورا دستہ بھی بھیج سکتا ہوں۔ مجھے سے ان معاملات پر بحث مت کیا کرو۔"

"فی الحال میرا سونے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں جان اسمتھ کی خبر لینا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت تم کیا کرو گے؟ وہ کہاں ملے گا؟" اول خان کی آواز تحیر زدہ تھی۔



"فون پر ملے گا۔ اسے کچھ ایسی خوراک دوں گا کہ اس کی نیندیں حرام ہوجائیں گی۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

"اس کا فون نمبر تمہیں کہاں سے ملے گا؟" اول خان کی حیرت برقرار تھی۔

"وہ اوبرائن کی جگہ آیا ہے۔ اسی کے فلیٹ میں رہ رہا ہوگا۔ وہاں کا فون نمبر میرے پاس محفوظ ہے۔"

"سی ایس ڈی ضرور آن کرلینا۔" اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ میری تجویز سے محظوظ ہوا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا "اس کے بعد تم سکھ کی نیند سوؤ گے۔ اور وہ کسی پاگل کی طرح رات بھر جاگتا رہے گا۔"

ہم دونوں نے جان اسمتھ کی شان میں چند بے تکلفانہ فقروں کا تبادلہ کیا اور بات ختم کردی۔

اول خان سے بات ہونے کے بعد میری بے چینی حیرت انگیز طور پر دور ہوچلی تھی۔ وہ شاید میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا کہ میں نے وقت سے پہلے خطرے کی بو محسوس کرلی تھی۔ بے چینی ختم ہونے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے گہری نیند سوئی ہوئی غزالہ کے خواب انگیز سراپا پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی نیند میں خلل پڑنے کے اندیشے کی وجہ سے خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

اول خان ایک ذمے دار آدمی تھا۔ کبھی کوئی کچی بات منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کی کہی ہوئی بیشتر باتوں کو سند کے طور پر لیا تھا اور مجھے کبھی شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر طرف سے تصدیق کیے بغیر روی والی بات نہیں کہی ہوگی۔

میں نے جان اسمتھ سے پہلے وہ خوش خبری ماروتی تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ خبر اتنی بڑی تھی کہ میں اس وقت بھی روی اور ماروتی کی نیند خراب کرسکتا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم سے فون ملایا تو دوسری گھنٹی پر ایک غنودہ مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں مظہر بول رہا ہوں۔ ماروتی یا روی سے بات کرادو۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ماروتی بے خبر سو رہی ہے۔ میں روی بول رہا ہوں۔ چاہو تو مجھ سے بات کرلو ورنہ میں اسے جگادوں۔" اس کی آواز سے نیند کا نشہ بہت حد تک کافور ہوگیا۔ مجھے ماننا پڑا کہ وہ اپنی بیوی کی آزادیوں کے بارے میں غیر معمولی حد تک فراخ دل تھا۔

"تمہارے لیے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ صبح تم بے فکر ہوکر اپنے گھر جاسکتے ہو۔ اب وہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"اوہ ـــ گریٹ!" ریسیور پر روی کی مسرت آمیز آواز ابھری۔ "ماروتی نے تمہارے بارے میں سچ کہا تھا۔ تم واقعی کمال کے آدمی ہو۔"

"شکریہ اب تم آرام کرو۔ پھر کسی بھلے وقت پر تم سے ملاقات ہوگی۔"

"اس سے زیادہ بھلا وقت اور کیا ہوگا۔ کل شام تم ہمارے ساتھ چائے پیو گے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

میں دل سے اس ملاقات کا خواہاں تھا مگر میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر کہا "تم دونوں میرے دوست!" اس نے کوشش نہ کی۔ ماروتی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری مسلمانی بہت مضبوط ہے اور تم شراب نہیں پیتے اس لیے تمہیں چائے پر مدعو کررہا ہوں ورنہ ہم تینوں مل کر ٹاک ٹیل پارٹی اڑاتے۔"

"میں ایک شرط پر وعدہ کرسکتا ہوں کہ تمہارے بڑے بھائی ہماری محفل میں شامل نہ ہوں۔"

"ارے! تم بھابی جی کی فکر نہ کرو۔ وہ مجھ سے اور میرے دوستوں سے دور رہتے ہیں۔ ان پر ہر وقت بزرگی سوار رہتی ہے۔" اس کی آواز سے ایسی بشاشت مترشح تھی جیسے وہ سرے سے سویا ہی نہ ہو۔"

میں نے اس سے وعدہ کرلیا اور بات ختم ہوجانے کے بعد کئی منٹ تک سوچتا رہا کہ اس نے شراب نوشی سے پرہیز کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا' وہ اس کی طبیعت کے لاابالی پن کا نتیجہ تھا یا اس نے لطیف پیرائے میں مجھے یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ہر بات سے باخبر تھا۔

کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کے بعد میں نے اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کا پیغام کچھ بھی رہا ہو' یہ بات طے تھی کہ اس نے مجھے اگلی شام چائے پر مدعو کرلیا تھا جہاں میں اس سے کھل کر بہت سی باتیں کرسکتا تھا۔

وقت بہت خاموشی سے گزرتا چلا گیا تھا۔ میں نے اوبرائن ڈی ہنٹ کی سابقہ قیام گاہ کا نمبر ملایا تو وہاں راوی نے عیش و آرام کی ہر تحریر پر قلم پھیرا ہوا تھا۔ پہلی گھنٹی بجنے کے بعد ہی کسی کٹ کھنے سے امریکی کی غراہٹ نے میری طبیعت مکدر کردی۔

"اگر تم ہی جان اسمتھ ہو تو تم سے فون پر زیادہ دیر بات کرنی ممکن نہیں ہے۔ میرے کان کا پردہ پھٹ جائے گا۔"

"یو سن آف اے گن!" میرے کانوں میں غصیلی آواز گونجی "میں ہی جان ہوں۔ تم کون ہو؟"

"میں تمہاری جان کا روگ ہوں جسے لوگ ڈینی کے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اوہ۔ یو۔۔۔!" اس طرف سے یک بیک مغلظات کا ایک سلسلہ شروع ہوا پھر اچانک ہی لائن ڈراپ ہوگئی۔ کمرے سے سی ایس ڈی کا بزر سنائی دیا تھا۔ میں نے کریڈل دبا کر فوراً ہی جان کا نمبر دوبارہ ملالیا۔

"اب تم نے کال ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تو میں تیسری بار تمہارا نمبر نہیں ملاؤں گا۔" میں نے سلسلہ ملتے ہی

"تمہارے مرشد کو بھی علم نہیں ہوگا اور میں کال ریکارڈ کرلوں گا۔ مجھ سے ہوائی باتیں ۔۔۔ کرو۔"

"ابھی لائن بلاوجہ ڈراپ نہیں ہوئی تھی۔ میرے فون سے کال سینسنگ ڈیوائس منسلک ہے۔ تم اپنے ریسیور کے ساتھ کسی بھی دوسرے آلے کو چھیڑو گے اور لائن خود بہ خود بند ہوجائے گی۔ یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے۔"

"نہیں ہوگی۔" اس نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سی ایس ڈی جیسی حساس چیزیں زرد جاپانیوں نے تم کالوں تک پہنچادی ہوں گی۔ تم بولو میں سن رہا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ابھی تمہارے پاس کچھ وقت ہے۔ تم نے مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو تمہارا وقت ضرور پورا ہوجائے گا۔"

"بڈیان بکنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت تم نے کیوں فون کیا ہے۔" اس کی آواز میں تجسس تھا۔

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری طرح تم بھی جاگ رہے ہو۔ تم نے مائیکرو سینٹر کو تباہ کرکے اچھا نہیں کیا۔ میری فون کال اس بات کا ثبوت ہے کہ میں تمہارے ٹھکانے سے واقف ہوں اور مائیکرو سینٹر میں ہونے والی دس اموات کے بدلے تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔"

"اوہ! وہاں دس آدمی مرے ہیں۔" اس کی آواز سے خوشی مترشح تھی "اب تمہارا دماغ کچھ ٹھکانے پر آگیا ہوگا۔"

"آدمی نہیں، صرف چوہے مرے ہیں!" میں نے ہکا سا قہقہہ لگا کر کہا "خالی عمارتوں میں صرف چوہے پروان چڑھتے ہیں۔ ان کے لیے ادارۂ تحفظ حیوانات تم سے جواب طلب کرے گا۔ میں ان کا بدلہ تمہارے خون سے لوں گا۔"

"اب یہاں اوبرائن جیسا فلسفی نہیں، میں رہتا ہوں۔ تم اس عمارت کے قریب بھی پھٹکے تو تمہارے چیتھڑے اڑا دیے جائیں گے۔ ہمیں اپنے تحفظ کے لیے ہر قسم کی آزادی میسر ہے۔ تمہارے خلاف اس آزادی کو بے رحمی سے استعمال کیا جائے گا۔"

"یہ آزادی جمی اور ڈیوڈ کو بھی حاصل تھی۔ ان کا انجام تمہارے سامنے ہے۔"

"مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے میں تم ہی ملوث ہوسکتے ہو۔ تمہارے خلاف فردِ جرم روز بروز سنگین ہوتی جارہی ہے۔"

"وہ اپنی بدحواسی کی وجہ سے کھڈ میں گر کر مرے ہیں۔ انہیں کرشن کمار سے اپنا سودا طے کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ اس سے پہلے میرے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بھاگے اور خود ہی شرم سے ایک کھائی میں جا گرے۔ میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔"

"ان کی باقیات کا پوسٹ مارٹم ہونے تک ہم خاموش ہیں۔ امریکی ماہروں کا معائنہ مکمل ہونے کے بعد ہر بات سامنے آجائے گی پھر تم دیکھنا کہ تمہیں کون امان دیتا ہے۔ تم پر تمہاری اپنی زمین تنگ کردی جائے گی۔"

"وہ اب بھی بہت تنگ ہے۔ میں چھوٹے سے مکان میں رہتا ہوں پھر بھی تمہاری دسترس سے باہر ہوں۔"

"تمہارے لیے صرف چھ فٹ زیرِ زمین جگہ ہونی چاہیے۔ تم اس سے زیادہ کے حق دار نہیں ہو۔"

"اتنی جگہ اب تک تمہارے آدمیوں کو راس آتی رہی ہے۔ اپنے لیے بھی کہیں بندوبست کرلو۔"

"جمی اور ڈیوڈ کامیاب ہوجاتے تو اس وقت تم ان بڑے بولوں کے لیے آزاد نہ ہوتے۔"

"وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ کرشن کمار نے بنیاد ہی بدنیتی پر رکھی تھی۔ کیا اس بات سے تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں کہ تم لوگوں سے اپنی مخبری کے عوض انعام کا سودا کرنے والا کوئی اور نہیں، را کا ایک منجھا ہوا ایجنٹ تھا۔"

"یہ ہمارا اور ان کا معاملہ ہے۔" جان کی آواز میں مزید تلخی گھل گئی "ہم ان سے اپنے معاملات طے کرنا جانتے ہیں۔ اس بارے میں تمہیں کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے تم اپنی بات کرو۔"

"تم وہ لوگ ہو جن پر ان کے دوست اعتماد نہیں کرتے، مجھے تو تم اپنا دشمن شمار کرتے ہو۔ میں تم سے عداوت کے سوا اور کیا کرسکتا ہوں۔"

"تم نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟" جان نے ترشی سے پوچھا۔

"وہ مقصد میں حاصل کرچکا ہوں۔ تمہیں معلوم ہوچکا ہے کہ مائیکرو سینٹر تباہ کرکے تم نے کچھ حاصل نہیں کیا اور مجھے تمہارا ٹھکانا معلوم ہے۔"



"میں اس کثیر المنزلہ عمارت میں رہ کر خوف زدہ نہیں ہوں۔ اوبرائن کا چھوڑا ہوا فلیٹ آباد کرتے ہوئے مجھے اطمینان تھا کہ یہاں میں محفوظ ہوں۔ میرے خلاف اندھا دھند کارروائی کرکے کوئی پاگل ہی سیکڑوں پاکستانیوں کے خون کی ہولی کھیلے گا۔"

"تم ہروقت فلیٹ میں نہیں رہتے۔ یہاں آتے جاتے بھی ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میں اپنے دفتر سے بھی روز آجاتا ہوں۔ ہم لوگ اتنے بودے نہیں ہیں جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔"

"میرے سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اب تمہیں یہاں ایف بی آئی کی کمک کی ضرورت بھی پیش آگئی ہے۔"

"تم اپنی ذات میں ایک کیڑے سے بھی زیادہ حقیر ہو۔ تمہاری اصل قوت پوری انتظامیہ میں مضمر ہے جو پل پل وہ کر تمہاری مدد کرتی ہے اور اندر کی خبر، تم تک پہنچاتی ہے۔ یہ حقیقت تم خود بھی جانتے ہو۔"

"یہ مسئلہ ہر ایک کے ساتھ ہے۔ تمہیں آج سی آئی اے، ایف بی آئی اور امریکی حکومت کی سرپرستی حاصل نہ رہے تو تم خود کو صفرے بھی بہت نیچے پاؤ گے۔ ہر شخص کو اصل طاقت اس کی ٹیم مہیا کرتی ہے۔ موازنہ کرو گے تو میری ٹیم کو بہت مضبوط پاؤ گے۔"

"میرا اور تمہارا کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے اور میرے اختیار کو پاکستان سے امریکا تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمہیں کوئی اپنانے کے لیے تیار نہیں۔ پاکستان کے ریکارڈ میں تمہارا اندراج ایک مجرم کی حیثیت سے ہے۔ یوں سمجھو کہ قانون کا کوئی محافظ اپنے فرائض کی انجام دہی میں دس خون بھی کردے تو اس سے کوئی بازپرس نہیں کی جاتی۔ قاتل ایک قتل کردے تو سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ بیورو کریسی نے تمہیں اپنا آلۂ کار بلکہ کھلونا بنایا ہوا ہے۔ تم سے کام لینے والے اپنی لوہیوں میں کلغیاں سجاتے ہیں، تمہیں کچھ نہیں ملتا۔ جب تم بوڑھے ہوجاؤ گے اور ان کے کسی کام کے نہیں رہو گے تو اندھیرے میں سے آنے والی کوئی بے نام و نشان گولی تمہاری زندگی کا چراغ گل کردے گی۔"

اس کی تقریر بہت لمبی ہوتی جارہی تھی۔ میں نے بات درمیان میں کاٹ دی "یہ سب تم مجھے کیوں سنا رہے ہو؟"

"شاید تمہیں عقل آجائے اور یہ باتیں تمہیں بھی نظر آنے لگیں۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ تم لوگ اپنے فائدے کے بغیر کسی کو ٹھوکر بھی نہیں مارتے۔"

"تم دہشت گردی کی زندگی سے تائب ہوکر باعزت زندگی کی راہ اختیار کرلو تو ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔"

"میرے تائب ہونے سے تمہیں کیا آسانیاں میسر آسکتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری وجہ سے ہم اپنے کئی اچھے دماغوں سے محروم ہوچکے ہیں۔ تم راستے سے ہٹ جاؤ تاکہ ہم اپنی توانائیاں دوسرے تعمیری کاموں پر صرف کرسکیں اور ہمیں مزید نقصانات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے اسے چارہ ڈالتے ہوئے کہا "تمہاری کیا تجویز ہے؟"

"اگر تمہاری دو رویاں ہلانے والے اجازت دیں تو گوشہ نشینی اختیار کرلو۔"

"اس سلسلے میں تم میری کیا مدد کرو گے؟"

اس بار میرے کانوں میں اس کا نیم وحشیانہ قہقہہ گونجا پھر اس نے کہا "کچھ بھی نہیں، ہماری کتابوں میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے قاتل اور دہشت گرد کے طور پر درج ہوچکا ہے۔ میں اوبرائن نہیں ہوں جو تمہارے اس جال میں پھنس جاؤں۔"

"اوبرائن سے میری کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔" میں نے انجان بن کر کہا۔

"کہا جاتا ہے کہ کرنل جمال دستی تمہارا ایک بہروپ تھا۔ میں اس بحث میں اپنا وقت برباد نہیں کروں گا۔"

"میرا وقت بھی اتنا بے وقعت نہیں ہے کہ میں تمہاری بے مغز باتیں سنتا رہوں۔" میں نے فون بند کردیا۔

اس سے بات کرکے میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تھی اور اپنا بین السطور پیغام اس تک پہنچا دیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ ایک ناکامی کے بعد اس نے دوبارہ کنفلو ریکارڈ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ سلسلہ کسی خلل کے بغیر جاری رہا تھا۔

واقعات کی جو لہر آگر گزر چکی تھی۔ میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوچکا تھا اور میں یکایک آرام دہ بستر کی خواہش محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں جلتا ہوا اکلوتا بلب گل کیا اور اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

○☆○

میں باہر کی فضا میں جگمگاتا سا اجالا پھیلنے کے بعد سویا تھا اس لیے دیر تک سوتا رہا۔ کسی نے میری نیند میں خلل ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ گیارہ بجے میں نے بستر چھوڑ کر باتھ روم

کا رخ کیا اور تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو تینوں میرے منتظر تھے۔

"خیریت ہے۔" میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا "آج تینوں کے تیور یکساں نظر آرہے ہیں۔"

"تمہارے لیے ماروتی کا فون آیا تھا۔" ویرا نے اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ کر کہا "وہ تمہارے جوابی فون کا انتظار کررہی ہوگی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فون کرنا تم کو ناگوار گزرا ہے۔" میں نے ویرا سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"وہ تمہارے سوا کسی سے بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ بس اپنا پیغام دے کر فون بند کردیا۔" ویرا نے منہ بنا کر کہا "میں ریسیور پر منظر کا نام سن کر لمحہ بھر کے لیے چکرا گئی تھی پھر یاد آیا کہ اس سے تم اسی نام سے ملے تھے۔"

"اس کی جگہ تم ہوتیں تو تم بھی یہی کرتیں۔ وہ کہاں سے بول رہی تھی۔"

"میرا اندازہ ہے کہ منہ سے بول رہی تھی۔" ویرا کے بے ہودہ جواب پر وہ تینوں ہنس پڑے۔

"سنا ہے کہ تم رات بھر جاگتے رہے۔" سلطان شاہ نے میرا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر کہا "اول خان نے تین بجے تمہیں فون کیا تھا۔ اس وقت تک تمہاری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر ماروتی تمہاری کسی کال کا حوالہ دے رہی تھی۔"

وہ شرنفانہ سوال تھا۔ میں نے اسے اپنی اور روی کی گفتگو کے بارے میں بتادیا۔

"آپ ویرا کی باتوں پر بلاوجہ ناراض ہوتے ہیں۔ یہ ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی الٹی سیدھی باتیں کرجاتی ہیں۔" غزالہ بولی۔

"یہ بات یاد رکھنا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "آئندہ تمہیں ویرا کی کوئی بات بری لگی تو میں یہ مشورہ یاد دلا دوں گا۔"

ہنسنے بولنے کے باوجود ہمارے درمیان کچھ دیر تک تناؤ کی کیفیت موجود رہی۔ اس کا واحد سبب ماروتی کی فون کال تھی۔ میرے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ تناؤ دور ہوا تو میری رات کی مصروفیات زیر بحث آگئیں۔ میرے بیدار ہونے سے پہلے اول خان کا فون آچکا تھا۔ اس کی زبانی انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ پچھلی رات مائیکرو سینٹر کو تباہ کردیا گیا تھا۔

اول خان کو ہری چند کے بارے میں تشویش تھی۔ گھر سے غائب ہونے کے بعد پورے حیدر آباد میں اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد ماروتی سے رابطہ کرکے اسے روی کی مکمل گلو خلاصی کی نوید سناؤں اور پھر اس سے ہری چند کے بارے میں بات کروں تاکہ کرشن کمار کا وہ ساتھی بھی گرفت میں آسکے۔ اسے ڈر تھا کہ تاخیر کی صورت میں کہیں وہ سرحد پار نہ نکل جائے۔

اول خان کی فکرمندی میں ماروتی کی فون کال کا جواز موجود تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ اسی نظریے کے تحت میں نے رات کو روی سے بات کی تھی اور شام کے لیے اس کی دعوت بھی قبول کرلی تھی۔

میری اور جان اسمتھ کی گفتگو میرے نزدیک بے مقصد تھی مگر ان کے لیے وہ دلچسپی کا سبب بن گئی اور اس پر دیر تک سوال اور جواب کا سلسلہ چلتا رہا۔ میری مصروفیات کے بارے میں ان کی بریفنگ مکمل ہوچکی تھی۔ وہ آپس میں تبادلہ خیال کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں جاکر تازہ اخبار سنبھال لیا جس میں پچھلے واقعات کی بازگشت کے ساتھ نیا مواد بھی شامل تھا۔

پچھلے روز کرشن کمار کی شناخت کے سلسلے میں روی موہن کا نام بہت اچھالا گیا تھا لیکن گرین فارم پر اس کی تصاویر کی شناخت اور پھر میرپور خاص سے شواہد مل جانے کے بعد روی موہن کا نام اچانک خبروں سے غائب ہوگیا تھا۔ وہ ایک اچھی علامت تھی کیونکہ اس وقت پورے شہر میں صرف روی اور ماروتی ہی ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا کرسکتے تھے۔

اول خان کی عجلت کی وجہ سے ہمارے گھر کا فون نمبر جگدیش، روی اور ماروتی تک پہنچا ہوا تھا۔ جگدیش سے رسمی باتیں ہوئی تھیں اس لیے وہ اس نمبر کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھا مگر روی اور ماروتی کو پوری طرح علم تھا کہ میں نے کرشن کمار کا سراغ حاصل کرنے کے لیے ان سے روی کی معافی کا سودا کیا تھا اور اسی رات کرشن کمار کو مار دیا گیا تھا۔ وہ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ کرشن کمار ہمارا شکار رہا تھا۔

ماروتی کے لیے میں صرف ایک چہرہ تھا کیونکہ وہ میرے اصل نام سے بے خبر تھی۔ روی کے لیے میں صرف ایک آواز تھا۔ ان کے پاس میرا کوئی حقیقی سراغ تھا تو وہ فون نمبر تھا۔ اس پر تھوڑی سی محنت کرکے کوئی بھی ہمارے گھر تک پہنچ سکتا تھا۔

میرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دونوں میاں بیوی ہمارے رازدار بن گئے تھے۔ ان کی خوشنودی کی اہمیت میرے اور



اول خان کے سوا کوئی نہیں سمجھ رہا تھا وہ کرشن کمار کے قتل کے موضوع پر زبان کھول کر دشواریاں بھی پیدا کرسکتے تھے۔

بارہ بجے اسلام آباد سے جلال کا فون آگیا۔ اس نے رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد بتایا کہ امریکی حکومت نے جمی اور ڈیوڈ کی موت پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا مگر وزارت خارجہ کو وائٹ ہاؤس سے ایک سخت نوٹ بھیجا گیا تھا جس میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ جمی اور ڈیوڈ نے واضح ہدایات کی خلاف ورزی کی قیمت ایک جان لیوا ظاہری حادثے کی صورت میں ادا کی جو پاکستان کی سرزمین پر ایک معمول بن چکی ہے۔

حدود اور ہدایات سے بہت سے لوگ تجاوز کرتے رہتے ہیں جن میں پاکستانیوں کے ساتھ بہت سے غیر ملکی بھی شامل ہیں لیکن یہ بات حیرت اور صدمے کے ساتھ نوٹ کی گئی ہے کہ بعض پراسرار اور ناپدید قوتیں ہر وقت امریکی مہمانوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں اور جہاں بھی ان میں سے کوئی مقررہ حدود سے تجاوز کرتا ہے "اسے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یا سرعام تذلیل کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں رابن، مائر اس کے ساتھی کمانڈو، بوب رائفل، جمی جونز اور ڈیوڈ رسل کے خصوصی حوالے دیے گئے تھے۔

مہذب سفارتی زبان استعمال کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وائٹ ہاؤس کو یقین ہے کہ حقیقت یہ نہیں ہے مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بعض عناصر کو پاکستانی حکومت کی جانب سے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جب اور جہاں بھی مناسب سمجھیں، کسی امریکی اہلکار کو مار ڈالیں۔ ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ ضرورت پیش آئی تو انہیں سرکاری تحفظ بھی فراہم کیا جائے گا۔

وائٹ ہاؤس اس خطرناک تاثر کا فوری خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ حالات برقرار رہے تو امریکی ملازمین پاکستان میں اپنی تعیناتی قبول کرنے سے انکار کردیں گے۔ ممکن ہے کہ سارے سفارتی دفاتر بند کرنے کی نوبت آجائے۔ ایسا ہوا تو یہ پاکستان اور امریکا کے تعلقات کے لیے بدترین دھچکا ہوگا جس سے بچنے کے لیے پاکستانی حکومت کو پوری سنجیدگی اور طاقت سے کارروائی کرنی چاہیے جو نظر بھی آسکے۔

شاید اس نوٹ کی نقل جلال کے پاس موجود تھی۔ اس نے اس کے منتخب حصے مجھے پڑھ کر انگریزی میں ہی سنائے تھے۔

"یہ توہین آمیز نوٹ ہے۔ اسے قبول کرنے سے انکار کردینا چاہیے تھا۔" میں نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

"یہ سفارتی سرد مہری کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ فی الحال ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔" جلال نے مجھے سمجھایا۔

"اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟" میں نے غصے اور بے بسی سے پوچھا "حقیقت یہ نہیں ہے، کہنے کے بعد سارے الزامات ہمارے سر تھوپ دیے گئے ہیں۔ اس طرح وائٹ ہاؤس والے اپنے ملازمین کے جرائم کی پردہ پوشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"انہوں نے پوپ رائفل والے معاملے میں امریکی صدر کی معذرت کی خفت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ مراسلہ بھیجا ہے۔ ماہرین سرجوڑ کر حقائق کی روشنی میں طبیعت جھک ہوجائے گی۔" جواب تیار کررہے ہیں۔ اسے بند

دیا ہو تو لطف آجائے گا۔ راستہ انہوں نے خود سمجھایا ہے۔ حقیقت یہ نہیں ہے مگر۔ اس کے بعد الزامات کی ایک طویل فہرست گنوائی جاسکتی ہے۔ شاید اسلام آباد اور کراچی کے دفاتر میں اس مراسلے کی نقلیں فیکس پر آچکی ہیں۔ جب ہی جان اسمتھ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا کہ اب مجھ پر میرے اپنے ملک کی زمین تنگ کردی جائے گی۔" میں نے خیال آتے ہی اسے وہ نکتہ بھی بتادیا۔

"جان سے تمہارا ٹکراؤ کیسے ہوگیا؟" میرے انکشاف نے جلال کو بری طرح چونکا دیا۔

"ٹکراؤ نہیں ہوا، آج صبح چار بجے میں نے اسے فون کیا تھا۔ رات انہوں نے فریڈم انٹرنیشنل والی پوری عمارت کو بموں کے دھماکے سے اڑا دیا۔"

"مائیکرو سینٹر کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ وہ دو۔ نامعلوم نقاب پوش تھے مگر یہ شناخت نہیں ہوسکی کہ ان کی قومیت کیا تھی۔ وہ جو چاہے کرتے رہیں، تم ان کے منہ مت لگو۔ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہو اور ان کی نظروں میں آنے سے بچو۔"

"اس سے بات کرنے کے بعد ہی یقین ہوا ہے کہ مائیکرو سینٹر اڑانے والے امریکی تھے۔"

"یہ تحقیق کرنے کی کیا ضرورت تھی ڈینی؟" جلال کی آواز التجا آمیز ہوگئی "ہمارے اپنے طور طریقے ہیں۔ کچھ وقت ضرور لگتا ہے لیکن سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ اجلاسوں میں تمہارا نام ہماری کمزوری بن جاتا ہے۔ ہم ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوتے ہیں مگر تمہاری مداخت میں ایک لفظ نہیں بول سکتے۔ وہ فوراً تمہاری سرپرستی کا الزام لگانے پر اتر آتے ہیں۔"

میں اس کی پریشانی اور آزردگی کے اسباب پوری طرح سمجھتا تھا مگر اس کے مشورے نے مجھے افسردہ کردیا۔ میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا "وہ ہمارے درمیان ایسی ہی تلخیوں اور غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کی امید پر بلند بانگ دعوے کررہا تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہیں کوئی شکایت نہ ہو۔ اب ان کے کسی معاملے میں میرا نام نہیں آئے گا۔ میں کے ون کی مجبوری کی وجہ سے جمی اور ڈیوڈ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔"

"تمہارے لہجے سے ظاہر ہورہا ہے کہ تم ناراض نہیں گئے میں نے تمہیں اپنا دوست کہا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ [illegible] کا ساتھ توڑنے سے نہیں روکتا لیکن خود کو جان بوجھ کر سامنے مت لاؤ۔ [illegible] اپنے طور پر سوچنے دو۔"

"میں نے میجر بخشی کو بھی چھیڑا تھا۔۔۔ شاید وہ بھی غلط قدم تھا۔" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرکے کہا۔

"میں صرف امریکیوں کی بات کررہا تھا۔ بھارتی ہمارے سامنے مردار خور گدھ ہیں جو ہر زندہ وجود سے خوف کھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ تم من مانیاں کرتے رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ہر فیصلے کے پیچھے دماغ سوزی کار فرما ہوتی ہے۔"

"میں سوچتا اور سلگتا ہوں، کسی فیصلے پر پہنچتا ہوں اور اس پر عمل کرگزرتا ہوں۔ میرے لیے مصلحتوں کا تابع رہنا دشوار ہوجاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں امریکیوں کو بھول جاؤں۔۔۔"

وہ سنجیدہ اور بردبار افسر تھا مگر اس وقت یکایک جذباتی ہوگیا۔ اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا مخلصانہ مشورہ مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ دیر تک فون پر میری دل جوئی کرتا رہا اور چند دو طرفہ وعدوں کے بعد وہ گفتگو ختم ہوگئی۔

دن ڈھلے اول خان سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اسی شام ماروتی کے گھر مدعو تھا۔ جان اسمتھ کے ساتھ ہونے والی باتوں پر اس کا ردِعمل جلال سے بالکل مختلف تھا۔ دونوں میں فرق صرف اتنا تھا کہ جلال ضابطوں کا اسیر اور اپنے بڑوں کو جواب دہ تھا جبکہ ایس ٹی ایف کا ہر اسٹیشن کمانڈر اپنی جگہ پر ایک مضبوط اکائی تھا۔ اپنے عمل اور فیصلوں کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس کے بعد اس کا صرف ایک چیف تھا جو اپنی پیشگی ہدایات کی حدود میں اپنے کمانڈروں کے ہر فیصلے کو من و عن قبول کرلیتا تھا۔

ویرا دن بھر میرے آس پاس ہی منڈلاتی رہی۔ وہ کسی ضرورت کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو جلد ہی واپس آگئی۔ میں نے دانستہ ماروتی کو فون نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت بے چینی سے میری کال کا انتظار کررہی ہوگی مگر میں ویرا کو بولنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

چار بجے میں نے کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر کپڑے تبدیل کیے تو سلطان شاہ میرے پاس آپہنچا اور رازدارانہ لہجے میں بولا "تم چائے کی دعوت پر جارہے ہو تو تمہیں ایک ڈرائیور کی ضرورت بھی ہوگی۔"

"میں غیر ضروری طور پر کسی کا ان کی نظروں میں آنا پسند نہیں کرتا۔ تم ان سے تعلق کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو تو اندازہ ہوگا کہ تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھایا "جہاں ضرورت ہوتی ہے میں خود کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔"

میری سنجیدگی کی وجہ سے اسے کوئی دوسرا سوال کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

غزالہ کو مجھے جوتوں کی تلاش کے بہانے سے خود کمرے میں بلانا پڑا۔ وہ دروازہ بند کرکے جوں ہی پلٹی تو میں نے سختی سے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ وہ کسمسا کر بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے کہا "روی اور ماروتی کے گھر جانے کی اجازت ہے؟"

"میں نے تو آپ کو کبھی نہیں روکا۔ آپ ضرور جائیں، شوق سے جائیں۔" غزالہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں وہاں اپنے شوق سے نہیں، مجبوریوں کے تحت جارہا ہوں۔ تفصیل اول خان سے پوچھ لینا۔"

"مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ پر پورا اعتماد ہے۔ آپ کہیں بھی چلے جائیں، لوٹ کر گھر ہی آتے ہیں۔"

غزالہ کے ان الفاظ میں خلوص و محبت کے ساتھ موہوم سا شکوہ بھی پنہاں تھا جو اپنی جگہ درست اور جائز تھا۔ میں اس کے سامنے ہمیشہ بہت محتاط رہتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے اور ویرا کے باہمی تعلق کے بارے میں بہت کچھ جان لینے کے باوجود انجان بنی رہتی تھی اور کبھی اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہوکر زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتی تھی تو کوئی ایسی بات نہیں کرتی تھی جس سے میرے جذبات مجروح ہوں یا الزام تراشی کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہو۔

میں نے اس کی پیشانی چوم کر اس کے بازو چھوڑے اور

جوتے پہننے میں مصروف ہوگیا۔

وہ مسہری کے کونے پر ٹک کر میری طرف دیکھتی رہی۔ میں جوتے پہن کر تیاری سے اٹھا تو وہ بولی "آپ نے عام سے کپڑے پہنے ہیں۔ آج کے لیے تو کوئی اچھا جوڑا پہن لیتے۔ آپ کی الماری میں ایک سے ایک جوڑا پڑا ہے۔"

"میں نے زیادہ اہتمام کیا تو ماروتی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجائے گی۔" میں نے ہنس کر کہا "میں کام کو کام تک رکھنا چاہتا ہوں۔ تم نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ وہ بہت آزاد خیال عورت ہے۔ اس کا شوہر بھی اسی جیسا ہے۔"

"میاں بیوی ایک جیسے ہوں تو اچھا گزارہ ہوتا ہے۔" [illegible] بھی ہنس دی۔

میں دروازہ کھول کر [illegible] تینوں کو الوداع کہا اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے نکل گیا۔ موبائل فون پہلے ہی میری تحویل میں تھا۔

گھر سے کچھ دور نکلنے کے بعد میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر، دوسرے سے موبائل فون پر روی کا نمبر ملایا۔ گھر کے نمبر سے فوراً ہی ماروتی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھر سے نکل کر اسی کی طرف آرہا تھا۔ اس نے مزید کچھ کہنے سننے کے لیے بات آگے بڑھانی چاہی لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں ٹریفک کے ہجوم میں تھا۔ زیادہ دیر تک موبائل پر بات نہیں کرسکتا تھا۔

اسے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

مزے مزے سے گاڑی چلاتا ہوا میں پونے پانچ بجے اولڈ کلفٹن کے علاقے میں موہن ہاؤس کے پھاٹک پر پہنچ چکا تھا۔ پہلی بار میں نے دیکھ لیا تھا کہ گھر کے ڈرائیوے میں چار گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں پھر بھی ان سے آگے جگہ موجود تھی لیکن پہلے سے کھڑی ہوئی گاڑیوں پر سے گزر کر وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس وقت میں اطلاع دے کر، پروگرام کے مطابق پہنچا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ میری کار کے لیے اندر جگہ ہوگی۔

میں نے پھاٹک کے سامنے ہارن بجایا۔ فوراً ہی پھاٹک کھول دیا گیا۔ میں گاڑی اندر بڑھالے گیا۔ اس وقت وہاں صرف دو گاڑیاں موجود تھیں۔

میں گاڑی کا انجن بند کرکے نیچے اترا ہی تھا کہ ڈرائنگ روم کے برابر والا دروازہ کھلا۔ وہاں سے قمیص پتلون میں ملبوس ایک صحت مند اور خوش لباس نوجوان تقریباً دوڑتا ہوا نکلا اور تیر کی طرح میری طرف آیا۔

"آؤ مظہر جی، آؤ! تم نے میرا مان رکھ کر میرا دل خوش کردیا۔" اس کی زندگی سے بھرپور اور گرم جوش آواز سن کر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ روی موہن تھا اور اپنی شخصیت یا وضع قطع سے کسی بھی طرح جگدیش موہن کا چھوٹا بھائی نہیں لگتا تھا۔

کرتے پاجامے میں ملبوس موٹے اور بدصورت جگدیش کے برعکس روی وجیہہ اور خوش رو آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت کے بجائے تجربے کی پختگی پھیلی ہوئی تھی جو اس کی عمر کی غماز تھی۔

وہ قریب آتے ہی ایسی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا جیسے برسوں کا شناسا ہو۔

"تم آج بہت زیادہ خوش ہو یا ہمیشہ ایسے ہی خوش و خرم رہتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آج میں تمہاری وجہ سے بہت... بہت ہی خوش ہوں۔ ویسے بھی میں سدا خوش رہنے کا عادی ہوں۔"

میرے سینے سے الگ ہوتے ہوئے وہ بولا تو اس کے سانس میں الکحل کی ہلکی سی بو موجود تھی۔ اس نے میرے پہنچنے سے پہلے شراب پی تھی اور اسی وجہ سے اس کی خوشی دوبالا ہوئی جارہی تھی۔

وہ میرے آگے بچھا جارہا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جانے کے بجائے وہ اسی دروازے میں لے گیا جس سے خود برآمد ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع لابی تھی جہاں دیواروں کے ساتھ منقش سندھی صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بان سے بنی ہوئی، نیچے پیروں والی رنگا رنگ کرسیاں تھیں۔ دیواروں اور چھتوں پر ٹھری دستکاریوں کے بہت سے دلکش شاہکار سجے ہوئے تھے جن میں کئی رلیاں، ٹکوں سے بنی ہوئی نفیس اور نازک نوکیاں، سرکنڈوں کے چھلکوں سے بنی ہوئی بڑی بڑی دیوار گیر تصویریں اور مور کے پروں کے دائرے شامل تھے۔

وہ لابی جگدیش کے ڈرائنگ روم سے زیادہ آراستہ، کشادہ اور تاثر انگیز تھی۔ میرا خیال تھا کہ روی مجھے وہیں بٹھائے گا مگر وہ مجھے ساتھ لے کر ان اندرونی زینوں کی طرف لے گیا جو بہت کشادہ گولائی میں اوپر جارہے تھے۔

زینوں سے نیا قالین شروع ہوگیا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ پورے گھر میں الکحل کی ہلکی سی بو بری ہوئی تھی۔ اپنے کاروبار کی وجہ سے شاید وہ لوگ گھر کے کسی حصے میں شراب کا ذخیرہ رکھتے تھے۔

چند زینے طے کرتے ہی مجھے ماروتی نظر آگئی جو گلابی



ساڑی میں ملبوس، سیڑھیوں کے اختتام پر ہماری منتظر تھی۔

"مظہر جی! یہ ہے میرا گھر اور اوپر کھڑی ہے میری بیوی، ماروتی۔" روی کہہ رہا تھا۔

میری نگاہیں پوری طرح اوپر اٹھ گئیں۔ اس نے ساڑی بہت قریب سے باندھی ہوئی تھی۔ بلاؤز کی تیاری میں پوری احتیاط کی گئی تھی کہ ضرورت سے زیادہ سوت زائد بھی کپڑا موجود نہ ہو۔ نیچے گلے والا وہ بلاؤز پیٹ کا حصہ شروع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ پہلو سے نظر آنے والے آثار بتا رہے تھے کہ پشت پر وہ بلاؤز محض پٹیوں تک محدود ہوگیا ہوگا۔

ساڑی کے سمٹے ہوئے پلو سے جسم کے کسی کھلے ہوئے حصے کو دانستہ چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہلکے میک اپ میں اپنے ماتھے کی بندیا کے ساتھ اس وقت ماروتی ایک بالکل نئی عورت نظر آرہی تھی۔

"ہیلو مظہر ڈارلنگ!" اوپر پہنچتے ہی ماروتی میرے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے اپنا گداز اور مخروطی ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ میں نے ذرا سختی سے اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کا چہرہ بے اختیار میری طرف جھکتا چلا آیا۔ مجھے اس کے تنفس کی حرارت اپنے کھلے ہوئے گریبان سے جلد میں گھلتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے جسم سے پرفیوم کی اور سانسوں سے الکحل کی بو آرہی تھی۔

چند ثانیوں کے لیے میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے روی کی طرف دیکھا تو وہ خوش اور بے پروا نظر آرہا تھا۔ تب مجھے خیال آیا اور میں نے اپنی خوش جمال میزبان کی پیشانی پر ایک نرم سا بوسہ لیا، اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

سیڑھیوں سے چند قدم آگے ان کے ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ وہاں ہر چیز نئی اور چمکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ آرائش کا سارا انداز مغربی تھا۔ وہاں ٹھہری تہذیب اور ثقافت کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ روی نے مجھے ادب سے دہرے صوفے پر بٹھایا، ماروتی میرے برابر میں بیٹھ گئی۔ آخر میں روی نے ہم دونوں کے سامنے والی نشست سنبھال لی۔ درمیان میں موٹے شیشے کی گول سینٹر ٹیبل تھی جس پر ڈرائی فروٹ کی بھری ہوئی ٹرے موجود تھی۔

"ماروتی تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس دن گھر سے بھاگ کر برا کیا۔" روی نے فروٹ ٹرے میری طرف سرکا کر کہا "مجھے معلوم ہوتا کہ تم جیسا بھلا آدمی میرے گھر آیا ہے تو میں ہرگز کہیں نہیں جاتا۔"

"اس روز ہمارے تیور خراب تھے۔ ماروتی بیچ میں نہ آتی تو تمہارا بچنا مشکل تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ کرشن کمار۔"

"بس بس!" روی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کردیا "مظہر جی! میں جانتا تھا کہ وہ کسی دن مجھے بھی لے ڈوبے گا۔ اس نے میرے گرد دھیرے دھیرے جال ڈالا تھا۔ اب اس کا ذکر کرکے اپنا موڈ خراب نہ کرو۔"

"یہ بھنے ہوئے کاجو لو۔" ماروتی نے مٹھی بھر کاجو مجھے تھمادیے "بہت خستہ اور لذیذ ہیں۔"

میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا [illegible] ہوئی شوخ آنکھوں [illegible] وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، [illegible] اپنی مٹھی ٹرے میں پلٹی کی اور بچے ہوئے چند کاجو منہ میں ڈال لیے۔

ہمیں بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر خادمہ لدی پھندی ٹرالی پر چائے اور دیگر لوازم لے آئی۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ ٹی کوزی کے ساتھ ٹرے پر تین پیالیاں موجود تھیں۔ ماروتی نے اٹھ کر ٹرالی خود سنبھالی اور ملازمہ کو لوٹا دیا۔

"کیا تم دونوں بھی میرے ساتھ صرف چائے پر گزارہ کرو گے؟" میں نے روی سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے تمہیں ٹی پارٹی پر بلایا ہے۔ چاہو تو ابھی یہ کاک ٹیل پارٹی بن سکتی ہے۔"

"میں صرف چائے لوں گا۔ میری وجہ سے تم دونوں اپنی شام برباد نہ کرو۔ تم بلا تکلف اپنی پسند کے ڈرنکس لے سکتے ہو۔"

"ارے نہیں، مظہر جی! ہم اتنے برے میزبان نہیں ہیں۔ ایسی بدتمیزی اور وہ بھی تمہارے ساتھ کیسے کرسکتے ہیں۔"

انہیں اپنی راہ پر لانے کے لیے شراب نوشی پر اکسانا ضروری تھا۔ میں نے کہا "میں تمہیں اس بدتمیزی کا حکم دوں تو تم کیا کرو گے؟"

"تعمیل!" روی سے پہلے ماروتی بول پڑی "ہم تمہیں ناراض نہیں کرسکتے۔"

"بس، تو پھر اسے میرا حکم ہی سمجھو!" میں نے ماروتی سے کہا۔ اس نے آنکھ سے روی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں چوم کر اٹھا اور دوڑتا ہوا اندرونی دروازے سے گزر کر غائب ہوگیا۔

ماروتی نے دھیرے سے میری ٹانگ پر ہاتھ مارا۔ میں

نے اس کی طرف دیکھا تو وہ آنکھ مار کر مسکرائی اور بولی "تم نے دیکھا کہ روی کیسے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی عزتِ نفس کی مجروح نہیں کرتے۔ دیکھ لو ہم کتنے خوش ہیں۔"

روی دروازے سے دوبارہ برآمد ہوا تو اس نے اپنی بانہوں اور پیٹ کے درمیان راکل سلیوٹ کی ایک بوتل' دو گلاس اور ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ قریب آیا تو ماروتی نے وہ چیزیں میز پر منتقل کرنے میں اس کی مدد کی۔ روی ایک گہرا سانس لے کر تھکے ہوئے انداز میں اپنی نشست پر گر گیا۔ "منظر جی! تم واقعی گریٹ ہو۔ آج میں تمہارے کی پیالی سے اپنا گلاس ٹکراؤں گا۔"

ماروتی نے اٹھ کر میرے لیے چائے تیار کی اور سب سے بسکٹ' پیسٹریز اور کئی اشیا پلیٹ میں ڈال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میرے لیے چائے بن جانے کے بعد روی نے بوتل کو ہاتھ لگایا۔ وہ میزبانی کے بہت بنیادی آداب تھے۔ میں باریک بینی سے دیکھ رہا تھا کہ روی اس فن میں طاق تھا۔

اس نے ماروتی کے لیے بہت ہلکا گلاس بنایا' اس کے اپنے گلاس کا رنگ گہرا تھا۔

بوتل بند کر کے روی نے اپنے گلاس اٹھایا' میں نے چائے کی پیالی تھام لی۔ چیئرز کی تین آوازوں کے ساتھ دو گلاس ایک پیالی سے ٹکرائے۔ انہوں نے اپنے اپنے گلاسوں سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے میں نے بھی گرم چائے سے لب تر کر کے پیالی واپس ٹرے میں رکھ دی۔

روی سے اصل موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کا گلاس آدھے سے زیادہ خالی ہو جائے۔ اسے مصروف رکھنے کے لیے میں نے جگدیش کا ذکر چھیڑ دیا۔ "تمہارے بڑے بھائی کہاں ہیں۔ آج وہ نظر ہی نہیں آئے!"

"بھایا جی!" اس نے اپنا گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لے کر استہزائیہ انداز میں کہا "اپنی بیوی کے ساتھ سمندر کی سیر کو گئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے سارے دوست شرابی کبابی ہیں۔ وہ ہوتے تو میں انہیں دکھاتا کہ تم صرف چائے پیتے ہو۔"

"ان کو اپنی ذات اور عزت کا بڑا گھمنڈ ہے۔" ماروتی بولی "ہر ایک کی تحقیر کر کے وہ اندر سے خوش ہوتے ہیں۔"

"یہ بری عادت ہے ان کی۔" روی نے اعتراف کیا "میں جب سے گھر آیا ہوں' ان کی سامنے نہیں گیا۔ نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالیں گے۔ میں دن بھر ہر گھنٹی اور ہارن پر ہول رہا تھا کہ کہیں پھر پولیس نہ آ گئی ہو۔ بھایا جی مجھے گردن سے پکڑ کر ان کے سامنے ڈال دیتے اور میری ایک نہ سنتے۔"

"گھمنڈ کسی چیز کا بھی ہو' برا ہوتا ہے۔ ایک نہ ایک روز آدمی اسی چیز سے محروم ہو جاتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"جب بھی گئی' بھایا جی کی عزت ہی جائے گی۔" ماروتی بولی "وہ ہر وقت اسی کا رونا روتے رہتے ہیں۔"

"ایسی بدفال منہ سے نہ نکالو۔" روی نے نرمی سے اپنی بیوی کو ٹوکا "وہ صحیح روتے ہیں۔ کوئی اپنے دروازے پر ایک پولیس والے کا نام آنا پسند نہیں کرتا کہ لوگ نہ جانے کیا سوچیں۔ یہاں وہ تین گاڑیوں میں لد کر آئے تھے۔ اب منظر جی ہمارے مہمان ہیں تو مجھے یقین آیا ہے کہ ہمیں ستانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ اس سے پہلے میری جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔"

"تمہارے لیے بہت پاپڑ بیلے گئے ہیں ورنہ پولیس اور ایجنسیوں کو اب بھی کرشن کمار کے ساتھیوں کی تلاش ہے۔"

روی نے عجلت میں اپنے گلاس سے ایک کافی لمبا گھونٹ لیا اور اسے آدھا کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے' اس کے ساتھیوں کا انجام بھی اس سے کم نہیں ہوگا۔ ایک بار کسی کا وارنٹ نکل جائے تو پھر عدالت سے ہی اس کی ضمانت ہوتی ہے۔ وارنٹ کا واپس لیا جانا بہت بڑی بات ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں بھاگ گیا تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔"

"بھایا جی تو تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں سے بھگا رہے تھے تاکہ سب تنکھ ان کے قبضے میں چلا جائے۔" یہ کہتے ہوئے ماروتی نے کسمسا کر اپنی جگہ پہلو بدلا اور صوفے میں یوں ڈھلک کر بیٹھ گئی کہ میرے اور اس کے جسم کا فاصلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ پلو اور آستین سے محروم اس کے شانے کا کچھ وزن میرے بازو پر منتقل ہو گیا۔ میرے سرے پر پسپائی کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔

"اب ان باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یوں سمجھو کہ منظر جی کی مہربانی سے مجھے بلکہ ہم دونوں کو نئی زندگی ملی ہے۔ اس کے لیے ہم ان کی جتنی بھی خدمت کریں' وہ کم ہے۔"

"تمہارا دامن بچ گیا مگر ہمیں آدمی درکار ہے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر بات چھیڑ دی "اپنے ساتھ دو سروں کو بچانے کی کوشش مت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی وجہ سے تم لوگ دوبارہ کسی مصیبت میں گھر جاؤ اور میں بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں۔"



"ہم کسی کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہے۔" روی نے حیرانی سے کہا "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"بہت سے ہیں۔ کرشن کمار کے سارے ہی قریبی ساتھی ان میں شامل ہیں۔"

"تم نام بتاؤ' مجھے ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے' وہ میں بتاؤں گا۔" روی نے خلوص سے کہا۔

"میں صرف ایک نام لے سکتا ہوں۔ باقی نام تم خود بتاؤ گے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دیکھا کہ روی بہت تیزی سے پی رہا تھا جب کہ ماروتی بس اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے گلاس کی سطح ایک انچ بھی نہیں گری تھی۔

"ماروتی! منظر جی کس کا ذکر کر رہے ہیں؟" روی نے گلاس اٹھا کر خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

"تم ہری چند کی بات کر رہے ہو؟" ماروتی نے اس کے جواب دینے کے بجائے مجھ سے سوال کیا۔

میں متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا "اسے تم نے کوئی خبر پہنچائی تھی؟" بات خود بہ خود آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے بہت آہستگی سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اپنے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا پھر روی سے مخاطب ہو کر بولی "تمہارے بھاگ جانے کے بعد میں نے ہری چند کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ ایجنسی والے تمہاری تلاش میں تھے۔ تمہارے بعد ہری چند کی باری آسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے وقت سے پہلے ہوشیار کر دوں۔"

"یہ تم نے بہت برا کیا۔" روی نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "میری طرح وہ بھی نکل گیا ہوگا۔"

"اس وقت میں بہت پریشان تھی۔ ڈری ہوئی تھی کہ کہیں ہری چند تمہارے ٹھکانوں کا پتا نہ بتا دے۔"

"ایسا کر کے تم نے منظر جی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔" ماروتی کا جواب سنتے ہوئے روی نے کچھ اور اسکاچ اپنے معدے میں اتار لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار کے ہلکے سے ڈورے تیرنے لگے تھے۔ وہ کس بھی لمحے اپنا ٹکڑا گلاس خالی کر سکتا تھا۔

ماروتی نے مجروح اور شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "کیا روی ٹھیک کہہ رہے ہیں؟"

"آپس کے معاملات تم دونوں ہی طے کر لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ میں نے سب کارڈ تمہارے سامنے رکھ دیے ہیں۔"

"اس وقت تک منظر جی سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ ہوا' سب کے سامنے ہوا تھا' بھایا جی نے ان کے سامنے مجھے مارنا اور دھکیلنا شروع کر دیا پھر اندر لے جا کر مجھے تمہاری بھاوج اور بہنوں کے حوالے کر دیا۔" اپنی چتا سناتے ہوئے ماروتی کی آواز رندھ گئی۔

"یہ مت کہو ماروتی!" میں نے نرمی سے اس کی تصحیح کی "تمہارے بھایا جی کو غصہ اسی لیے آیا تھا کہ اس کے سامنے ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں اور تم روی کی تلاش میں ہمارے ساتھ گھر سے نکلنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔"

"بھایا جی نے ان سب کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ہمارے درمیان کچھ بھی طے نہیں ہوا تھا۔" اپنی ہولی مظلومانہ کاٹی بوجھ میرے اوپر لاد کر گلا اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ آواز بلند کیے بغیر اس طرح میں اپنے بازو کو بوجھ سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوا۔ سارا ختم ہوتے ہی وہ چونک کر سنبھلی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے گزرے ہوئے واقعات کو اپنے ذہن میں دہرایا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس سے میری اصل مفاہمت اس وقت ہوئی تھی' جب میں نے گھر پہنچ کر اس کے تحریری پیغام کے جواب میں اس سے فون پر رابطہ کیا تھا۔

"اگر تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نے ہماری واپسی اور میرے فون کرنے کے درمیان ہری چند کو فون کیا تھا تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ وہ نکل گیا اور اب تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔"

اسکاچ کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لینے کے بعد ماروتی کی ہچکیاں اور سسکیاں رک گئی تھیں۔ اس نے بڑی بڑی نم آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "شکریہ کہ تم کو میرے بات پر یقین آگیا۔ مجھے دنیا میں روی سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ تم سے بات ہو جانے کے بعد میں نے کسی سے کوئی غلط رابطہ نہیں کیا۔ بس روی کی تلاش میں شہر بھر کی خاک چھانتی رہی۔"

"کرشن کمار' ہری چند کا پرانا دوست تھا یا تمہارا؟" میں نے روی سے پوچھا۔ میں اپنے اگلے سوال سے پہلے ماروتی کو اپنے اوسان بحال کرنے کے لیے کچھ وقت دینا چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ رونا دھونا شروع نہ کر سکے۔

"کرشن کمار نچلے اور درمیانی طبقے میں اٹھنے بیٹھنے والا آدمی تھا۔ وہ ان سے کام لیتا تھا اور ان ہی کے کام آتا تھا۔ اس کی ہری چند سے بہت پرانی دوستی تھی۔ اس نے پرانی جگہ چھوڑ کر ہمارے پاس نوکری کرنے کے بعد کرشن کمار کو مجھ سے

بلوایا تھا۔" روی نے بتایا۔

"اس نے اپنی دفتری کار تمہاری اجازت سے کرشن کمار یا اس کے آدمیوں کو دی تھی؟"

"میرے فرشتوں کو بھی اس کی اس حرکت کا علم نہیں ہے۔ کار کا کیا قصہ تھا؟"

"کرشن کمار کے آدمیوں نے ہری چند کی گاڑی میں کراچی آکر ایک بڑی واردات کی تھی اور وہ گاڑی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔" میں نے ماروتی کو سنانے کے لیے دو فقروں میں وہ تفصیل سنا ڈالی۔

"وہیں سے تم میرے پیچھے لگے ہوگے۔" اس نے کھوئی سانپ نکلا۔ یہ کہہ کر وہ ماروتی سے کہا "وہ ٹھگ حرام میری آستین کا تم نے سنا کہ مظہر جی کیا بتا رہے ہیں۔"

"میں سب سن رہی ہوں۔" یہ کہہ کر ماروتی نے میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور گڑگڑانے لگی "روی میری زندگی ہیں۔ ان پر کوئی آنچ آتی ہو تو ہری چند کو پھانسی لگوا دو لیکن ایسی کوئی بات نہ ہو تو اسے بچالو۔ وہ میرا اکلوتا ماموں زاد بھائی ہے۔"

میں نے ماروتی کو کوئی جواب دینے کے بجائے بدمزگی سے روی کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے یہ بات بہت دیر پہلے بتادی تھی کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بچانے کی کوشش نہ کرو ورنہ تم ایسی مصیبت میں پڑو گے کہ میں بھی کچھ نہ کرسکوں گا۔"

اس وقت تک روی کے چہرے سے ساری شوخی اور بے پروائی کافور ہو چکی تھی۔ دنیا کی سب سے مہنگی وہسکی کے نشے اور پھر موضوع کی سنگینی کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت گمبھیر ہو چکا تھا۔ اس نے غلط میں اپنے لیے نیا گلاس تیار کیا جس میں شراب اور پانی کی مقدار یکساں تھی۔ اس نے دہشت کے عالم میں بنے گلاس سے تلخ سیال کا ایک قدرے چھوٹا سا گھونٹ لیا پھر ماروتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو پھانسی کے پھندے پر لٹکنا ہوگا۔ وہ تمہارا بہت چہیتا اور منہ چڑھا بھائی ہے۔ اس نے تمہیں ضرور بتایا ہوگا کہ وہ کہاں چھپے گا۔ مظہر جی کو اب اس کا پتا بتادو!"

ماروتی کے جڑے ہوئے ہاتھ مایوسی اور بے بسی سے اس کی گود میں گر گئے۔ اس نے روی سے کہا "ہری چند نے اپنا ٹھکانا صرف اس لیے بتایا تھا کہ تمہیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو اس تک پہنچا جاسکے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج میرے شوہر کی زندگی کے لیے ماموں زاد بھائی کے خون کی ضرورت ہے۔ روی! میں تمہارے لیے یہ قربانی بھی دے ڈالوں گی۔ ہری چند ہالا میں ملے گا۔"

"ہالا ایک خاصا بڑا شہر ہے۔ اسے کہاں کہاں ڈھونڈا جائے گا؟" روی نے رسانیت سے پوچھا۔

"وہ بھٹ شاہ میں کسی ملنگ کے روپ میں چھپا ہوا ہوگا۔" ماروتی نے آخری کلید بھی سامنے رکھ دی۔

"ہم اسے نہیں پہچانتے۔ خطرہ بھانپ کر وہ فقیروں کی بھیڑ میں کہیں غائب ہو سکتا ہے۔" میں نے روی سے کہا "اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ ہالا تک چلنا ہوگا۔ اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔"

"میں اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہوں۔ تین گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"میں بھایا جی کے ساتھ اکیلی یہاں نہیں رہوں گی۔ وہ چوبیس گھنٹے کر میری زندگی دوبھر کردیں گے۔" ماروتی بولی۔

روی کی مستفسرانہ نگاہیں میری چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ اس سفر کے بارے میں غزالہ ویرا اور سلطان شاہ کے ردِعمل کا اندازہ لگایا پھر روی کو منع کردیا "ماروتی کا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

"اب میں ایک منٹ کے لیے بھایا جی کی بدزبانی برداشت نہیں کرسکتی۔" ماروتی نے احتجاج کیا۔

"تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کیا جارہا۔" میں نے جواب دیا "آج کی رات تم کسی ہوٹل کے پرتعیش کمرے میں گزار لو۔ کل واپسی پر روی تمہیں ہوٹل سے گھر لے آئے گا۔ یہ تمہارے مسئلے کا سب سے آسان حل ہے۔"

مظہر کی تجویز بہت مناسب ہے۔" روی نے اپنا فیصلہ صادر کردیا۔ "ایک بھائی کی گرفتاری پر بہن کا جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ نہ جانے وہاں کیا حالات ہوں۔ اگر وہ مزاحمت کرتا ہوا مارا گیا تو تم کچھ بھی کرسکتی ہو۔ ویسے بھی لمبا سفر بہت تھکا دینے والا ہوگا۔ تم حال ہی سے بے حال ہو جاؤ گی۔ آج کی رات تم پی سی یا شیراٹن میں گزار لو۔ صبح سے پہلے ہم لوٹ آئیں گے۔"

"تم کہتے ہو تو یہی ٹھیک ہے۔" ماروتی نے کسی بحث کے بغیر اس کی بات مان لی۔

ان دونوں کے درمیان مفاہمت کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے پر حکم مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ دلیل کے ساتھ بات سمجھاتے تھے اور برا فریق مان لیتا تھا۔

اس مرحلے پر اچانک مجھے یاد آیا کہ اس کھیل کے ا



اہم کردار کو سب نے بالکل بھلا دیا۔

کرشن ہمارے گھر میں گھسا تو اس کے ساتھ بھکاری کے روپ میں ایک اور آدمی تھا جسے اس نے نریش کہا تھا۔ اس نے ہمارا گھر دیکھا ہوا تھا۔ اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی نہ ہی اس کا کوئی ذکر آیا تھا۔

"تم نریش نامی کسی شخص سے بھی واقف ہو؟" وہ خیال آتے ہی میں نے روی سے پوچھا۔

اس نے اپنے دہن پر زور دینے کی کوشش کرتے ہوئے ٹھوڑی میں سر ہلا دیا۔ "میرے لیے یہ نام نیا ہے۔ شاید ہری چند جانتا ہو۔ اس کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔"

"کیا تم چھانٹ چھانٹ کر صرف ہندوؤں کو تلاش کررہے ہو؟" ماروتی نے غیر متوقع طور پر سوال کرکے مجھے چونکا دیا۔

"ان کے کرتوت تمہارے سامنے ہیں۔ تم سے زیادہ روی ان کے بارے میں جانتا ہوگا۔ تم کرشن کمار کے کسی مسلمان ساتھی کا نام بتاؤ پھر دیکھو کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کے چکر میں اب تک بہت سے مسلمان بھی مارے گئے ہیں۔"

"یہ بدقسمتی کی بات ہے ماروتی!" روی نے حسب عادت اسے سمجھایا "کرشن کمار نے یہاں اکھنڈ بھارت کو چکر چلایا ہوا تھا۔ ہندو ہی اس نعرے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہاں رہنے والے مسلمانوں کے لیے یہ ملک ہی سب کچھ ہے۔"

"لیکن روی! تم نے تو کبھی اکھنڈ بھارت کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔" ماروتی نے تائید طلب لہجے میں پوچھا۔

"کام کبھی نہیں کیا لیکن کرشن کمار کو بڑی رقمیں دیتا رہا ہوں۔ وہ گھر کے بھوکے ہندوؤں کے لیے اکثر مجھ سے چندے لیتا رہتا تھا۔"

"شاید اسی لیے تمہاری جان بچ گئی ہے۔ کرشن کمار کے چند قریبی ساتھیوں کی نشان دہی کرکے تم اپنا بوجھ ہلکا کرسکتے ہو۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" اس نے سادگی سے کہا پھر پوچھا "ہمیں ہالا کس وقت روانہ ہونا ہے؟"

"تم اپنا گلاس ختم کرو۔ میں دیکھتا ہوں۔ اتنی نہ پی لینا کہ ہالا پہنچنے تک تم گہری نیند سو رہے ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جاکر اول خان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ اپنے دفتر سے نکل چکا تھا۔ اسے میری چائے کی دعوت کا شدت سے انتظار تھا۔ مجھے توقع تھی کہ مجھ سے براہِ راست گفتگو کے ارادے سے وہ ہمارے گھر پہنچا ہوا ہوگا۔ میں نے گھر کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ویرا کی آواز سنائی دی۔

میں نے اس سے اول خان کے بارے میں پوچھا تو وہ چہکنے لگی "کیا تمہاری ٹی پارٹی رات تک چلتی رہے گی؟"

"میں وہیں ہوں۔" میں نے جھنجلا کر کہا "اول خان کو دے دو۔"

وقت ہالا روانہ ہونا ہے۔ تم سے زیادہ روی ان کے بارے میں جانتا ہوگا۔ تم کرشن کمار کے کسی مسلمان ساتھی کا نام بتاؤ پھر دیکھو کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کے چکر میں اب تک بہت سے مسلمان بھی مارے گئے ہیں۔"

"یہ بدقسمتی کی بات ہے ماروتی!" روی نے حسب عادت اسے سمجھایا "کرشن کمار نے یہاں اکھنڈ بھارت کو چکر چلایا ہوا تھا۔ ہندو ہی اس نعرے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہاں رہنے والے مسلمانوں کے لیے یہ ملک ہی سب کچھ ہے۔"

"لیکن روی! تم نے تو کبھی اکھنڈ بھارت کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔" ماروتی نے تائید طلب لہجے میں پوچھا۔

"کام کبھی نہیں کیا لیکن کرشن کمار کو بڑی رقمیں دیتا رہا ہوں۔ وہ گھر کے بھوکے ہندوؤں کے لیے اکثر مجھ سے چندے لیتا رہتا تھا۔"

"شاید اسی لیے تمہاری جان بچ گئی ہے۔ کرشن کمار کے چند قریبی ساتھیوں کی نشان دہی کرکے تم اپنا بوجھ ہلکا کرسکتے ہو۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" اس نے سادگی سے کہا پھر پوچھا "ہمیں ہالا کس وقت روانہ ہونا ہے؟"

"تم اپنا گلاس ختم کرو۔ میں دیکھتا ہوں۔ اتنی نہ پی لینا کہ ہالا پہنچنے تک تم گہری نیند سو رہے ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جاکر اول خان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ اپنے دفتر سے نکل چکا تھا۔ اسے میری چائے کی دعوت کا شدت سے انتظار تھا۔ مجھے توقع تھی کہ مجھ سے براہِ راست گفتگو کے ارادے سے وہ ہمارے گھر پہنچا ہوا ہوگا۔ میں نے گھر کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ویرا کی آواز سنائی

## مشورہ

طبی معائنہ ختم ہونے پر سلیم نے پُرامید لہجے میں پوچھا "کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب..... میں زندہ رہوں گا نا؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "لیکن میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

کو پہچان لے گا اور دیکھتے ہی تیر کی طرح اس کی طرف آئے گا۔ ہم روی سے دور رہیں گے۔ ہری چند جوں ہی اس کے قریب آئے گا، ہم اسے دبوچ لیں گے۔ سب کچھ اسی طرح ہوا تو کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے تمہاری گاڑی میں دو چار ہتھیار اور ان کے فاضل راؤنڈ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"بس میں ابھی پہنچتا ہوں۔ ہوٹل کے پاس تم مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔" ہری چند کے بارے میں اول خان شروع سے ہی سرگرم تھا۔

"آرام سے پہنچو۔ مجھے اولڈ کلفٹن سے پی سی کے گزشتہ ۳ گھنٹے سے بہت کچھ اضافی وقت صرف ہوگا۔"

"میں آدھے گھنٹے میں نکلوں گا۔" اس نے کہا اور پروگرام طے ہوتے ہی میں نے فون بند کردیا۔

میں واپس لوٹا تو ان دونوں کے گلاس خالی ہونے کے قریب تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

"بس اب فوراً نکلنا ہے تاکہ ہماری واپسی میں زیادہ دیر نہ ہو۔" میں نے کھڑے کھڑے کہا۔

"پانچ منٹ بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" ماروتی نے اپنا گلاس اٹھایا اور اندر چل دی۔

اپنے وعدے کے مطابق وہ پانچ منٹ میں ساڑی کے بجائے قمیض شلوار کا نفیس سوٹ زیب تن کرکے واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفری بیگ بھی تھا جس میں اس کا شب خوابی لباس وغیرہ موجود تھا۔

روی نے اپنے گلاس میں باقی ماندہ سیال اپنے معدے میں انڈیلا اور ہم دونوں نے بھی اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔ ماروتی نے اپنی ملازمہ کو بلا کر میز سمیٹنے اور گھر کی دیکھ بھال کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور تینوں وہاں سے چل دیے۔

شراب نوشی کے اثرات کے بارے میں وقت اور مقدار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ میرے حساب سے روی نے اعصابی دباؤ کے باعث تھوڑی سی دیر میں رائل سیلوٹ کی کافی زیادہ مقدار لی تھی لیکن پھر بھی وہ حیرت انگیز طور پر بالکل نارمل نظر آرہا تھا۔ صرف آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی قدر نشے میں ہے ورنہ اس کی بول چال اور چال ڈھال میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ وہ یقینی طور پر بلا نوش تھا۔

گاڑی میں اس نے ماروتی کو میرے ساتھ اگلی نشست پر بٹھا کر ایک مرتبہ پھر اپنی رواداری کا فراخ دلانہ مظاہرہ کیا اور خود پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے مقابلے میں ماروتی نے نرا پانی ہی پیا تھا۔ اس کے گلاس میں وہسکی کی مقدار نہ ہونے کے برابر تھی مگر پھر بھی وہ سرور میں تھی اور تھوڑی دیر پہلے ہونے والی ناخوش گوار گفتگو کے اثرات سے نجات حاصل کرچکی تھی۔

میں نے اول خان سے پی سی کا نام لیا تھا مگر ماروتی کو شیراٹن پسند تھا۔ دونوں ہوٹل ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ میں نے اولڈ کلفٹن سے اکل کرمین روڈ پکڑی اور تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا، پل عبور کرکے ہوٹل میٹروپول کے چوراہے سے بائیں طرف مڑ گیا۔ اس سڑک کے اگلے سرے پر شہر کے دونوں مشہور ہوٹل ایک دوسرے کے سامنے واقع ہیں۔

ٹریفک کی بھیڑ سے کٹ کر، میں اگلے چوراہے سے پہلے ہوٹل کے پورچ میں داخل ہوا اور ماروتی کو وہیں اتار دیا۔ وہ نیچے اتر کر اپنی بیوی کی پیشانی پر الوداعی بوسہ ثبت کیا اور اگلی نشست سنبھال لی۔ اگلے ہی لمحے ہم ہوٹل سے باہر جانے والے راستے پر بڑھ رہے تھے۔

ہم ٹریفک کی بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے گلشن اقبال میں مقررہ مقام پر پہنچے تو ہمیں خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اول خان اپنی گاڑی کے باہر کھڑا بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ سلطان شاہ اس سے کچھ دور کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر انجن بند کردیا اور روی کو اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ روی کے لیے اول خان کا نام اظہر تھا۔ ان دونوں کے رسمی تعارف کے بعد ہم اول خان کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس مرتبہ روی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

"تمہاری گاڑی کا کیا ہوگا۔" ہماری روانگی کے بعد روی نے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔

"فکر مت کرو۔ کوئی نہ کوئی وہ گاڑی لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

اول خان خاموشی سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے چہرے سے کچھ فکرمندی جھلک رہی تھی جس نے مجھے بھی مضطرب کردیا تھا مگر روی کی موجودگی میں، میں اس سے کوئی سوال کرنے سے گریز کررہا تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سے ہمارے بارے میں روی کا اعتماد متزلزل ہو سکتا تھا۔ میں کام پورا ہونے تک اسے اپنی کسی کمزوری کا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

**فیڈرل پکچرز**، ہالی ووڈ کے ڈائریکٹر آف پبلسٹی رچرڈ ریڈ کی طرف سے فیڈرل پکچرز کے خصوصی نمائندے نے جارج رابرٹ، مقیم سیوائے ہوٹل نیویارک کے نام ایک خط:

"ڈیئر جارج!

اگر تمہارے پاس کوئی تیز رفتار کار موجود ہے تو بہت اچھا ہے اور اگر نہیں ہے تو فوراً ایسی کوئی کار کرائے پر حاصل کرلو کیونکہ تمہیں ہنگامی طور پر ایک مسئلے سے نمٹنے کے لیے اوکلاہاما کی طرف روانہ ہونا ہے۔

کیا تمہیں فلیم ژان کا نام یاد ہے؟ میں یہ محض رسماً پوچھ رہا ہوں ورنہ ظاہر ہے فلیم ژان کو کون بھول سکتا ہے۔ وہ اپنے وقت کی سب سے مقبول فلم اسٹار تھی اور صرف ہماری فلم کمپنی میں ہی نہیں بلکہ پورے ہالی ووڈ میں اس کی زبردست مانگ تھی۔ اسے اپنی فلم میں لینے کے لیے تمام بڑی کمپنیوں کے درمیان رسا کشی ہوتی تھی۔ بارہ پندرہ سال پہلے تک وہ پوری امریکی قوم کے دلوں کی دھڑکن تھی۔ تمہیں یاد ہی ہوگا کہ عین اپنے عروج کے دور میں اس کے دماغ پر اس پاگل پن کا حملہ ہوا جس کے نتیجے میں انسان شادی پر تل جاتا ہے۔ اس نے اوکلاہاما کے علاقے ٹلسا کے ایک شخص ٹام مارلے سے شادی کرلی۔ یہ یاد دلانے کی بھی غالباً ضرورت نہیں کہ ٹام مارلے ایک نہایت دولت مند شخص تھا۔ وہ تیل کے نہ جانے کتنے کنوؤں کا مالک تھا۔ شادی کے بعد فلیم ژان اسی کے علاقے کی طرف سدھار گئی۔

ظاہر ہے اس وقت ہم لوگوں نے اس شادی کو اپنی کمپنی کے لیے کوئی بڑا سانحہ نہیں سمجھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ عشق کی یہ گرمی درحقیقت اس لیے ہے کہ ٹام مارلے کو حال ہی میں اتنی دولت وجائیداد ورثے میں ملی ہے۔ جلد ہی عشق کا بھوت دونوں کے سر سے اتر جائے گا اور فلیم ژان اس امیر زادے کی بہت سی دولت سمیٹ کر طلاق کی صورت میں پروانہ آزادی حاصل کرکے ہالی ووڈ واپس لوٹ آئے گی اور سب سلسلے وہیں سے شروع ہوجائیں گے جہاں سے ٹوٹے تھے۔

ہمارا یہ خیال غلط تھا!

لگتا ہے فلیم ژان سچ مچ اس شخص کے عشق میں گرفتار ہوچکی تھی اور یہ عشق پائیدار بھی تھا۔ کیونکہ اس دن کے بعد سے آج تک فلیم ژان اسی علاقے میں رہ رہی ہے۔ اس کے ہاں دو بچے بھی ہوچکے ہیں جو اب خاصے بڑے ہوچکے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے ان کی بہت اچھی پرورش کی ہے اور علاقے کی بہت معزز اور سماجی طور پر سرگرم خواتین

فلمی دنیا میں پس پردہ وقوع پذیر ہونے والی عجیب وغریب کش مکش کی احوال

# شعلہ بدن

محمود احمد مودی

مشتاق مشہور ہے کہ گیا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا
گزرے وقت کو بیادہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے پلٹایا نہیں جا سکتا۔ ماضی کی ایک اداکارہ کی داستان حیات حقیقت کو فراموش کرکے گئے وقت کو لوٹانا چاہتی تھی مگر جس طرح گیا وقت کبھی واپس نہیں آتا اسی طرح حالات بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔

میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ خلاصہ اس کہانی کا یہ ہوا کہ لڑکی مستقل طور پر ہمارے ہاتھ سے جاچکی تھی اور مکمل طور پر ایک وفاشعار اور خانہ دار خاتون بن چکی تھی۔

پھر ہوا کچھ یوں کہ پچھلے مہینے کی ایک رات ہماری کمپنی کے مالک' ہمارے پیارے مسٹر لیو بیلے نے ایک بہت بڑی پارٹی دی جس میں ہالی ووڈ کے تمام سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ مسٹر لیو بیلے کی پارٹیاں اکثر تاریخی ہی ہوتی ہیں لیکن یہ پارٹی اس لیے کچھ زیادہ ہی تاریخی ہوگئی کہ اس میں غلطی غیر متوقع طور پر بھولی بسری فلیم ڈان آن پہنچی۔ وہ ہنالولو سے واپس اپنے گھر ٹلسا جاتے ہوئے راستے میں کچھ دیر کے لیے رکی تھی اور پارٹی کی خبر یا کپر پرانے شناساؤں سے ہیلو ہائے کرنے کے ارادے سے چلی آئی تھی۔

سب نے بے یقینی اور مسرت سے لبریز چیخوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے برسوں بعد بھی وہ اپنے زمانہ عروج ہی کی طرح تازہ دم' خوب صورت اور نوجوان نظر آرہی تھی۔ پارٹی میں زمانۂ حال کے تمام ٹاپ اسٹارز اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھے لیکن یقین کرو کہ فلیم ڈان کی آمد کے بعد گویا سب کے حسن کے چراغ مدھم پڑگئے اور چند لمحوں کے اندر اندر فلیم سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ہر وہ موجود جس کے جسم میں ذرا سی بھی جان تھی' اسے زور دار انداز میں "ہیلو" کہنے کے لیے دوسروں کو دھکیل کر' ان کے پاؤں کچلتا ہوا اس تک پہنچنے کی فکر میں تھا۔

آخر کار میں اور مسٹر لیو بیلے بھی کسی نہ کسی طرح ہجوم کے درمیان راستہ بناتے ہوئے فلیم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے اسے گلے لگایا۔ اس اعتبار سے وہ یقیناً میری زندگی کے حسین ترین لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا لیکن اسی لمحے میں نے اپنی زندگی کا منحوس ترین مکالمہ بولا اور وہ مکالمہ یہ تھا:

"فلیم! ذرا دیکھو۔ لوگ اب بھی تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ اب ہمارے درمیان واپس آجاؤ اور فلموں میں کام کرو تاکہ تمہارے پرستار تمہیں پھر سے دیکھ سکیں۔"

یقین کرو جارج۔ اس وقت میرے ذہن میں اس کے سوا کوئی خیال نہیں تھا کہ ذرا خوش خلقی کا مظاہرہ کروں فلیم کو خوش کروں اور ذرا اس کا دل بڑھاؤں۔ میں پبلسٹی کے شعبے کا ڈائریکٹر ہوں۔ اس قسم کی گفتگو کرنا میرے پیشے کا ایک حصہ بھی ہے لیکن خدا مجھے معاف کرے اب تو میرا اپنے پیشے پر لعنت بھیجنے کو جی چاہ رہا ہے۔

تمہیں معلوم ہے اس عورت۔ فلیم ڈان نے کیا کیا؟ وہ ٹلسا' اپنے گھر واپس گئی اور اس کے چند دن بعد ہی اس علاقے کے ایک ٹی وی نیٹ ورک نے اعلان کردیا کہ اپنے وقت کی سپر اسٹار فلیم ڈان ان کی ایک ٹی وی سیریز میں مرکزی کردار میں جلوہ گر ہورہی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے اس سلسلے میں ہم سے مشورہ کرنا تو درکنار' ہمیں اطلاع تک دینی گوارا نہیں کی۔ اس بات کا علم ہمیں اخبارات اور شوبزنس کے رسائل سے ہوا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان خبروں میں کہیں ہمارا ذکر تک نہیں تھا کہ اسے یہ خیال ہم نے دلایا تھا یا ہماری تجویز تھی۔ اس سے ہمیں کوئی فائدہ تو نہیں پہنچنا تھا لیکن تھوڑا سا کریڈٹ ہی مل جاتا۔

بہرحال اصل غم ناک کہانی یہ نہیں ہے۔ اس کی طرف تو میں اب آرہا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ دولت' فلیم کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے اور اس نے جس طرح اس دولت کے کچھ حصے سے کام لینے کا پروگرام بنایا ہے وہ ہماری کمر توڑنے' ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے اور ہمیں ہماری ہی نظروں میں ذلیل کرنے کے لیے کافی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس سیریز کے لیے خود سرمایہ کاری کررہی ہے بلکہ اس نے ہماری کمپنی کے تمام ٹیکنیکل اسٹاف کو توڑ لیا ہے۔ اس نے ہمارے ہر شعبے کے ماہر ترین آدمی کو موجودہ معاوضوں سے کہیں زیادہ معاوضوں اور مراعات کا لالچ دے کر اس پراجیکٹ کے لیے بلالیا ہے۔

ہمارا بہترین کیمرا مین ال نیف' بہترین لائٹ مین ہ کرین' بہترین میک اپ مین آرٹ برسٹل' بہترین ڈریس ڈیزائنر لی لیک۔ یہ سب اس کے لیے کام کریں گے حتیٰ کہ ویلسن وارڈ کی خدمات بھی اس نے حاصل کرلی ہیں جس نے اس کے فلمی کیریئر کے دوران میں اس کی بہترین فلمیں ڈائریکٹ کی تھیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ان دنوں فلموں میں جس طرح نت نئے رجحانات کا سیلاب آیا ہوا ہے اور جس طرح نئی نئی کمپنیاں بھاری سرمایہ لے کر اس میدان میں آرہی ہیں' ہم ان کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں کرپارہے اور مسابقت کے اس نئے دور میں ہماری کمپنی کافی پیچھے رہ گئی ہے جس کی وجہ سے ہم ان لوگوں کو کچھ اچھے معاوضے ادا نہیں کرپارہے تھے۔ ظاہر ہے یہ ہمارے ہاں خوش نہیں تھے چنانچہ جونہی فلیم ڈان نے ان کی طرف رخ کرکے اپنی چیک بک لہرائی' یہ دوڑے چلے گئے۔

بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارا اس سلسلے میں صبر کرکے بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر ٹی وی والے اسی طرح ہالی ووڈ کے صف اول کے ہنرمندوں کو توڑ کر لے جاتے رہے اور ہالی ووڈ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تو جلد ہی ہم لوگوں کو فاقے کرنے پڑیں گے۔ اچھے ہنرمندوں کے بغیر اگر ہم نے فلمیں بنانے کی کوشش کی تو ممکن ہے ہمیں اس الزام میں گرفتار کرلیا جائے کہ ہم قیمتی خام مال ضائع کررہے ہیں۔ یہ انہی ہنرمندوں کا کمال تھا کہ ہم اب تک نہایت پکھنانہ یا پھر بے سروپا رومانی اور ڈراؤنی کہانیوں پر بھی کامیاب فلمیں بناتے آرہے تھے۔ اگر ہم اس کام سے بھی رہ گئے تو ہم کریں گے کیا؟ ہم برگر کے کھیل لگانے یا الٹا ہیٹ ہاتھ میں پکڑ کر بھیک مانگنے سے تو رہے لیکن مجھے کم از کم اپنا تو یہی انجام نظر آرہا ہے اس لیے کہ ہمارا پیارا باس لیو بیلے اس سارے بحران کا ذمے دار مجھے قرار دے رہا ہے۔

"اگر تم اس پارٹی میں اپنا یہ غار جیسا منہ بند رکھتے تو اس بحران کی نوبت نہ آتی۔" اس نے کہا تھا "نہ تم بکواس کرتے اور نہ ہی شوبزنس میں واپس آنے کا کیڑا اس کے دماغ میں کلبلاتا۔"

اس نے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کچھ اور الفاظ بھی استعمال کیے تھے جو میں یہاں نہیں لکھ رہا۔ عین ممکن ہے کہ ان سے تمہاری اخلاقیات پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہ ہوں۔ خیر۔۔۔ یہ کچھ اتنی زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے کمپنی سے نکالنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بے ہودہ خیال جڑ پکڑ رہا ہو کہ جہاں اتنے بہت سے اہم آدمی خود چلے گئے' ایک آدمی کو دھکا دے کر بھی نکال دیا جائے تو کیا حرج ہے لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں قربانی کا بکرا بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں محض اس لیے ایک اچھی ملازمت سے محروم ہونا ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میں نے ایک محفل میں ایک دوستانہ جملہ بول دیا تھا۔

میں اس ہاتھ پر کاٹنے کی کوشش ضرور کروں گا جس سے مجھے چانٹا مارا گیا ہے۔ مختصراً اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ ایسے انتظامات کرنا چاہتا ہوں کہ فلیم ڈان کی سیریز بہت بری طرح فلاپ ہوجائے۔ یہ تجربہ اس بری طرح ناکام ہو کہ چند فلمیں بنانے کے بعد ہی فلیم کانوں کو ہاتھ لگا لے اور مزید فلمیں تیار کرنے کا ارادہ ترک کرکے ہمارے آدمیوں کو واپس بھیج دے۔ چنانچہ تم فوری طور پر ٹلسا پہنچو اور اس عورت کے کام میں اسی طرح رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرو جس طرح چلتی ہوئی گاڑی کے انجن میں ریت ڈال کر اسے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس قسم کی تدبیریں کرنے میں تم ماہر ہو۔ مجھے تمہاری ذہانت پر بھروسا ہے۔ تمہارا:

رچرڈ"

○☆○

فیڈرل پکچرز کے خصوصی نمائندے جارج رابرٹ' مقیم سٹی ہوٹل' ٹلسا کی جانب سے ڈائریکٹر آف پبلسٹی مسٹر رچرڈ ریڈ کے نام جوابی خط:

ڈیئر مسٹر رچرڈ ریڈ!

میں آپ کی ہدایت کے مطابق فوری طور پر ٹلسا پہنچ تو گیا ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرا یہاں آنا محض وقت کا زیاں ہوگا۔ میں آج صبح آٹھ بجے ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے حالات کا جائزہ لینے میں کافی وقت صرف کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں فلیم ڈان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ہالی ووڈ کے سمندر میں ایک چھوٹی سی مچھلی تھی۔ جب وہ اپنی پہلی فلم میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کرنے کے لیے سوئمنگ سوٹ پول کے منظر کی فلم بندی کے لیے کیمرے کے سامنے جانے لگی تھی تو اس کے سوئمنگ کے ڈوریاں میں نے ہی باندھی تھیں۔ اب اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ اللہ نے اسے خوب صورت بنایا ہے اور قسمت بھی اچھی لکھی ہے۔ وہ تیزی سے فلمی دنیا کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی اور سب سے اوپر جا پہنچی۔

خیر۔۔۔ ان پرانی باتوں کو چھوڑیے۔ ہم تازہ ترین صورت حال کی طرف آتے ہیں۔ میں نے یہاں پہنچتے ہی فلیم ڈان کو فون کیا اور ادھر ادھر کی فضول باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر کہا "ہیلو فلیم! ہنی! میں تمہارا انکل جارج بول رہا ہوں یہ تم کن فضولیات میں پڑگئی ہو؟ میں نے سنا ہے تم کوئی ٹی وی پروڈکشن وغیرہ شروع کررہی ہو؟"

"اوہ جارج!" وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی "اتنے عرصے بعد تمہاری آواز سن کر بہت اچھا محسوس ہورہا ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

قصہ مختصر یہ کہ اس سے گفتگو کے نتیجے میں' میں چند منٹ بعد ہی ایک ٹیکسی میں بیٹھا ٹلسا کے مضافاتی علاقے کی طرف رواں تھا۔ ٹلسا کا مضافاتی علاقہ حیرت انگیز طور پر اور ناقابل یقین حد تک سرسبز ہے اور جوں جوں میں شہر سے دور ہوتا جارہا تھا' زیادہ سے زیادہ بڑے بڑے مکانات نظر آرہے تھے۔ آخر کار میں وہاں کے سب سے بڑے مکان تک جا پہنچا۔

مکان کیا تھا' خود اپنی جگہ گویا ایک الگ آبادی تھی۔ اس میں ایک نہیں' کئی طویل و عریض' سرسبز و شاداب خوب صورت لان تھے' گھوڑوں کے اصطبل تھے' گائے بھینسوں کے باڑے تھے' کئی سو ٹہلنگ پول تھے' بیلی کاپٹر کے لیے پیڈ تھا اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ مکان کی اصل عمارت کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی عمارت سے کم نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال بھی آیا کہ مجھے یہاں کمرا ریزرو کرانے کے بعد آنا چاہیے تھا۔

ایک باوردی خادمہ مجھے دروازے پر ملی اور میں نے حتی الامکان بارعب انداز میں اسے بتایا کہ میں مسٹر جارج رابرٹ ہوں۔ چند لمحے بعد ہی فلیم ڈان گویا ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ سچ پوچھیں تو اس عورت کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔ انکل ہو یا بھتیجا۔ ہر پرانے جاننے والے سے بہت گرم جوشی سے ملتی ہے۔

پھر ٹام ہارلے بھی آگیا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے وہ چھریرے جسم کا ایک دراز قد اور وجیہہ آدمی ہے۔ بس اس کے بالوں کو دیکھ کر ذرا خیال آتا ہے کہ اسے حجامت کی ضرورت ہے لیکن بہرحال بہت ہی اچھا' بہت ہی با اخلاق آدمی ہے۔ اس سے پہلے شاید میں ایسے کسی آدمی سے نہیں ملا جو اتنا امیر ہونے کے باوجود اتنا با اخلاق ہو۔

بیٹھنے کے لیے اپنے کئی ڈرائنگ روموں سے ایک کو انہوں نے منتخب کیا اور محض پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد ساری صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔ واضح رہے کہ حل سمجھ میں نہیں آیا' صرف صورت حال سمجھ میں آئی۔ میرے خیال میں اس صورتِ حال کا کوئی حل ہے بھی نہیں کم از کم ہمارے پاس نہیں ہے۔

اصل میں یہ ایک خالص گھریلو قسم کا مسئلہ ہے اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر گھر میں پہلے ہی اتنے مسئلے ہوتے ہیں کہ کسی اور کو ان میں دخل دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ فلیم نے جو پروگرام بنایا ہے' اس کی بنیاد یا پس منظر یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی کو نیچا دکھانا' کسی کو نقصان پہنچانا یا شوبزنس کی دنیا میں خود کوئی بڑی پروڈیو سر بننا چاہتی ہے۔ اصل میں تو اس میدان میں اسے اس کے اپنے بچوں نے دھکا دیا ہے یا یوں سمجھیں کہ وہ انہیں قائل کرنے' انہیں متاثر کرنے اور ان کی نظروں میں اپنے آپ کو کچھ ثابت کرنے کے لیے اتنا تردد کر رہی ہے اور اتنی دولت داؤ پر لگا رہی ہے۔

میرے علم میں ہے کہ فلمی دنیا سے کنارہ کشی کرنے والی اور بھی کئی' اپنے وقت کی بڑی بڑی اسٹارز کو اس مسئلے کا سامنا رہا ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ اسی طرح اچانک ان کی پرانی فلمیں ٹی وی پر دکھائی جانے لگتی ہیں اور وہ حیرت' مسرت اور فخر سے اپنے بچوں کو بتاتی ہیں "بچو! یہ تمہاری ممی کی فلمیں ہیں تمہاری ممی پہلے فلم اسٹار ہوا کرتی تھیں۔"

اس کے بعد جو کچھ دوسری فلم اسٹارز کے ساتھ ہوا تھا' وہی فلیم کے ساتھ ہوا یعنی اس کے بچوں نے حقارت سے صرف اتنا کہا "اونہہ۔۔۔!"

آپ کو تو معلوم ہی ہے آج کل کے بچوں کو متاثر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ فلیم کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام جیکب ہے۔ وہ گیارہ سال کا ہے۔ چھوٹے کا نام بٹن ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ ان کے خیال میں ممی کا کسی زمانے میں فلم کی سپر اسٹار ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

انہوں نے بعد میں ذرا وضاحت سے کچھ یوں اظہار خیال فرمایا "مانا کہ آپ فلم اسٹار تھیں لیکن ٹی وی اسٹار تو نہیں تھیں ناں۔۔۔ اور اب تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ لو سیل ہال کو دیکھیں' وہ اپنے وقت میں فلم اسٹار تھی اور اب ٹی وی اسٹار ہے۔ اس کا "لو سی شو" کتنے عرصے سے ٹی وی پر چل رہا ہے اور کتنا پسند کیا جاتا ہے۔ بچہ بچہ اسے جانتا ہے' جونی کے پاپا تک اس کے آٹوگراف لے کر آئے تھے اور فخر سے سب کو دکھا رہے تھے۔"

آخر اپنے وقت کی ایک سپر اسٹار کس حد تک اپنی انا کا مجروح ہونا برداشت کر سکتی ہے؟ انا مجروح کرنے والے خواہ اس کے اپنے بچے ہی ہوں لیکن ایک ماں کی حیثیت سے بھی بہرحال اس کی کچھ انا ہوتی ہے۔ ٹی وی پر اس کی یکے بعد دیگرے فلمیں چل رہی تھیں لیکن اس کے اپنے بچے اور ان کی دوست فلم کے دوران میں کسمسانے اور پہلو بدلنے لگتے تھے۔ آخر کار ان میں سے کوئی بول ہی اٹھتا تھا "وہ چینل لگاؤ ناجس سے "لو سی شو" آنے والا ہے۔"

ستم ظریفی یہ ہوتی کہ چینل بدلنے میں سب سے زیادہ پھرتی خود فلیم کے بچے دکھاتے۔ رفتہ رفتہ یہ بات فلیم کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگی اور آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان ننھے شیطانوں پر ثابت کرے گی کہ ان کی ممی اب بھی کوئی گئی گزری عورت نہیں ہے۔ اس کے لیے ٹی وی کی اسٹار بننا بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گو کہ اسے احساس تھا کہ اس طرح سوچنا یا اس قسم کا فیصلہ کرنا ایک بچکانا بات تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس سے باز نہ رکھ سکی۔

اس نے صرف یہی فیصلہ نہیں کیا کہ وہ ٹی وی پر آئے گی بلکہ یہ بھی ٹھان لی ہے کہ پروڈکشن اس کی اپنی ہوگی' کہانی



اس کے اپنے گھر کے گرد گھوما کرے گی' اس کی اپنی جاگیر اور قرب و جوار کے علاقے میں زیادہ شوٹنگ ہوا کرے گی' اس کے بعد جہاں تک بھی کہانی کا تقاضا ہوگا' وہ شوٹنگ کے لیے جایا کریں گے۔ مزید یہ کہ اس کے کمسن بچے اس سارے کھیل کے صرف تماشائی نہیں ہوں گے بلکہ وہ خود بھی اس میں حصہ لیں گے۔ یعنی وہ بھی ہر قسط کے مستقل کردار ہوں گے اور پوری سیریز میں اداکاری کریں گے۔ یوں انہیں پتا چلے گا کہ ان کی ماں اب بھی کیا چیز ہے۔ وہ محض قصۂ پارینہ اور ماضی کا بھولا بسرا کردار نہیں تھی۔

فلیم جب ہالی ووڈ میں آپ لوگوں کی پارٹی میں اچانک پہنچی تو اس وقت اس کا ٹی وی پروڈکشنز کا پروگرام بن چکا تھا اور وہ ٹی وی نیٹ ورک والوں سے بات کر چکی تھی۔ ان تمام بڑے بڑے ہنرمندوں سے رابطے شروع ہو چکے تھے جو فلیم کی بہترین فلموں میں شریک رہ چکے تھے۔ یوں سمجھو کہ اس وقت تو پروگرام کا آئیڈیا تک بھی فائنل ہوئے بھی دو ماہ گزر چکے تھے۔ فلم اور ٹی وی کے دو مشہور رائٹر ہیمفری اور ٹوپڈ اسکرپٹ پر کام شروع کر چکے تھے۔

ان کا ارادہ ایک کامیڈی سیریز کا ہے جس میں ہر ہار ایک الگ کہانی پیش کی جائے گی۔ کہانی ایک فیملی کے گرد گھومے گی جو ظاہر ہے فلیم کی فیملی ہوگی۔ توقع یہی رکھی جا رہی ہے کہ اسے پوری فیملی اور خاص طور پر بچے دلچسپی سے دیکھیں گے۔ ٹام ہارلے کی املاک میں کئی بڑے بڑے اور جدید قسم کے ڈیری فارمز و غیرہ بھی شامل ہیں۔ صرف اس کے مکان' آس پاس کے علاقے اور اس کے تیل کے کنوؤں ہی کو نہیں بلکہ ان ڈیری فارمز کو بھی لوکیشنز کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

حیرت انگیز طور پر ٹام ہارلے اس سارے پروگرام میں فلیم کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر فلیم یہ سب کچھ کرنا چاہتی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ ادھر فلیم چونکہ برسوں بعد شوبزنس کی دنیا میں دوبارہ قدم رکھنے جا رہی تھی اس لیے خوف زدہ بھی تھی کہ کہیں اس کا سابقہ امیج خراب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ٹی وی نیٹ ورک والوں پر مکمل انحصار کرنے کے بجائے خود اپنے زمانے کے ہالی ووڈ کے بہترین ہنرمندوں کو جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ دولت اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی چنانچہ ہالی ووڈ کے اصطبل میں جتنے بھی جینیئس گدھے گھوڑے موجود تھے وہ سب دولتیاں جھاڑتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ فلیم کو یقین ہے کہ ان کے ساتھ وہ خود اعتمادی سے کام کر سکے گی۔ جو نہی اس کی سیریز مقبولیت حاصل کرے گی' یہ لوگ واپس آجائیں گے۔

یوں گویا ایک بات تو طے ہو گئی کہ یہ سارا بحران محض آپ کے ایک جملے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا۔ آپ کو خود بھی اس ضمن میں اپنے آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے اور ہمارے باس مسٹر لیونیلے کو یہ خیال اپنے ننھے سے دماغ سے نکال دینا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اس سلسلے میں اب کچھ کرنا بہت بڑی کمینگی ہوگی۔ یہ ایک خوب صورت اور آئیڈیل قسم کی فیملی کی خوشیوں کا معاملہ ہے۔ ان میں رکاوٹ ڈالنا اور بدمزگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے چوری چھپے کسی پادری کی گردن پہ خارش پیدا کرنے والا پاؤڈر چھڑکنا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس قسم کی کمینگی آمیز حرکت کرنا ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ مخلص:

جارج رابرٹ"

○☆○

رچرڈ ریڈ کی جانب سے جارج رابرٹ کے نام ارجنٹ تار:

"ڈیئر جارج! مبارک ہو۔۔۔ تم نے اب یقیناً مشیر ازدواجیات بلکہ شاید حافظِ ازدواجیات کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ تمہیں یہ نیا پیشہ مبارک ہو۔ میں اس پیشے میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔ تمہارے اس نئے پیشے کا علم مجھے تمہارا خط پڑھ کر ہوا۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں فلیم کی ازدواجی زندگی کی فکر خود فلیم سے بھی زیادہ ہے۔

اس کی فیملی لائف کے لیے تمہاری فکر مندی اور ہمدردیاں قابلِ ستائش ہیں لیکن تمہیں یاد دلاتا چلوں کہ تمہاری تھوڑی بہت ہمدردیوں کا مستحق میں بھی ہوں۔ میں تمہارا باس' تمہارا پرانا دوست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج کل معاشی خطرات میں گھرا ہوا ایک مظلوم انسان ہوں۔ میری ملازمت کو شدید خطرات لاحق ہیں اس لیے جیسا کہ میں نے اپنے خط میں واضح کیا تھا کہ مسئلے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

ہمارے جو ہنرمند فلیم کی ٹی وی پروڈکشن کے سلسلے میں چلے گئے ہیں' ضروری نہیں ہے کہ پراجیکٹ کی کامیابی کے بعد وہ واپس آجائیں۔ ایک بار جب وہ آزاد انہ ماحول میں' زیادہ معاوضوں پر کام کرنے کا مزہ چکھ لیں گے تو پھر آگے سے آگے ہی بڑھنے کی فکر کریں گے۔ شاید وہ محسوس کریں گے کہ انہیں ہماری ضرورت ہی نہیں رہی۔ ٹی وی پروڈکشنز والے ویسے بھی انہیں سر پر بٹھائیں گے کیونکہ انہیں تو پروڈکشن

کے سر پر کا بھی علم نہیں ہوتا۔ انہیں جونہی کیمرے اور لائٹوں کے بٹن دبانے آجاتے ہیں' وہ پروڈکشن میں کود پڑتے ہیں۔

اگر ہمارے آدمی ان کے ہتھے چڑھ گئے اور واپس نہ آئے تو سمجھ لو کمپنی کی تباہی میں کوئی کسر نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ تم فلیم کے لیے اپنے محبت بھرے جذبات اور ہمدردانہ خیالات کو ایک طرف رکھو اور حقیقت پسندی کا ہتھوڑا لے کر اس محاذ پر پل پڑو جو ہمارے خلاف کھولا جارہا ہے۔ تم ایسی تدبیر کرو کہ انہی آدمیوں کے ہاتھوں ان لوگوں کا بیڑا غرق ہوجائے جنہیں یہ اپنی پروڈکشن شاندار بنانے کے لیے لے گئے ہیں۔ اگر تم اپنے آپ کو اس کام کے قابل نہیں سمجھتے اور تمہارا دل ودماغ تمہارا ساتھ نہیں دے رہا تو مجھے فوراً اطلاع دو۔ میں کسی اور آدمی کو اس مہم کے لیے روانہ کردوں۔"

○☆○

جارج رابرٹ کی طرف سے رچرڈ ریڈ کے نام خط:

ڈیئر مسٹر ریڈ!

آپ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ ایکٹرسوں کے لیے دل میں زیادہ ہمدردی نہیں رکھنی چاہیے۔ ان کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ ہمدردی کی کچھ ایسی مستحق بھی نہیں ہوتیں۔ آپ مجھ سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے آپ کو دوسرا آدمی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی ایسا ناکارہ بھی نہیں ہوا کہ ایسے چھوٹے موٹے کام بھی نہ کرسکوں۔ مجھے تو اب ویسے ہی اس عورت فلیم ڈان پر سخت غصہ آرہا ہے۔ بہت ہی کمینی عورت ہے۔ ان ایکٹرسوں کو آنکھیں پھیرتے تو زرا دیر نہیں لگتی۔ ابھی تو اس عورت کی پروڈکشن باقاعدہ طور پر شروع بھی نہیں ہوئی اور اس کی نظریں بدل گئی ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کے منصوبوں کا بہت اچھی طرح بیڑا غرق کروں گا۔

فلیم کی سب سے اچھی فلموں کا ڈائریکٹر ویلس وارڈ' جسے وہ بڑے چاؤ سے لے کر آئی تھی آپ کو معلوم ہے اس نے آتے ہی سب سے پہلا کام کیا کیا؟ وہ ٹی وی پروڈکشنز کے طور طریقوں کا عادی نہیں ہے۔ اس نے سب سے پہلے فلیم کے بچوں کو مسترد کردیا۔ اسے یہ تجویز ہی پسند نہیں آئی کہ سیریز میں فلیم کے حقیقی بچے اس کے بچوں کا کردار ادا کریں تاہم اس نے بچوں کا آڈیشن لیا اور اس کے بعد انہیں بالکل ہی مسترد کردیا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے فلیم سے کہا "ان بچوں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ تو تمہارے بچے ہی نہیں لگتے اور پھر انہیں ایکٹنگ بالکل نہیں آتی۔ یہ تو کیمرے کے سامنے بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے عام زندگی میں نظر آتے ہیں۔"

اس نے فلیم کے جواب کی ضرورت محسوس کیے بغیر بچوں کو دودھ کی مکھی کی طرح سیریز سے نکال پھینکا اور دو پیشہ ور اداکار بچوں کو بلوانے کے لیے ہالی ووڈ فون کردیا۔ بے چارے دونوں بچے جیک اور بٹن تمام تیاریوں کے دوران میں ایک کونے میں کھڑے' آنکھوں میں آنسو لیے سوچتے رہتے تھے کہ کیا واقعی ہم اپنی مما کے بچے نہیں لگتے؟ شکر ہے ویلس وارڈ نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے پاپا کے بچے نہیں لگتے۔ بچوں کو اس بات پر ویلس وارڈ کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن وہ اس باریک سے فرق اور اس نازک بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں تو بس یہ معلوم ہے کہ ان کے اردگرد جانے کیا ہورہا ہے اور انہیں ان ساری سرگرمیوں میں سے نکال پھینکا گیا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ فلیم نے بھی اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اسے ویلس وارڈ کا فیصلہ پسند تو نہیں آیا لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ یہ شہرت کا چسکا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے انسان شاید خود اپنی اولاد کی حمایت کرنا بھی چھوا دیتا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے ٹام بارلے کے ردِعمل پر ہے۔ پروڈکشن کی سرگرمیوں کے دوران میں وہ کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ان کارروائیوں سے بڑا لطف اندوز ہورہا ہے۔ چہرے پر ایک احمقانہ مسکراہٹ لیے وہ اِدھر اُدھر پھرتا رہتا ہے اور اس پروگرام کے سلسلے میں کوئی اس کی رائے لینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے "اگر فلیم یہ کرنا چاہتی ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"

لیکن مجھے اس صورتِ حال پر اعتراض ہے۔ یہ ایک بہت اچھی اور آئیڈیل قسم کی فیملی ہے۔ جیک اور بٹن بہت پیارے بچے ہیں۔ اگر یہاں کوئی اور ان کے مفادات کی حفاظت اور ان کے محسوسات کا احترام نہیں کرے گا تو میں کروں گا۔ میں کل صبح سے ہی اس عورت کے منصوبوں کے محل زمیں بوس کرنے کے لیے کارروائیاں شروع کردوں گا بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے کارروائیاں شروع کردی ہیں۔ میں نے نہایت رازدارانہ انداز میں کیمرامین کو بتادیا ہے کہ لائٹ مین اسے ٹیم سے نکلوانے کی کوشش کررہا ہے اور لائٹ مین سے میں نے کہہ دیا ہے کہ کیمرامین اس کی پھپھی کرانے کے درپے ہے۔ اس کے بعد میں نے رازداری سے ایک آپ مین کو بتادیا ہے کہ وہ دونوں اسے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے ان تینوں سے وعدہ بھی لے لیا ہے کہ وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے کہ یہ بات میں نے انہیں بتائی تھی۔

اس کے علاوہ میں نے ڈریس ڈیزائنر للی لیک سے کہہ دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کیا کرے کیونکہ ویلس وارڈ اس کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ وہ بالکل کوئی پریشان حال دکھائی دینے لگی ہے۔ آج رات میں اطمینان سے لیٹ کر غور کروں گا کہ صبح ٹام بارلے کو رازدارانہ انداز میں کیا بتایا جائے؟

اس کے علاوہ آپ یہ بھی امید رکھیں کہ جلد ہی یہاں کیمرے اور لائٹس خراب ہونا شروع ہوجائیں گی۔ مجھے ان چیزوں میں کچھ خامیاں نظر آرہی ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو مجھے وہ لائن ہی کمزور نظر آرہی ہے جس کے ذریعے اس پروجیکٹ کے لیے بجلی فراہم کی جارہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ آگے چل کر انہیں موم بتیوں کی روشنیوں میں فلم بندی کرنا پڑے۔ بہرحال آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ٹی وی اداکارہ کے طور پر فلیم ڈان کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہونے والا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا:

جارج رابرٹ۔"

○☆○

رچرڈ ریڈ کی جانب سے جارج رابرٹ کے نام ارجنٹ تار:

ڈیئر جارج!

خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔ اپنی تمام الٹی سیدھی کارروائیاں فوری طور پر ترک کردو۔ وہاں جو عظیم الشان منصوبہ زیرِ تکمیل ہے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے ابھی ابھی اس معاملے کی ایک ایسی پیچیدگی کا علم ہوا ہے جس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ تم فی الحال اپنے کمرے سے بھی مت نکلو بلکہ کمرے سے تو کیا' تم اپنے بیڈ سے بھی مت نکلو۔ جب تک تمہیں میرا تفصیلی خط نہ مل جائے' جو میں ٹیلی گرام کے فوراً بعد ہوائی ڈاک کی اسپیشل ڈلیوری سے ارسال کررہا ہوں۔ تمہارا۔

رچرڈ ریڈ

○☆○

رچرڈ ریڈ کی جانب سے جارج رابرٹ کے نام ارجنٹ ہوائی ڈاک اور اسپیشل ڈلیوری سے خط:

ڈیئر جارج!

خدا کا شکر ہے کہ تمہارے کس زیادہ خطرناک قدم اٹھانے سے پہلے میں تمہیں ٹیلی گرام بھیج کر اس سے روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پوری طرح "ایکشن" میں آنے سے پہلے میرا ارجنٹ ٹیلی گرام تمہیں مل گیا ہوگا۔

جارج! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ دنیا میں اگر چند خاص مسائل نہ ہوتے تو یہ کتنی اچھی اور خوب صورت جگہ ہوتی۔ مثلاً ایک بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ امیر اور غریب لوگوں سے نمٹنے کے کون سے الگ الگ طریقے ہونے چاہئیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ امیر لوگوں سے نمٹنا زیادہ مشکل کام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں کا طبقہ گھڑی کی مشینری کی طرح ہے۔ ایک پہیہ دوسرے پہیے میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک اسپرنگ دوسرے نہ جانے کتنے پرزوں سے جڑا ہوا ہے۔ ایک پرزے کو چھیڑو تو دوسرے نہ جانے کتنے پرزے رک جاتے ہیں۔ مثلاً تم کسی ایک سرمایہ دار کے خلاف کوئی جوڑ توڑ کرکے اس کا بیڑا غرق کردیتے ہو تو پتا چلتا ہے کہ ساتھ ہی اس کے کسی بھائی یا کزن کا بھی بیڑا غرق ہوگیا جو تمہارے شہر کی گیس کمپنی کا مالک تھا۔ اس کا بیڑا غرق ہونے کے نتیجے میں اس کی گیس کمپنی بند ہوگئی ہے اور اس کے نتیجے میں تمہارے گھر کا چولھا بھی بند ہوگیا ہے اور تمہیں اپنے لیے چائنیز آتش دان کے کوئلوں میں بھوننا پڑ رہی ہیں۔

قصہ اصل میں یوں ہے کہ آج صبح جب میں اپنے اور تمہارے باس لیونیلے کے آفس میں گیا اور اسے بتایا کہ آج میں نے فلیم ڈان کے منصوبے کا بیڑا غرق کرنے اور اپنے ہنرمندوں کو واپس بلوانے کا ایک منصوبہ تیار کرلیا ہے تو یوں سمجھو کہ باس کے ہاتھوں میری زندگی ضائع ہوتے ہوتے بچی ہے۔ اگر کوئی آلہ قتل باس کے آس پاس موجود ہوتا تو عین ممکن ہے کہ اس وقت تم میری تعفین اور تدفین میں شرکت کے لیے یہاں موجود ہوتے۔

معلوم یہ ہوا کہ فلیم ڈان کے شوہر ٹام بارلے کا ایک بڑا بھائی باب بارلے بھی ہے اور وہ ٹام سے بھی زیادہ تیل کے کنوؤں کا مالک ہے۔ باب بارلے نے حال ہی میں لوئیسیانا ریاست میں پھیلے ہوئے ایک ہی کمپنی کے چار ہزار سنیما ہال خریدے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہماری کمپنی صرف فلمیں ہی نہیں بناتی بلکہ سنیما ہالز میں اسکرینیں اور پروجیکٹرز نصب کرنے کا کام بھی کرتی ہے۔ اُدھر باب بارلے

نے چار ہزار سنیما ہال خریدے ہیں اور اِدھر ہماری کمپنی نے اس سے کامیاب مذاکرات کرکے ان سنیما ہالز میں نئی، بڑی اسکرینیں اور زیادہ جدید پروجیکٹرز نصب کرنے کا ٹھیکا لیا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ یہ سنیما کافی عرصے تک ہماری ان فلموں کی نمائش بھی کریں گے جو زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ چنانچہ اس مرحلے پر اگر میں نے اس خاندان کو پریشان کرنے یا ان دونوں بھائیوں میں سے کسی کو ناراض کرنے والی کوئی حرکت کی تو میرا آئندہ مستقل ایڈریس میرے گھر کا قریبی قبرستان بھی ہوسکتا ہے۔

بہرحال اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنا منصوبہ بالکل ہی ترک کررہے ہیں۔ ہم اسے قطعی طور پر ترک کرنے کے متحمل تو نہیں ہوسکتے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں اب مکمل طور پر کوئی نیا طریقہ کار یا یوں کہو کہ ایک نیا طریقۂ واردات سوچنا پڑے گا۔ میں جلد ہی تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ مایوس ہونے یا حوصلہ ہارنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ تمہارا:

رچرڈ ریڈ

○☆○

جارج رابرٹ کی طرف سے رچرڈ ریڈ کے نام ارجنٹ ٹیلیگرام:

ڈیئر رچرڈ ریڈ!

میں بوب ہارلے کو تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ اصل میں وہی تو اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ نیو آرلینز میں رہتا ہے۔ میں فوری طور پر اس سے ملنے روانہ ہورہا ہوں۔ آپ کو بڑی اسکرینوں اور پروجیکٹروں کی تنصیب کے ٹھیکے کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری ذرا بوب ہارلے سے ملاقات ہولینے دیں۔ اس کے بعد وہ شاید اپنے ایک ایک سنیما میں کئی کئی پروجیکٹر اور کئی کئی بڑی اسکرینیں لگوانے پر رضامند ہوجائے۔ عین ممکن ہے وہ اپنے سنیما ہالز کے باتھ رومز میں بھی اسکرین اور پروجیکٹر لگوالے۔ دراصل جب بوب ہارلے اپنے انکل جارج سے ملے گا تو وہ ان کا بے پناہ شکر گزار ہوگا۔ بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔ آپ کا خیر خواہ:

جارج رابرٹ

○☆○

رچرڈ ریڈ کی طرف سے مسٹر بوب ہارلے کے نام ارجنٹ ٹیلی گرام:

ڈیئر سر!

ہماری کمپنی فیڈرل پکچرز، ہالی ووڈ کا ایک بڑا اور قابلِ اعتماد ملازم جارج رابرٹ آپ سے ملنے کے لیے روانہ ہوا ہے۔ یوں تو وہ ایک معقول اور سمجھ دار آدمی ہے لیکن ان دنوں کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے لیکن نہیں۔ شاید میں کچھ غلط لکھ گیا۔ ہماری کمپنی میں ایسا کوئی آدمی ملنا تو مشکل ہے جس نے کبھی زیادہ کام نہ کیا ہو۔ بہرحال آپ یہ سمجھ لیں کہ کسی وجہ سے اس کی ذہنی حالت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ جب آپ سے ملے تو کچھ الٹی سیدھی باتیں کرے۔ آپ اس کی باتوں پر بالکل توجہ نہ دیں۔ ویسے وہ کوئی خطرناک پاگل نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم اس سے نرمی سے پیش آئیں۔ عام احتیاطی تدبیر کے طور پر بہتر ہوگا کہ جونہی وہ آپ کے پاس پہنچے، چار پانچ لمبے تڑنگے آدمیوں کو حکم دیں کہ وہ اسے یوں زمین سے چپکادیں جیسے استری کے لیے پاجامے کو پھیلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ فون کرکے مجھے اطلاع دیں۔ مخلص:

رچرڈ ریڈ

○☆○

بوب ہارلے کی جانب سے رچرڈ ریڈ کے نام جوابی ارجنٹ ٹیلی گرام:

ڈیئر مسٹر رچرڈ ریڈ!

جارج رابرٹ کے بارے میں یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی یا پھر آپ کو کوئی غلط اطلاع ملی ہوگی۔ جارج آج صبح یہاں پہنچ گیا لیکن مجھے چار پانچ لمبے تڑنگے آدمیوں سے اسے فرش پر چت کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہماری ملاقات نہایت خوش گوار ماحول میں ہوئی اور اس بات چیت کے نتیجے میں، میں محسوس کررہا ہوں کہ ہم نے جو نئے سنیما خریدے ہیں، صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے دو سو پرانے سنیماؤں کے لیے بھی آپ سے بڑی اسکرینیں اور مشینری خریدنے کا آرڈر دے دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں جلد ہی لیو بیلے کو اس سلسلے میں باضابطہ طور پر خط لکھ دوں گا۔ خط میں صرف آپ کو اطمینان دلانے اور تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ:

بوب ہارلے

○☆○

جارج رابرٹ کی طرف سے رچرڈ ریڈ کے نام ٹیلی گرام:

ڈیئر مسٹر رچرڈ ریڈ!



آخر آپ کو بوب ہارلے کے نام وہ احمقانہ ٹیلی گرام بھیجنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ شاید اسی قسم کی حرکات کو دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا کہا جاتا ہے یا پھر شاید آپ خطرہ محسوس کررہے تھے کہ میں یہاں آکر اور بوب ہارلے سے مل کر نہ جانے کس حد تک کام خراب کردوں گا۔ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ بوب ہارلے نے تو آپ کا وہ ٹیلی گرام بھی مجھے دکھایا جو آپ نے اسے میرے بارے میں بھیجا تھا لیکن خیر کوئی بات نہیں میں نے اس پر آپ کو معاف کردیا ہے اور بوب ہارلے کو بھی تسلی دے دی ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ عمر کا تقاضا ہے۔ زیادہ بڑھاپے میں اکثر لوگ سنکی اور خبطی ہوجاتے ہیں۔ الٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہیں اور دوسروں کی ذہنی حالت پر شک کرتے ہیں۔ انہیں علم ہی نہیں ہوتا کہ دراصل ان کی اپنی ذہنی حالت مشکوک ہے اور پھر آپ تو اس لیے اور بھی زیادہ قابلِ رحم ہیں کہ آپ کو بہت سی بیماریاں لاحق ہیں۔ یہ سب کچھ سن کر بوب ہارلے آپ کی طرف سے نہ صرف مطمئن ہوگیا بلکہ اس نے چند سیکنڈ آپ کے بارے میں اظہارِ ہمدردی بھی کیا۔ یہاں یعنی لوئیسیانا اور اوکلاہاما، دونوں ریاستوں میں حالات بالکل ٹھیک ہیں اور ہمارے حق میں ہیں۔ مزید تفصیلات میں اگلے خط میں لکھ رہا ہوں جو ہوائی ڈاک سے روانہ کروں گا۔ آپ کا:

جارج رابرٹ

○☆○

جارج رابرٹ کی طرف سے رچرڈ ریڈ کے نام خط:

ڈیئر رچرڈ ریڈ!

میں واپس ٹلسا، اوکلاہاما پہنچ چکا ہوں اور ہوٹل سے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں جو ہوائی ڈاک سے روانہ کروں گا۔ کل ہی میری بوب ہارلے سے تفصیلی ملاقات ہوئی جو بے حد دلچسپ اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ میں ایک خاص وجہ کے تحت فوری طور پر اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوا تھا۔

اصل میں جونہی آپ نے اپنے ٹیلی گرام میں بوب ہارلے کا ذکر کیا، میرے کمپیوٹر نما ذہن کا گویا کوئی بٹن دب گیا۔ مجھے فوراً یاد آگیا اور اب یقیناً آپ کو بھی یاد آجائے گا کہ بیس سال قبل خود بوب ہارلے نے بھی اپنے وقت کی مشہور فلم اسٹار میگی مورگن سے شادی کی تھی۔ فلیم ڈان سے پہلے فلمی دنیا پر اس کی حکمرانی تھی۔ بوب اور میگی کی شادی بھی کامیاب رہی تھی۔ وہ اب بھی شہد کی ان دو مکھیوں کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں جنہیں پھولوں کی

## پیش بین

بحری جہاز طوفان میں گھر کر ڈوب گیا۔ رشید اور حامد ایک تختے پر تیرتے ہوئے ایک ویران جزیرے پر جا پہنچے۔ ایک ہفتے وہ وہاں بھوکے پیاسے رہے۔ خوش قسمتی سے ایک دن رشید ایک چڑیا شکار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے اپنے چاقو سے چڑیا کو عین درمیان سے کاٹ کر دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا حامد کو دے دیا۔

حامد نے نظروں ہی نظروں میں گویا دونوں ٹکڑوں کو تولا اور بولا "میرا ٹکڑا وزن میں دو رتی زیادہ لگ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں .... تم کھالو۔" رشید نے فراخ دلی سے کہا۔

"کیوں کھالوں؟" حامد غصے سے چلایا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم مجھے کیوں کھلا کھلا کر موٹا کرنا چاہتے ہو۔"

○☆○

دکان میں آزادانہ طور پر آنے جانے کے مواقع حاصل ہوں۔

ان کے تین پیارے سے بچے بھی ہیں جو اَب خاصے بڑے ہوچکے ہیں۔ جب مجھے بوب ہارلے کی یاد آئی تو یہ خیال بھی آیا کہ فلیم ڈان نے ہمارے لیے جو بحران کھڑا کیا ہے اس کے بارے میں مشورے کے لیے وہ موزوں ترین آدمی ہے اور میرا یہ خیال ٹھیک ہی نکلا۔ بوب ہارلے بہت ہی ذہین اور سمجھ دار آدمی ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس نے مجھے کس طرح صورتِ حال سے نمٹنے کا مشورہ دیا؟ بالکل اسی طرح جیسے میں پہلے ہی نوٹ کرتا رہا تھا۔

یعنی محفل میں سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہو لیکن موقع ملتے ہی اُس کو لرز میں زہر ڈال دو جس سے سب پانی

لے لے کر پی رہے ہوں۔ ظاہر یہی کرو کہ آپ سے بڑھ کر سب کا ہمدرد کوئی نہیں لیکن آنکھ بچا کر سب کے راستے میں کانٹے بکھیرتے جاؤ۔ بوب نے بتایا کہ اس کی اپنی شادی کی کامیابی کا راز یہی ہے۔

اس کی طویل شادی شدہ زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئے جب میگی نے فلمی دنیا، تھیٹر کی دنیا یا کسی نہ کسی اور دنیا کی طرف واپس جانا چاہا۔ کوئی نہ کوئی شخص ہر تھوڑے عرصے بعد اس کے دماغ میں یہ خیال ڈال دیتا تھا کہ اس کے جانے سے فلاں جگہ بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے اور اسے واپس آکر اس خلا کو ضرور پر کرنا چاہیے۔

بوب بارلے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے کبھی میگی کو ایسے کسی کام سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ اس سے یہی کہتا تھا کہ اگر وہ شوبزنس میں دوبارہ قسمت آزمائی کرنا چاہتی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں وہ اچھی طرح اپنا شوق پورا کرلے۔ شوہر اور بچے صبر و سکون سے اس کی واپسی کا انتظار کرلیں گے۔

صرف یہی نہیں، بوب بارلے تو انتظامات میں مدد دینے کے لیے اپنے خصوصی سیکریٹری کو بھی اس کے ساتھ کردیتا تھا۔ وہ خصوصی سیکریٹری کچھ اس خوب صورتی سے "انتظامات میں مدد" دیتا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں میگی اپنے منصوبے سے عاجز آجاتی تھی اور اس پر لعنت بھیج کر واپس آجاتی تھی۔ بوب اور بچے اس کی واپسی پر بھی خوشی کا اظہار کرتے تھے اور اسے خوش آمدید کہتے تھے۔ خصوصی سیکریٹری کو اگلی تنخواہ کے ساتھ خصوصی بونس مل جاتا تھا اور میگی اگلے سال دو سال کے لیے اپنی گھریلو دنیا میں چین سے بیٹھ جاتی تھی۔

بوب کا کہنا ہے کہ اس کا یہ فارمولا اب تک کامیاب چلا آرہا ہے۔ اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر آپ کی بیوی بھی بے پناہ مشہور رہ چکی ہو تو گھریلو زندگی میں اسے خوش رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ جب وہ اپنے پرانے ٹھکانے کی طرف واپس جانے کی کوشش کرے تو اس کی رسی کو مناسب حد تک ڈھیل دو لیکن موقع محل دیکھ کر صحیح وقت پر اس کی رسی کو کھینچ لو کہ چڑیا گھونسلے سے زیادہ دور تک اڑنے نہ پائے اور اسے یہ احساس بھی نہ ہو کہ درحقیقت اس کے پاؤں میں کوئی رسی بندھی ہوئی ہے۔

بوب بارلے نے گرگی یہ بات اپنے چھوٹے بھائی ٹام کو بھی بتادی تھی اور وہ اس نسخے پر پہلی بار عمل کررہا تھا۔ اسی لیے فلیم کی ٹی وی پروڈکشن کے سلسلے میں اس کا رویہ اتنا اچھا نظر آرہا تھا اور وہ ان تیاریوں کے دوران میں باچھیں کھلاتا نظر آرہا تھا لیکن درحقیقت اسی نے خفیہ طور پر ڈائریکٹر ویلس وارڈ کو غالباً رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ اس کے بچوں کو ڈرامے سے کٹ کرادے اور ان کی جگہ پیشہ ور اداکار بچوں کو بلوالے۔ یہ فلیم کے لیے پہلا زوردار جھٹکا ہوگا۔

اس کے علاوہ میں تو کیمروں اور لائٹوں وغیرہ کی بجلی کی سپلائی کاٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا، یہاں واپس آکر پتا چلا کہ ٹام تو اس کے لیے جگہ بھی منتخب کیے بیٹھا ہے کہ لائن کہاں سے کاٹنا مناسب ہوگا جہاں نقص کا پتا چلانا بھی بہت مشکل ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ میرے خیالات بڑے لوگوں کے خیالات سے کتنے ملتے ہیں۔ ٹام سے میری کھل کر بات ہو چکی ہے اور تمام معاملات ہماری منشا کے مطابق جارہے ہیں۔

پیشہ ور اداکار بچے آج دوپہر کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔ ان کے پہنچتے ہی فلیم کے حقیقی بچوں نے انہیں دبوچ لیا اور مار مار کر ادھ مرا کردیا۔ ٹیکنیکل اسٹاف کا ہر آدمی دوسرے آدمی کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ دو کیمرے خراب ہو چکے ہیں اور لگتا ہے کہ ان کی مرمت بھی ممکن نہیں ہوگی۔ بجلی کی سپلائی لائن میں گڑبڑ ہو چکی ہے جس کی وجہ سے ایک باڑ میں آگ بھی لگ چکی ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہے کہ فلیم شوٹنگ کی لوکیشن پر آئی تھی۔ وہ اس قدر غصے میں تھی کہ اس نے لات مار کر ایک قیمتی کرسی توڑ دی اور اعلان کردیا کہ وہ اس سیریز میں کام نہیں کرے گی۔ اس نے پروڈکشن کا ارادہ ہی ملتوی کردیا ہے۔

چنانچہ آپ امید رکھیں کہ آپ کے ہنرمندوں کی ٹیم جلد ہی کسی ویگن میں بھر کر آپ کے پاس واپس پہنچ جائے گی کیونکہ سب ہی کے بارے میں باتیں گردش کررہی ہیں کہ فلاں نے فلاں کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے فلاں نے فلاں کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے۔ چنانچہ کوئی کسی کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میرے یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ یہ باتیں کس نے پھیلائی ہوں گی۔ بس ایک اچھی بات یہ ہے کہ سب کو دو دو چار چار مہینے کے گزارے کے قابل پیسے مل گئے ہیں۔ میں ابھی چند دن اور اس علاقے میں رہوں گا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیے گا۔ آپ کا اپنا:

جارج رابرٹ

(انگریزی سے ترجمہ)

جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے کی عملی تفسیر پیش کرتا انوکھا ماجرا

ڈاکٹر ساجد امجد

# گونگا گواہ

**ایک پیشہ ور گواہ کی داستانِ حیات، وہ زندگی بھر اپنا جھوٹ، سچ کہہ کر فروخت کرتا رہا۔ اس کی دی ہوئی شہادت نظامِ عدل و انصاف کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتی رہی اور ایک دن یہی عمارت اس پر آن گری۔**

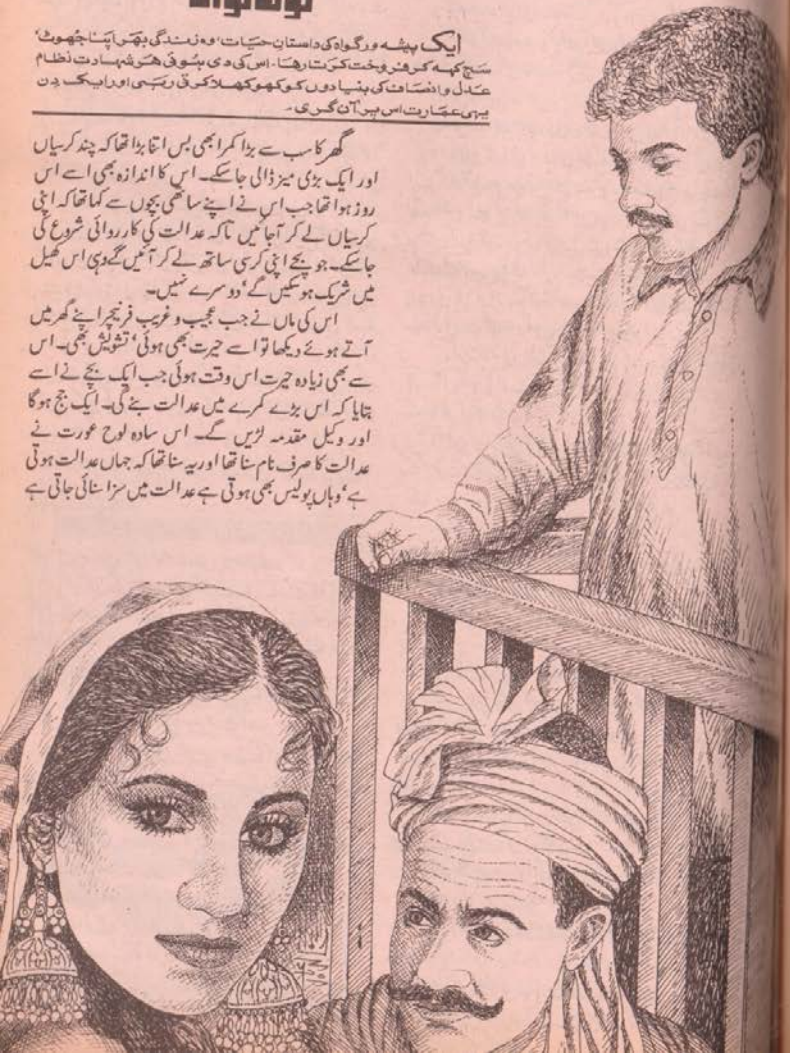

گھر کا سب سے بڑا کمرا ابھی بس اتنا بڑا تھا کہ چند کرسیاں اور ایک بڑی میز ڈالی جاسکے۔ اس کا اندازہ بھی اسے اس روز ہوا تھا جب اس نے اپنے ساتھی بچوں سے کہا تھا کہ اپنی کرسیاں لے کر آجائیں تاکہ عدالت کی کارروائی شروع کی جاسکے۔ جو بچے اپنی کرسی ساتھ لے کر آئیں گے وہی اس کھیل میں شریک ہوسکیں گے، دوسرے نہیں۔

اس کی ماں نے جب عجیب و غریب فرنیچر اپنے گھر میں آتے ہوئے دیکھا تو اسے حیرت بھی ہوئی، تشویش بھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب ایک بچے نے اسے بتایا کہ اس بڑے کمرے میں عدالت بنے گی۔ ایک جج ہوگا اور وکیل مقدمہ لڑیں گے۔ اس سادہ لوح عورت نے عدالت کا صرف نام سنا تھا اور یہ سنا تھا کہ جہاں عدالت ہوتی ہے، وہاں پولیس بھی ہوتی ہے عدالت میں سزا سنائی جاتی ہے

اور پولیس پکڑ کر جیل پہنچا دیتی ہے۔ وہ یہ سوچ کر سر سے پاؤں تک کانپ گئی کہ جب عدالت سجے گی تو یہاں پولیس بھی ضرور آئے گی۔ اسے یاد آیا کہ جب بڑے چوہدری صاحب نے اپنی ایک بیوی کو کھڑے کھڑے گولی ماردی تھی تو بات عدالت تک پہنچ گئی تھی۔ چوہدری صاحب کو پولیس پکڑ کر بھی لے گئی تھی لیکن ان کے ہاتھ لمبے تھے اس لیے بچ کر آگئے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو بڑی لمبی سزا ہوتی۔

یہ ایک چھوٹا قصبہ تھا جس میں چوہدریوں کی عمل داری تھی۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ رعایا کے طور پر زندہ رہتے اور مرجاتے تھے۔ دنیا بہت آگے بڑھ چکی تھی لیکن اس قصبے میں تعلیم کا عام چلن نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی معلومات چوہدری کی حویلی تک محدود تھیں۔ عورتیں تو یوں بھی گھر میں بیٹھنے والی ہوتی ہیں' انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس قصبے سے باہر بھی کوئی دنیا آباد ہے۔ عفت بانو تو ویسے بھی اپنی فطرت میں ایسی سیدھی سادی تھی کہ اللہ میاں کی گائے کہلاتی تھی۔ وہ بھلا ان عدالتوں کو کیا جانے اور کیا سمجھے۔ وہ بڑی بے چینی سے اپنے شوہر کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ بھی دیکھ لے کہ اس کے گھر میں کیسی عدالت سج رہی ہے۔

○☆○

"بھئی منشی سراج! تمہارا بیٹا اب کتنا بڑا ہوگیا؟" چوہدری نے پوچھا۔

"حضور' ابھی کیا عمر ہے اس کی۔ پورے دس سال کا بھی نہیں ہوا۔ چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔"

"کیا کرو گے تعلیم دلا کر۔" چوہدری نے حقے کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ "پڑھ لکھ لے گیا تو تمہارے ہاتھوں سے چلا جائے گا۔ میری حویلی کے دروازے اس پر کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں لاکر کسی کام پر لگادو۔"

"میں نے خود یہی سوچا ہے لیکن وہ اتنا تو پڑھ لکھ لے جتنا میں نے پڑھا ہے۔" منشی سراج نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی لیکن یہ سوچ لینا کہ میں اسے قصبے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے لیکن اب بھی حکمرانی میری ہی ہے۔"

"حضور' میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میری اولاد آپ ہی کی خدمت کرے گی۔"

"مجھے تم سے یہی امید ہے۔" چوہدری نے کہا۔

"آپ کو یہی امید ہونی چاہیے۔"

"اچھا یہ باتیں تو ہو چکیں۔ یہ بتاؤ' کریم کی بیوہ والے معاملے کا کیا ہوا۔"

"وہی ہوا جو آپ نے چاہا تھا۔ کاغذات کے مطابق کریم نے آپ سے قرض لیا تھا اور اس کے عوض اپنی تمام زمین آپ کے نام کرکے مرگیا۔"

"سب کام ہوشیاری سے ہوا ہے نا؟"

"بہت ہوشیاری سے۔"

"کاغذات اسے پہنچادو تاکہ وہ عدالت میں جائے اور عدالت کا فیصلہ بھی ہمارے حق میں ہوجائے۔"

"جی بہتر۔"

اس کے بعد چوہدری نذر محمد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ منشی سراج اب آزاد تھا۔ چاہے تو بیٹھا رہے' چاہے تو گھر چلا جائے۔ گھر جاکر ابھی سے کیا کرنا تھا لیکن چوہدری کی باتوں نے اسے پریشان کردیا تھا۔ وہ خود تو حویلی میں پلنے والے گناہوں میں گلے گلے ڈوب چکا تھا لیکن اپنے بیٹے کو بچانا چاہتا تھا جب کہ چوہدری کا اصرار کچھ اور تھا۔ وہ ان الجھنوں سے بچنے کے لیے حویلی سے نکلا اور گھر کی طرف چل دیا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کے گھر کے ایک کمرے میں عدالت کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ تمام بچے اپنی اپنی کرسیوں کے ساتھ آچکے تھے۔

"میں تمہارا ہی انتظار کررہی تھی۔ ذرا اپنے لاڈلے کے کرتوت دیکھو۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی نے کہا۔

"کیا کردیا اس نے؟"

"گھر میں عدالت لگا کر بیٹھا ہے۔ عدالت لگی ہے تو اب تھوڑی دیر میں پولیس بھی ضرور آئے گی۔"

"کیا بکواس کررہی ہو۔ یہاں کیوں آنے لگی تھی پولیس۔"

"ذرا کمرے میں جاکر دیکھو کیا ہورہا ہے۔"

منشی سراج ابھی تک کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا لیکن پولیس کے نام سے وہ بھی ڈر گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف اس کی بیوی نے اشارہ کیا تھا۔

"نادر' یہ تمہارا گھر ہے اس لیے تم جج بنو گے۔" ایک بچہ اس کے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے جج بننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" نادر نے کہا۔

"تو پھر وکیل بن جاؤ۔"

"میں تو گواہ بنوں گا۔" نادر نے کہا اور سارے بچے ہنسنے لگے۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ عدالت میں سب سے اہم آدمی جج نہیں گواہ ہوتا ہے۔ بیناجی' اگر گواہ اپنی گواہی نہ



دے تو جج بھی کچھ نہیں کرسکتا۔"

منشی سراج کمرے سے باہر کھڑا ہوا' بچوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن رہا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ اس کا بیٹا ابھی سے کتنی عقل مندی کی باتیں کرتا ہے۔

یہ تو اسے معلوم ہی ہوگیا تھا کہ یہ کوئی اصلی عدالت نہیں بلکہ بچوں کا کھیل ہے۔ یہ فکر بھی دور ہوگئی تھی کہ یہاں پولیس آئے گی۔ وہ اپنی موجودگی ظاہر کیے بغیر واپس آگیا۔

"ایک تو میں تمہاری بے وقوفی سے بہت تنگ ہوں۔" منشی سراج واپس آتے ہی اپنی بیوی پر برس پڑا۔ "بچوں کے معصوم کھیل کو تم ان کے کرتوت کہہ رہی ہو۔ حد ہوگئی۔"

"مجھے کیا معلوم۔ میں نے تو یہی سنا تھا کہ کمرے میں عدالت لگے گی۔"

"بے وقوف! بچے عدالت عدالت کھیل رہے ہیں جیسے تم گڑیوں کی فرضی شادیاں کیا کرتی تھیں۔"

"شادی کی بات اور ہے۔ یہ عدالت کا کون سا کھیل ہے۔"

"ہوتا ہے یہ بھی ایک کھیل۔" منشی سراج نے کہا۔ "تم حقہ تازہ کرکے لاؤ۔ بہت دیر سے حقہ نہیں پیا ہے۔"

جتنی دیر میں وہ حقہ بھر کے لاتی' منشی پھر بچوں کی باتیں سننے کے لیے کمرے کے دروازے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

"...اس رات مجھے گھر لوٹنے میں ذرا دیر ہوگئی تھی۔ میں نے جلدی گھر پہنچنے کے لیے پکی سڑک چھوڑ دی اور کچے راستے پر چل پڑا۔ رات ہوگئی تھی اس لیے اس طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسی وقت میں نے ایک چیخ سنی۔ ایک عورت کی چیخ۔ اس کے بعد ایک اور چیخ ابھری اور پھر خاموشی چھاگئی۔ میں اس طرف بھاگا جس طرف سے یہ آواز آئی تھی۔ میں ایک ٹارچ ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک عورت کی لاش کو میں نے زمین پر پڑے دیکھا۔ اس عورت کو اسی وقت کسی نے قتل کیا تھا۔ اسی وقت مجھے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ میں نے اس آواز کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا۔ بھاگنے والا بھاری بدن کا تھا اس لیے مجھ سے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ ایک جگہ اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ میں اسے فوراً پہچان گیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکا ہوگا کیونکہ میری طرف اندھیرا تھا۔

دوسرے دن پوری بستی میں شور مچ گیا کہ اصغری کو کسی نے قتل کردیا۔ اب بات میری سمجھ میں آئی کہ جو لاش میں نے دیکھی تھی وہ اصغری کی تھی۔ میں نے اس کے گھر والوں کو پوری بات بتادی۔ قاتل کا نام بھی بتادیا۔ میرے ہی کہنے پر اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا گیا۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہی وہ آدمی تھا جسے میں نے اس رات ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تھا۔"

منشی سراج نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کا بیٹا نادر گواہ بنا ہوا یہ فرضی تقریر کررہا تھا اور اب اس کا چچازاد بھائی ملزم بنا ہوا تھا۔ اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس کی بیوی اسے آوازیں دے رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے بیوی سے حقہ تازہ کرنے کو کہا تھا۔ وہ واپس آیا تو حقہ اس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ حقے کے کش لے رہا تھا لیکن اس کا ذہن نادر کی تقریر میں الجھا ہوا تھا۔ کتنے اعتماد سے تقریر کررہا تھا جیسے وہ کوئی منجھا ہوا وکیل ہو۔ وہ چوہدری کے ساتھ کئی مرتبہ عدالتوں میں گیا تھا اور اس نے وکیلوں کو بولتے ہوئے سنا تھا۔ وہ نادر کو وکیل بنائے گا۔ اس نے سوچا اور ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"کیا آپ ہی آپ ہنس رہے ہو۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"ہنس نہیں رہا ہوں بے وقوف! سوچ رہا ہوں۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں' ہم اپنے نادر کو وکیل بنائیں گے۔"

"پھر وہی عدالت۔"

"تو کیا جانے وکیل کیا ہوتا ہے؟ پولیس تک ڈرتی ہے

Email: kitabiat@usa.net

اس سے۔"

"تمہارا بیٹا ہے' جو جی چاہے بناؤ۔ میں کون ہوتی ہوں کچھ کہنے والی۔"

"بنا تو دوں میں اسے وکیل لیکن ایک مصیبت ہے۔ چوہدری نہیں چاہتا کہ اس قصبے کا کوئی بھی آدمی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔"

"اچھی زبردستی ہے۔ ہم اپنے بچے کو جو بھی بنانا چاہیں' اسے کیوں اعتراض ہوگا؟"

"اگر سب لوگ پڑھ لکھ گئے تو اس کی غلامی کون کرے گا۔ اس سے خوف کون کھائے گا۔ بس یہی ڈر ہے اسے۔"

"سنو!" اس کی بیوی نے اس کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاحب کچھ کہہ رہے تھے کیا۔"

"ارے واہ! تو تو بڑی عقل مند ہوگئی ہے تو نے کیسے اندازہ لگالیا ہے؟"

"آج سے پہلے تم نے ایسی کوئی بات بھی تو نہیں کی تھی۔"

"چوہدری صاحب آج نادر کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ اس کی تعلیم کا سن کر خوش نہیں ہوئے بلکہ الٹا مجھے سمجھانے لگے کہ پڑھ لکھ کر وہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اسے ابھی سے حویلی میں کسی کام پر لگادوں۔"

"کہہ تو وہ بھی ٹھیک ہی رہے ہیں۔ رمضانی چاچا نے کس طرح پیسے جوڑ جوڑ کر اپنے بیٹے کو باہر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ کیا نتیجہ ہوا؟ آج تک واپس نہیں آیا۔"

"نیک بخت! اول تو اپنا نادر ایسا ہے نہیں اور اگر پلٹ کر نہیں بھی آیا تو اپنی زندگی تو بنا ہی لے گا۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ چوہدری کے ہر جرم میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ وہ کریم کی بیوہ کی پوری جائیداد ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے اور میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں۔ نادر کو یہ تو نہیں کرنا پڑے گا۔"

"کیوں دیتے ہو اس کا ساتھ؟"

"پاگل ہوگئی ہے کیا۔ چوہدری کا ساتھ نہ دے کر مجھے مرنا ہے کیا۔"

"کیوں کسی بیوہ کی بددعا لیتے ہو۔"

"بددعا لینا ہی تو نہیں چاہتا۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ نادر اپنا مستقبل بنالے تو ہم بھی چپکے سے یہ قصبہ چھوڑ دیں۔"

"ابھی کہاں نادر کے ابا۔ ابھی تو اس کے بڑے ہونے میں بھی برسوں پڑے ہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ ہم بھی ابھی سے کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔"

بچوں کا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ اپنی اپنی کرسیاں اٹھا کر تمام بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ سب بچوں کو رخصت کرنے کے بعد نادر اپنے باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے خوب کھیل نکالا ہے۔" منشی سراج نے نادر سے کہا۔

"مجھے سب کھیلوں میں یہی کھیل اچھا لگتا ہے۔"

"اب تم ایسا کرو کہ خوب محنت کرو اور پڑھ لکھ کر وکیل بن جاؤ۔ پھر اصلی عدالت سجانا۔"

"نہیں ابا۔ میں وکیل نہیں بنوں گا۔ مجھے تو گواہ بننا اچھا لگتا ہے۔"

منشی سراج کو ہنسی آگئی "یہ ضروری تو نہیں کہ تم ہر واقعے کو اپنی آنکھ سے دیکھو اور گواہی دینے عدالت میں پہنچ جاؤ جب کہ وکیل ہر وقت عدالت میں ہوتا ہے اور اس کی عزت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے علم سے گواہ کی گواہی کو جھٹلا بھی دیتا ہے۔"

یہ بات نادر کی سمجھ میں آگئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ بڑا ہو کر وکیل بنے گا۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو ایک ہی خیال اس کے دماغ میں تھا کہ وہ بڑا ہو کر وکیل بنے گا۔

منشی سراج دوسرے دن حویلی پہنچا تو شہر سے دو وکیل آئے بیٹھے تھے۔ چوہدری نے اسے بتایا کہ یہ عدالت سے بے دخلی کے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ اب کریم کی بیوہ کا اپنی جائیداد اور زمین پر کوئی حق نہیں رہے گا۔"

"چوہدری صاحب' وہ مکان تو اس بیوہ کے پاس رہنے دیں جس میں وہ رہتی ہے۔" منشی سراج نے کہا۔

"وہ ہے اور اس کی بیٹی ہے۔ کہیں بھی رہ لیں گی۔ اسے بڑے گھر کا کیا کریں گی۔"

"وہ اپنی جوان لڑکی کو لے کر کہاں ماری ماری پھرے گی۔" منشی سراج نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"منشی! اپنی حیثیت میں رہ کر سفارش کیا کرو۔ یہ بھی بھولو کہ قرض کے کاغذات تم ہی نے تیار کیے تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ آپ کا دعویٰ بھی درست ہے۔ میں تو مہربانی کی بات کررہا تھا۔ اگر مہربانی ہوجاتی۔"

"مہربانی کی اس نے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ہم نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ہم سے کردے لیکن وہ تیار نہیں ہوئی۔"

چوہدری کی اس دلیل کے بعد مزید کچھ بولنا اس کے



اپنے حق میں بہتر نہیں تھا لہٰذا وہ چپ ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نوجوان لڑکی ہرگز چوہدری کے لائق نہیں لیکن وہ چوہدری کی مخالفت کیسے کرسکتا تھا۔

"تم ان وکیلوں کے ساتھ جاؤ اور کریم کی بیوہ کو یہ کاغذات پڑھ کر سنادو۔ وہ صرف پندرہ دن اپنے گھر میں رہ سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

منشی سراج کو بادل ناخواستہ ان وکیلوں کے ساتھ جانا پڑا۔

"خیر النسا کی ماں! میں نے چوہدری کو بہت سمجھایا لیکن تمہارے شوہر نے اس سے قرض لیا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ تمہاری جائیداد لینا چاہتا ہے۔ عدالت سے اس نے اجازت بھی لے لی ہے لہٰذا اب تم یہ مکان خالی کردو۔"

"منشی سراج! یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کریم نے کوئی قرض نہیں لیا تھا۔ پھر بھی تم ناحق اس کا ساتھ دے رہے ہو۔"

"اس نے واقعی قرض لیا تھا۔ دستاویز موجود ہے۔"

"سب جعلی ہے۔ اس کے بنانے والے تم ہو۔ خدا کے لیے مجھ بیوہ پر رحم کھاؤ۔ جب مرجاؤ گے تو یہ چوہدری تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔ چند روپوں کے لیے تم میری بددعائیں مت لو۔ کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے تو عدالت میں چلی جاؤ۔"

"میں بیوہ عورت کہاں عدالتوں کے چکر کاٹتی پھروں گی۔"

"تو پھر چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ مجھے کیوں جھوٹا بناتی ہو۔"

منشی سراج نے چوہدری کا پیغام اسے پہنچادیا اور اس کے آنسوؤں میں سے راستہ بناتا ہوا واپس آگیا۔

رات ہوئی تو وہ بیوہ اور اس کی بیٹی منشی سراج کے گھر آئیں۔ مقصد یہی تھا کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔ منشی کے لیے یہ نہایت کڑا امتحان تھا۔ اگر وہ یہ کہتا کہ کاغذات جعلی ہیں تو جھوٹا بھی قرار پاتا اور چوہدری کا عتاب بھی نازل ہوتا۔ وہ عورت کمزور تھی اس لیے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ منشی سراج بہت سوچ سمجھ کر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ وہ عورت روتی پیٹتی واپس چلی گئی۔

"میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔" منشی سراج کی بیوی نے کہا "جب تم سچ بولتے ہو تو تمہارا چہرہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس وقت تمہارے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اس عورت کے بارے میں تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی' ڈرتا ہوں اس سے؟"

"اس سے نہیں ڈرتے لیکن چوہدری سے تو ڈرتے ہو۔ اس کی وجہ سے جھوٹ بول رہے ہوگے۔"

"ہزار مرتبہ کہا ہے' تو میرے معاملے میں مت بولو یا سچ کہوں' مرضی میری۔ تو کون ہوتی سمجھانے والی۔"

"یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے نادر کے ابا۔ اگر اس کی بددعا لگ گئی تو ہم سب ہی تباہ و برباد ہوں گے نہیں۔"

"ابھی تک کسی کی بددعا لگی نہیں۔ یہ بڑی دینے والی۔" منشی سراج نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسا مت کہو نادر کے ابا۔ کیا خبر کس وقت ہائے لگ جائے۔ اللہ سے اس کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔" منشی سراج' بیوی کے سامنے بھی یہ اقرار نہیں کرتا تھا کہ کاغذات جعلی ہیں۔ وہ اس عورت کی آہ و زاری سے ضرور متاثر ہوا تھا لیکن بیوی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ عورت شور مچاتی رہی لیکن چوہدری اور اس کے آگے اس کی ایک نہیں چلی اور اسے اپنے گھر سے ہاتھ دھونا پڑا۔

چوہدری کے منہ کو تو خون لگ چکا تھا۔ اب وہ مظلوم اس کا مشغلہ بن گئے تھے اور منشی اس کے ہر ظلم میں شریک اور دست راست بنا ہوا تھا۔ اس کے ضمیر نے پہلے پہلے بہت سمجھایا تھا لیکن اب تو وہ اس کا عادی ہوچکا تھا۔ چوہدری کا منہ چڑھا تھا اس لیے سب لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ چوہدری کی طرف سے انعام و اکرام بھی ملتے تھے۔ یہ جھوٹی شان اور دولت کا لالچ اسے آمادہ کرتا تھا کہ وہ چوہدری کا ساتھ دیتا رہے حالانکہ اس کی بیوی ڈراتی رہتی تھی کہ کہیں کسی مظلوم کی آہ نہ لگ جائے۔ آہستہ آہستہ اس نے بھی صبر کرلیا تھا اور منشی سراج کہنا چھوڑ دیا تھا۔

وقت گزرتا جارہا تھا۔ چوہدری کے مظالم جاری تھے۔ منشی سراج ان مظالم میں برابر کا شریک تھا۔

نادر اب آٹھویں کلاس میں آگیا تھا۔ منشی سراج کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ اسے شہر کس طرح بھیجے۔ وہ صرف ہائی اسکول تک کی تعلیم ہوسکتی تھی۔ میٹرک کرنے کے بعد اسے بہرحال قصبے سے باہر جانا تھا۔ اسے چوہدری

کا علم تھا لیکن اس نے چوہدری کو اتنا خوش کر دیا تھا کہ یہ امید بھی تھی کہ چوہدری اس کی بات ٹالے گا نہیں۔ اب صرف اس وقت کا انتظار تھا جب نادر میٹرک کر لے۔

انسان سوچتا کچھ ہے لیکن ہوتا کچھ ہے۔ چوہدری کے ساتھ ناؤنوش میں شریک ہونے کے بعد منشی سراج رات گئے گھر پہنچا تھا۔ شراب کا نشہ ابھی تک اس کے بدن میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ اس عالم میں وہ ہزار مرتبہ گھر پہنچا تھا لیکن آج عالم ہی دوسرا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہوا میں چلنے کی مشق کر رہا ہو۔ اس کی بیوی نے بڑی مشکل سے اسے بستر تک پہنچایا اور دیوار کو سمجھانے بیٹھ گئی۔

"چوہدری کی صحبت نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ کیوں اپنی صحت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔ تمہیں نہ ہمارا خیال ہے نہ نادر کی آوارگی کا۔ تمہیں معلوم ہے وہ ابھی سے سگریٹ پینے لگا ہے۔ اسکول سے اس کی روز شکایتیں آتی ہیں۔ تم یا تو گھر میں نہیں ہوتے یا ہوش میں نہیں ہوتے۔ کہوں تو کس سے کہوں۔"

دیواریں جواب نہیں دیتیں۔ منشی سراج کے پاس بھی اس کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔ اسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور کون اس سے باتیں کر رہا ہے۔

اس کی بیوی جب خود ہی بولتے بولتے تھک گئی تو اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

صبح ہوئی تو وہ نادر کو اسکول بھیجنے کے بعد گھر کے کام دھندوں میں لگ گئی پھر اسے اچانک منشی سراج کا خیال آیا۔ بے چارہ بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے۔ اسے اٹھا کر کچھ کھلا پلا تو دوں۔ یہ سوچ کر وہ اس کے بستر کی طرف گئی۔ وہ اسی طرح بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ زندگی کے آثار بس اتنے تھے کہ سانس چل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی پھر گھبرا کر باہر کی طرف بھاگی۔ گھر کے قریب ہی ایک ڈاکٹر بیٹھتا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گئی اور ڈاکٹر کو بلا کر لے آئی۔

"ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ فوراً شہر کے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ دیر ہو گئی تو ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں اکیلی عورت انہیں کیسے لے کر جاؤں۔ میں نے تو کبھی شہر دیکھا بھی نہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"آپ کے میاں تو چوہدری صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ ان سے جا کر کہیں۔ ان کے پاس سواری بھی ہے، آدمی بھی ہیں اور تعلقات بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کا بہت اچھا علاج ہو جائے گا۔"

بات معقول تھی۔ منشی سراج کی بیوی کی سمجھ میں فوراً آ گئی۔ اس نے اسی وقت نادر کو اسکول سے لیا اور چوہدری کی حویلی پہنچ گئی۔ حویلی میں ابھی لوگ سو کر بھی نہیں اٹھے تھے۔ اس نے بہت شور مچایا۔ منشی سراج کی خطرناک حالت کا رونا رویا لیکن چوہدری کے کارندوں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"چوہدری صاحب سو کر اٹھیں گے تو منشی کو ضرور شہر لے جائیں گے لیکن ابھی تو وہ سو رہے ہیں۔"

"ایک دن نہیں سوئیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ منشی نے ان کے ہزاروں کام کیے ہیں، وہ اس کا ایک کام نہیں کر سکتے۔"

"منشی نے اگر کام کیے ہیں تو تنخواہ بھی لی ہے۔"

"مالک کا یہ کام بھی ہے کہ اپنے نوکروں کی مدد کرے۔"

"چوہدری صاحب مدد سے انکار نہیں کریں گے لیکن انہیں اٹھائے کون۔"

"میں اٹھاتی ہوں۔ تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گی۔"

آخر ایک بوڑھے ملازم سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی۔

"بیٹی، تم انتظار کرو۔ چوہدری کو میں اطلاع کرتا ہوں۔"

وہ اور نادر ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ پر اسے خود غرضی کی تحریریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس حویلی کے لیے منشی سراج نے کیا نہیں کیا تھا لیکن آج چوہدری کے آرام کا خیال سب کو ہے، منشی کی کسی کو پرواہ بھی نہیں۔ ان خیالوں میں گم ہوئے اسے کافی دیر گزر گئی ہے اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب نادر بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔

"اماں، ہم کب تک انتظار کریں گے۔ آؤ چلو، ہم خود ہی کچھ انتظام کرتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا چل۔ تیرے باپ نے یہاں بیکار اپنی جوانی غارت کی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ وہ بوڑھا ملازم واپس آ گیا۔

"چوہدری صاحب سو کر اٹھ گئے ہیں۔ تیار ہو رہے ہیں۔ بس ابھی آتے ہیں۔"

اس نے بھی سوچا، جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں کچھ دیر اور سہی۔ چوہدری آ جائے گا تو منشی کا علاج اچھی طرح ہو سکے گا۔ وہ پھر بیٹھ گئی۔

چوہدری کی تیاری نے اسے تھکا دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ چوہدری کے آنے کا شور مچ گیا۔ وہ کبھی چوہدری کے سامنے نہیں آئی تھی لیکن آج کی بات اور تھی۔ اس کا شوہر مُردوں کی طرح گھر میں پڑا ہوا تھا پھر اسے اپنا ہوش کیسے رہتا۔ وہ چادر سنبھالنا بھی بھول گئی۔

"کیا ہوا ہمارے منشی کو؟" چوہدری نے آتے ہی پوچھا۔

"ان بے وقوفوں نے مجھے اٹھایا ہی نہیں ورنہ میں اسی وقت اٹھ جاتا۔ آخر وہ ہمارا آدمی ہے۔"

منشی کی بیوی کو چوہدری کا یہ انداز اچھا معلوم ہوا۔ وہ کتنا ہمدرد ہے۔ اس کے گھر کی خراب ہیں۔ جلتے ہوں گے منشی سے۔

چوہدری نے اپنے دو ملازموں کو ساتھ لیا اور چوہدری کے گھر پہنچ گیا۔

منشی سراج اب بھی اسی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی بیوی کو اب امید ہو گئی تھی کہ چوہدری آگیا ہے' اب منشی کا علاج ہو جائے گا۔ چوہدری کے ملازموں نے منشی سراج کو اٹھا کر جیپ میں لٹا دیا۔

"تم گھر میں بیٹھو' اب یہ ہماری ذمے داری ہے۔ منشی کو ہم خود ہی شہر لے جائیں گے۔" چوہدری نے منشی کی بیوی سے کہا۔

اس نے بھی سوچا کہ وہ جا کر کیا کرے گی البتہ نادر کو اس نے بھیج دیا۔

دوپہر گزر کر شام آگئی اور پھر رات ہو گئی۔ کوئی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ چوہدری ساتھ ہے' وہ سب سنبھال لے گا۔

رات نے آہستہ آہستہ گزرنا شروع کر دیا تھا۔ محلے کی کچھ عورتیں شام تک اس کے ساتھ تھیں' اب وہ بھی اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ وہ گھر میں اکیلی بھی تھی پریشان بھی۔ اسے پہلی مرتبہ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ محلے کے لوگ انہیں اچھا نہیں سمجھتے۔ یہاں کسی پر ذرا سی مصیبت پڑ جائے تو سب مدد کو پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کی مدد کو کوئی نہیں آیا تھا۔ جو دو چار عورتیں آگئی تھیں ان کا انداز بھی بس رسمی سا تھا۔ رشتے داروں نے تو پہلے ہی ناتا توڑ لیا تھا۔ یہ سب چوہدری کی وجہ سے ہوا تھا۔ چوہدری سے لوگ خوش نہیں تھے اور منشی' چوہدری کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔

منشی ٹھیک ہو کر آجائے پھر میں اس سے کہوں گی اب چوہدری کا ساتھ چھوڑ دے۔ وہ تو بڑا آدمی ہے اپنے کام نکال لیتا ہے لیکن ہمیں تو قدم قدم پر لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

وہ بڑی بے چینی سے کسی خبر کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی لیٹ جاتی تھی کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ گئی۔ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اے اللہ! میرے شوہر کی حفاظت کرنا۔ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور وضو کر کے نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دروازے کے سامنے کئی گاڑیاں ایک ساتھ آکر رکی ہوں پھر کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز بھی آئی۔ اب اس میں کیا شک تھا کہ منشی سراج اسپتال سے واپس آگیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا۔ چوہدری کی جیپ اور اس کے پیچھے اسپتال کی ایمبولینس کھڑی تھی۔ محلے کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ نادر کو سہارا دیے ہوئے تھے جو بُری طرح رو رہا تھا۔ یہ رو کیوں رو رہا ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی کچھ بتاتا' اسے سب معلوم ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گھر عورتوں سے بھر گیا۔ منشی کی لاش سفید کفن میں لپٹی صحن میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اتنی روئی تھی کہ ڈاکٹر نے انجکشن دے کر اسے سلا دیا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ ہوش میں آئی۔ یہی وہ وقت تھا کہ لوگ منشی کی میت کو قبرستان لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

وہ نادر کو گلے لگا کر خوب روئی اور پھر ہمیشہ کے لیے تنہا ہو گئی۔ منشی سراج نے یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

○☆○

منشی سراج جب زندہ تھا' اپنی ہر بے راہ روی کے باوجود نادر کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسے میٹرک کے بعد شہر بھیج دے گا اور وکیل بنائے گا۔ اسے شک تھا کہ چوہدری مخالفت کرے گا لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ مخالفت کے باوجود اسے قصبے سے باہر بھیجے گا۔ نادر اب میٹرک میں آیا تھا تو ارادہ کرنے والا ہی رخصت ہو گیا۔

منشی سراج کی بیوی جب شوہر کی موت کے صدمے سے باہر آئی تو اسے نادر کا خیال آیا۔ نادر کا باپ اسے وکیل بنانا چاہتا تھا۔ وہ اس کی آرزو ضرور پوری کرے گی۔ اس کا باپ اتنی دولت چھوڑ کر ضرور مرا ہے کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔

باپ کے مرنے کے بعد نادر کو بھی یہ احساس شدت سے ہوا تھا کہ اپنی ماں کا اب وہی سہارا ہے۔ اس لیے اب وہ بھی دل سے چاہتا تھا کہ جلد از جلد کم از کم میٹرک کر لے۔



اس کی ماں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد وہ چپکے سے شہر چلے جائیں گے۔

ابھی میٹرک کی منزل دور تھی کہ چوہدری کے پیغام آنے لگے۔ وہ نادر کو اپنے پاس ملازم رکھنا چاہتا تھا اور پھر ایک دن وہ خود چل کر آگیا۔

"میں نے سراج مرحوم سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں نادر کو قصبے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ آپ سے بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ منشی کی روح کو تسلی اسی وقت ہو گی جب نادر میری حویلی پر پہنچ جائے گا۔"

"چوہدری صاحب' ابھی اس کی عمر نوکری کی کہاں ہے۔" نادر کی ماں نے کہا۔

"منشی جب میرے پاس آیا تھا تو صرف آٹھویں پڑھے ہوئے تھا۔ نادر تو پھر دسویں میں آگیا ہے اور پھر یتیم بچوں کو تو محنت مزدوری تک کرنی پڑی ہے۔ میں تو پھر اسے عزت کی نوکری دوں گا۔"

"چوہدری صاحب' وہ یتیم ضرور ہے لیکن میں تو زندہ ہوں۔ اسے مزدوری کی کیا ضرورت ہے۔"

"نادر کی ماں' یہ سوچ لینا کہ منشی جو کچھ تمہارے پاس چھوڑ گیا ہے' وہ میرا ہی دیا ہوا ہے۔"

چوہدری کھلے لفظوں میں دھمکی دے رہا تھا۔ نادر کی ماں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"چوہدری صاحب' میری خواہش ہے کہ وہ میٹرک کر لے۔ اس کے بعد اسے آپ ہی کے پاس نوکری کرنی ہے اور کہاں جانا ہے۔"

"چلو' ٹھیک ہے۔ کچھ دن اور انتظار کر لیتے ہیں۔" چوہدری نے کہا اور بات ختم ہو گئی۔

منشی کی بیوی ہر قیمت پر نادر کو چوہدری کی صحبت سے بچانا چاہتی تھی۔ اس دھمکی کے بعد اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ چپکے سے یہ بستی چھوڑ دے۔ اس کے پاس صرف اتنی مہلت تھی کہ نادر میٹرک کر لے۔

اس نے نادر کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بات پھیل نہ جائے۔ وہ بڑی خاموشی سے تیاری کر رہی تھی۔ تیاری تو آسان تھی لیکن وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ یہ مکان چھوڑ کر کیسے جائے۔ اگر اسے بیچتی ہے تو چوہدری کو فوراً معلوم ہو جائے گا۔ پھر اس نے یہی سوچا کہ مکان کو تالا لگا کر جائے گی۔ جب نادر وکیل بن جائے گا تو ہم پھر اس مکان میں آجائیں گے۔ چوہدری' نادر کا کیا بگاڑ لے گا۔ وہ تو اس وقت تک وکیل بن چکا ہو گا۔

اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ وکیل سے پولیس بھی ڈرتی ہے۔ یہ چوہدری کیا چیز ہے۔

نادر نے امتحان دیا اور وہ پاس بھی ہو گیا۔ اب اس کی ماں کو اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ اب یہ بھی ضروری تھا کہ وہ نادر کو اعتماد میں لے۔ اس نے نادر کو بتا دیا کہ وہ اس کی پڑھائی کے لیے یہ بستی چھوڑ رہی ہے۔ نادر کو بھی وکیل بننے کی دھن ایسی سمائی تھی کہ فوراً تیار ہو گیا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ شہر پہنچتے ہی وکیل بن جائے گا۔

نادر کی ماں کو ایک دن خبر ملی کہ چوہدری شکار پر جا رہا ہے۔ یہی مناسب موقع تھا قصبے سے نکلنے کا۔ اس موقع پر اس ڈاکٹر نے ان کی مدد کی جو منشی سراج کو دیکھنے آیا تھا اور شہر کے اسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ شہر میں اس کا ایک بھائی رہتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا پتا انہیں دیا کہ جب تک تمہارے رہنے کا بندوبست نہیں ہو جائے گا' وہ تمہیں اپنے پاس ٹھہرا لے گا۔

عفت بانو نے اللہ کا نام لیا اور نادر کو اپنے ساتھ لے کر شہر آگئی۔ یہ دنیا ان دونوں کے لیے نئی بھی تھی اور عجیب وغریب بھی لیکن ڈاکٹر کی معرفت ایک سہارا مل گیا تھا اس لیے اطمینان بھی تھا۔

"نادر' یہ ہوتا ہے شہر! یہاں تو بہت لوگ رہتے ہیں۔ ہاتھ پکڑ لے۔ کہیں گم ہی نہ ہو جانا۔" نادر کی ماں نے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی تو ہوتا ہے شہر۔ دیکھ لے اچھی طرح۔" نادر نے کہا۔

"خدا کرے' یہاں کا چوہدری اچھا ہو۔"

"یہاں کوئی چوہدری نہیں ہوتا۔"

"پھر تو اچھا ہے۔ کوئی تجھے نوکری کے لیے نہیں کہے گا۔ تو خوب پڑھنا۔"

"تم باتیں ہی کرتی رہو گی یا چلو گی بھی۔ ابھی ڈاکٹر کے بھائی کا پتا بھی ڈھونڈنا ہے۔"

"اتنی بھیڑ میں ان کا گھر ملے گا کیسے۔"

"مل جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا یہ کاغذ دکھا کر کسی سے معلوم کر لینا۔ اس پر ان کا پتا لکھا ہوا ہے۔"

"تو پھر دکھاتا کسی کو۔"

نادر کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس نے ایک آدمی کو پرچا دکھایا اور اسی نے پتا بتا دیا۔

"یہ تو کوئی بہت مشہور آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں تو سب جانتے ہیں۔" نادر نے کہا۔

"یہ تو ہے اماں لیکن وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ یہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔ یہ جو موڑ کھڑی ہے ہمیں اس میں جانا پڑے گا۔"

"یہ ہمیں کیوں لے جائے گا۔ یہ تو ہمیں جانتا تک نہیں۔"

"ایک تو تم سمجھتی نہیں ہو۔ اسے یہاں ٹیکسی کہتے ہیں۔ یہ ہم سے کرایہ وصول کرے گا اور ہمیں چھوڑ آئے گا۔"

نادر نے ٹیکسی والے سے بات کی اور ٹیکسی میں سامان رکھ دیا۔

ٹیکسی والے نے انہیں ایک ایسے علاقے میں پہنچا دیا جہاں دور تک کچے پکے مکان پھیلے ہوئے تھے۔

"علاقہ تو یہی ہے۔ اب مکان تم خود ڈھونڈ لو۔" ٹیکسی والے نے کہا۔

"بھیا ہم کہاں ڈھونڈیں گے۔ مکان بھی تم ہی ڈھونڈ کر دو۔" نادر کی ماں نے کہا۔

"ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈھونڈو گی تو کرایہ بہت ہو جائے گا۔" ٹیکسی والے نے کہا۔

"تم کرائے کی پرواہ مت کرو۔ پیسے ہمارے پاس بہت ہیں۔ بس تم مکان ڈھونڈ کر دے دو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" ٹیکسی والے نے کہا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

قسمت اچھی تھی کہ زیادہ گھومنا نہیں پڑا اور مکان مل گیا۔

"یہ تو کوئی غریب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" نادر نے مکان کی حالت دیکھ کر کہا۔

"ہمیں کیا لینا۔ بس اچھے لوگ ہوں۔" نادر کی ماں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ دستک دیتے' ایک آدمی خود ہی باہر نکلا۔ شاید کسی کام سے باہر آیا تھا کہ دروازے پر ایک لڑکے اور ایک عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"ہمیں ڈاکٹر جاوید نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ خط بھی آپ کو دیا ہے۔"

اس آدمی نے وہ خط لیا اور وہیں کھڑے کھڑے اسے پڑھ لیا۔

"آیئے۔ آپ لوگ اندر آجایئے۔"

گھر میں ایک عورت اور دو نوجوان لڑکیاں ان کی منتظر تھیں۔

ان لوگوں کی مہمان نوازی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اچھے بھی ہیں اور ڈاکٹر جاوید سے محبت بھی کرتے ہیں۔

گھر کا سربراہ اسکول ماسٹر تھا۔ لہٰذا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ نادر کی تعلیم کا کیا ہو گا۔ انہوں نے پہلے ہی دن وعدہ کر لیا کہ وہ نادر کا داخلہ کسی اچھے کالج میں کرا دیں گے۔

کچھ دن اس گھر میں گزارنے کے بعد نادر کی ماں نے اپنے رہنے کے لیے کرائے کا ایک مکان لے لیا۔ ایک کالج میں نادر کا داخلہ بھی ہو گیا۔

نادر کی ماں یہ سمجھ رہی تھی کہ بس شہر پہنچتے ہی وہ وکیل بن جائے گا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس میں کئی سال لگ جائیں گے تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ جو تھوڑی بہت رقم وہ اپنے ساتھ لائی تھی' اس سے کب تک گزارہ ہوتا۔ نادر کی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لیے اس نے ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی۔

نادر پہلے دو سال تک تو خوب دل لگا کر پڑھتا رہا لیکن پھر اسے بری صحبتیں راس آگئیں۔ محلے میں کئی لڑکے ایسے تھے جو نشے کے عادی تھے۔ نادر کا ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہوا تو وہ بھی نشہ کرنے لگا۔ ماں تو صبح کی گئی شام کو واپس آتی تھی۔ نگرانی کرنے کے لیے کوئی اور تھا نہیں لہٰذا نادر اس راہ پر چلا تو چلتا ہی چلا گیا۔ وہ وکیل بننے آیا تھا اور نشے کا شکار ہو کر رہ گیا۔

اس کی ماں اس کی حالت سے بے خبر' اسے وکیل بنانے کے لیے دن رات محنت کر رہی تھی۔ اس کا یہ حال تھا کہ کئی مہینے سے اسکول نہیں گیا تھا۔ وہ ان پڑھ عورت یہی سمجھ رہی تھی کہ امتحان ہو رہے ہیں اور وہ ہر امتحان میں پاس بھی ہو رہا ہے۔ وہ جتنے پیسے مانگتا' اسے کہیں نہ کہیں سے دیتی کہ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

یہ راز' راز ہی رہتا لیکن نادر کی گرتی ہوئی صحت نے اسے فکر مند کر دیا۔ وہ پھر بھی یہی سمجھتی رہتی کہ پڑھائی کی محنت نے اس کی صحت تباہ کر دی ہے لیکن محلے کے ایک آدمی نے مہربانی کی کہ اسے نادر کی حرکتوں سے آگاہ کر دیا۔ اس نے تو سر پیٹ لیا۔ وہ اسے یہاں کس لیے لائی تھی اور وہ کیا بن گیا۔ اسے منشی سراج یاد آگیا۔ نشے کی عادت نے اسے کس طرح وقت سے پہلے موت کی نیند سلا دیا اور اب اس کا جگر گوشہ بھی اسی راہ پر جا رہا تھا۔ اس نے سوچا وہ نادر سے بات کرے گی۔ کچھ نہیں ہوا تو وہ یہ محلہ بدل لے گی یا پھر یہ شہر چھوڑ کر واپس اپنے قصبے چلی جائے گی۔ وہ اس وقت تک روتی رہی جب تک نادر گھر میں نہیں آگیا۔



"کیا ہوا اماں؟ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"مجھے تیرے باپ کی موت نے اتنا نہیں رلایا تھا جتنی تیری وہ زندگی رلا رہی ہے جو تو گزار رہا ہے۔"

"کیا ہوا میری زندگی کو؟"

"ذرا اپنی شکل آئینے میں دیکھ۔ ایسے ہوتے ہیں جوان پوت؟"

"تم وکالت کو سمجھتی کیا ہو۔ پڑھ پڑھ کے میرا یہ حال ہو گیا ہے۔"

"مجھے نہیں بنانا تجھے وکیل۔ چل واپس اپنے قصبے' اپنے گھر چلتے ہیں۔"

"ماں!" وہ چیخا "آئندہ وہاں چلنے کا نام بھی نہ لینا۔ میں چوہدری کے تلوے نہیں چاٹ سکتا۔"

"یہاں جو زندگی تو گزار رہا ہے' اس سے تو اچھا ہے کہ چل کر چوہدری کے تلوے چاٹ لے۔"

"کیسی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ تو نشہ کرنے لگا ہے۔"

"جب معلوم ہو ہی گیا ہے تو پوچھتی کیوں ہو۔"

"اس لیے پوچھتی ہوں کہ کیا اس لیے تجھے یہاں لے کر آئی تھی۔ میرا تو ارمان تھا کہ تو وکیل بنے گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں وکیل بننے کا۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ذرا عدالتوں میں جا کر دیکھو۔ کتنے وکیل بیکار گھومتے پھرتے ہیں۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں' واپس چل۔"

"تم چلی جاؤ۔ میں تو اب یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" نادر نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔

اب بات کھل ہی گئی تھی تو اس کی ماں نے اسے موقع بے موقع سمجھانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ ٹھنڈے دل سے بات سنتا' کبھی غصے میں آجاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں کی نصیحتیں چپکے چپکے اس کے دل پر اثر انداز ہونے لگیں اور وہ نشہ چھوڑنے پر تیار ہو گیا لیکن اب وہ نشے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ باقاعدہ علاج کے بغیر نشہ اس سے چھوٹ نہیں سکتا تھا۔

عفت بانو نے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا تاکہ اس کا نشہ چھوٹ جائے۔

نادر اپنا علاج مکمل کرانے کے بعد گھر آیا تو اس کا نشہ چھوٹ چکا تھا لیکن یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ اسی محلے میں رہا اور یہاں کے دوستوں سے چھٹکارا نہ مل سکا تو ممکن ہے بُری عادتوں کا پھر سے شکار ہو جائے۔ اس لیے احتیاط کے طور پر یہ علاقہ چھوڑ دیا گیا۔

نادر کو نشے کی لت سے تو چھٹکارا مل گیا تھا لیکن پڑھائی کی طرف سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب اس کی ماں نوکری کر رہی تھی اور وہ دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی ماں کو یہ فکر تھی کہ اگر وہ اسی طرح خالی گھومتا رہا تو پھر کسی غلط صحبت کا شکار نہ ہو جائے۔

اس کی ماں اسے روز نوکری ڈھونڈنے کے لیے کہتی تھی۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن نوکری تھی کہاں جو ملتی۔

"بس بہت ہو چکی۔ اب مجھ سے نوکری نہیں ہوتی۔ جب بھوکے مرو گے تو خود ہاتھ پاؤں چلاؤ گے۔" ایک دن اس نے ماں سے کہا۔

"اماں' مجھے کوئی اچھا لگتا ہے بیکار بیٹھنا لیکن نوکری ملتی ہی نہیں۔"

"میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ میں نے سوچا تھا تجھے وکیل بناؤں گی اور یہاں نوکری تک کے لالے پڑ گئے۔ کب تک یہاں پڑے رہیں گے۔ چل اپنے گھر چلتے ہیں۔"

وہ جب پریشان ہوتی تھی' واپس چلنے کی دھمکی دیتی تھی۔ نادر شہر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ڈر بھی جاتا تھا۔ اس وقت بھی دھمکی کارگر ہوئی۔ وہ ماں کے گلے سے لگ گیا۔

"اماں۔ میں نے ایک جگہ بات کی ہے۔ جلد ہی نوکری مل جائے گی۔"

اس نے کہیں بات نہیں کی تھی۔ نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے تو محض بہانہ کیا تھا لیکن اپنی بات سچ کر کے دکھانے کے لیے اسے کوشش بھی کرنی تھی۔

وہ اسی کوشش میں گھر سے نکلا تھا اور اپنے خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کار والا اگر بریک نہ لگاتا تو وہ کار کے نیچے آچکا ہوتا۔

"ابے کیا خودکشی کرنے نکلا ہے۔" کار میں بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

"اندھے ہو کر تو خود چلاتے ہو اور دوسروں کو کہتے ہو۔" نادر نے چیخ کر کہا پھر اسے خیال آیا جیسے اس آدمی کو اس نے کہیں دیکھا ہے پھر اس کا کالا کوٹ دیکھ کر اسے سب کچھ یاد آگیا۔

"آپ تو وہی ہیں جو چوہدری نذر محمد کے گھر آتے تھے۔" نادر نے کہا۔

"کون چوہدری نذر؟"

"ارے وہی قصبہ جلال پور والے چوہدری۔"

"ہاں میں وہی ہوں لیکن تم کون ہو؟"

"ارے آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں منشی سراج کا بیٹا

نادر علی ہوں۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم میری گاڑی کے نیچے آجاؤ۔"

"وکیل صاحب! میں جان بوجھ کر تھوڑی ٹکرایا تھا۔"

"چل ٹھیک ہے۔ آئندہ دیکھ کر چلنا۔"

اس آدمی نے بظاہر بہت سختی کردی تھی لیکن نادر ابھی تک گاڑی کا دروازہ پکڑے کھڑا تھا۔

"وکیل صاحب! ایک بات کہوں۔" نادر نے کہا "میں نوکری ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا ہوں۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ مجھے کہیں نوکری دلا دیں۔"

"کیسی نوکری چاہیے تجھے؟"

"کیسی بھی ہو۔ مجھے تو تنخواہ سے مطلب ہے۔"

"اچھا' یہ کارڈ رکھ لے۔ کسی وقت آکر مل لینا۔"

وہ دوسرے ہی دن ان کے شاندار دفتر میں پہنچ گیا اور پھر کئی دن تک مسلسل جاتا رہا۔ بالآخر ایک دن انہوں نے اس کے لیے نوکری تو نہیں' ایک کام نکال لیا۔

"تم اس آدمی کے پاس نوکری کے لیے گئے تھے۔" وکیل نے ایک فوٹو اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں تو اس کے پاس کبھی نہیں گیا۔" نادر نے کہا۔

"جو کہہ رہا ہوں اسے سنتے جاؤ۔" وکیل نے کہا "اس آدمی نے تمہیں اس لڑکی سے ملوا دیا تھا۔" وکیل نے ایک لڑکی کا فوٹو اسے دکھایا "اس کے بعد اس آدمی نے تمہارے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر کہا تھا' اس لڑکی کو قتل کردو تو یہ دس ہزار تمہیں دے دے گا۔ تم نے انکار کردیا تھا۔ اس آدمی نے کہا تھا' کوئی بات نہیں وہ یہ کام کسی اور سے کرالے گا۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اس آدمی کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ تمہیں عدالت میں اس کے خلاف گواہی دینی ہے اور یہ سب باتیں کہنی ہیں جو میں نے تمہیں بتائیں۔"

نادر کو اپنے بچپن کا وہ کھیل یاد آگیا جس میں وہ فرضی عدالت بناتا تھا اور گواہ بنا کرتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے۔ اس کام کے میں تمہیں پورے پانچ ہزار دوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو۔" وکیل نے کہا۔

پانچ ہزار کی رقم اس کے لیے اتنی تھی کہ وہ فوراً تیار ہوگیا۔

عدالت میں اس نے اتنی مہارت اور اعتماد سے گواہی دی کہ وکیل خود حیران رہ گیا۔ مخالف وکیل کی جرح کے جواب میں اس نے ایسی شان دار تقریر کی کہ بذات خود چھوٹا موٹا وکیل معلوم ہوتا تھا۔

اس جھوٹی گواہی کے بعد اس کے ضمیر نے ملامت ضرور کی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ عدالت کے باہر کئی ایسے لوگ گھوم رہے ہیں جو معاوضہ لے کر حلف اٹھاتے ہیں اور جھوٹی گواہی دیتے ہیں تو اس نے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کچھ دن بعد اسے ایک اور مقدمے میں گواہی دینی پڑی اور اس کے بعد ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ عدالت میں سب جانتے تھے کہ وہ پیشہ ور ہے۔ مگر یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ یہاں اسی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی کوئی اعتراض نہیں اٹھا۔ مخالف وکیل بھی کرائے کے گواہ لاتے تھے۔ اس لیے وہ بھی اعتراض نہیں کرسکتے تھے۔ یہ ایک کاروبار تھا جو بڑی سرگرمی سے چل رہا تھا جیسے اسپتالوں میں معاوضہ لے کر خون دینے والوں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ نادر کی خوبی یہ تھی کہ وہ مخالف وکیل کی جرح سے عاجز نہیں ہوتا تھا۔ مرعوب ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ان عدالتوں کو بھی اپنے بچپن کا ایک کھیل ہی سمجھ رہا تھا۔ اب ہر وکیل یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے توڑ لیا جائے۔

اسے قتل کے ایک مقدمے میں بطور گواہ پیش ہونا تھا۔ اس گواہی کے لیے اس نے بھاری معاوضہ طلب کیا تھا۔ وہ ابھی گھر میں آیا ہی تھا کہ ایک آدمی اس سے ملنے آیا۔

"آپ سیٹھ مراد کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔" اس آدمی نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"مجھے سیٹھ مراد نے بھیجا ہے۔ ہم چاہتے ہیں آپ ہمارے حق میں گواہی دیں۔"

"میں جبار ایڈووکیٹ کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ جتنا معاوضہ آپ نے ان سے لیا ہے ہم اس کا دگنا آپ کو دیں گے۔"

نادر اس پیشکش پر سوچ میں پڑ گیا اور پھر اس نے پیشکش قبول کرلی۔

اس نے جبار ایڈووکیٹ سے بھی معاوضہ لے لیا اور سیٹھ مراد سے بھی۔ عدالت میں پیش ہوا تو اس کی گواہی بدل چکی تھی۔ چند پیشیوں کے بعد سیٹھ مراد باعزت بری ہوگیا۔

اس کی اس حرکت نے جبار ایڈووکیٹ کو برہم کردیا اور اس نے کاروباری معاہدہ ختم کردیا لیکن اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا اتنا نام ہوگیا تھا کہ اس کے لیے کام کی کمی نہیں تھی۔



اب وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ اس کی ماں یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے یہ سب کچھ حق حلال کی کمائی سے بنایا ہے۔ اسی لیے اسے اپنے نادر پر فخر تھا۔ ہر ماں کی طرح اسے بھی یہ آرزو تھی کہ اب اس کی شادی ہوجانی چاہیے۔ اب نادر کے پاس دولت تھی اور دولت ہر عیب کو چھپا لیتی ہے لہٰذا کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ ایک دن خاموشی سے اپنے قصبے جلال پور گئی اور ایک جگہ نادر کی بات پکی کر کے آئی۔ ایک مہینے بعد شادی ہوگئی۔ نادر اب قصبے میں نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا بیوی کے ساتھ شہر آگیا۔

نادر نے اپنے کام کو ماں سے تو چھپا لیا تھا لیکن بیوی سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اسے جب اپنے شوہر کے گھناؤنے کام کا علم ہوا تو اس نے ساتھ رہنے سے انکار کردیا بات اتنی بڑھی کہ اس کی اصلیت اس کی ماں پر بھی کھل گئی کہ اس نے اپنی جھوٹی گواہیوں سے کیسے کیسے بے گناہوں کو سزا دلوائی ہے۔

اس کی بیوی اسے چھوڑ کر تو نہیں گئی لیکن اس کی ماں نے اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ اب یہ کام چھوڑ دے گا۔ اس نے بھی سوچا کہ بہت دولت کمائی' اب وہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرسکتا ہے۔

وہ ایک دکان کھول کر بیٹھ گیا لیکن وہی مثل ہے کہ چور' چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ کبھی کبھی کسی بھاری معاوضے کا لالچ اسے عدالت کی طرف لے جاتا تھا۔ اب چونکہ وہ کاروبار کررہا تھا اس لیے اس کی بیوی کو یہ شک بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے پرانے دھندے کی طرف لوٹ گیا ہے۔

○☆○

اس کی ماں کا انتقال ہوچکا تھا۔ ایک بیٹی تھی جو اب جوان ہوچکی تھی۔ نادر کی بیوی نے شادی کی تمام تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ بس کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھی۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے ارمان اس کے دل میں تھے۔

اس رات نادر دیر سے گھر آیا تھا اور آتے ہی سوگیا تھا۔ رات میں کسی وقت طبیعت خراب ہوئی۔ گھر میں گاڑی موجود تھی۔ اس کی بیٹی اور بیوی اسے لے کر اسپتال چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ بروقت دیکھ بھال ہوگئی تھی لیکن شاید اب اس کے گناہوں کے


حسن وہ! جو چھپائے نہ چھپے!

میرے نسوانی حسن کا راز

بلوسم بریسٹ کریم (یونانی)

قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہابرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد

بلوسم بریسٹ کریم جو قیمت=/1501

- بریسٹ کے ٹشوز کو سخت کرکے اُبھار لاتی ہے۔
- بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کرکے پروقار شخصیت کا مالک بناتی ہے
- کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے

اسٹاکسٹ:-

طاہر شاپنگ سینٹر، پل بازار اڈا کوٹلہ | ابن سینا گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازیخان
خواجہ سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی | زرین ہومیو اسٹور جنرل بازار فیصل آباد
صدیق میڈیکل سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی | حبیب دواخانہ گھنٹہ گھر بازار ملتان
سلیم جنرل سٹور ایوب مارکیٹ طیر کراچی | راجہ برادرز تصیلی بازار سیالکوٹ
ابراہیم سن ایوب مارکیٹ طیر کراچی | پاکستان جنرل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ
تھری اسٹار جنرل سٹور مدینہ مارکیٹ۔ | شکیل میڈیکل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ
ریشم بازار حیدرآباد | شاہ دین میڈیکل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ
نیو دیلی دواخانہ دکھورہ روڈ سکھر | ڈاکٹر ریاض میڈیکل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ
پیر زادہ میڈیکل سٹور سیرانی روڈ سکھر | الفاتحہ میڈیکل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ
حافظ میڈیکل سٹور کچری بازار گوجرانوالہ | الفاتحہ دواخانہ بازار مارکیٹ کلاں بازار
ہیل جنرل سٹور فرنٹیئر مارکیٹ شاہ عالم لاہور | ڈیرہ غازی خان
جرمن ہومیو شور بازار رحیم یار خان | حق القیوم جنرل سٹور ہسپتال روڈ بھکر ال

ڈسٹری بیوٹرز:
• ریاض محمود ۶۹، نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور • شاہی طبی دواخانہ بوہڑ بازار راولپنڈی
• محمد صابرین اینڈ سنز نیو سرتی والے چوک بازار ملتان • گھر بیٹھے بذریعہ وی پی پارسل منگوانے کے لئے

حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

ازالے کا وقت آگیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے اس پر دوسرا حملہ ہوا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ ڈاکٹروں کی پوری کوشش کے باوجود اس کی زبان بند ہوگئی اور پورا بدن مفلوج ہوگیا۔

اس کی بیوی سمجھتی تھی کہ یہ اس کے گناہوں کا خمیازہ ہے جو وہ بھگت رہا ہے لیکن اب کسی سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ اب تو اس زندہ لاش کی خدمت کرنے ہی میں اس کی جنت تھی۔

نادر میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنا ہاتھ بھی ہلا سکے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو تکتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی اندرونی جذبے کے تحت آنکھیں بھیگ جاتیں تو کھرا کر آنکھیں بند کرلیتا۔

اب اس کی بیوی کے لیے شہر میں رہنا دوبھر ہونے لگا تھا۔ نادر نے جو کچھ جمع کیا تھا' علاج پر خرچ ہوگیا تھا۔ کوئی ہمدردی اور مدد کرنے والا بھی نہیں تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ اس زندہ لاش کو لے کر اپنے میکے چلی جائے۔ قصبے میں نادر کا گھر موجود تھا جہاں وہ رہ سکتی تھی۔

ابھی انہیں قصبے میں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نادر کی بیوی کا ایک رشتے دار ان سے ملنے آیا۔ نادر کی بیٹی رخسانہ اسے پہلی ہی نظر میں بھائی اور پھر وہ روزانہ آنے لگا۔ اس کا نام جبار تھا اور چال چلن کا اچھا نہیں تھا لیکن نادر کی بیوی کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی اس لیے وہ اسے گوارا کرتی رہی۔

کچھ ہی دن میں جبار اپنی اصلیت پر اتر آیا اور اس نے رخسانہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ جب رخسانہ کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ہوئی تو اس نے شادی کا پیغام دے دیا۔

نادر کی بیوی اب اتنی مجبور تھی کہ رخسانہ کی شادی کہیں بھی کرسکتی تھی لیکن جبار کے ساتھ اس کی شادی کرنے کا مطلب اسے کنوئیں میں دھکیلنا تھا لہٰذا اس نے صاف انکار کردیا۔

"باجی' یہ مت بھولو کہ جب سے میں نے یہاں آنا شروع کیا ہے' کتنے پیسے خرچ کرچکا ہوں۔"

"اگر تم نے چار پیسے اس نیت سے خرچ کیے تھے تو لعنت ہے تم پر۔"

"تم سیدھی طرح رخسانہ کی شادی مجھ سے کردو ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔" جبار نے دھمکی دی۔

"شادی رخسانہ کی مرضی سے ہوگی اور وہ تیار نہیں ہے۔"

جبار خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔ نادر کی بیوی نے شکر ادا کیا کہ طوفان گزر گیا۔

جبار کی طرف سے مسلسل دھمکیاں آرہی تھیں لیکن نادر کی بیوی نے کسی دھمکی کی پرواہ نہیں کی۔ نادر سب کچھ سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا لیکن کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ نادر کی بیوی پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ نادر کی چارپائی دالان میں پڑی تھی۔ رخسانہ کمرے میں تھی۔ شاید سو رہی تھی۔

نادر کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھا اس کی بیوی آئی ہے لیکن وہ جبار تھا۔ اسے دیکھ کر نادر کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن نہ تو وہ اسے روک سکتا تھا اور نہ شور مچا سکتا تھا۔ جبار مسکراتا ہوا اس کی چارپائی کے قریب سے گزرا اور اس کمرے میں چلا گیا جہاں رخسانہ تھی۔

ابھی وہ جبار کی آمد کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ رخسانہ کی دل ہلا دینے والی چیخیں بلند ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی بے بس آنکھوں نے جبار کو دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔

نادر کی بیوی گھر پہنچی تو رخسانہ بے ہوش پڑی تھی۔ کسی نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ نادر کو اب معلوم ہوا کہ جبار کیوں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجرم کون ہے لیکن وہ بیوی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن آنسوؤں کی زبان نہیں ہوتی۔

نادر کی بیوی نے رخسانہ کو اسپتال پہنچایا اور تھانے میں رپورٹ درج کرادی۔ ایف آئی آر میں اس نے جبار کا نام لکھوایا تھا لیکن ظاہر ہے یہ محض شک تھا۔ افسوس کہ رخسانہ بھی اپنے گنہگار کو نہیں دیکھ سکی تھی۔

زندگی بھر جھوٹی گواہیاں دے کر لوگوں کو سزائیں دلوانے والا خاموش تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ سچی گواہی دینے کا وقت آیا تو وہ بولنے سے قاصر تھا۔ وہ عینی گواہ تھا لیکن کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

مقدمہ عدالت میں چلا لیکن کوئی شہادت نہیں تھی۔ جبار کا نام شک کی بنیاد پر لکھا گیا تھا لہٰذا شک کا فائدہ اسے ملا اور وہ رہا ہوگیا۔

رخسانہ کا جھلسا ہوا چہرہ اپنے باپ کے گناہوں کی گواہی دینے کے لیے نشانِ عبرت بن گیا۔



# حضرت زکریا علیہ السلام

ضیاء تسنیم بلگرامی

آپؑ نے سب سے پہلی بار ظہورِ مسیحؑ کی بشارت دی تھی۔ ایک بیٹے کی خواہش میں آپؑ دو بار بوڑھے ہوگئے۔ بیوی بھی ضعیفی کی وجہ سے اولاد کی طرف سے مایوس ہوگئیں۔ پھر انہیں عجیب و بے مثل صورت میں بتایا گیا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اس لیے وہ اولاد کی طرف سے مایوس نہ ہوں۔ اولاد ہوئی اور آپؑ نبوت کی ذمہ داریاں پوری کرنے لگے۔ شیطان نے قوم کا ساتھ دیا اور حضرت زکریا علیہ السلام کو آرے سے چروا دیا۔

## یہودیوں کی شرارتوں اور گمراہیوں کے واقعات

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایک سو سال پہلے حضرت داؤد کی نسل سے بیت المقدس کے کاہنوں کے خاندان میں ایک لڑکا پیدا ہوا' اس کا نام زکریا رکھا گیا۔ اس بچے نے ابتدا ہی سے نیک نفسی کی زندگی گزاری۔ اس کی نیکی اور شرافت کا حوالہ دیا جاتا تھا۔

ہیکل سلیمانی میں جو لوگ خدمات انجام دیتے تھے' انہیں کاہن کہا جاتا تھا۔ ان میں کچھ جاروب کشی کرتے تھے' کچھ مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ کسی کے ذمے عبادت تھی۔ یہودیوں میں نماز پڑھی جاتی تھی اور نماز کا امام بھی کاہن ہی ہوتا تھا اور یہ کاہن' ہیکل کے تمام کاہنوں کا سردار کہلاتا تھا۔

حضرت زکریاؑ کے زمانے میں عمران بن ناثی سب سے بڑے کاہن تھے۔ عمران کی شادی حنہ بنت فاقود سے ہوئی تھی' یہ خاتون بھی بہت نیک نفس' پارسا اور خدا شناس تھیں۔ بنی اسرائیل میں ان دونوں میاں بیوی کو بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

حنہ بنت فاقود کی ایک بہن الی شبع تھیں۔ اس الی شبع کو مغرب میں الزبتھ (ELIZABETH) کہا جاتا ہے۔ یہ خاتون بھی نہایت نیک اور پارسا تھیں' ان کی شادی حضرت زکریاؑ سے کردی گئی۔

لیکن یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ دونوں ایک عرصے تک اولاد سے محروم رہے۔

عمران کو یہ دکھ پریشان کررہا تھا کہ اگر ان کے گھر میں بیٹا پیدا نہ ہوا تو ان کی موروثی کہانت کا منصب کسے دیا جائے گا کیونکہ یہ منصب موروثی تھا اور صدیوں سے اسی طرح منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔

سالوں بعد اچانک امید کی کرن نمودار ہوئی اور حنہ نے اپنے شوہر عمران کو بتایا کہ وہ امید سے ہے۔ اس خوش خبری نے عمران کو وہ خوشی بخشی کہ زندگی میں ایسی خوشی انہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف اولاد کی خواہش پوری ہورہی تھی دوسری طرف زکریا اولاد سے محروم تھے اور اس کا کوئی بظاہر امکان بھی نہیں تھا۔

حنہ اور الی شبع جب بھی ایک جگہ بیٹھتیں تو حنہ کے چہرے پر شادمانی ہوتی اور الی شبع کے چہرے پر محرومی اور مایوسی۔

حنہ نے اپنی بہن کو بتایا "میں نے تو یہ نذر مان رکھی ہے کہ میں اپنے بچے کو ہیکل کے حوالے کردوں گی۔"

الی شبع نے کہا "بے شک تم ایسا کرسکتی ہو کیونکہ تمہارے یہاں ولادت کے اشارے موجود ہیں مگر مجھے خدا نے اولاد سے کیوں محروم رکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔"

حنہ نے کہا "ہم دونوں ایک عرصے سے مایوسی میں مبتلا تھے کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو یہ موروثی کہانت کا سلسلہ اپنے گھر سے اٹھ کر دوسرے خاندان میں چلا جائے گا لیکن خدا نے ہماری سن لی اور ہمارے گھر میں امید کا دیا روشن ہوگیا۔"

حضرت زکریاؑ نجاری کا پیشہ کرتے تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے تو ایک سوہانِ روح کیفیت پورے

ماحول پر طاری نظر آتی تھی۔

جب سے عمران کے گھر میں اولاد کی امید پائی جارہی تھی تو یہ دونوں میاں بیوی بھی وہی ذکر لے بیٹھتے۔

بیوی شمع اپنی بہن حنہ کا ذکر کرتیں اور اپنے شوہر حضرت زکریاؑ سے کہتیں "اللہ نے ان کی تو سن لی' اب دیکھیے ہم پر اس کی نظر کرم کب ہوتی ہے؟"

حضرت زکریاؑ کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے تھے' انہیں یقین تھا کہ وہ مستجاب الدعوات ہیں اور انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیابی پر بھروسا تھا۔ اپنی بیوی سے یہی کہتے رہتے تھے کہ ہمیں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے جس اللہ نے عمران اور حنہ کو اپنی رحمت سے نوازا ہے' وہی ہمیں بھی وقت آنے پر نوازدے گا۔

الی شمع نے سرد آہ بھری اور کہا "ہم دونوں جوانی کی حدوں سے گزرتے جارہے ہیں' بڑھاپا ہمیں اپنی طرف بلا رہا ہے۔ کیا اللہ بڑھاپے میں اولاد دے گا۔"

حضرت زکریاؑ نے بیوی کو تسلی دی اور کہا "بیوی یہ تمہارے منہ سے مایوسی کی بات اچھی نہیں لگتی۔ تم تو اپنی بہن کی طرح نہایت نیک اور اللہ کی شاکر بندی ہو' لوگ سنیں گے کہ الی شمع اپنے رب کا شکوہ کررہی تھی' تو کیا کہیں گے۔"

الی شمع خاموش ہوگئیں اور اب اپنا زیادہ وقت اپنی بہن حنہ کے پاس گزارتیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا کہ عمران اور حنہ کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس خوشی نے بہت سے گھروں کو خوشی بخش دی۔

باہر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ اندر حنہ کے لڑکا پیدا ہوا ہے یا لڑکی لیکن حنہ کو لڑکی دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی' وہ رہ رہ کر یہی سوچ رہی تھیں کہ اب وہ اپنی نذر کس طرح پوری کریں گی کیونکہ ہیکل میں لڑکے نذر کیے جاتے تھے جب کہ گھر میں خلاف امید لڑکی پیدا ہوگئی تھی اور اسے ہیکل کی نذر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ تو پہلے کبھی لڑکی ہیکل میں بطور نذر داخل کی گئی تھی اور نہ اب داخل کی جاسکتی تھی۔

باہر جب عمران کو یہ بتایا گیا کہ اندر لڑکی پیدا ہوئی ہے تو انہیں بھی بڑی مایوسی ہوئی اور وہ یہ سوچنے لگے کہ ان کی بیوی نے جو منت مانی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی نذر کردیں گی تو اب وہ منت کس طرح پوری ہوگی۔

لڑکی کا نام مریم رکھا گیا اور اللہ کے بھید اللہ ہی جانے' ابھی عمران کو یہ فکر لاحق تھی کہ اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ گویا ان کی مشکل حل ہوگئی اور وہ ذہنی کشمکش سے نجات پاگئے۔

اب حنہ اور ان کی بیٹی مریم کی کفالت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خاندان میں دوسرے لوگ بھی تھے جو ان دونوں کی کفالت پر آمادہ تھے مگر حضرت زکریاؑ اور الی شمع کی خواہش تھی کہ حنہ ان کے پاس رہیں تاکہ ان کے گھر میں مریم کے دم قدم سے مسرت و شادمانی ان دونوں کو بھی میسر آجائے۔

دونوں میاں بیوی آپس میں باتیں کرتے رہتے کہ حنہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا جائے تاکہ مریم بھی ان کے گھر میں آجائے۔ بیوی نے شوہر کو سمجھایا کہ خبردار جب تک خاندان کے دوسرے لوگ اور ہیکل کے جملہ کاہن یہ منظوری نہ دے دیں اس وقت تک ہم حنہ اور بھانجی مریم کو اپنے گھر نہیں لاسکتے۔ حضرت زکریاؑ نے بیوی کو یقین دلایا "بیوی! تم فکر نہ کرو' میں اس مسئلے کو اپنے خاندان والوں اور کاہنوں کے سامنے رکھتا ہوں۔ ان سے میں کہوں گا کہ ہماری ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لیے ہم ان دونوں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔"

الی شمع نے کہا "ٹھیک ہے' تم یہ بات کرکے دیکھو۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ موذی ہمیں' بہن حنہ اور بھانجی مریم کو اپنے گھر میں رکھنے دیں گے۔"

شام کو چراغ جلنے سے پہلے حضرت زکریاؑ نے قبیلے والوں اور کاہنوں کو ہیکل میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہ لوگ ہیکل میں جمع ہونے لگے اور ان میں سے کسی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ مسئلہ کون سا ہے جس کے لیے ان سب کو یہاں جمع کیا گیا ہے۔

حضرت زکریاؑ نے حاضرین سے کہا "لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ میں لاولد ہوں اور فی الحال اپنے گھر میں اس کا کوئی امکان



بھی نہیں پایا جاتا' اس لیے اللہ نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ حنہ اور مریم کے دم قدم سے اپنی خوشیاں حاصل کریں۔"

یہیں الی شمع اور حنہ بھی موجود تھیں۔

الی شمع نے حاضرین سے کہا "میری بہن حنہ اور مریم میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہیں۔"

ایک کاہن نے کھڑے ہوکر اعتراض کیا "صاحبان! ہم میں کئی ایسے موجود ہیں جو ان دونوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہیں پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دونوں کو یہ دونوں دے دیے جائیں۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "تب پھر ایسا کرو کہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ جانے کا حق دے دو۔" حضرت زکریاؑ نے یہ تجویز اس لیے پیش کی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جب بات ان دونوں پر ڈالی جائے گی تو وہ ان سب پر حضرت زکریاؑ اور الی شمع کو ترجیح دیں گی۔

ایک کاہن نے کہا "ہم یہ مسئلہ کسی ایک شخص پر یا تم سب پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ایسے معاملات ہمیشہ فال سے طے کیے جاتے ہیں' ہم سب کل صبح دریائے اردن کے کنارے جائیں گے اور فال ڈال کر دیکھیں گے کہ یہ کس کی تائید میں نکلتی ہے۔"

حاضرین نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ کل صبح وہ سب اپنے اپنے قلم لے کر دریائے اردن کے کنارے پہنچ جائیں۔

اس رات سب ہی نے فال نکالنے کی تیاریاں شروع کردیں اور زرگل یا بید مشک کی شاخیں عام قلم جتنی کاٹ لی گئی اور ان سے قلم بنائے گئے اور ان قلموں پر فال میں حصے لینے والوں نے اپنے اپنے نام لکھ دیے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت زکریاؑ بھی قلم پر اپنا نام لکھ کر دریا کے کنارے پہنچ گئے' وہاں اک ہجوم موجود تھا اور اس طرح بہت سے قلم جمع ہوگئے۔

ایک کاہن نے یہ قلم سب سے لے لیے اور کہا "اب میں ان قلموں کو دریا کے دھارے پر ڈالتا ہوں۔ بیشتر قلم دھارے میں بہہ جائیں گے مگر جسے اللہ کی طرف سے کفیل مقرر کیا گیا ہوگا' اس کا قلم مخالف سمت میں چلنا شروع کردے گا' یہ ایک ایسی تائید ایزدی ہوگی کہ کسی کو نہ تو اس پر اعتراض ہوگا اور نہ شکایت۔"

یہ قلم کاہن نے سبھی کے ہاتھوں سے لے کر دریا میں پھینک دیے اور کنارے بیٹھ کر نظارہ کرنے لگے کہ دیکھیں کس کا قلم مخالف سمت میں بہنا شروع کرتا ہے۔

حضرت زکریاؑ کو یہ یقین تھا کہ اللہ نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا اور وہ اس وقت بھی مایوس نہیں کرے گا۔

وہ قلم پہلے تو دھارے کی سمت میں بہتے رہے مگر پھر ایک قلم ان سے الگ ہوگیا اور دھارے کی مخالف سمت میں بہنے لگا۔

اس قلم کو دریا سے نکالا گیا کہ دیکھیں کہ یہ کس خوش قسمت کا قلم ہے۔ اس پر حضرت زکریاؑ کا نام درج تھا۔

چنانچہ جب لوگوں نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مقدمے کا فیصلہ حضرت زکریاؑ کے حق میں ہوگیا ہے تو لوگوں نے ان کو مبارک باد دی اور کہا "بے شک' آپ دونوں سے زیادہ مستحق ان کی کفالت کے لیے کوئی اور نہیں تھا۔"

الی شمع نے اپنی بہن حنہ اور بھانجی مریم کو ساتھ لیا اور اپنے گھر پہنچیں۔

اس روز یہ گھرانا بستی میں سب سے زیادہ خوش و خرم نظر آرہا تھا۔ حضرت زکریاؑ نے بھی بھانجی کو گود میں اٹھالیا اور دیر تک پیار کرتے رہے۔ جیسے ان کو ان کی بچھڑی ہوئی بیٹی مل گئی ہو۔

اب اس گھر میں حضرت مریم کی شکل میں اگرچہ ایک بچی تو آگئی تھی مگر کچھ ہی عرصے بعد الی شمع کو اپنی اولاد کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ ان کا دکھ حضرت زکریاؑ کا دکھ بن جاتا۔ یہ ہیکل میں جاکے گریہ وزاری کرتے کہ "اے اللہ' تو ہمیں اولاد سے کب نوازے گا۔" گھر میں الی شمع اولاد کے لیے مناجاتیں کرتی رہتیں۔

ادھر حضرت مریم بڑی ہورہی تھیں اور اب یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ حنہ نے مریم کی ولادت سے پہلے جو منت مانی تھی' اسے کس طرح پورا کیا جائے۔

حضرت زکریاؑ کو بھی یہی فکر لاحق تھی کہ اگر منت مانی گئی ہے تو اسے پورا ضرور کیا جائے لیکن یہ بیٹی ہم زلف عمران اور

سالی حنہ کی تھی اور منت بھی انہی دونوں نے مانی تھی۔ اب عمران تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے' نہ موجود تھیں' وہی اپنی منت کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتی تھیں۔

حضرت زکریاؑ نے اپنی بیوی الی شبع سے کہا "تم اپنی بہن حنہ سے پوچھو کہ انہوں نے مریم کی ولادت سے پہلے جو منت مانی تھی اس کا بھلا بیٹے سے تعلق تھا مگر اللہ نے بیٹی دے دی اب وہ یہ بتائیں کہ اپنی منت وہ کس طرح پوری کریں گی؟"

الی شبع نے کہا "میں بہن سے بات تو کروں گی مگر لڑکی کو کس طرح ہمیشہ کے لیے ہیکل کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ جس لڑکے کو ہیکل کے حوالے کیا جاتا ہے' وہ پوری زندگی دنیا داری سے دور رہتا ہے' وہ شادی بھی نہیں کر سکتا۔ لڑکا اتنی پابندیاں برداشت کر سکتا ہے مگر آج تک ہیکل میں کوئی لڑکی اس طرح نہیں کی گئی کہ وہ زندگی بھر کنواری رہے اور دنیا کو ترک کر دے۔"

اس موقع پر بھی دونوں کو اپنی اولاد کا خیال آیا اور الی شبع نے کہا "نہ جانے اللہ کو کیا منظور ہے کہ وہ تاخیر سے کام لے رہا ہے۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "حالانکہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے دعا مانگی ہو اور قبول نہ کی گئی ہو۔"

الی شبع نے کہا "میں تو اپنی اولاد کے لیے مسلسل دعا مانگتی رہتی ہوں کہ نہ جانے کب دریائے رحمت جوش میں آجائے اور باب اجابت کھل جائے۔" مجھے تو اس سعد ترین گھڑی کا انتظار ہے۔" اولاد کی خواہش اور تمنا ایسی حلاوت انگیز تھی کہ دونوں اس موضوع پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

اسی دوران میں ایک دن حضرت مریم مویشیوں کو چارہ کھلا کر اندر داخل ہوئیں تو حنہ کی بھرپور نظریں اپنی بیٹی پر پڑیں اور انہیں یاد آیا کہ منت والا مسئلہ ابھی تک التوا میں پڑا ہوا ہے۔ وہ اسی وقت انھیں اور اپنی بہن الی شبع کے پاس گئیں اور پوچھا "بھائی زکریا کہاں ہیں؟"

الی شبع نے جواب دیا "وہ دروازے پر باہر مکان کی چوکھٹیں تیار کر رہے ہیں۔"

حنہ نے پوچھا "بھائی زکریا اندر کب آئیں گے؟"

الی شبع نے جواب دیا "کچھ معلوم نہیں' ویسے جب کام ختم ہو جائے گا' وہ اندر آجائیں گے۔"

حنہ نے بے قراری سے کہا "بہن الی شبع! تم مریم کو دیکھ رہی ہو؟"

الی شبع نے جواب دیا "ہاں' دیکھ رہی ہوں' اللہ نظر بد سے بچائے' کیسا قد کاٹھ نکال رہی ہے۔"

حنہ نے کہا "بہن الی شبع! میری تو بھوک پیاس اور راتوں کی نیند اڑ گئی ہے کیونکہ میں نے اس کی ولادت سے پہلے ایک منت مانی تھی جو مستقل التوا میں پڑی ہوئی ہے۔"

باہر حضرت زکریاؑ کا کام خلافِ معمول جلدی ختم ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور دونوں بہنوں کو مصروفِ گفتگو دیکھا تو پوچھا "کیا کسی خاص موضوع پر بات ہو رہی ہے؟"

الی شبع نے اپنی بہن الی شبع کی طرف دیکھا اور حسنہ نے بولنا شروع کر دیا "بھائی زکریا! آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے مریم کی ولادت سے پہلے ایک منت مانی تھی جس کے بعد مریم پیدا ہوئی اور اتنی بڑی ہو گئی۔ اب مجھے اپنی منت کی عدم ادائیگی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے' بتائیں کہ میں کیا کروں؟"

حضرت زکریاؑ نے کہا "حنہ بہن! آپ مریم کی ماں ہیں اور منت بھی آپ ہی نے مانی تھی اس لیے آپ ہی یہ فیصلہ کریں گی کہ کیا کیا جائے۔"

حنہ نے کہا "بے شک فیصلہ تو مجھی کو کرنا چاہیے مگر اللہ نے آپ کو ہم دونوں کا کفیل بنا دیا ہے' آپ ہمارے سرپرست ہیں اس لیے یہ فیصلہ بھی آپ ہی کریں گے۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "اچھا پھر مجھے سوچنے دو کیونکہ یہ ہماری آزمائش کی گھڑی ہے اور ہم کوئی ناسپاسی والا فیصلہ کر کے اپنے رب کو ناراض نہیں کر سکتے۔"



اب حضرت زکریاؑ کام سے فارغ ہونے کے بعد جب ہیکل جاتے تو لوگ ان سے پوچھتے "عمران اور ان کی بیوی نے مریم کی ولادت سے پہلے جو منت مانی تھی' اس کا کیا ہوا؟"

حضرت زکریاؑ نے کہا "تم لوگ ہیکل کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہو۔ صدیوں پرانے واقعات تمہیں اس طرح یاد ہیں کہ جب چاہو کسی کتاب کی طرح فر فر پڑھ کر سنا دو۔ تم لوگ اپنے حافظے پر زور دو اور یاد کر کے بتاؤ کہ ہیکل میں کبھی کسی لڑکی کو نذر کے طور پر داخل کیا گیا تھا۔ مریم تو بیٹی ہے اسے کس طرح ہیکل میں زندگی بھر کے لیے داخل کیا جائے۔"

ہیکل کی اکثریت نے متفقہ طور پر کہا "ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ اللہ' عمران کی بیوی اور آپ کا امتحان لے رہا ہے۔ نذر مانی گئی ہے تو اسے پورا بھی ہونا چاہیے۔"

حضرت زکریاؑ نے بھی ان کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا "میں خود بھی اللہ کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اب ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مریم کو اتنے بڑے ہیکل میں مردوں کے ساتھ کس طرح چھوڑا جائے۔"

کاہنوں نے کہا "بے شک ہمیں بھی آپ کی اس سوچ سے کوئی اختلاف نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سوال کا جواب بھی آپ سے بہتر کوئی اور نہیں دے سکتا۔"

حضرت زکریاؑ نے ان لوگوں سے کچھ وقت لیا مگر اب حضرت زکریاؑ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ مریم کے مسئلے کو التوا میں نہیں ڈالا جائے گا اور اسے ہر حال میں ہیکل کی نذر کر دیا جائے گا۔

حضرت زکریاؑ نے حنہ کو اپنی بیوی الی شبع کی موجودگی میں بتایا "حنہ بہن! مجھ سے کاہن پوچھ رہے تھے کہ تم نے مریم سے متعلق جو منت مانی تھی اس کا کیا ہوا تو میں نے ان سب کو یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ ہیکل کی امانت ہیکل کے حوالے کر دی جائے گی مگر ذرا سی بچی یہ ہے کہ مریم کو ہیکل میں مردوں کے ساتھ کس طرح چھوڑا جائے۔"

حنہ نے کہا "میں بھی یہی سوچتی رہتی ہوں جب کوئی حل نظر نہیں آتا تو سوچنا بند کر دیتی ہوں۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "میں نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے۔ میں ہیکل سے ملحق ایک لکڑی کا حجرہ بنا دوں گا۔ مریم کو اسی حجرے میں پہنچا دیا جائے گا اور وہ اس حجرے سے نکل کر ہیکل کی خدمت کر لے گی اور پھر اپنے حجرے میں واپس آجائے گی۔ اس حجرے میں' میں آتا جاتا رہوں گا۔"

حنہ کو حضرت زکریاؑ کے اس حل سے بڑی خوشی ہوئی اور اسے ایسا لگا جیسے وہ بہت ہلکی ہو گئی ہو۔

حضرت زکریاؑ نے ہیکل سے متصل لکڑی کا حجرہ بنانا شروع کر دیا۔ لوگ یہ منظر دیکھنے کے لیے آتے اور آپس میں کہہ دیتے کہ یہ کیسا دین دار شخص ہے جو اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔

لکڑی کا حجرہ تیار ہوتا رہا اور حضرت مریم خود کو اس میں رہنے اور مستقل آباد ہونے کے لیے تیار کرتی رہیں۔

جب یہ حجرہ تیار ہو گیا تو حضرت زکریاؑ نے حضرت مریم کو بتایا "بیٹی اب تجھے ہیکل سے متصل حجرے میں رہنا ہے کیونکہ تو ہمارے پاس ہیکل کی امانت ہے۔"

حضرت مریم نے اللہ کی صابر اور شاکر بندی کی طرح کوئی اعتراض نہیں کیا اور کہا "میں اللہ کی رضا میں خوش ہوں۔"

حضرت زکریاؑ' حنہ اور الی شبع یہ تینوں حضرت مریم کو کاٹھ کے حجرے میں لے گئیں یہاں لکڑی کی کئی چیزیں موجود تھیں ان کے لیے یہ برتن بھی پہنچا دیے گئے اور معمولی سا بستر بھی رکھ دیا گیا۔

حنہ نے حجرے کا بغور جائزہ لیا جہاں ان کی بیٹی کو زندگی بھر رہنا تھا تو انہیں کچھ عجیب سی پریشانی محسوس ہوئی اور انہوں نے کہا "اے اللہ! میں اپنی مریم کو تیرے سپرد کر رہی ہوں کیونکہ تو ارحم الرحمین اور سمیع و بصیر ہے تو ہی ستار العیوب اور حقیقی حفاظت کرنے والا ہے۔ میں نے اپنی منت پوری کر دی' اب تو بھی میری مریم کے مرتبے' مقام اور درجے کو آخری دم تک پہنچا دے کہ پھر کوئی لڑکی یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔"

حضرت زکریاؑ نے بھی حضرت مریم کے سر پر شفقت آمیز ہاتھ پھیرا اور بھانجی کے حق میں دعا کی اور اسی حجرے میں انہوں نے اپنے لیے بھی دعا مانگی "اے اللہ! اب تو سر کے بال بھی سفید ہو گئے مگر میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں' مجھے نرینہ

نہیں تو ایک ہی اولاد نرینہ عطا فرمادے۔"

یہیں الی شبع نے بھی اسی قسم کی دعا مانگی۔ اب ان کا گھر مریم کے یہاں چلے آنے کے بعد سنسان ہو گیا تھا۔ گو کہ حضرت مریم اپنے حجرے میں منتقل ہو گئی تھیں مگر حضرت زکریاؑ نے ان کی دیکھ بھال جاری رکھی۔

اب یہ عجیب کرشمہ ظہور میں آیا کہ وہ جب بھی حضرت مریم کے پاس حجرے میں پہنچتے تو انہیں وہاں رکھا ہوا کھانا بھی ملتا اور پھل اور میوے وغیرہ بھی۔ یہ پھل موسمی بھی ہوتے اور غیر موسمی بھی۔ یہ چیزیں ایسی نہیں تھیں کہ حضرت زکریاؑ انہیں نظر انداز کر دیتے۔ انہوں نے مریم سے شروع شروع میں تو کچھ نہیں پوچھا لیکن جب کئی بار اسی چیز کا مشاہدہ کیا تو آپ نے ازراہ تعجب حضرت مریم سے پوچھا "بیٹی مریم! میں یہ مسلسل دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے حجرے میں کھانا تو موتا ہی ہے لیکن موسمی اور غیر موسمی پھل اور میرے بھی موجود ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آتی ہیں؟"

حضرت مریم نے فرمایا "یہ چیزیں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے عطا فرماتا ہے' وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔"

اس واقعے کو قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"زکریا جب کبھی حجرے میں آس پاس جاتے تو وہاں کھانا پاتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر وہ ایک دن بولے کہ اے مریم! یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے۔ وہ بولیں کہ خدا کے یہاں سے' بے شک خدا جس کو چاہتا ہے' بے حساب رزق دیتا ہے۔" (آل عمران ۳۷)

مفسرین نے رزق سے مراد علمی صحیفے لیے ہیں جو ظاہری نہیں بلکہ روحانی غذا ہیں۔ حضرت زکریاؑ نے جو یہ مشاہدات بار بار کیے تو انہیں مسلسل حیرت ہوتی رہی کہ موسمی پھل تو خیر کوئی بات نہیں مگر یہ جو غیر موسمی پھل مریم کے حجرے میں ملتے ہیں تو یقیناً یہ غیر معمولی واقعہ ہے اور اس کے پیچھے اللہ کی قدرت کاملہ کار فرما ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔"

حضرت زکریاؑ نے اپنی بیوی الی شبع کو بتایا "بیوی! میں مریم کے حجرے میں جب بھی جاتا ہوں تو وہاں مجھے موسمی اور غیر موسمی پھل موجود ملتے ہیں' میں حیران ہوں کہ مریم پہ خدا کی کیسی نوازشیں ہیں۔"

بیوی نے اپنے شوہر اور اپنے بڑھاپے پر غور کیا تو بڑے کرب سے کہا "اب ہم دونوں بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکے ہیں اور دونوں نے ایک بیٹے کے لیے اپنے رب سے کتنی دعا مانگیں مگر ابھی تک اس سے محروم رہے۔ جب جوانی تھی تو اولاد کی امیدیں تھیں' اب اس بڑھاپے میں ہم کیا اولاد کی امید کریں۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "تم اپنے رب سے مایوس نہ ہو' ہم اب بھی اولاد کی امید کر سکتے ہیں۔"

الی شبع نے کہا "کس طرح؟ لوگ تو مجھے بانجھ کہتے ہیں' شاید اسی لیے میں اولاد سے محروم ہوں۔ جس جوان بانجھ عورت سے جوانی میں کوئی اولاد نہیں پیدا ہوئی تو اس سے بڑھاپے میں کیا امید کی جائے گی۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "بیوی! تم میری باتیں ذرا غور سے سنو' میں نے مریم کے حجرے میں غیر موسمی پھل دیکھے تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اللہ کی قدرت کاملہ سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اگر وہ مریم کو غیر موسمی پھل دے سکتا ہے تو ہم دونوں کو وہ غیر موسمی اولاد بھی دے سکتا ہے۔ آؤ ہم دونوں چپکے چپکے اللہ سے اولاد کے لیے دعا کریں' وہ ہر شے پر قادر ہے۔"

دونوں میاں بیوی خشوع و خضوع سے ایک اولاد کے لیے چپکے چپکے دعا مانگتے رہے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اللہ اب بھی انہیں اولاد دے سکتا ہے۔

دونوں اپنے رب سے کہہ رہے تھے "اے ہمارے پروردگار! ہماری ہڈیاں بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گئی ہیں اور سر کے بال بڑھاپے کی وجہ سے سفید ہو چکے ہیں لیکن اے ہمارے پروردگار! ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تجھ سے مانگ کر ہم کبھی محروم نہیں رہے۔ مجھے تو اپنے بھائی بندوں سے ڈر لگتا ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ میری بیوی بانجھ ہے' وہ مجھے اس طرح تجھ سے اولاد مانگتے دیکھیں گے تو ہم پر ہنسیں گے اسی لیے ہم تجھ سے چپکے چپکے اولاد کی دعا کر رہے ہیں۔ اے اللہ! تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما جو میری اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو اور اے پروردگار اسی اولاد کو خوش اطوار بنائیو۔"

دونوں دعا مانگ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ انہیں دل پر بوجھ نہیں محسوس ہوا۔ دونوں خود کو ہلکا محسوس کر رہے تھے اور دل



دماغ بشاش اور خوش تھے۔ انہیں اچانک طمانیت قلب حاصل ہو گئی تھی۔

وہ حجرے سے دعا مانگ کر نکلے بھی نہیں تھے کہ انہیں کسی کی آواز سنائی دی "اے زکریا! اللہ آپ کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔" حضرت زکریاؑ نے ادھر اُدھر دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کسی نے نہ صرف اولاد کی بشارت دی بلکہ بیٹے کا نام بھی بتا دیا۔

جب کوئی نظر نہ آیا اور اپنے اور اپنی بیوی کے بڑھاپے کا خیال آیا اور یہ بھی کہ بیوی بانجھ ہے تو انہوں نے براہ راست اللہ کو مخاطب کیا "اے میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہو گا کیونکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔"

دوسری طرف سے جواب ملا "اے زکریا! خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے ہم نے تم کو ایک لڑکے کی بشارت دی جس کا نام یحییٰ ہے اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔"

حضرت زکریاؑ نے دوبارہ عرض کیا "اے میرے پروردگار' میرے ہاں لڑکا کس طرح پیدا ہو گا میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔"

دوسری طرف سے جواب ملا "اسی طرح ہو گا' تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ آسان ہے اور میں پہلے تم کو بھی پیدا کر چکا ہوں اور تم کچھ چیز نہ تھے۔"

اسی واقعے کو تحریف شدہ انجیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے مطابق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو لگائے اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کی مذبح کے داہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا اور زکریا دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی مگر فرشتے نے اس سے کہا کہ اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سن لی گئی اور تیرے لیے تیری بیوی الی شبع کے بطن سے بیٹا پیدا ہو گا تو اس کا نام یوحنا رکھنا۔ زکریا نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا کہ اے زکریا میں جبرائیل ہوں اور میں خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں یہاں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوش خبری دوں۔" (انجیل الوقا باب ۱ آیت ۸ تا ۱۹)

حضرت زکریاؑ کو اس بشارت پر خوشی تو ہو رہی تھی مگر حیرت اور استعجاب نے ان کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں درخواست کی "اے اللہ! اس بشارت پر یقین ہے مگر چاہتا ہوں کہ اس عجیب و غریب اور عظیم الشان واقعہ کی کوئی نشانی مقرر فرما دی جائے۔"

انہیں دوسری طرف سے جواب ملا "اے زکریا! جب تم تین دن رات بجز اشارے کے لوگوں سے کوئی کلام نہ کر سکو اور تمہاری زبان خالص ذکر الٰہی کے لیے وقف ہو جائے تو سمجھ لینا کہ استقرارِ حمل ہو گیا۔"

اس واقعے کو قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"عرض کیا پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ فرمایا نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن اشارے کے سوا بات نہ کر سکو گے تو ان دنوں میں تم اپنے پروردگار کو کثرت سے یاد اور صبح و شام اس کی تسبیح کرنا (آل عمران ۴۱)

چنانچہ وہ وقت آ گیا اور حضرت زکریاؑ سے لوگوں سے بات کرنے کی صلاحیت لے لی گئی۔ اب وہ کسی سے بات نہیں کر سکتے تھے لیکن جب وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے تو ان کی قوت گویائی بحال رہتی۔

اس واقعے کو تحریف انجیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"فرشتے نے کہا اور دیکھو جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کو جب اپنے وقت پر پوری ہوں گی' یقین نہ کیا اور لوگ زکریا کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس اس نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہاں سے اشارے کرتا تھا اور گونگا بھی رہا۔" (بالا انجیل لوقا باب ۱ آیت ۲۰ تا ۲۲)

اس واقعے کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ رائے دی ہے کہ بنی اسرائیل میں جب روزہ رکھا جاتا تو یہاں روزے کے اعمال میں خاموشی بھی ایک عمل تھی یعنی حضرت زکریاؑ نے اللہ کی ہدایات پر جب عبادت شروع کی تو انہوں نے روزہ رکھ لیا اور اس طرح وہ تین دن خاموش رہے اور اسی کو بات نہ کرسکنے کی علامت قرار دیا گیا۔

حضرت زکریاؑ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں ولادت ہونے والی ہے تو وہ بے حد خوش ہوئے کیونکہ یہ ایک نادر واقعہ تھا جس کی انہیں پہلے سے ہی بشارت دے دی گئی تھی۔

الی شبع بھی اللہ کی اس مہربانی اور نوازش سے بے حد خوش تھیں اور وہ اللہ کی حمد وثنا میں مشغول رہتیں۔

بنی اسرائیلی بھی حیران تھے کہ ناممکن شے ممکن ہوگئی تھی۔ انہوں نے حضرت مریم کے جھرے میں جو موسمی اور غیر موسمی پھل اور میوے دیکھے تھے' وہی انہیں حیران کررہے تھے تاکہ حضرت زکریاؑ اور الی شبع کے بڑھاپے میں اولاد کی ولادت۔

الی شبع کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا اور حضرت زکریاؑ نے اپنے اس بیٹے کا نام یحییٰ رکھ دیا کیونکہ یہ نام اللہ کی طرف سے تجویز کیا گیا تھا۔

بیٹے کی ولادت پر خوشی سے حضرت زکریاؑ نے بارہ گاؤالٰہی میں حمد وثنا کا جو نذرانہ پیش کیا' اسے انجیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"اور اس کا باپ زکریا روح القدس سے بھر گیا اور نبوت کی راہ سے کہنے لگا۔

خداوند اسرائیل کے خدا کی حمد ہو۔

کیونکہ اس نے اپنی امت پر توجہ کرکے اسے چھٹکارا دیا۔

اور اپنے خادم داؤد کے گھرانے میں۔

ہمارے لیے نجات کا سینگ نکالا۔

(جیسا اس نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کہا تھا

جو کہ دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں)

یعنی ہم کو ہمارے دشمنوں سے۔

اور سب کینہ رکھنے والوں کے ہاتھ سے نجات بخشی

تاکہ ہمارے باپ دادا پر رحم کرے

اور اپنے پاک عہد کو یاد فرمائے

یعنی اس قسم کو جو اس نے ہمارے باپ دادا ابراہیم سے کھائی تھی۔

کہ وہ ہمیں یہ عنایت کرے گا کہ اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر

اس کے حضور پاکیزگی اور راست بازی سے عمر بھر بے خوف اس کی عبادت کریں

اور اے لڑکے تو خدا تعالیٰ کا نبی کہلائے گا۔

کیونکہ تو خداوند کی راہیں تیار کرنے کو اس کے آگے چلے گا۔

جو ان کو گناہوں کی معافی سے حاصل ہو۔

یہ ہمارے خدا کی عین رحمت سے ہوگا۔

جس کے سبب سے عالم بالا کا آفتاب ہم پر طلوع کرے گا۔

تاکہ ان کو جو اندھیرے اور موت کے سائے میں بیٹھے ہیں روشنی بخشے اور ہمارے قدموں کو سلامتی کی راہ پر ڈالے۔"

(انجیل لوقا باب ۱ ۶۷ تا ۷۹)

اس حمد وشکر کے آخری حصے میں حضرت مسیحؑ کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جن کے مناد حضرت یحییٰ تھے۔ اس میں حضرت مسیحؑ کے لیے خداوند کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو یقیناً بعد کی نصرانی تحریف ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک برگزیدہ نبی کی زبان



سے ایک اور نبی کے لیے جو اسی طرح اللہ کا بندہ اور انسان ہے اس قسم کا لفظ ادا ہو سکے۔

اب حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے بعد کار نبوت انجام دینا شروع کیے وہ گمراہ بنی اسرائیلیوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے مگر ان کی قوم انہیں جھٹلاتی رہی۔ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک حضرت زکریاؑ اولاد سے محروم تھے تو اپنی قوم کی طرف اس طرح متوجہ نہیں تھے' وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت زکریاؑ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اس لیے انہیں اپنے ذاتی کاموں میں مشغول رہنا چاہیے مگر حضرت زکریاؑ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو برملا برائیوں سے روکنے لگے تھے' ان کے مخالف سب ہی لوگ تھے۔ وہ تاجروں اور دکان داروں کو غلط سودا بیچنے' زیادہ نفع کمانے' غلط چیزوں کو اس کی پوری قیمت وصول کرنے سے روک رہے تھے تو دوسری طرف وہ یہودی عالموں کو منع کررہے تھے کہ دین میں تحریف نہ کریں اور کسی مسئلے کی تشریح میں اپنی طرف سے ردوبدل نہ کریں۔

ان کی یہ باتیں اب کسی کو بھی پسند نہیں آرہی تھیں اسی لیے احبار دین یہود اور تاجر مل جل کے حضرت زکریاؑ کی مخالفت کرنے لگے۔ یہ سب حضرت زکریاؑ کو بالواسطہ دھمکیاں دینے لگے۔

حضرت زکریاؑ کے مزاج میں نبوت کی استقامت تھی اس لیے انہیں کسی کا ڈر نہ تھا۔ وہ کسی سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے تاجروں سے کہا "تمہارے دلوں سے ایمان نکل گیا اس کی جگہ بے ایمانی نے لے لی۔ تمہارے دلوں سے اللہ کا خوف نکل گیا اس کی جگہ شیطان کے مکر اور ریا نے لے لی' میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اپنی اصلاح کرلو ورنہ تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔"

آپ عالموں سے کہتے "تم لوگ دینی مسائل کی غلط ترجمانی کرتے ہو۔ ایسا مت کرو ورنہ اللہ تمہیں بھی ذلیل وخوار کرے گا۔"

علمائے یہود نے حضرت زکریاؑ کی مخالفت شروع کردی اور وہ ان سے پوچھتے تھے کہ تم تو ہم میں سے نہیں ہو۔ یعنی ہم اپنے دین کے عالم ہیں۔ سند دیتے ہیں' دینی معاملات کی تشریح ہم کرتے ہیں' اسے مستند سمجھا جاتا ہے۔ تم کس حیثیت سے بات کرتے ہو۔

حضرت زکریاؑ کہتے "میں اللہ کا نبی ہوں اور مجھے اسی لیے تم میں بھیجا گیا ہے کہ تم دینی مسائل کی غلط تشریح کرتے ہو۔ تم قوم کو صحیح راہ نہیں دکھاتے' اسے گمراہ کرتے ہو۔"

تاجروں نے علماء سے اتحاد کرلیا تھا۔ انہیں کاروباری معاملات میں حضرت زکریاؑ کی مداخلت بہت بری لگتی تھی۔ وہ ان سے وہی پرانی باتیں کہتے تھے جو حضرت صالحؑ کی قوم ثمود ان سے کہا کرتی تھی۔ حضرت شعیبؑ کی قوم مدین میں بھی یہی کچھ کہتی رہی تھی۔ ان تاجروں نے حضرت زکریاؑ سے کہا "جب ہم اپنی چیزوں کے مالک ہیں اور ہمیں ان پر اچھا برا اختیار حاصل ہے تو ہم اسے مفت میں دے دیں یا قیمتاً فروخت کردیں کسی اور کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے پھر تم کیوں دخل دیتے ہو؟"

حضرت زکریاؑ نے کہا "لوگو! میں کب کہتا ہوں کہ تم اپنی چیزوں کے مالک اور مختار نہیں ہو۔ ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں کہ تم اپنی کوئی چیز کسی کو مفت کیوں دیتے ہو یا اس کی قیمت کیوں وصول کرتے ہو۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ تم اپنی عیب دار چیز پوری قیمت پر فروخت نہ کرو' میں یہ بھی کہتا ہوں کہ تم بہت زیادہ منافع نہ لو اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ تم کسی کی احتیاج اور ضرورت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔"

تاجروں نے کہا "اب تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو اور شاید تم سے اپنی تجاری کام بھی صحیح طور پر نہیں ہوتا شاید اسی لیے تمہارے پاس باتیں کرنے کا بہت وقت ہے۔ اپنے اس فضول اور فالتو وقت کو اپنے بیٹے یحییٰ کی پرورش میں صرف کرو تو بہتر ہے۔"

ان تاجروں نے حضرت زکریاؑ کی شکایت اپنے علما سے کی اور کہا "آپ لوگ زکریا کو اپنے طور پر منع کریں کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل دینے سے باز رہیں ورنہ ہم ان سے بہت بری طرح پیش آئیں گے۔"

علمائے یہود نے حضرت زکریاؑ کو سمجھایا "بزرگوار! ہم پہلے بھی آپ کو سمجھا چکے ہیں کہ اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ آپ نجار ہیں اور لکڑی سے چیزیں بناتے رہتے ہیں۔ سچ بتائیں کہ کسی تاجر یا عالم نے کبھی آپ کے کاموں میں دخل دیا کہ آپ

دروازہ کتنے میں بناتے ہیں یا چوکھٹ کتنے میں تیار کرتے ہیں پھر آپ تاجروں کے معاملات میں کیوں دخل دیتے ہیں اس طرح تو آپ سب کو اپنا دشمن بنالیں گے۔"

حضرت زکریاؑ نے عالموں کی عقل پر افسوس کیا "لوگو! تم کیسی عامیانہ بات کرتے ہو۔ میں نے اب تک کسی سے محنت کا زیادہ معاوضہ نہیں لیا اگر زیادہ معاوضہ لیتا تو میں ظالم کہلاتا اور تم لوگ میری بات ہرگز نہ سنتے لیکن میں جنہیں برائیوں سے روک رہا ہوں، وہ اس کے مستحق ہیں اور میں فریضہ نبوت انجام دینے کا پابند ہوں۔"

عالموں نے کہا "زکریا تم نہیں جانتے کہ اگر قوم متحد ہوگئی اور انہوں نے تمہارے خلاف متحدہ کارروائیاں شروع کردیں تو تم ضعیف اور کمزور شخص ہو ان کا مقابلہ کس طرح کرو گے؟"

حضرت زکریاؑ نے کہا "تم بھی کیسے سادہ دل اور نادان لوگ ہو تم بار بار میرے بڑھاپے کا ذکر کرکے مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہو جب کہ میں تم سے بار بار یہ کہتا ہوں کہ میں نبی ہوں اور میں اپنے اللہ پر بھروسا کرتا ہوں۔ مجھے وہیں سے یہ قوت ملی ہے کہ مجھے نہ تو تاجروں سے ڈر لگتا ہے اور نہ تم عالموں سے اور نہ ہی تم دونوں کے اتحاد سے۔"

علما نے مایوسی سے کہا "ٹھیک ہے جناب، آپ ہماری بات نہیں مانیں گے تو مصیبت میں پڑجائیں گے۔ ہم تو آپ کے مہربان دوست، ہم وطن، ہم مذہب اور ہمدرد لوگ ہیں۔ ہمیں آپ کی ضعیفی کا احساس ہے اگر آپ پر کوئی ظلم کرے گا تو ہمیں افسوس ہوگا۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "تم ہم پر افسوس نہ کرو اور نہ ہم سے ہمدردی رکھو۔ تم دینی مسائل کی صحیح تشریح کرتے رہو کیونکہ تمہاری گمراہی قوم کو گمراہ کردے گی اور تمہارے گناہ میں قوم کے دوسرے گناہ گاروں کے مقابلے میں زیادہ اضافہ ہوجائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ یوم الحساب میں تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑے اور تم عذاب جھیلو۔"

علما نے کہا "ہم تو تمہاری بھلائی اسی دنیا میں چاہتے ہیں اور تم ہمیں آخرت کے عذاب سے ڈرا رہے ہو۔ اس آخرت کے عذاب سے جسے کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے یوم الحساب دیکھا ہے۔ اب ہم دونوں کی راہیں الگ الگ ہوگئی ہیں۔ تم اپنا کام کرتے رہو، ہم اپنا کام کرتے رہیں گے مگر تم ایک نکتہ ضرور ذہن نشین کرلو کہ اس ماحول اور معاشرے میں تم تنہا ہو، اکیلے ہو، ایک چند سالہ بچہ تم سے اتفاق کرسکتا تھا مگر تمہاری طرح وہ بھی کمزور ہے اور تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ تمہارے مقابلے میں ہم سب ہیں، پوری قوم ہے، آخر تم کس کس سے لڑو گے، کس طرح لڑو گے اور کب تک لڑو گے۔"

حضرت زکریاؑ دیکھ رہے تھے کہ ان ظالموں کے دل پتھر کے ہیں یا ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کے دماغ صحیح بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں اپنا فائدہ تو نظر آتا ہے مگر دوسرے کے نقصان پر ان کی نظر نہیں جاتی۔

آپ کی بیوی الی شیع آپ کو بہت پریشان دیکھ رہی تھیں، انہیں اپنے شوہر سے ہمدردی تھی، محبت تھی مگر انہیں ان کے کام سے روک نہیں سکتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ حضرت زکریاؑ جو کچھ کررہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے سونپی گئی نبوت کی ذمے داری ہے۔"

"حضرت زکریاؑ نے بیوی کو بتایا "ظالموں نے ایکا کرلیا ہے۔ تاجر اور عالم متحد ہوگئے ہیں، کاش ان کا یہ اتحاد نیکی کے لیے ہوتا مگر وہ سب برائیوں میں متحد الخیال ہیں، ان پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ بتاؤ میں کیا کروں۔"

بیوی نے سمجھایا "آپ کو جو کچھ کرنا ہے، کرتے رہیے نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دیجیے۔"

حضرت زکریاؑ نے کہا "میں ان سے فرداً فرداً بات کرتا ہوں تو وہ مجھ سے تمسخر کرتے ہیں اور میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ بتاؤ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں اور انہیں کس طرح راہِ راست پر لاؤں۔"

بیوی نے کہا "آپ ہیکل کے سامنے کھڑے ہوجایا کریں وہاں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں، آپ ان سب کو مخاطب کیا کریں، اگر آپ کی باتوں کا چند افراد پر بھی اثر ہوجائے تو یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہوگی اور وہ چند افراد دوسروں کو سدھارنے کی کوشش کریں گے اور آپ کے معاون و مددگار بن جائیں گے اس لیے آپ مایوس نہ ہوں اور کارِ نبوت انجام دیتے رہیں۔"



حضرت زکریاؑ نے اب یہی طریقہ اختیار کیا کہ جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا وہیں وعظ شروع کردیتے لیکن یہ کوشش بھی کارگر نہ ہوئی۔

ان کی سب سے زیادہ مخالفت تاجر کرتے تھے اور تاجروں کی حمایت میں علما آگے آجاتے تھے ان علما کو تاجروں کی طرف سے فائدے حاصل ہوتے رہتے تھے۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت زکریاؑ نے وہاں بولنا شروع کردیا جہاں برائیاں ہورہی تھیں۔ یعنی وہ تاجروں اور گاہکوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے۔ اگر تاجروں کی کسی چیز کا نقص ان کے علم میں آجاتا تو وہ اس نقص کو گاہک پر ظاہر کردیتے اور سودا بگڑ جاتا۔

ایسے موقعوں پر تاجروں کو بڑی تکلیف پہنچتی اور وہ مشتعل ہوکر کہتے "زکریا باز آجاؤ ورنہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کرے گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

حضرت زکریاؑ نے جواب دیا "تمہاری پہنچائی ہوئی کوئی تکلیف آخرت کے دردناک عذاب سے زیادہ نہیں ہوسکتی اس لیے میں اپنا کام جاری رکھوں گا اور دعاکروں گا کہ اللہ تمہیں صحیح راہ دکھائے اور اس پر چلائے۔"

ان تاجروں نے عالموں سے مدد کی درخواست کی اور کہا "یہ بوڑھا تو ہمیں کاروبار بھی نہیں کرنے دیتا، ہر جگہ پہنچ جاتا ہے اور ہمارے گاہکوں کو ورغلاتا ہے اس کا کوئی علاج ہونا چاہیے۔"

عالموں کو حیرت تھی کہ ان شاطر اور چالاک لوگوں کا ایک بوڑھے پر بس نہیں چلتا۔

ایک عالم نے کہا "جب تم لوگ ہم سے مدد مانگتے ہو تو ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کیونکہ تم دنیا بھر کے لوگوں کو قابو میں کرلیتے ہو مگر ایک بوڑھے آدمی پر قابو نہیں پاتے۔"

تاجروں نے کہا "جناب بات صرف اتنی ہی ہے کہ ہم ایک بوڑھے کو وہ اذیت نہیں دینا چاہتے جس کا وہ اپنے برے کاموں کی وجہ سے مستحق ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔"

ایک عالم نے حضرت زکریاؑ کا مذاق اڑایا "وہ تو یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس روح القدس آتے ہیں اور اس میں سما جاتے ہیں اور وہ جو بات بھی کرتا ہے، من جانب اللہ ہوتی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت اس کے کام سے نہیں روک سکتی۔"

ایک انتہائی شریر تاجر نے کہا "اس کے لیے اکیلا میں کافی ہوں۔ تم لوگ مجھے اجازت دے دو۔ میں اس کا کام تمام کردوں گا۔"

ایک عالم نے کہا "تو ہمیں بہت زیادہ بھولا انسان لگتا ہے۔ میں سچ بتاتا ہوں کہ بظاہر تو یہ شخص بہت معصوم اور تنہا ہے اور غریب غربا اس کے ہم خیال ہونے کے باوجود اس کا ساتھ یوں نہیں دیتے کہ وہ تم سے ڈرتے ہیں ورنہ یہ یقین رکھو کہ تم جب بھی زکریاؑ کو کوئی سزا دو گے یا اسے تکلیف پہنچاؤ گے تو یہ غریب اس کا ساتھ ضرور دیں گے اور میں تم دونوں کے اس تصادم سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ کوشش کرو کہ یہ معاملہ باتوں سے سلجھ جائے۔"

تاجر نے عالم کو طعنہ دیا "تم خیالی لوگ ہو جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہو، اسی سے کم حد تک عملی میدان رہتے ہو مگر ہم پڑھتے کچھ نہیں مگر ہر وقت عملی میدان میں رہتے ہیں۔"

یہ تاجر، عالموں کو حضرت زکریاؑ کے خلاف اکساتے رہتے تھے اور چونکہ تاجروں کا مفاد عالموں کو راضی رکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور عالموں کا مفاد تاجروں سے وابستہ تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کے ہم خیال رہتے تھے۔ جب صبح شام حضرت زکریاؑ کے وعظوں کا سلسلہ جاری رہا اور معاشرہ کے دونوں اہم طبقوں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت زکریاؑ عام لوگوں کو عالموں کے ریا اور تاجروں کے جھوٹ سے آگاہ کردیں گے اور یہ روش کسی بڑے انقلاب کا سبب بن جائے گی تو دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا جائے لیکن یہ کام وہ اتفاق رائے سے کرنا چاہتے تھے۔

ان کے اس منصوبے کی خبر حضرت زکریاؑ کو بھی ہوگئی اور جنہیں حضرت زکریاؑ سے محبت تھی مگر کمزور تھے اور وہ مصلحتاً ان

دونوں طبقوں کی مخالفت مول نہیں لے سکتے تھے انہوں نے حضرت زکریاؑ کو آگاہ کردیا کہ آپ اپنے گھر میں نہ رہیں کیونکہ کچھ لوگ آپ کی جان کے پیاسے ہیں۔ کسی وقت بھی گھر میں گھس کے قتل کردیں گے۔

حضرت زکریاؑ نے بہت غور کیا کہ ان پیچھا کرنے والے قاتلوں سے کس طرح بچا جائے۔

چونکہ حضرت زکریاؑ کا پیشہ نجاری تھا اس لیے انہیں جنگل میں پناہ لینے کی سوجھی لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ مخالف انہیں جنگل سے ڈھونڈ نکالیں گے تو اس جنگل میں بھی کوئی ایسی خفیہ جگہ ہونی چاہیے جہاں وہ تلاش کے باوجود نہ پاسکیں۔

حضرت زکریاؑ کو یاد آیا کہ جب وہ درختوں سے لکڑیاں کاٹ کر حاصل کرتے تھے تو ان میں ایک ایسا تناور درخت بھی تھا جو بیچ سے دیکھنے میں قد آور تنا رکھتا تھا مگر اوپر چڑھ کر دیکھا جاتا تو اس میں ایک کشادہ اور گہرا خلا تھا اگر کوئی شخص اس تنے میں اتر جاتا تو اسے کبھی بھی لوگ نہ پکڑپاتے۔

حضرت زکریاؑ نے اس تنے میں رہنے کے لیے جگہ بنائی تاکہ اندر داخل ہونے اور نکلنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

حضرت زکریاؑ کچھ دن تو جنگل میں پناہ لیتے رہے اس کے بعد آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد گھر تو جاتے مگر وہاں سے نکل کر چپ چاپ تنے میں روپوش ہوجاتے۔

ان کی قوم کے لوگوں نے ان کے مکان کو گھیراؤ کیا تاکہ حضرت زکریاؑ کو گھر سے نکال کے قتل کردیں مگر حضرت زکریاؑ گھر میں نہیں ملے۔

انہوں نے بیوی الی شبع سے پوچھا "آج کل زکریا کیا گھر پر نہیں رہتے۔"

الی شبع نے جواب دیا "وہ گھر میں بھی نہیں رہتے ہیں اور گھر کے باہر بھی ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔"

گھیراؤ کرنے والوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ زکریاؑ کو گھر پر نہ مارا جائے کیونکہ یہاں ان کے حامی بھی مقابلے پر آسکتے ہیں اس لیے ان کا دوسرا ٹھکانا معلوم کیا جائے۔

حضرت زکریاؑ کے مخالفین نے اپنا ایک آدمی حضرت زکریاؑ کے تعاقب میں لگادیا اور کہا "ان کا ٹھکانا دیکھ لو تاکہ ہم وہاں پہنچ کے خاموشی سے زکریاؑ کا کام تمام کردیں۔"

اس آدمی نے نہایت خاموشی سے حضرت زکریاؑ کا پیچھا کیا اور جنگل میں اس تنے تک پہنچ گیا جہاں حضرت زکریاؑ پناہ لیا کرتے تھے۔

اس نے حضرت زکریاؑ کو ایک درخت کی آڑ میں جاتے دیکھا اور پھر حضرت زکریاؑ غائب ہوگئے۔ وہ دیر تک جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا اور جب کہیں حضرت زکریاؑ نہ ملے تو اس نے آبادی میں آکے یہ روداد سنادی اور کہا "جناب وہ تو مجھے جادوگر لگتے ہیں کہ درخت کی آڑ میں گئے اور غائب ہوگئے۔"

یہودیوں کو اس شخص کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ درخت کی آڑ میں جاکے غائب ہوجانا بڑی عجیب وغریب بات تھی گویا زکریاؑ کو جادو آتا تھا کہ وہ جادو کے زور سے غائب ہوجاتے تھے۔

یہ چکر کچھ دنوں یونہی چلتا رہا حضرت زکریاؑ اب بھی وعظ وتلقین کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور لوگوں کے ہجوم میں انہیں قتل کردینا ممکن نہیں تھا۔

آخر ان کی قوم کے شرّی اور مجرمانہ دماغ رکھنے والوں نے فیصلہ کیا کہ ذکر کا پیچھا کرکے ان کا ٹھکانا دیکھ لیا جائے۔ یہ چند سرکش اور فسادی صبح وشام تک ان کے ساتھ لگے رہے۔

حضرت زکریاؑ گھر آگئے تو یہ باہر چھپ کر ان کے نکلنے کے منتظر رہے یہاں تک کہ وہ جیسے ہی باہر نکلے، یہ دور سے ان کے پیچھے ہولیے۔ چلتے چلتے جنگل آگیا اور حضرت زکریاؑ اس جنگل میں کہیں غائب ہوگئے۔ اب ان کی نہایت شدومد سے تلاش شروع ہوگئی۔

ان سب کا بھی یہی کہنا تھا کہ انہوں نے حضرت زکریاؑ کو ایک درخت کے پیچھے جاتے دیکھا اور پھر انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھاگیا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ آخر یہ مسئلہ دوسرے دن پر چھوڑ دیا گیا اور کہا "دوستو! اس بڑے تناور درخت کو یاد رکھو کل جب ہم زکریاؑ کا پیچھا کریں گے تو اس درخت پر خصوصی توجہ رکھیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ زکریاؑ یہاں سے کس طرح غائب



ہوجاتے ہیں۔"

چنانچہ ایک بار پھر حضرت زکریاؑ کو لاعلم رکھ کے ان کا پیچھا کیا گیا۔ انہیں کئی بار یہ احساس ہوا کہ جیسے کوئی ان کا پیچھا کررہا ہے۔ پیچھا کرنے والا کوئی ایک شخص نہیں کئی ہیں۔

وہ اس بار چھپتے چھپاتے بچتے بچاتے اس درخت تک پہنچ گئے اور تنے سے کہا "اے میری پناہ گاہ کھل جا تنے! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، میرے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں تو مجھے چھپالے تاکہ یہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں۔"

وہ ایک بار پھر تنے میں غائب ہوگئے اور لوگ انہیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اب ان سب کو حیرت تھی کہ حضرت زکریاؑ آخر کہاں چلے جاتے ہیں۔

ان کی جستجو کے دوران میں ایک شخص پر ان کی نظر گئی، یہ شخص بس تنے کو گھورے جارہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "تم اس تنے پر کیا دیکھ رہے ہو۔"

اس نے جواب دیا "جناب میں نے زکریاؑ کو روپوش ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

کچھ لوگوں نے بے قراری سے پوچھا "ہمیں بھی ان کا راستہ بتاؤ تاکہ ہم بھی انہیں دیکھیں اور سزا دیں۔"

اس شخص نے کہا "اگر میں ان کا پتا بتادوں تو تم زکریاؑ کے ساتھ کیا سلوک کروگے۔"

یہودیوں نے جواب دیا "ہم انہیں ہلاک کردیں گے کیونکہ اس شخص نے ہم سب کو بے حد پریشان کررکھا ہے۔"

چند یہودیوں کو اس اجنبی شخص پر حیرت تھی کہ یہ کون ہے جو اپنی بستی کا نہیں معلوم ہوتا مگر اسے زکریاؑ کے مقابلے میں ان سے ہمدردی ہے۔

ایک یہودی نے پوچھا "تم کون ہو اور تمہیں زکریاؑ کے بجائے ہم سے ہمدردی کیوں ہے؟"

اس شخص نے کہا "تمہیں میری جتنی مدد درکار ہے، میں کرنے کو تیار ہوں اب رہے یہ سوال کہ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں، یہ وقت ضائع کرنے والے سوال ہیں۔ تم زکریاؑ کا ٹھکانا دیکھ لو اور میں صرف اسی لیے یہاں آیا ہوں۔"

ایک یہودی نے حیرت سے کہا "جناب کمال تو یہ ہے کہ ہم صبح سے زکریاؑ کا پیچھا کررہے ہیں ہم چاہتے تو شہر میں بھی زکریاؑ کو قتل کردیتے مگر ہم اپنی بستی میں کوئی انتشار پسند نہیں کرتے اس لیے ہم نے کئی دن سے یہ فیصلہ کررکھا ہے کہ زکریاؑ کو بستی کے باہر ان کی پناہ گاہ میں قتل کیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ انہیں یہاں تک تو آتے ہوئے دیکھا جاتا ہے مگر پھر اچانک کہاں غائب ہوجاتے ہیں، کچھ علم نہیں ہوتا۔"

اس شخص نے درخت کے نیچے لے جاکے تنے کے اوپر اشارہ کیا "دیکھو وہاں تمہیں کچھ نظر آتا ہے۔"

یہودیوں نے اوپر دیکھا تو زکریاؑ کے لباس کا کچھ حصہ اوپر تنے سے لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

یہودیوں نے کہا "بے شک، زکریاؑ نے اسی قسم کا اور اسی رنگ کا لباس پہن رکھا ہے۔"

اس شخص نے کہا "زکریاؑ نے اس درخت کے تنے کے اندر پناہ لے رکھی ہے۔ تنے کا خلا باہر سے دکھائی نہیں دیتا اس وقت زکریاؑ سے چوک ہوگئی کہ ان کے لباس کا کچھ حصہ باہر رہ گیا اور میں نے اسے دیکھ لیا۔"

یہودیوں کو اس شخص کی ایک ایک بات عجیب لگ رہی تھی۔

اس شخص نے مزید کہا "زکریاؑ سے سہواً یہ بھول ہوگئی کہ انہوں نے اس مصیبت میں اس درخت کے تنے سے پناہ مانگی حالانکہ انہیں اللہ کو یاد کرنا چاہیے تھا کیونکہ اللہ کی مخلوق، مخلوق کو کیا پناہ دے گی۔"

اب یہودیوں میں بحث چھڑ گئی کہ حضرت زکریاؑ کو کس طرح نکالا جائے۔

اس شخص نے مشورہ دیا "دیکھو میری مانو تم سب ابھی تک یہی چاہتے تھے کہ زکریاؑ کو قتل کردو مگر تم پر اس قتل کا الزام نہ آئے۔ وہ نجار ہیں تم بھی ان کے پیشے کا فائدہ اٹھاؤ درخت کو کاٹنے والا آرا لے آؤ اور اس تنے کو کاٹ دو۔ زکریاؑ تنے کے ساتھ خود بہ خود کٹ جائیں گے۔"

یہودی حیران تھے کہ اس جیسا شخص ان کے پورے شہر میں نہیں ملے گا۔ اتنا ذہین، اتنا چالاک، اور اتنا کینہ پرور۔ ان کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ان شخص کو زکریاؑ سے اتنا عناد کیوں ہے۔

ایک یہودی نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا "دوست تم نے ہمارا کسی لالچ کے بغیر اتنا ساتھ دیا' اب تو اپنا تعارف کروا دو۔"

اس شخص نے کہا "تم نے عزازیل کا نام تو سنا ہوگا وہی جو کبھی معلم الملکوت ہوا کرتا تھا مگر آدم کو سجدہ نہ کرنے کی نافرمانی کی سزا میں راندہ درگاہ خداوندی ہوا اور اب تم لوگ اسے ابلیس اور شیطان کہتے ہو' میں زکریا جیسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ شخص غائب ہوگیا اور فوری طور پر یہودیوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون تھا اور یہ جو اپنا تفصیلی تعارف کروا گیا ہے وہ کیا ہے۔

بالآخر ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ شیطان تھا جو ان کے شیطانی افعال میں ان کا مددگار بنا ہوا تھا۔

یہودی ایک بڑے آرے کی تلاش میں بستی میں گئے اور وہاں سے آرا لیا پھر یہ آرا درخت کے تنے پر چلنے لگا۔

اندر حضرت زکریاؑ نے محسوس کرلیا کہ تنے کو آرے سے کاٹا جارہا ہے۔

حضرت زکریاؑ نے اللہ سے مدد چاہی تو انہیں اپنے سامنے وہی شخص نظر آیا جس نے یحییٰ کی پیدائش کی بشارت دی تھی اور بتایا تھا کہ میں جبرائیل ہوں۔

حضرت زکریاؑ نے حضرت جبرائیلؑ سے کہا "جبرائیل! تم دیکھ رہے ہو کہ میری قوم میرے ساتھ کیا سلوک کررہی ہے؟"

حضرت جبرائیلؑ نے کہا "اے زکریا! اب آپ خاموش رہیں اور جو کچھ ہورہا ہے' اسے ہوجانے دیں' صبر کریں اور اس مصیبت کو جھیل جائیں آپ نے اس تنے سے پناہ مانگی تھی سو اس نے دے دی۔ مگر اب جو اس تنے پر آرا چل رہا ہے' یہ تو اس آرے سے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اللہ کو آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ اللہ کے بجائے تنے سے پناہ مانگیں۔"

آرے نے تنے کے ساتھ حضرت زکریاؑ کو بھی چیر ڈالا۔

اس واقعے کو مشہور یہودی عالم وہب بن منبہ نے اسی طرح تفصیل سے بیان کیا تھا یہ مسلمان ہوگئے تھے اور اس قسم کی تفصیلات کو اپنی آبائی یہودی کتابوں کے حوالے سے بیان کیا کرتے تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو آرے سے نہیں چیرا گیا تھا مگر حضرت مسیحؑ نے اپنی تقریروں اور خطابوں میں حضرت زکریاؑ کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔

یہودیوں نے حضرت زکریاؑ سے پہلے بھی اپنے نیک اور اچھے رہنماؤں کو شہید کیا تھا مگر بعد میں ان کے اخلاف نے شہید ہونے والوں کے مزار بنوائے اور ان کی بے پناہ عزت و تکریم کی جس سے یہ بات ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت زکریاؑ کو واقعی شہید کیا تھا۔

انجیل متی میں حضرت مسیحؑ نے یہودیوں سے خطاب فرمایا۔

"اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو' غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھردو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راست باز' ہابیل کے خون سے لے کر برقیاہ کے بیٹے زکریا (علیہ السلام) کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا ہے' میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔" (انجیل متی باب۔ ۲۳ آیت ۲۹ تا ۳۶)

مضمون کے مناظرہ

قصص القرآن — خواجہ احمد الدین
انبیائے قرآن — جمیل احمد
جادۂ فلسطین و شام — جی۔ ای سارجنٹ
قصص القرآن — حافظ محمد ادریس
ترجمان القرآن — مولانا آزاد
عہد نامۂ جدید



اس معاشرے کا المیہ جو دُنیا کو انسانی مساوات کا درس دیتا رہا

نفسا نفسی کے اس دور میں کسی ہمدرد و غم گسار کی تلاش میں سرگرداں ایک بوڑھے کوچوان کا قصۂ غم۔ روسی ادب سے انتخاب۔

انتون چیخوف/ارشاد احمد شیخ

# فسانۂ غم

چہار طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ برف آہستہ آہستہ تازہ روشنی کیے ہوئے فانوسوں کے اوپر چکر لگا رہی تھی۔ مکانوں کی چھتوں' گھوڑوں کی پیٹھ' آدمیوں کے کاندھوں اور ٹوپوں پر برف کے نرم اور پتلے تہ چڑھتی جارہی تھی۔ تانگے والا ایونا پوناتو بالکل سفید ہوگیا تھا اور بھوت لگ رہا تھا۔ وہ اتنا جھک گیا تھا جتنا ایک آدمی جھک سکتا ہے۔ وہ اپنے تانگے میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی بھی حرکت پیدا نہیں ہورہی تھی۔

ایسے لگ رہا تھا کہ اگر ساری برف اس کے اوپر گر گئی تو بھی وہ اسے اتار کر جھٹکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ اس کا چھوٹا گھوڑا بھی سفید ہو گیا تھا اور چپ کھڑا تھا۔ وہ آنے دو آنے بکنے والا کاٹھ کا گھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ کسی کو بھی اگر آرام دہ گھر سے بستر میں سے اٹھا کر' ایسے ماحول میں پھینک دیا جائے' جس میں بھیانک روشنی دینے والی بتیاں' نہ ختم ہونے والا شور اور لوگوں کی دھکم پیل ہو تو شاید کوئی بھی اپنے آپ کو کسی خیال میں گم ہونے سے نہ روک سکے گا۔ کافی وقت ایونا اور اس کا گھوڑا وہاں سے ہلے ہی نہ تھے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ اپنا گھر چھوڑ آئے تھے اور اس وقت تک کوئی سواری نہیں لگی تھی۔ شام کی دھند شہر پہ گر رہی تھی۔ بتیوں کی سفید روشنی بڑھتی جا رہی تھی اور شہر کا شور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

"ویرگ تک تانگا۔" اچانک ایونا کے کانوں میں ایک آواز سنائی دی۔ ایونا اٹھا اور دیکھا تو ایک افسر سر پر ہیٹ اور جسم پر اوور کوٹ پہنے کھڑا ہے۔

"ویرگ روڈ۔" افسر نے دہرایا "ارے! تم سوئے ہوئے ہو کیا؟"

"ویرگ روڈ۔" ایونا نے سر ہلا کر' باگیں کھینچیں۔ گھوڑے کے کاندھے اور پیٹھ پر چڑھی ہوئی برف پھسل کر نیچے گرنے لگی۔ افسر سلیج میں بیٹھ گیا۔ تانگے والا بلا ضرورت بوجھ عادت ہنٹر لہرانے لگا۔ چھوٹے گھوڑے نے اپنا سر آگے کیا اور اپنی کاٹھ جیسی ٹانگوں پر زور دے کر' سوائے کسی فیصلے کے آگے چلنے لگا۔

"ارے اندھے! کیا کر رہے ہو؟" لوگوں کی چیخیں' راستے سے گزرنے والے منہ سے نکل کر ایونا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

"ارے بدمعاش! تانگا کہاں چلا رہے ہو؟ تمہیں تو تانگا چلانا بھی نہیں آ رہا ہے۔ دائیں طرف چلو۔" افسر نے غصے میں کہا۔

ٹیکسی والے نے گالیاں دیں' قریب سے گزرنے والا آدمی' جس کو گھوڑے نے کچل ہی دیا تھا۔ راستے سے بھاگ کر ہٹا اور کونے میں کھڑا ہو کر اپنے کوٹ سے برف اتارتے ہوئے اس کو گھورنے لگا۔ ایونا اپنے تانگے میں یوں پہلو بدل رہا تھا جیسے کانٹوں پہ بیٹھا ہوا ہو۔ اپنی گنی ایسے ہی اِدھر اُدھر کر رہا تھا جیسے اپنا وزن برابر کر رہا ہو۔ ایسے منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو اور جیسے اس کو علم ہی نہ ہو کہ وہ کیوں اور کس لیے یہاں بیٹھا ہو۔

"یہ سب کیسے بدمعاش ہیں۔" افسر نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ سب مل کر تمہارے خلاف سازش کر رہے ہوں کہ تمہیں اتار کر پھینک دیں یا تمہیں گاڑی کے نیچے پھینک دیں۔"

ایونا نے مڑ کر افسر کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ ہلائے۔ دیکھنے میں ایسے آ رہا تھا کہ یہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن اس کے حلق میں سے صرف ہلکی آواز نکلی۔

"کیا؟" افسر نے پوچھا۔

ایونا اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لے آیا اور بڑی مشکل سے کرخت آواز میں بولا "میرا بیٹا بارن اس ہفتے مر گیا۔"

"ہوں۔ کیسے مرا؟"

ایونا اپنا سارا جسم افسر کی جانب پھیر کر کہنے لگا "کسی کو کیا پتا؟ کہتے ہیں بڑے بخار کی وجہ سے۔ وہ تین دن اسپتال میں تھا اور پھر مر گیا۔ اللہ کا حکم ٹل نہیں سکتا۔"

"بدمعاش' سر سیدھا کر کے بیٹھو۔" اندھیرے میں سے آواز آئی "بوڑھے کتے! نشے میں دھت ہو گیا؟ ابے! آنکھیں تو کھول کر بیٹھ۔" تانگا جہاں جہاں سے گزر رہا تھا ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں۔

"چل۔ چل۔" افسر نے کہا "نہیں تو وہاں کل تک بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ تھوڑا تیز چل۔" تانگے والے نے پہلے سر سیدھا کیا اور سیدھا بیٹھ گیا اور منہ پھلا کر ہوا میں ہنٹر گھمانے لگا۔ کئی بار اس نے مڑ کر اپنی سواری کی جانب دیکھا لیکن وہ اپنی آنکھیں ہی بند کر کے بیٹھا تھا اور ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی بات ہی سننا پسند نہیں تھا۔ اس نے افسر کو ویرگ روڈ پر اتارا اور ایک مے خانے کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی گدی پر پھر کھڑا ہو گیا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔ برف پھر اس کے جسم اور گھوڑے پر گرنے لگی۔ ایک گھنٹا' دو گھنٹے۔۔۔ پھر فٹ پاتھ پہ جوتوں کو ٹھکتے' ہنسی میں لڑتے جھگڑتے تین نوجوان آئے۔ ان میں دو لمبے اور پتلے تھے اور ایک چھوٹے قد کا کبڑا تھا۔

"پولیس اسٹیشن تک تانگا چاہیے۔" کبڑے نے کہا۔ "تینوں کے لیے تین روبل۔"

ایونا نے باگیں تھامیں اور گھوڑے کو سنبھالا۔ تین روبل مناسب کرایہ نہیں تھا لیکن جہاں تک کرائے کا سوال تھا تو اس کی ایونا کو پروا نہیں تھی۔ نوجوان اک دوسرے کو دھکیلتے' گالیاں دیتے ایک ہی دم اکٹھے تانگے میں چڑھنے لگے تو ان میں اس بات پر تو تو میں میں شروع ہو گئی کہ کھڑا کون رہے۔ آخر کار گالیوں سے مزین بحث و مباحثے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ کبڑا کھڑا رہے گا کیونکہ وہ سب میں چھوٹا تھا۔

"چلو۔ اب جلدی کرو۔" کبڑے نے پائیدان پر کھڑے ہوئے کہا۔

"اب بوڑھے! تمہاری ٹوپی کیسی ہے۔ شاید اس سے بدصورت چورے پٹسبرگ میں نہیں ملے گی۔"

"ہا۔ ہا۔" ایونا ہنسا "ایسی۔۔۔"

"ارے مستی مارے' جلدی کرو۔ کیا سارا راستہ اسی رفتار سے چلو گے؟ گھوڑے کو ہنٹر مارو۔"

"میرا سر پھٹ رہا ہے۔" ایک دبلے نے کہا "گزشتہ رات میں نے شراب کی چار بوتلیں پی ڈالیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔" دوسرے دبلے نے غصے میں کہا۔

"خدا کی مار پڑے' اگر یہ جھوٹ ہو۔"

"یہ ایسا سچ ہے جیسے کہا جائے کہ چیونٹی ہنسی۔"

"ہا۔ ہا۔" ایونا نے دانت نکالے "کتنے نہ زندہ دل ہیں۔"

"ابے بڈھے! چلو گے بھی یا ایسے ہی تانگا چلاتے ہو؟ ہنٹر مارو۔ تیز چلو۔" کبڑا بولا۔

ایونا نے کبڑے کو غصے سے دیکھا اور اس کی آواز میں دکھ محسوس کیا۔ اس نے ان کی بدکلامی کو سنا' راستے پر چلتے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا اور آہستہ آہستہ اس کی تنہائی گھٹنے لگی۔ کبڑا قسموں پہ قسمیں کھا رہا تھا۔ دبلے آدمی پیڈونا نامی ایک عورت کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ایونا نے کئی بار مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور آخر دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"میرا بیٹا۔ اس ہفتے۔۔۔ فوت ہو گیا۔"

"ہم سب کو مرنا ہے۔" کبڑے نے ٹھنڈی سانس لی اور کھانس کر اپنے ہونٹ پونچھے۔

"معتبر آدمی! اب جلدی کرو۔ خدا جانے کب وہاں پہنچیں گے۔ ہنٹر مارو۔"

"ابے! سن بھی رہے ہو۔ تمہاری رفتار سے تو آدمی پیدل اچھا۔ کوئی بات تمہارے ذہن میں سما ہی نہیں رہی تھی۔"

ایونا اس کے کڑوے الفاظ پر دکھی ہونے کے بجائے صرف سنتا رہا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ ہنسا "کتنے زندہ دل نوجوان ہیں۔ اللہ ان کو زندگی دے۔"

"تانگے والے' تمہاری شادی ہو گئی ہے؟" ایک دبلے نے پوچھا۔

"میری؟ ہا۔ ہا۔ جوان! اب ایسے کہا جائے کہ میرے لیے بیوی اور کچا مکان' قبر ہو گئے ہیں۔ میرا بیٹا مر گیا اور میں زندہ رہ گیا۔ حیرت کی بات ہے موت راستہ بھول گئی۔ میری طرف آنے کے بجائے میرے بیٹے کی جانب چلی گئی۔"

ایونا نے گردن کو موڑا کہ جیسے ان کو بتائے کہ اس کا بیٹا کیسے مر گیا لیکن اسی وقت کبڑے نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شکر ہے۔ منزل پر آخر پہنچ ہی گئے۔"

ایونا نے دیکھا کہ وہ ایک بڑے دروازے میں گم ہو گئے۔ ایک بار پھر وہ تنہا ہو گیا۔ اس کا دکھ جو کہ ایک دو لمحوں کے لیے ختم ہو گیا تھا اب شدت سے دل میں زخم کرنے لگا۔

وہ انتظار میں' راستے کے دونوں طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید گزرنے والوں میں سے کوئی ایسا مل جائے جو کہ اس کے



## وجہ انتخاب

مرد جب کوئی چیز خریدتا ہے تو عام طور پر اس کی صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے... اور وہ یہ کہ اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عورت جب کوئی خریدتی ہے تو اس کی مندرجہ ذیل آٹھ وجوہات میں سے کوئی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے:

1 :- کیونکہ اس کے شوہر نے اسے وہ چیز خریدنے سے منع کیا تھا۔

2 :- کیونکہ اس چیز کی وجہ سے وہ دبلی' کم عمر اور زیادہ خوب صورت نظر آنے لگے گی۔

3 :- کیونکہ وہ باہر کی بنی ہوئی ہو گی۔

4 :- کیونکہ پڑوسنیں اسے خریدنے کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

5 :- کیونکہ اس سے پہلے وہ کسی کے پاس نہیں تھی۔

6 :- کیونکہ اس سے پہلے وہ سب کے پاس تھی۔

7 :- کیونکہ وہ منفرد نظر آ رہی تھی۔

8 :- کیونکہ۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ۔۔۔□

دل کا درد سنے لیکن آدمیوں کا ہجوم اس کو یا اس کے دل کے درد کو بنا دیکھے گزرتا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں اتنا گہرا اور بڑا دکھ دکھائی دے رہا تھا کہ اس کا دل پھٹ جاتا تو دکھ نکل کر ساری دنیا کو گھیر لیتا لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دکھ نے اپنے آپ کو اس طرح چھپا لیا تھا کہ دن کسی روشنی میں کوئی بھی اس کو دیکھ نہیں سکتا۔

ایونا نے قریبی بنگلے کے چوکیدار کو بوری سمیت جاتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ اس سے بات کی جائے۔

"یار! کیا نام ہوا ہے؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

"ساڑھے نو۔ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے جاؤ۔"

ایونا کچھ قدم آگے بڑھا۔ اس کا جسم کیچڑ ہو گیا تھا اور پھر وہ اپنے غم میں ڈوب گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ آدمیوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ پانچ منٹ کے اندر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "اصطبل۔" اس نے سوچا اور باگیں زور سے کھینچیں اور چھوٹے گھوڑے نے جیسے اس کے خیال کو پہچان لیا اور بھاگنا شروع کیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایونا ایک گندے بچ کے آگے بیٹھا تھا۔ بچ کے چاروں اطراف زمین پر اور تختوں پر لوگ خراٹے لے رہے تھے۔ ہوا گرم اور سانس گھٹنے والی تھی۔ ایونا نے سوئے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور جلد واپس آنے پر افسوس کرنے لگا۔

"میں نے تو گھوڑے کا دانہ بھی نہیں کمایا۔" وہ سوچنے لگا "یہی تو میری مصیبت ہے۔ آدمی جس نے اچھی طرح کام پورا کیا ہے، پیٹ کے لیے ٹھیک ٹھاک کمایا ہے وہی ہمیشہ اچھی نیند کرتا ہے۔"

ایک نوجوان تانگے والا اٹھا اور پانی کے ڈول کی طرف بڑھا۔

"تمہیں پانی چاہیے کیا؟" ایونا نے پوچھا۔

"پانی چاہیے کیا!" اس نوجوان نے بغیر کچھ سمجھے دھرایا۔

"بہت اچھا۔ تمہاری صحت بہت اچھی ہے لیکن بھائی! سنو۔ تمہیں تو معلوم ہوگا۔ میرا بیٹا مر گیا ہے تم نے سنا ہے نا؟ اس ہفتے میں اسپتال۔۔۔ یہ بڑا لمبا قصہ ہے۔"

ایونا نے اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لیے پھر نوجوان کو دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جوان اپنا سر ڈھانپ کر نیند میں غلطاں ہو گیا تھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی سانس لی اور سر کھجانے لگا۔ جس طرح جوان کو پانی پینے کی ضرورت تھی اسی طرح بوڑھے کو بات کرنے کی تمنا تھی۔ اس کے بیٹے کو مرے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا لیکن آج تک کسی کو ٹھیک طرح سے اپنا درد بتا نہیں سکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اور اچھے طریقے سے بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح اس کا بیٹا بیمار ہوا، اس نے کیا سختیاں دیکھیں، اس نے مرنے سے پہلے کیا کہا اور وہ کیسے مرا۔ اس خواہش تھی کہ اپنے بیٹے کے جنازے، دفن کرنے، بیٹے کے کپڑے اسپتال سے لانے کا احوال اچھے طریقے سے بتائے۔ اس کی بیٹی انیشا دیہ گاؤں میں ہے، اس کا حال بھی بتائے۔ کیا یہ معمولی بات تھی جو یہ بتانا چاہتا تھا؟ یقیناً سننے والے کا دل روپڑتا اور اس سے ہمدردی کرتا۔

چل کر گھوڑے کو سنبھالا جائے۔" ایونا نے سوچا۔ "سونے کے لیے تو بہت وقت ہے اس لیے اس کی کیا فکر۔"

اس نے کوٹ پہنا اور اصطبل کی طرف چلا گیا۔ وہ گھاس اور موسم کے بارے میں سوچنے لگا کیونکہ تنہائی میں بیٹے کی سوچ اس کے دل میں زخم پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی باتیں دوسروں سے تو کر سکتا تھا لیکن تنہائی میں بیٹے کی باتوں کو یاد کرنا یا تصور کرنا، اس کے لیے عذاب تھا۔

"گھاس کھا رہے ہو؟" ایونا نے اپنے گھوڑے کی چمکتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کھاؤ کھاؤ۔ جب کہ تم نے دانہ نہیں کمایا ہے لیکن تم گھاس کھا سکتے ہو۔ ہاں! میں اب تانگا چلانے سے معذور ہو گیا ہوں۔ میرا بیٹا چلا سکتا تھا، میں نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو فرسٹ کلاس ڈرائیور ہوتا۔" ایونا چپ ہو گیا اور پھر کہنے لگا۔

"میرے چھوٹے گھوڑے! حقیقت یہ ہے کہ اب کزوا ایوانچ نہیں۔ وہ ہمیں درد کی زندگی میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب سنو! اگر تمہارا ایک بچہ ہوتا اور تم ایک بچے کے باپ ہوتے اور اچانک وہ تمہیں چھوڑ کر چلا جاتا اور تم اکیلے زندگی گزارنے کے لیے رہ جاتے تو تمہارے لیے کتنی دکھ کی بات ہوتی یہاں! کیا یہ دکھ والی بات نہیں؟"

چھوٹا گھوڑا جو گھاس بھی کھا رہا تھا اور اس کی باتیں بھی سن رہا تھا، اس نے اپنے مالک کے ہاتھ پر منہ رکھا اور پھونکیں مارنے لگا۔ یوں لگا جیسے وہ ایونا کا دکھ بٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایونا کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی اور اس نے اپنے چھوٹے گھوڑے کو سارا قصہ سنانا شروع کیا۔



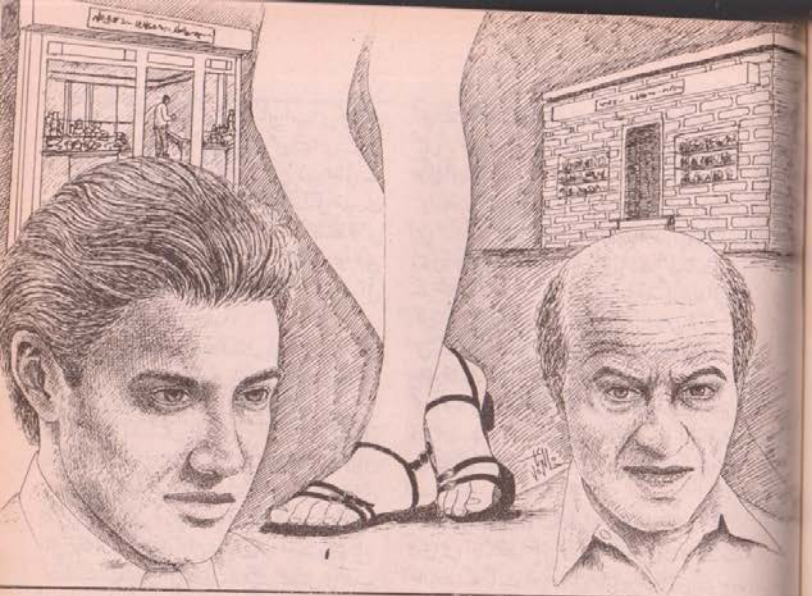

نسلوں کے درمیان پائی جانے والی تفاوت کی خفیف تصویر

# جنریشن گیپ

نجمہ مودی

اپنے ماضی کو سینے سے لگائے ایک حال مست بوڑھے کا فسانہ۔ وہ جدید زمانے کے ہم قدم نہیں چلنا چاہتا تھا مگر اس کی اولاد بھی تو اپنے وقت میں ہی جینا چاہتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے پندرہ برسوں میں بلیکر اسٹریٹ میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ "کوالٹی ریسٹورنٹ" جس کے کھانے کبھی بہت مشہور ہوا کرتے تھے، سکڑ کر ایک لنچ روم تک محدود ہو گیا تھا اور اس کی باقی جگہ میں ایک چمکتی دمکتی سپر مارکیٹ بن گئی تھی جو بازار میں سب سے نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشوں سے بڑے بڑے رنگین پوسٹر اور جلتی بجھتی بتیاں دکھائی دیتیں۔ سارا دن خریدار سودا سلف کی ٹرالیاں بھر بھر کر پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑیوں تک لاتے دکھائی دیتے۔

بازار میں ذرا آگے میکس کی ٹیلرنگ شاپ ہوا کرتی تھی۔ میکس کا دعویٰ تھا کہ اس بازار کے اردگرد کم از کم ایک میل کے دائرے میں جتنے بھی مرد رہتے تھے، وہ کبھی نہ کبھی ان

سب کے لیے پتلون ضرور سی چکا تھا لیکن اب اس کی دکان ٹوٹ کر ڈرائیونگ لانڈری شاپ بن گئی تھی جسے اس کے بیٹے چلاتے تھے۔ اس دکان میں جو لوگ میلے کپڑے دھلائی کے لیے دینے آتے تھے۔ انہیں گاڑی سے اترنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ گاڑی دکان کے سامنے روکتے تھے تو منی اسکرٹ میں ملبوس ایک خوب صورت اور خوش ادا لڑکی لہراتی اور اپنی سڈول ٹانگوں کی نمائش کرتی گاڑی تک آتی تھی اور کپڑے لے جاتی تھی۔

پرانی دکانوں میں صرف کوشاس کی بیکری اپنی اصلی حالت میں رہ گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بازار کی ہر دکان کا نقشہ بدل گیا تھا لیکن کوشاس کی بیکری میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نئے زمانے میں بڑی بڑی کمپنیاں طرح طرح کی ڈبل روٹیاں متعارف کرا رہی تھیں۔ ہر ایک کی الگ الگ خوبیاں بیان کی جاتی تھیں لیکن کوشاس اب بھی اسی طریقے سے اپنی بیکری میں ڈبل روٹی خود تیار کر رہا تھا جس طرح وہ پچھلے تیس سال سے کرتا آ رہا تھا۔ ڈبل روٹیاں اور بنکٹ وغیرہ تیار کرنے کے لیے اوون بھی بیکری کے پچھلے حصے میں ہی نصب تھا۔ ان چیزوں کے لیے اس کے اپنے کچھ فارمولے تھے جو وہ اب بھی کسی تبدیلی کے بغیر استعمال کر رہا تھا۔ اس نے صرف ایک معمولی سی تبدیلی کو قبول کیا تھا اور وہ یہ کہ دکان کی پیشانی پر جھولتے ہوئے پرانے دھندلے اور سانولے زدہ بورڈ کی جگہ چھوٹا سا ایک نیون سائن لگوالیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دکان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یوں اب پورے بازار میں، تبدیلیوں کے سمندر میں اس کی دکان ایک الگ تھلگ جزیرے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

اس کے گاہکوں میں زیادہ تعداد بوڑھے لوگوں کی تھی جو برسوں سے اس کے ہاں سودا لیتے آ رہے تھے۔ اس دکان سے چیزیں لینا گویا ان کی عادت بن گئی تھی جسے وہ اب ترک نہیں کرپاتے تھے۔ کوشاس ان کی روایتوں میں شامل تھا۔ اس نسل کے جن لوگوں کا انتقال ہوتا جا رہا تھا، کوشاس کو ان کے متبادل گاہک میسر نہیں آئے تھے۔ البتہ صبح چونکہ وہ بازار کی دیگر دکانوں کی نسبت دکان ذرا جلدی کھول لیتا تھا اور رات کو دیر سے بند کرتا تھا، اس لیے ان اوقات میں مجبوری میں اس کے ہاں کچھ غیر متوقع گاہک آجاتے تھے۔

کاروبار مندا ہونے سے کوشاس پریشان نہیں تھا۔ اس کی ضروریات محدود تھیں۔ ویسے بھی وہ زیادہ گاہکوں کو سنبھال بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ پیروں پر ورم رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ جوتے بھی خاص قسم کے پہنتا تھا۔ وہ آسانی اور پھرتی سے اِدھر اُدھر حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ جوانی کی پھرتی اور توانائی اب خواب وخیال ہوگئی تھی۔

جب اس کی بیوی زندہ تھی تو اس نے یہی سوچا تھا کہ اس عمر کو پہنچنے تک وہ کاروبار چھوڑ دے گا اور ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کرے گا لیکن چند سال قبل ہارٹ اٹیک سے بیوی کے انتقال کے بعد اس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ گھر سے نکل کر دکان ہی گویا اس کی پناہ گاہ تھی جس کی مخصوص خوشبوئیں اس کے خون میں رچ بچی تھیں۔ وہ اب اپنے بیٹے تک اور بہو مارتھا کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کی دو سال کی ایک بیٹی بھی تھی۔ کوشاس کو اپنی پوتی سے بہت پیار تھا۔ گھر سے دکان... اور دکان سے گھر۔ بس یہی اس کی محدود سی دنیا تھی جس میں وہ اپنے کنبے کے ساتھ ہنسی خوشی، قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اس کا پرانا دوست میکس، بیکری میں آجاتا تھا۔ میکس وہی ٹیلر تھا جس نے زمانے کے انقلابات کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی دکان بیٹوں کے سپرد کردی تھی اور اب وہ "ڈرائیونگ لانڈری شاپ" تھی۔ اس کے بیٹے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کاروبار کرنے اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کے سلسلے میں زیادہ تر نوجوانوں کی طرح حد سے زیادہ پرجوش تھے اور میکس کو ان کی بات ماننے ہی بن پڑی تھی۔

دوپہر میں کوشاس کی بیکری میں دکان داری بالکل ہی ٹھنڈی پڑجاتی تھی۔ دکان کی فضا میں مزید سستی اور کاہلی سی در آتی۔ ایسے میں میکس کے آجانے سے کوشاس کے لیے بھی گویا زندگی کچھ بیدار سی ہوجاتی۔ دونوں دوست ان شیلفوں کے سامنے شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتے جن میں اچار وغیرہ کے جار سجے رہتے تھے۔

اس روز بھی بازی شروع کرتے وقت میکس نے اپنے بے کیف سے ہونٹ سکیڑے اور اپنے ٹیڑے میڑھے سے کانوں کو مسلتے ہوئے پوچھا "کچھ یاد بھی ہے کہ میں اس مہینے میں کتنی بازیاں جیتا ہوں؟ میرا خیال ہے میں نے تم سے کم از کم بارہ بازیاں زیادہ جیتی ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ صرف تین بازیاں جیتی ہیں۔ تمہاری نہ تو یادداشت اچھی ہے اور نہ ہی تمہیں حساب آتا ہے۔" کوشاس نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"خیر، آج کی بازی بھی میری جیتی ہوئی بازیوں میں شمار کرلو۔" میکس ذرا اکڑ کر بولا "بس پانچ سات منٹ کی بات ہے کہ تم چاروں خانے چت پڑے ہوں گے۔ آج تو میں تمہیں ایسی مار لگاؤں گا کہ یاد کرو گے۔"

"تمہاری زبان جتنا کام کرتی ہے، اگر اتنا ہی تمہارا دماغ بھی کام آتا تو تم شطرنج کے عالم چیمپین ہوتے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شطرنج زبان سے زیادہ نہیں کھیلی جاسکتی ہے۔"

"تم کھیل شروع کرو۔" میکس بے تابی سے بولا "آج میں تم پر ذرا رحم نہیں کروں گا۔"

جلد ہی دونوں کھیل میں کھو گئے۔ بیکری میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دونوں سر جھکائے بساطِ بر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اچانک دروازہ کھلا اور وہ گھنٹی مدھم سی آواز میں بج اٹھی جو کسی کی آمد کا پتا دیتی تھی۔ موٹی سی ایک عمر رسیدہ عورت اندر آئی اور کوشاس اسے سودا دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا لیکن کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں میکس کو تنبیہہ کرنا نہیں بھولا تھا "بے ایمانی مت کرنا، تمہیں معلوم ہے شطرنج کا مجھ جیسا اچھا کھلاڑی بھی نہیں بھولتا کہ کون سا مہرہ کہاں رکھا تھا۔"

میکس قہر آلود نظروں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

"خوش آمدید مسز لارسن!" کوشاس نے خاتون کو مخاطب کیا "آپ کا پیارا نواسا کیسا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" مسز لارسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا ہے مگر تین بڑے آدمیوں جتنا کھاتا ہے۔ آپ سنائیں، آپ کی فیملی کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میری پوتی تو دو سال کی عمر میں ہی ملکۂ حسن معلوم ہوتی ہے۔" کوشاس نے مسرور لہجے میں جواب دیا پھر لاڈ سے پوچھا "کہو بچے، کیا چیز چاہیے؟"

مسز لارسن نے مکھن کی چند ٹکیاں، ڈبل روٹی اور پنیر طلب کیا جو کوشاس نے لفافے میں ڈال کر اس کے سامنے رکھا اور کیش رجسٹر پر، ذرا لمبے بل بنا کر کاغذ کی پنی پھاڑ کر ساتھ ہی رکھ دی۔ مسز لارسن نے ادائیگی کی اور گھٹ گھٹ کرتی رخصت ہوگئی۔

میکس بولا "کل میں نے اس عورت اور اس کے دیوزاد نواسے کو سپر مارکیٹ سے دو بڑی بڑی بوریوں جیسے لفافے لے نکلتے دیکھا تھا۔ وہاں سے یہ اتنا زیادہ سودا سلف خریدتے ہیں۔ یہاں سے صرف اتنی سی چیزیں خریدی ہیں۔"

"یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ وہ اتنی چیزیں بھی خرید کر لے گئی ہے۔" کوشاس طمانیت بھری سانس لے کر بولا "تم خود سوچو کہ وہ تو سپر مارکیٹ جاتی رہتی ہے اور سپر مارکیٹ میں پنیر کا ایک الگ کاؤنٹر ہے جس پر نہ جانے کس کس ملک کا پنیر موجود رہتا ہے اور ڈبل روٹیاں بھی وہاں نہ جانے کتنی اقسام کی ملتی ہیں پھر بھی مسز لارسن نے یہ چیزیں یہاں سے خریدیں، کیا یہ کافی نہیں؟"

میکس ٹٹولنے والی نظروں سے ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا "سچ سچ بتاؤ، تم اس دکان سے کچھ کما بھی رہے ہو یا نہیں؟"

"ظاہر ہے۔" کوشاس اس کے سوال پر تعجب سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "تمہارے خیال میں کیا میں بے وقوف ہوں جو یہاں بیٹھا جھک مار رہا ہوں؟ آخر میں بزنس مین ہوں۔ کچھ کماتا ہوں تبھی یہاں بیٹھا ہوں۔"

پھر اس کا لہجہ کچھ دھیما ہوگیا "وہ پہلی سی بات تو نہیں ہے لیکن بہرحال، تھوڑی بہت کمائی تو ہو رہی ہے۔"

"اور تمہارے بیٹے نک کے اب اس دکان کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟ کیا وہ اب بھی اس کا نقشہ بدلنے کے منصوبوں کے ساتھ بڑھی اور الیکٹریشین کو لے کر آتا رہتا ہے؟" میکس نے پوچھا۔

"ہاں۔ پچھلے ہفتے وہ کچھ لوگوں کو لے کر آیا تھا۔" کوشاس مسکراتے ہوئے بولا "گھنٹوں وہ پیمائش لیتے رہے اور نہ جانے کیا کیا لکھ کر انہوں نے کتنے کاغذ بھر دیے۔ نک بہت جوش میں تھا۔ نہ جانے کیا کچھ کر گزرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ کم از کم میرے مرنے کا انتظار کرلو۔ اس کے بعد اس دکان کے ساتھ جو جی چاہے کرنا۔"

"وہ بھلا ہمارے مرنے کا انتظار کہاں کرسکتے ہیں۔" میکس افسوس زدہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مجھے تو اس کا عملی تجربہ ہوچکا ہے۔ میں نے ستائیس سال اپنی ٹیلرنگ شاپ چلائی۔ ستائیس سال ایک دکان چلانے والے مالک کو

## بدقسمتی

ایک صاحب اپنے گھر کے سامنے سیڑھی لگا کر دروازوں اور روشن دانوں کی جالیاں صاف کررہے تھے۔ ان کے پڑوسی اپنے برآمدے کا فرش ٹھیک کررہے تھے۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد ایک نے دوسرے سے کہا "تم خوش قسمت ہو یار! تمہارے دفتر میں صرف ایک ہفتے چھٹی ہوتی ہے۔ میرے دفتر میں تو ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔"

اتنا حق تو ہونا چاہیے تھا کہ وہ جب چاہتا' اپنی خوشی سے اپنا کاروبار چھوڑتا اور ریٹائر ہو کر گھر بیٹھتا یا وہ ریٹائر ہونا چاہتا تو اس کے مرنے کا انتظار کرلیا جاتا لیکن بھئی کیسا انتظار اور کہاں کا انتظار۔ انہوں نے تو کھڑے پیروں مجھے دکان سے نکال باہر کیا۔ دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ ایک روز اچانک ہی آکر انہوں نے مجھے "خوش خبری" سنادی "پاپا! کل دکان کو گرانے والے آرہے ہیں۔ اسے نئے سرے تعمیر کیا جائے گا۔ اس کی جگہ اب ڈرائیونِ لانڈری شاپ بنے گی۔" انہوں نے تو مجھ سے رائے لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

پھر وہ اور بھی زیادہ ناگواری سے ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ "اور آج کل کے گاہکوں کو بھی دیکھو' وہ چاہتے ہیں انہیں اپنے میلے کپڑے لانڈری شاپ میں دینے کے لیے گاڑیوں سے اترنے کی بھی زحمت نہ کرنی پڑے۔ خدا کی پناہ! لوگ کس قدر کاہل اور آرام طلب ہوگئے ہیں اور آج کل کے کاروبار کرنے والوں کی بے شرمی اور بے حیائی دیکھو۔ کاروں سے کپڑے لینے کے لیے منی اسکرٹ والی لڑکی رکھی ہوئی ہے جو دکان سے گاڑیوں تک اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کرتے ہوئے جاتی ہے۔"

"لیکن تم یہ اعتراف بھی کرچکے ہو کہ نئے کاروبار سے وہ خوب کمارہے ہیں۔" کوشاس بولا۔

"پیسا... پیسا... پیسا۔!" میکس تقریباً چلا اٹھا "ہر شخص بس پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ پیسے کے علاوہ جیسے کسی بھی چیز کی... کسی بھی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ پیسا انسان کو صرف زندہ رہنے کے لیے کمانا چاہیے... اور وہ بھی عزت و وقار کے ساتھ... اس طرح نہیں کہ لوگوں کی گاڑیوں سے میلے کپڑے منگوانے کے لیے ننگی ٹانگوں والی لڑکیوں کو بھیجنا شروع کردے۔"

اس لمحے بیکری کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ مدھم سی گھنٹی بجی اور کوشاس کا بیٹا نک اندر آگیا۔ وہ دبلا پتلا ایک سنجیدہ صورت نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ نظر آتی تھی۔

"ہائے پاپا... ہیلو انکل میکس!" اس نے اندر آکر کہا۔ "دکان کے وسط میں پہنچ کر اس نے چھت کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔ "پاپا! یہ فیوز بلب اسی طرح لگا ہوا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ نے الیکٹریشین سے بدلوالیا ہوگا۔"

"میں کل اسے اس کے بارے میں بتانا ہی بھول گیا۔"



کوشاس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "آج ضرور اس سے کہہ کر دو سرا بلب نکلوالوں گا۔"

"دکان میں روشنی پہلے ہی اتنی کم ہوتی ہے کہ بیچ والے شیلفوں میں رکھے ڈبے تو نظر ہی نہیں آتے۔ مزید ایک لائٹ بند ہونے سے تو دکان کی آدھی چیزیں نظر آنا بند ہوگئی ہیں۔" نک بولا۔

میکس نے مسکراتے ہوئے نوجوان نک کی طرف دیکھا۔ اور بولا "تمہارے دوستوں کا کیا حال ہے؟ میرا مطلب ہے بڑھئی اور الیکٹریشین کا؟"

نک نے آنکھیں سکیڑ کر میکس کی طرف دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دیے بغیر بولا "انکل میکس! اگر آپ برا نہ منائیں تو میں ذرا تخلیے میں پاپا سے کچھ ضروری بات کرلوں۔"

میکس آہستگی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے ... میں کچھ دیر کے لیے پارک میں ٹہلنے جارہا ہوں۔ وہاں بہت سی گھریلو ملازمائیں بچوں کو سیر کرانے آتی ہیں۔ بعض تو بڑی ٹھیک ٹھاک ہوتی ہیں۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوجاتی ہے۔" اس نے نک کو دھیرے سے آنکھ ماری' نک کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

اس سے پہلے کہ میکس دروازے کی طرف قدم بڑھاتا' کوشاس تحکمانہ انداز میں بولا "بیٹھ جاؤ میکس! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمارے گھر کی یا کاروبار کی کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔"

پھر وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نرمی سے بولا "تم نے دکان کے بارے میں کچھ نئے حساب کتاب لگائے ہیں؟"

نک نے ایک بار پھر ناگواری سے میکس کی طرف دیکھا اور گویا صورتِ حال پر صبر کرتے ہوئے جیب سے تہ شدہ کاغذ نکالے۔ جب وہ بولا تو اندرونی جوش کی وجہ سے اس کی آواز مرتعش تھی "پاپا! اب تک ہم نے جو بھی حساب کتاب لگایا اور جو بھی منصوبہ بنایا' یہ ان سب سے اچھا ہے۔" اس نے کاغذوں پر ہاتھ مارا "اس پر عمل کرکے ہم اس دکان میں سامان رکھنے کی گنجائش تین گنا بڑھاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دکان بالکل جدید بن جائے گی۔ دور سے گاہک دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوگا اور یہاں نئے زمانے کی ہر چیز' نئے زمانے ہی کے طور طریقوں کے مطابق اسے ملے گی۔"

"لیکن جو کچھ اس وقت موجود ہے وہ سب ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔" کوشاس نرمی سے بولا۔

"ہاں' توڑ پھوڑ تو ہوگی۔" نک نے تسلیم کیا۔

"اور میرے اوون کا کیا ہوگا جو پچھلے حصے میں رکھا ہے؟"

"ظاہر ہے اسے بھی ہٹانا پڑے گا۔" اتنا برا نا ہو چکا ہے اور اتنی جگہ گھیرتا ہے۔" نک گویا اپنی ناگواری کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اس کے تو سامنے والی یہ دیوار بھی ٹوٹ جائے گی۔" اس نے بیچ کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

میکس کو گویا بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ جلدی سے شطرنج کی بساط کی طرف دیکھنے لگا۔ کوشاس نے اسے گھورا' گویا جنبشے سے باز رہنے کی تلقین کررہا ہو مگر وہ اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔

"پاپا۔" نک اب ذرا تیز لہجے میں بولا "آپ کو معلوم ہے آپ کا یہ پرانا اوون جس حساب سے بجلی کھاتا ہے اس سے ایک ڈبل روٹی پر چالیس سینٹ تو لاگت آجاتی ہے اور آپ وہ تیس سینٹ میں بیچتے ہیں پھر یہ بھی مسئلہ ہے کہ اس پر ایک ہی قسم کی ڈبل روٹی تیار ہوپاتی ہے۔ سپر مارکیٹ میں لوگوں کے لیے چالیس اقسام کی ڈبل روٹی دستیاب ہے۔"

"پچاس اقسام کی۔" میکس نے لقمہ دیا "میں نے خود ایک مرتبہ گنی تھیں۔"

"لیکن میں تو تیس سال سے لوگوں کے لیے ڈبل روٹی بنارہا ہوں۔" کوشاس قدرے احتجاجی لہجے میں بولا۔

"جس طرح کا کاروبار آپ کررہے ہیں' وہ ختم بھی ہوجائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" نک کے لہجے میں کچھ اور جوش آگیا "وہ جو پراپرٹی ڈیلر ہے نا... ٹونی... معلوم ہے' وہ مجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ بازار کا یہ ٹکڑا جس میں ہماری دکان بھی ہے' یہ سونے کی کان ہے... سونے کی کان ...! سب سے زیادہ گاہک اسی حصے میں آتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے کاروبار کو نئے سرے سے سیٹ کرکے دونوں ہاتھوں سے مال کمانا شروع کردیا ہے۔ صرف ہم ہی پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"لیکن کماتو ہم بہرحال رہے ہیں۔ دو سروں جتنی نہ سہی لیکن آمدنی تو بہرحال ہورہی ہے۔" کوشاس بولا۔

"لیکن یہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے جتنا ہم کماسکتے ہیں بشرطیکہ ہم دکان کو صرف جدید انداز میں سیٹ کرلیں۔" نک تیزی سے بولا "پاپا! میں نے اس کی منصوبہ بندی کرنے میں اپنا دماغ خراب کرلیا ہے۔ ہر پہلو پر میں نے بہت مغز کھپایا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا تجربہ ناکام نہیں رہے گا۔ نئے انتظامات پر ہم جو رقم لگائیں گے وہ دو سال کے اندر اندر پوری ہوجائے گی۔ ہم سود سمیت وہ رقم نہایت آسانی سے قسطوں میں بینک کو واپس کردیں گے۔ کچھ رقم ہمارے پاس موجود بھی ہے۔ کام کی شروعات تو ہم اپنی جمع پونجی سے ہی کرسکتے ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کوشاس بولا "تمہاری بات میں وزن تو ہے لیکن مجھے اس سلسلے میں چند دن مزید سوچنے دو۔"

"پاپا!" نک کے لہجے میں برہمی جھلک آئی "تین سال سے آپ یہی کہہ رہے ہیں اور آج تک آپ نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔"

کوشاس آہستگی سے چلتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور سڑک سے گزرتے لوگوں کو چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"تیس سال بڑا طویل عرصہ ہوتا ہے۔" آخر اس کی آواز ابھری "وہ بچے جو کل تک اس دکان میں آکر پھیلی پھیلی آنکھوں سے ٹافیوں وغیرہ کے مرتبانوں کی طرف دیکھا کرتے تھے' اب ان کے اپنے بچے اتنے بڑے ہوچکے ہیں۔ میرے وہ دوست جو کبھی اس دکان میں آکر میرے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے تھے' ایک آدھ گلاس پیا کرتے تھے' ان میں سے بہت سے مجھ سے بھی زیادہ بوڑھے ہوچکے ہیں۔ بعض اب اس دنیا میں ہی نہیں ہیں۔ اس دکان سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔"

"پاپا!" نک کے لہجے میں اب نرمی آگئی "ٹھیک ہے... یادیں سب کو عزیز ہوتی ہیں لیکن آج کے دور میں انسان صرف ماضی کے خواب دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان کو زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے۔"

میکس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے خود کلامی کے سے انداز میں نیچی آواز میں بولا "میں نے کہا تھا نا... آج کی نسل ہمارے مرنے کا انتظار بھی نہیں کرسکتی۔"

نک نے اس کی بات نہیں سنی یا پھر شاید وہ جان بوجھ کر ان سنی کرتے ہوئے بدستور باپ کی طرف متوجہ رہا۔ کوشاس بولا "کاروبار کو بڑھانے کا مطلب ہوگا کہ ہمیں ملازموں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اب تک تو میں اکیلا ہی اس دکان کو چلا رہا تھا اور میری دکان میں جو گاہک آتے ہیں' وہ میری ہی توجہ چاہتے ہیں۔"

"اگر ہم ملازم رکھیں گے تو یہ بھی آپ ہی کے حق میں اچھا ہوگا۔ آپ پر کام کا بوجھ کم ہوجائے گا۔ آپ بس کاروبار کی نگرانی کیا کیجیے گا۔ آپ کو زیادہ جان کھپانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

میکس نے اس موقع پر گفتگو میں مداخلت کی اور نک

سے مخاطب ہوا "تمہیں بھی یہاں منی اسکرٹ والی کسی لڑکی کی ضرورت تو نہیں پڑے گی جو اپنی ٹانگوں کی نمائش کرتے ہوئے گاہکوں کو سودا سلف وغیرہ دے؟"

نک ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے آج کل کاروبار کو ترقی دینے کے لیے اس حد تک جانے کا بھی رواج ہے۔" میکس معصومیت سے بولا "میں نے سوچا اگر تمہیں اس قسم کی لڑکی کی ضرورت پڑی تو میں اپنے لڑکوں سے پوچھ کر تمہیں بتادوں گا کہ وہ کہاں اور کن شرائط پر ملے گی۔"

کوسٹاس نے گویا اپنے بیٹے کو اس بات میں الجھنے سے باز رکھنے کے لیے جلدی سے اپنی طرف متوجہ کیا "نک! اس موضوع پر ہم رات کو مزید بات چیت کریں گے۔ میں وہ اعداد و شمار بھی دیکھ لوں گا جو تم نے اس مرتبہ نکالے ہیں۔"

پھر اس نے فخریہ سے انداز میں میکس کو بتایا "جنح تفریق اور اعداد و شمار کے معاملے میں میرا بیٹا بہت ماہر ہے۔"

"پاپا!" نک بولا "مجھے معلوم ہے اس موضوع پر بات کرکے آپ کو خوشی نہیں ہوتی لیکن اب اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں تو پورے بازار والوں کے مذاق کا نشانہ بن کر رہ گیا ہوں کہ ہر وقت اس دکان کے بارے میں منصوبے بناتا رہتا ہوں لیکن ہو تا کچھ نہیں ہے۔ آپ میرے بارے میں بھی تو کچھ سوچیں۔"

کوسٹاس ایک لمحے تک خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا "میں ہمیشہ تمہارے ہی بارے میں تو سوچتا ہوں اور بھلا میں کس کے بارے میں سوچوں گا۔ تم۔ میری بہولوسی اور میری پوتی کیتیرین۔ تم تینوں ہی کے گرد تو میری سوچیں گھومتی ہیں۔ تم تینوں کے سوا دنیا میں مجھے کس کی فکر ہے؟"

نک کے چہرے پر قدرے شرمندگی کی سرخی ابھر آئی۔ اس نے سر جھکالیا اور دھیمے لہجے میں بولا "سوری پاپا۔! مجھے معلوم ہے آپ ہمارے بارے میں کتنا سوچتے ہیں۔"

ایک لمحے وہ شکست خوردہ سے انداز میں چپ رہا مگر پھر بھی ایک آخری حملہ کرنے سے باز نہ آیا اور اپنے مرتعش لہجے پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "میں تقریباً بیس منٹ سے یہاں موجود ہوں اور اس دوران میں ایک گاہک بھی نہیں آیا ہے۔ اسے آپ دکان کہتے ہیں؟ یہ دکان نہیں، قبرستان ہے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ شاید اب یہ دکان نہیں رہی، قبرستان ہی بن گئی ہے جس میں میری یادیں دفن ہے۔" کوسٹاس نہایت آہستگی سے بولا۔

"میں بھی اس قبرستان کی ایک قبر ہوں۔" میکس استہزائیہ سے لہجے میں بولا "جاتے جاتے مجھ پر تھوڑا سا پانی چھڑک جانا۔"

اس کے انداز پر کوسٹاس مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میکس تو ہنس ہی رہا تھا۔ نک نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر ذرا بھڑک کر باپ سے مخاطب ہوا "ہنسیں ہنسیں۔ آپ دونوں ضرور ہنسیں۔ میرا مذاق اڑائیں اور اس قبرستان میں بیٹھ کر سارا دن شطرنج کھیلتے رہیں لیکن کم از کم یہ اعتراف تو کرلیں کہ کاروبار کرنا اب آپ کے بس کی بات نہیں رہی۔ آپ اس لیے بھی اس جگہ کی حالت بدلنا نہیں چاہتے کہ اگر کاروبار بڑھ گیا تو آپ شطرنج نہیں کھیل سکیں گے۔ آپ یہاں بیٹھے سر جھکائے شطرنج ہی کھیلتے رہتے ہیں اور آپ کو معلوم ہی نہیں کہ باہر دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ آپ کے سر پر ذرا اوپر چھت میں لگی ہوئی لائٹ خراب ہو چکی ہے' اس کا بلب ہی بدل لینا چاہیے۔"

"نک!" کوسٹاس نے نرم لیکن تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

"سوری پاپا! مجھے احساس ہے کہ میں زیادہ بول رہا ہوں لیکن میں کیا کروں۔ مجھ سے یہ زوال دیکھا نہیں جاتا۔ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اور مجھے بھی آپ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو مجھ سے ہے۔ میں کاروبار کو ترقی دینے کی بات کررہا ہوں' اس میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہ ہماری پوری فیملی کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ میں اس وقت جوان ہوں۔ میرے اندر توانائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی خدمت کروں۔ آپ نے اپنی جوانی میرے لیے کام کرتے ہوئے گزار دی۔ اب مجھے آپ کی جگہ کام کرنا چاہیے اور آپ کو آرام کا موقع ملنا چاہیے لیکن آپ کو یہاں بیٹھ کر شطرنج کھیلنے کے سوا کسی چیز کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔"

وہ واپس جانے کے لیے اپنی تیزی سے مڑا کہ گرتے گرتے بچا۔ سنبھلتے ہی وہ دروازہ کھول کر نکل گیا۔

میکس نے افسوس زدہ انداز میں سر ہلایا اور ایک بار پھر اپنا مخصوص جملہ دہرایا "میں نے کہا نا۔ کہ وہ ہمارے مرنے کا انتظار بھی نہیں کرسکتے۔"

کوسٹاس واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "شاید ہم ہی خود غرض ہیں کہ ہمیں صرف اپنے محسوسات کا خیال ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ جوانی میں انسان



کس طرح سوچتا ہے۔" اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے دکان کے در و دیوار کا جائزہ لیا اور گہری سانس لے کر گویا ہوا میں رچی ہوئی طرح طرح کی خوشبوؤں کو اپنے سینے میں جذب کرنے کی کوشش کی پھر بولا "شاید لڑکا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ شاید یہ دکان نہ ہو۔ واقعی قبرستان ہو۔"

"کاروبار کی جگہ کو سرکس یا بے غیرتی کا اڈا بنانے سے تو بہتر ہے کہ اسے قبرستان ہی رہنے دیا جائے۔" میکس منہ بنا کر بولا "کم از کم یہاں مضحکہ خیز قسم کے رنگ برنگے نیون سائن تو نہیں جل بجھ رہے اور منی اسکرٹ والی کوئی لڑکی اپنی ٹانگوں کی نمائش کرتی تو نہیں پھر رہی۔"

"جوانی میں در اصل انسان زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جانے کے تصور سے بھی خوف زدہ ہوتا ہے۔" کوسٹاس بولا پھر وہ گویا خواب کے سے عالم میں گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "کیا وقت واقعی اتنی تیزی سے گزر گیا ہے؟ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ ہم اتوار کے دن ان بچوں کو بیچ گاڑیوں میں بٹھائے پارک میں سیر کرانے پھرا کرتے تھے اور بے تابی سے سوچا کرتے تھے کہ آخر یہ کب بڑے ہوں گے۔ ہم میں سے ہر ایک کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر امریکا کا صدر بنے گا۔"

اس نے سر جھکا کر بساط کی طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں بولا "کل تک ان بچوں کی بہتی ہوئی ناکیں صاف کرتے تھے' آج یہ بڑے ہو چکے ہیں۔ ان کی مائیں اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور ان کی دنیا ہی گویا ہم سے الگ ہے۔ وقت واقعی بڑی تیزی سے گزر جاتا ہے!"

میکس نے رومال نکال کر شوں شوں کی زور دار آواز کے ساتھ ناک صاف کی اور ناگواری سے بولا "چال چلو۔ چال۔ کیا دکان بند کرتے وقت چال چلو گے؟"

انہوں نے ڈھلتے تک تین بازیاں کھیلیں۔ اس کے بعد میکس اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ اس کا گنجا اور سوکھا سا سر دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ کوسٹاس نے گویا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چپکے چپکے دکان میں جھاڑو دے ڈالی۔ شام کو لیون نامی الیکٹریشین آیا تو کوسٹاس نے اس سے چھت کا بلب تبدیل کرالیا۔ رات تک چند گاہک آئے جنہوں نے تھوڑی بہت خریداری کی۔ کوسٹاس کا زیادہ وقت ان کی خیر و عافیت پوچھنے میں گزرا۔

اندھیرا پھیلا تو کوسٹاس نے باہر سے نظر آنے والے شیشے کے شوکیسوں کی بتیاں جلادیں۔ کچھ دیر بعد نک اپنی بیوی اور بچی سمیت آگیا۔ بچی اپنی پرام میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کوسٹاس نے انہیں آتے دیکھا تو دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا تاکہ نک کو بچہ گاڑی اندر لانے میں دشواری نہ ہو۔ نک جب اس کے پاس سے گزرا تو کوسٹاس نے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ دوپہر کی ناگواری کا اس پر کتنا اثر باقی تھا لیکن جب اس کی نظر اپنی پوتی پر پڑی تو وہ گویا ہر بات بھول گیا۔

اس نے لپک کر اپنی پوتی کو بچہ گاڑی سے اٹھالیا اور ہوا میں اونچا کرکے دائرے میں گھمانے لگا۔ بچی مسرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ہلکی ہلکی چیخیں مارنے لگی۔ کوسٹاس نے اسے نیچے کیا اور بازوؤں میں بھر کر اس کے روئی کے گالوں کی طرح پھولے پھولے نرم گلابی رخسار چومنے لگا۔ اس کی موچھوں سے گدگدی ہوئی تو بچی اپنے ننھے ہاتھ سے اس کا چہرہ دور ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے معصومانہ انداز میں ہنسنے لگی۔

کوسٹاس کی بہولوسی جو ایک سروقد' دبلی پتلی' اسمارٹ اور خوش شکل عورت تھی' مسکراتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں بولی "پاپا! میں آپ کے لیے کھانا تیار کرکے رکھ آئی ہوں ۔۔ جاکر گرم گرم ہی کھالیجیے۔ آج میں نے آپ کی پسندیدہ ڈش بنائی ہے۔ یعنی بھنا ہوا مٹر گوشت۔۔۔"

کوسٹاس نے دیکھا' اس کا بیٹا بھی مسکرا رہا تھا۔ تب وہ بھی بھرپور انداز میں مسکرادیا۔ اسی وقت میکس بھی کم روشنی والے گوشے سے نکل کر سامنے آتے ہوئے رشک آمیز لہجے میں بولا "بھنا ہوا گوشت اور مٹر؟ یہ تو میری بھی پسندیدہ ترین ڈش ہے؟ مجھے امید ہے اس کھانے میں ایک اور بڑھے کے لیے بھی گنجائش ہوگی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے میری خوراک محض ایک بیمار بچے جتنی ہے۔"

"اگر سب بیمار بچے تم جتنا کھانے لگیں تو وہ جلدی ہی ہٹے کٹے ہو جائیں۔" کوسٹاس بولا۔

## قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا ان صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بڑے حرمت سے محفوظ رکھیں۔

"میں تو ہمیشہ آپ کی گنجائش رکھ کر کھانا گھر میں رکھ کر آتی ہوں انکل میکس!" لوسی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولی "آپ ضرور پاپا کے ساتھ گھر جائیے۔ ان کا دل بھی لگا رہے گا۔"

کوسٹاس فخریہ انداز میں لوسی کی طرف دیکھ کر میکس سے مخاطب ہوا۔ "میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ میرے بیٹے نے لوسی جیسی لڑکی سے شادی کی ہے اور میری مزید خوش قسمتی یہ ہے کہ میں کیتھرین جیسی پیاری پوتی کا دادا بنا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اپنی پوتی کو چوما۔

"میرے بچوں نے تو بلاؤں سے شادیاں کی ہیں۔" میکس ٹھنڈی سانس لے کر بولا "غصہ ان کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ ہر وقت چیخی رہتی ہیں اور کھانے کی چیزیں ایسی بناتی ہیں کہ انہیں آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یقین کرو جب بھی میں کھانے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو کھانے کو دیکھ کر میرا خون خشک ہو جاتا ہے۔"

نک نے بچی کو دادا کی گود سے لے کر دوبارہ بچہ گاڑی میں بٹھایا۔ لوسی اسی دوران میں کاؤنٹر کے عقب میں جاتے ہوئے بولی "آپ دونوں جا کر اطمینان سے کھانا کھائیں... گپ شپ کریں۔ اب باقی وقت کے لیے دکان میں اور نک سنبھال لیں گے۔"

نک اپنے باپ کا کوٹ اٹھا کر اسے پہناتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولا "آج صبح جو باتیں ہوئی، میں ان پر شرمندہ ہوں پاپا! میں دوپہر سے اس موضوع پر سوچتا رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے آپ کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ اپنے طور طریقے یا اس بیکری کی حالت تبدیل کریں۔ جس شخص نے اتنے طویل عرصے سے ایک دکان کو چلایا ہو، اسے حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس دکان کو جس طرح بہتر سمجھے، اس طرح رکھے....."

"لیکن نک...! میں یہ نہیں کہتا کہ میرا ہی انداز فکر درست ہے۔" کوسٹاس نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

"مجھے اپنی بات ختم کر لینے دیجیے۔" نک اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "شاید میں اتنا عقل مند اور ذہین نہیں ہوں، جتنا بعض اوقات خود کو سمجھنے لگتا ہوں۔ میں تین سال سے اس سلسلے میں آپ کو پریشان کر رہا ہوں لیکن اب میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو احساس ہوا کہ میں آپ کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ میں نے لوسی سے بھی اس سلسلے میں تفصیل سے بات کی ہے اور یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے کہ آئندہ میں اس سلسلے میں آپ کو بالکل پریشان نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے تمام اعداد و شمار اور منصوبے ایک طرف رکھ دیے ہیں۔ یہ آپ کا اسٹور ہے۔ آپ جس طرح چاہیں اسے چلائیں۔"

کوسٹاس ایک طویل لمحے تک خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے اس تصور سے شرمندہ ہو گیا ہو کہ میکس اور لوسی دیکھ رہے ہوں گے۔

پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولا "یہ ٹھیک ہے کہ یہ میری دکان ہے لیکن مجھے بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ یہ دکان کیا ہے۔ بس شرمندگی کا سامان ہے۔ اسے نئی شکل دینا واقعی ناگزیر ہو گیا ہے۔ تیس سال پہلے کے معیار اور پیمانوں کے مطابق یہ ٹھیک تھی لیکن اب اس کی حیثیت ایک بڑی شاہراہ پر گھسٹتی ہوئی ایسی زنگ خوردہ پرانی بائیسکل جیسی ہو گئی ہے۔ جہاں نئے نئے ماڈلوں کی تیز رفتار کاریں دوڑ رہی ہیں۔ میں تمہارے خیال سے متفق ہو گیا ہوں۔ اس میں لازماً تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پاپا؟" نک بے یقینی سے بولا۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہی میرا فیصلہ ہے۔" کوسٹاس مضبوط لہجے میں بولا "میں اتنا برا بزنس مین نہیں ہوں کہ تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس نہ کر سکوں۔ میں تمہارے منصوبے میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں اور سمجھ بوجھ پر اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے تم نے جو کچھ سوچا ہو گا، ٹھیک ہی سوچا ہو گا اور تم جو کچھ کرو گے، اس کی وجہ سے مجھے شرمندگی نہیں ہو گی۔"

"پاپا! مجھے معلوم ہے یہ سب کچھ آپ آج دوپہر کی بات چیت کے بعد دل برداشتہ ہو کر کہہ رہے ہیں۔ اب میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔" نک نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"یہ تم بار بار آج دوپہر کی بات چیت کا حوالہ دینا بند کرو۔" کوسٹاس تیزی سے بولا "میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں کہ جوش میں بولے گئے چند جملوں کی وجہ سے اتنا بڑا فیصلہ کر لوں گا۔ یہ بیکری محض ایک ذریعۂ معاش ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں تو نہیں بندھا ہوا ہوں۔ اس کے ذریعے میں نے برسوں تک گزر اوقات کے لیے رقم ضرور کمائی ہے لیکن یہاں کام کرتے کرتے مجھے جوڑوں کا درد بھی ملا ہے اور میرے پاؤں بھی سوجے رہنے لگے ہیں۔ فی الحال تو تم دونوں میاں بیوی دکان سنبھالو۔ میں اور میکس جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ صبح تم اپنے بڑھئی اور الیکٹریشین کو بلوا کر کام



شروع کرا دو۔"

نک اپ میکس کی طرف مڑا جو ایک طرف بالکل خاموش کھڑا تھا۔

"آپ نے سنا انکل میکس!" وہ پرجوش لہجے میں بولا "پاپا نے میری بات مان لی ہے۔ اب ہم مل کر اس دکان کو اس سڑک کی سب سے اچھی بیکری بنا دیں گے۔ پاپا کو اپنے فیصلے پر شرمندگی نہیں ہو گی۔ لوگ رشک سے اس دکان کی طرف دیکھا کریں گے۔"

وہ اپنی بیوی کی طرف کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ میکس زیر لب بڑبڑا رہا تھا "یہ لوگ ہمارے مرنے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے اور چونکہ یہ ہمارا خون ہے اس لیے ہم ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔"

کوسٹاس نے اپنے بیٹے اور بہو کی طرف دیکھا جو پرجوش انداز میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کوسٹاس نے گویا انہیں سنانے کے لیے بلند آواز میں میکس سے کہا "میکس! تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم ماضی میں زندہ رہنے کے عادی ہو چکے ہو۔ تمہارا ذہن ترقی پسندانہ نہیں ہے۔ تم زمانے کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ تمہارے بیٹوں نے اچھا ہی کیا کہ تمہیں دکان سے باہر نکال پھینکا۔ تمہاری شکل بھی منحوست زدہ ہے اور تمہارے خیالات بھی۔"

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میکس اس کے پیچھے پیچھے لپکا گویا وہ بھی جواب میں اسے کھری کھری سنانا چاہتا ہو لیکن باہر آ کر جب وہ اس کے قریب پہنچا تو خشک سی ہنسی کے ساتھ بولا "اچھا۔ تو میرا ذہن ترقی پسندانہ نہیں ہے؟ میں زمانے کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتا؟ کوسٹاس! مجھے معلوم ہے یہ سب بکواس کر کے تم جلدی سے اس لیے وہاں سے نکل آئے کہ اگر تم کچھ دیر اور وہاں رکتے تو شاید رو پڑتے۔"

کوسٹاس نے اسے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس کی ورم زدہ ٹانگیں جس حد تک اجازت دے رہی تھیں، اس حد تک وہ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں پھولی پھولی سانسوں کے درمیان میکس بولا۔ "تمہیں معلوم ہے جب تمہاری دکان کی آرائش اور مرمت ہو جائے گی۔ ہر چیز نئی آ جائے گی تو پھر ایک چیز پرانی رہ جائے گی اور وہ سب کی آنکھوں میں بہت کھٹکے گی۔ معلوم ہے وہ چیز کیا ہو گی؟ وہ تم خود ہو گے؟"

"معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔" کوسٹاس کے لہجے میں ہلکی سی چڑچڑاہٹ تھی۔

"لیکن تمہیں اس پر دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔" میکس نے گویا اسے تسلی دی "جب وہ تمہیں دکان سے نکال پھینکیں گے تو تمہارا ساتھ دینے، تمہاری مدد کرنے اور تمہارا دل بہلانے کے لیے میں موجود رہوں گا۔ میں تمہیں سکھاؤں گا کہ پارک میں ٹہل ٹہل کر اور بچے کھلانے والی ملازماؤں کو دیکھ دیکھ کر وقت کیسے گزارہ جاتا ہے۔ پارک میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کے ساتھ سیاست پر بحث کیسے کی جاتی ہے۔"

پھر اس کا لہجہ قدرے فخریہ ہو گیا "میں ان معاملات میں تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ شطرنج کھیلنے کے لیے پارک میں کون سی بنچیں اچھی ہیں۔ کن پر زیادہ دیر تک پیڑوں کا سایہ رہتا ہے اور وہاں اگر موسم خراب ہو گیا ہو۔ بارش وغیرہ ہو رہی ہو تو پھر وقت گزاری کے لیے پبلک لائبریری سب سے اچھی جگہ ہے جہاں بڑے بڑے شہروں کے مشہور اخبار بھی آتے ہیں۔"

اس دوران میں وہ بازار کے سرے پر پہنچ چکے تھے۔ غیر ارادی طور پر وہ واپس چل دیے۔ کوسٹاس غصے سے بولا۔ "میکس! تم جہنم میں جاؤ۔ میرے کان کیوں کھا رہے ہو؟ مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ میرا انجام تم جیسا ہو۔"

میکس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے گویا کوسٹاس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموشی سے سر جھکائے چلتے رہے۔ اب وہ بالکل سست رفتاری سے گویا پاؤں گھسیٹتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے کندھے کسی انجانے بوجھ یا پھر شاید گزرے ہوئے ماہ و سال کی تھکن سے جھک گئے تھے۔ اسی دوران میں وہ ڈرائیو ان لانڈری کے سامنے سے گزرے جس کے شیشوں کے عقب سے رنگ برنگے نیون سائن جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔

ذرا آگے پہنچ کر میکس نے پلٹ کر "ڈرائیو ان لانڈری شاپ" کی طرف دیکھا جو کبھی اس کی ٹیلرنگ شاپ ہوا کرتی تھی پھر اس نے گویا اپنے تمام وجود کی نفرت ایک نقطے پر جمع کر کے دکان کی طرف منہ کر کے زور سے تھوک دیا۔

مزید چند قدم چل کر کوسٹاس کی بیکری آ گئی۔ جب وہ اس کے سامنے سے گزر گئے تو کوسٹاس نے بھی بالکل اسی طرح گردن گھما کر دکان کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھوک دیا۔

دونوں بوڑھوں کی آنکھوں میں نمی جھلملا رہی تھی!

(انگریزی سے ترجمہ)

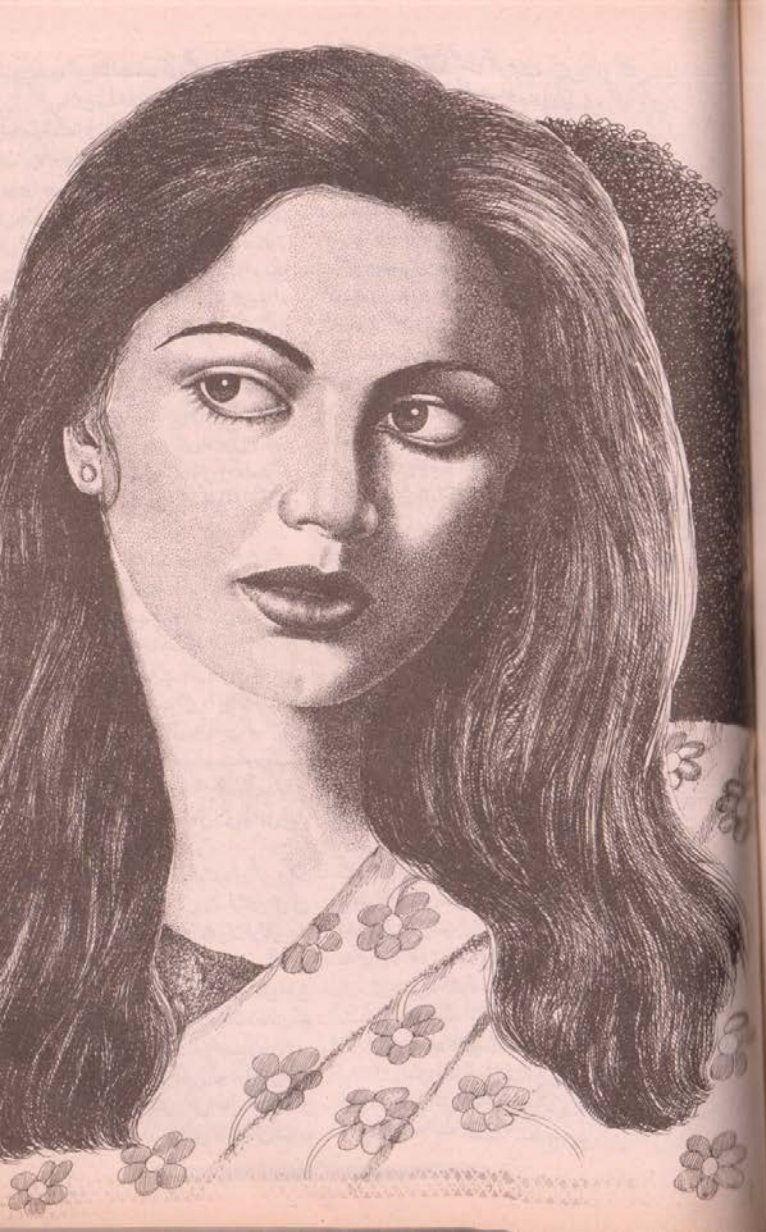

محبت کی بالادستی اور رشتوں کی ڈوری میں بندھی داستان جو دو مرکزوں میں ٹھہر کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہی

# فیصلہ

طاہر جاوید مغل

دوسرا اور آخری حصہ

خوب صورت وادیوں، گنگناتے آبشاروں اور حسین نظاروں کے جلو میں نمو پا کر سرم و بنارک کو نپل کی صورت اختیار کرنے والا جذبہ محبت ان سرسبز وادیوں اور دریائے کنہار کی طوفانی موجوں سے گزر کر میدانی علاقوں میں پہنچ کر تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اب اس جذبے کا رخ متعین ہو چکا تھا۔ پُرہیبت پہاڑوں کے درمیان اونچی نیچی چٹانوں کو پُرشور قوت کے ساتھ کاٹتا اور تمام رکاوٹوں کو عبور کرنے کے بعد میدانوں کی وسعتوں میں پھیل جانے والے کسی دریا کی طرح یہ جذبہ بھی قلب و ذہن کی بیکراں وسعتوں پر حاوی آ چکا تھا۔ کسی کا تمام دنوں کی دھڑکن بن کر وجود کا حصہ بن چکا تھا اور پھر پہلی بار جذبۂ محبت، لذتِ انتظار کی کیفیت سے آشنا ہوا۔ وہ انتظار جس کی کوئی حد نہ تھی۔ یہ کیفیت لمحاتی بھی ہو سکتی تھی اور مہ و سال پر محیط بھی۔ ایک طرف جذبے کی صداقت تھی دوسری طرف معاشرتی رسوم و رواج میں جکڑا ہنداوہ بے معنی گرد میں چھپے دو ٹوٹنا ممکن تھا۔ ہمارے معاشرے میں موجود تمام تر روشن خیالی کے باوجود عورت ذات سے منسلک آن، شان و اپنا بندوں، خلاف فطرت اور فرسودہ عقائد کی کہانی جن کی کوئی حقیقت نہیں مگر جنہیں آج کی ترقی یافتہ عورت بھی اپنے وجود کا حصہ بنائے جو دکھوں پر پھینک چڑھائے پُرسادہ نظر آتی ہے۔ آپ کے محبوب طاہر جاوید مغل کے کہنہ مشق قلم سے ایک ایسے فیصلے کی داستان جو کسی کو جنت طور میں لانے بغیر مُردہ دلوں میں زندگی کی شمع روشن کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

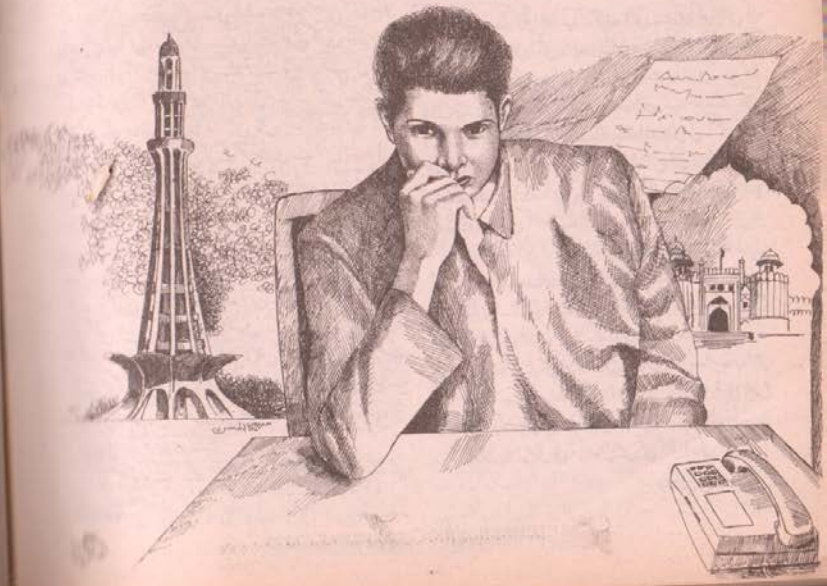

خط دینے بعد وہ جس متانت سے آئی تھیں' اسی متانت سے واپس چلی گئیں۔ میں نے خط پڑھا اور پڑھتا چلا گیا' لکھا تھا "تیمور صاحب! مجھے اس بات پر بے حد اذیت پہنچی ہے کہ آپ کو ایک بے ہودہ الزام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کاش' یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ میں آپ کی بے گناہی کی گواہ ہوں کیونکہ جس وقت فوزیہ والا واقعہ ہوا' آپ میرے ساتھ نیچے درختوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے لیکن میں یہ بات دوسروں کو نہیں بتا سکتی۔ میں نے واپس آکر کہا تھا کہ بازار سے خریداری کرکے آئی ہوں۔ اگر اب یہ کہوں کہ میں بازار نہیں گئی تھی بلکہ آپ کے ساتھ نیچے درختوں میں بیٹھی تھی تو شکوک پیدا ہوں گے۔ اور اس گروپ میں کچھ بے حد شکی مزاج قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اگر میں اس واقعے کے حوالے سے زیادہ پریشان ہوں تو شاید اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں آپ کی صفائی دے سکتی ہوں لیکن خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔ بہرحال اگر میں آپ کی بے گناہی کی گواہ نہ بھی ہوتی تو میرا ذہن آپ کے حوالے سے ایسے گھٹیا الزام کو کبھی تسلیم نہ کرتا۔

"میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں اور آخر میں آپ سے ایک گزارش ہے۔ اخلاق بتا رہا تھا کہ آپ واپس جانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ میں آپ پر زور تو نہیں دے سکتی' صرف گزارش کرسکتی ہوں۔ جیسا کہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے' جھیل والے غنڈے ہمارے پیچھے یہاں بھی آگئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسے موقع پر آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔ آپ کی موجودگی سے مجھے اور باقی سب کو تحفظ کا احساس رہے گا۔ میں نے اخلاق کو مشورہ دیا ہے اور آپ کو بھی رائے دیتی ہوں کہ سری پائے میں کیمپنگ کا پروگرام ختم کردیں اور واپس چلیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی ایسی بدمزگی پیدا ہوجائے جو ساری تفریح کو غارت کردے۔"

میں کافی دیر خط پکڑے بیٹھا رہا۔ فرحین کی تحریر دیکھتا رہا۔ لفظوں کے دائرے' خطوط۔ سب کچھ فرحین ہی کی طرح دلکش تھا۔ اس خط نے مجھے احساس دلایا کہ فرحین کے دل میں میرے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ یہ پتھر میں جونک لگنے والی بات تھی۔ اس سفر کے آغاز میں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ انتہائی سنجیدہ مزاج اور محتاط خاتون مجھ پر اتنا بھروسا کرے گی کہ مجھے ایک نامہ تحریر کرے گی اور اس نامے کی تحریر میں میرے لیے ہمدردی کی خوشبو ہوگی۔ یہ سب واقعات کی کرشمہ کاری تھی۔ فرحین بالکل اتفاقیہ طور پر میری بے گناہی کی گواہ ہوگئی تھیں اور یہ ایسی گواہی تھی جسے وہ دینے کی خواہش رکھتی تھیں مگر دے نہیں سکتی تھیں۔ یہ صورت حال میرے لیے تکلیف دہ ہونی چاہیے تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ گواہی کے سلسلے میں فرحین کی مجبوری نے فرحین کے دل میں میری ہمدردی کو ابھارا تھا اور میں اس ہمدردی کے لیے ہر قیمت چکانے کو تیار تھا۔ ان جھیل سی خاموش آنکھوں نے کوئی ایسا جادو کیا تھا مجھ پر کہ دل ودماغ ایک گلابی دھند میں اوجھل ہوتے چلے جارہے تھے۔ اس دھند میں ایک پاگل کردینے والی خوشبو تھی۔ ایک ایسا ریشمی لمس تھا جس کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ فرحین کا خط پڑھنے کے بعد میں نے پھاڑ دیا اور اس کے پرزے آتش دان میں جھونک دیے۔

اگلے روز بھی اخلاق اور ندیم کے پُرزور اصرار کے باوجود میں نے ناشتا اپنے کمرے میں ہی کیا۔ میں بڑے تایا کی شکل دیکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ انہیں دیکھ کر میرا دماغ پھر چیخ جائے گا اور ان کی وہ عقیلی نگاہیں یاد آجائیں گی جو پرسوں شام انہوں نے مجھ پر ڈالی تھیں اور جنہوں نے میرے سینے کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ اخلاق' ندیم اور تنویر وغیرہ نے بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کیا' ہاں سکھوتی نظر نہیں آیا۔ اخلاق کی زبانی علم ہوا کہ بدقماش لڑکوں کی ٹولی کو سبق سکھانے کے لیے بڑے تایا مقامی پولیس چوکی سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ سکھوتی بھی ان کا ہمنوا تھا مگر اکثریت نے اس کی مخالفت کی لہٰذا یہ پروگرام کینسل ہوگیا۔

ناشتے کے دوران میں ہم چاروں اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں ایک ایسی بات سامنے آئی جس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اپنے غم وغصے کو پس منظر میں دھکیل دوں اور فی الحال گروپ کو چھوڑنے کا خیال ترک کردوں۔۔۔ دراصل تنویر یہ بات کر رہا تھا کہ غنڈا پارٹی کو یہ کیسے علم ہوا کہ ہم شوگران میں ہیں؟ ندیم نے کہا کہ ممکن ہے کہ جب ہم ناران سے روانہ ہوئے تو گروپ میں سے ایک دو لڑکوں نے ہماری بے خبری میں ہمارا پیچھا کیا ہو' اس کے بعد ساتھیوں کو اطلاع دے دی ہو کہ ہم شوگران میں ہیں۔

میں نے کہا "پھر تو یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے ایک دو لڑکے پچھلے دو تین دن سے ہمارے ساتھ ہی شوگران میں موجود ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ فوزیہ کے ساتھ دست درازی کرنے والے بھی یہی لڑکے ہوں۔



میں نے اپنے خیال کا اظہار اخلاق وغیرہ پر کیا تو وہ بھی بری طرح چونک گئے۔ یہ بات واقعی قابل غور تھی۔

میں نے اس پہلو پر جتنا بھی سوچا' میرا یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا کہ گروپ کے کچھ لڑکے یہاں موجود تھے اور فوزیہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں غنڈا پارٹی کا عمل دخل ہے۔ بہرحال اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے میرے یا اخلاق وغیرہ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔

اگلے چار پانچ روز ہم نے شوگران میں ہی گزارے۔ لڑکے بھی شوگران میں موجود تھے۔ گاہے گاہے وہ ہمیں نظر بھی آتے رہے لیکن ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو پھر سے جھگڑے کا سبب بنتی۔ وہ اپنے حال میں مگن نظر آرہے تھے۔ ان کا ہوٹل ہمارے ہوٹل سے کافی فاصلے پر تھا اور شاید یہ بات بھی حالات کی بہتری میں معاون ثابت ہوئی تھی۔

فرحین کے ساتھ ایک دوبار میرا مختصر مکالمہ ہوچکا تھا۔ ان کے لہجے میں اب مجھے اپنے لیے وہ سرد مہری نظر نہیں آتی تھی جو اس سے پہلے بہت نمایاں تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ سب کام چھوڑ کر اور ہر طرف سے دھیان ہٹا کر ان کی مسکراہٹ دیکھتے رہو۔ شاید انہیں بھی اپنی مسکراہٹ کی قدر وقیمت کا علم تھا۔ لہٰذا وہ بہت کم مسکراتی تھیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ یہ مسکراہٹ واقعی اتنی خوبصورت ہے یا شوگران نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔ ہر بار ذہن سے یہی جواب آیا کہ شوگران نے اس مسکراہٹ کو خوبصورت نہیں بنایا ہوگا' اس مسکراہٹ نے شوگران کو چار چاند لگائے ہیں۔ وہ بڑی فلسفیانہ بات کرتی تھیں۔ میں بات پر جتنا غور کرتا تھا' اس کے نئے نئے معنی نکلتے چلے جاتے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بڑی تیزی سے فرحین کی شخصیت کے اثر میں آرہا ہوں۔ میرے دل میں فرحین کے لیے جو جذبہ پیدا ہوا تھا' وہ بے شک بہت خوبصورت تھا لیکن اس کے انجام کا سوچ کر میرا دل ہول جاتا تھا۔ فرحین کے اور میرے درمیان ناقابل عبور فاصلے حائل تھے۔ ان میں مزاج اور لائف اسٹائل کا فاصلہ بھی تھا۔ وہ مذہبی ذہن رکھنے والی ایک نہایت اصول پسند اور روایت پسند لڑکی تھی۔ میں مزاج کا رند تھا اور آوارہ گردی رگ رگ میں رچی بسی تھی۔ وہ شرافت کی علمبردار تھیں' میں بعض افراد کے نزدیک بدقماش شمار ہوتا تھا۔ وہ نہایت تعلیم یافتہ تھیں۔ میں نے واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ نرم ونازک پھول جیسی تھیں' میں صحرا میں اگا ہوا ایک پُرخار پودا تھا۔

غرض ہر لحاظ سے میرے اور ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ابھی تک ایک ایسے مخمس کے نام پر بیٹھی ہوئی تھی جو برسوں پہلے اسے بھلا کر سات سمندر پار آباد ہوگیا تھا' کبھی اس کی خبر لی تھی نہ اس کا حال جانا تھا لیکن وہ وفا کی پتلی اس کے ماں باپ کے پاس رہ رہی تھی اور شب وروز ان کی خدمت کررہی تھی۔ اسے اپنی ساری زندگی کی بربادی منظور تھی لیکن طلاق کا داغ ماتھے پر سجانا منظور نہیں تھا۔ میں نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا تو ذہن کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر نظر آنے والے پربتوں کے خوش نما مناظر میری نگاہوں کے سامنے رہے لیکن مجھ سے بہت دور چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری رگوں میں اس خطے کے رسم ورواج اب تک خون بن کر دوڑ رہے ہوں۔ ہندو مت کے وہ کہنہ عقائد جن کے مطابق بیوی اپنے شوہر کی میت کے ساتھ ستی ہوجایا کرتی تھی۔۔۔ وہ اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی کے سوا کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔

میں نے سوچا کہیں ہماری کچھ مشرقی عورتوں میں یہ حد سے تجاوز کرجانے والی شوہر پرستی بھی اس "ستی" کی کوئی بدلی ہوئی شکل تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے خون میں نسل در نسل سفر کرنے والے فرسودہ عقائد ابھی تک ہمارے اسلام کی تعلیمات کے خلاف مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کیوں ابھی تک کچھ ایسی رسمیں ہم میں باقی ہیں جن کا اسلام میں دور دور تک ذکر نہیں۔۔۔ ہمارا مذہب کسی جگہ یہ حکم نہیں دیتا کہ اگر ایک معصوم لڑکی کسی غلطی کے سبب ایک شرابی' جواری اور آوارہ شوہر کے پلے بندھ جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری عمر شوہر کے ظلم سہتی رہے اور اپنے چھٹکارے کے بارے میں سوچنا گناہ کبیرہ سمجھے۔

پھر میرے خیالات کا دھارا فرحین کی طرف مڑ گیا۔ وہ خوبصورت تھیں' جوان تھیں۔ کیوں اپنے لیے کوئی جیون ساتھی نہیں چاہتی تھیں۔ کوئی ہم مزاج' ہم خیال' پڑھا لکھا شریف زادہ اس کی زندگی میں آسکتا تھا اور اس کی خزاں کو بہار میں بدل سکتا تھا۔

پھر میرا دھیان یمنی کی طرف چلا گیا۔ فرحین کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ یمنی ایک جذباتی لڑکی ہے اور اس میں لاابالی پن بہت زیادہ ہے۔ میں صاف محسوس کررہا تھا کہ میرے ساتھ اس کے لگاؤ میں سنجیدگی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ جیسے اس نے وقت گزاری کے لیے مجھ سے بے

تکلفی اختیار کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے فلرٹ بھی کہا جاسکتا تھا۔ مجھے کاغان کی وہ رات ابھی بھولی نہیں تھی جب عینی نے مجھ میں اپنی دلچسپی کے اظہار کے لیے ایک نہایت عامیانہ طریقہ اختیار کیا تھا اور میرے بستر تک اپنا ہاتھ پہنچا دیا تھا۔ یہ واقعہ عینی کے کھلے ڈلے رہن سہن کا عکاس تھا۔ تنویر کی زبانی بھی مجھے ایک دن معلوم ہوا تھا کہ کالج میں اور خاندان میں عینی کے ایک دو افیئرز مشہور ہوئے ہیں۔ یہی وجوہات تھیں کہ میں اب عینی سے حتی الامکان کنی کترا رہا تھا۔ درحقیقت مجھے کبھی کبھی عینی میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ نہ ہی عینی کی خواہش کے باوجود اسے کبھی چھونے کی کوشش کی تھی۔ اگر دوران سفر میں نے عینی کی بے تکلفی کا جواب بے تکلفی سے دیا بھی تھا تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ میں غیر ارادی طور پر فرحین کی توجہ چاہ رہا تھا۔

فوزیہ والے واقعے کے بعد ایک شام عینی میرے پاس آئی تو میں نے اس سے واضح بے رخی اختیار کی۔ میں نے کہا۔ "تم نے دیکھ ہی لیا ہے عینی کہ تمہارے خاندان میں میری کتنی عزت ہے۔ اب اس عزت میں اور اضافہ مت کرو۔ بس اتنا ہی احترام و وقار مجھے ہضم ہوجائے تو بہت ہے۔"

وہ مجھے گھورتی رہی تھی لیکن بولی کچھ نہیں تھی پھر پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔

شوگران میں ہمارے قیام کا آٹھواں دن تھا۔ شام کو فارسٹ ریسٹ ہاؤس کے خوب صورت گراسی گراؤنڈ میں ٹہلتے ٹہلتے فرحین میرے پاس آگئیں، کہنے لگیں "کیا بات ہے، عینی آپ سے بہت کھنچی کھنچی ہے، کچھ کہا ہے آپ نے اسے؟"

میں نے کہا "سارے ہی مجھ سے کھنچے کھنچے ہیں۔ میں نے کسی سے کیا کہا ہے؟"

"کوئی کھنچا کھنچا نہیں، آپ ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔"

"کوئی بات ہو تو محسوس کی جاتی ہے اور میں تو ہوں ہی سراپا شر اور فساد۔ اگر میرے اور آپ لوگوں کے بیچ میں اخلاق نہ ہوتا تو شاید اب تک مجھے یہاں سے دھکے دے کر نکال دیا گیا ہوتا یا پھر پولیس کے حوالے کردیا گیا ہوتا۔"

"میں مانتی ہوں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ جس وقت فوزیہ والا واقعہ ہوا، آپ بغیر اطلاع کے اپنے کمرے سے نکلے ہوئے تھے۔ فوزیہ سے کھینچا تانی کرنے والے کا لباس بھی اتفاقاً وہی تھا جو آپ نے پہن رکھا تھا۔ بدحواسی میں فوزیہ کے منہ سے آپ کا نام نکل گیا۔ وہ خود بھی اب اس بات پر پشیمان ہے۔ ابا جان (بڑے تایا) سمیت سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ سے معذرت کرنے بھی آئیں۔"

"یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں فرحین صاحبہ! آپ نہیں جانتیں ان لوگوں کے دل میں میرے لیے نفرت کی کتنی ریل پیل ہے۔ ان کے چہروں کی مسکراہٹیں مصنوعی اور ان کے میٹھے بول دراصل زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔"

فرحین نے غور سے مجھے دیکھا پھر بولیں "کچھ بھی ہے، میں کم از کم عینی کے حوالے سے تو یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ وہ فوزیہ والے واقعے میں آپ کو قصوروار سمجھتی ہے اور اسی سبب آپ سے کھنچی کھنچی ہے۔"

"پھر آپ کیا سمجھتی ہیں؟ اس کے علاوہ اور کیا بات ہوسکتی ہے؟"

فرحین کی آنکھوں میں میرے لیے تشکر کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ آہستگی سے بولی "میرا خیال ہے کہ آپ نے اسے خود سے دور رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ سرد مہری برتی ہے اس سے۔"

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔" میں نے کہا۔

سامنے سے ندیم اور اخلاق ٹہلتے آرہے تھے۔ فرحین کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔ اخلاق اور ندیم نے بڑے احترام سے فرحین کو سلام کیا۔ ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ شاید انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ فرحین صاحبہ جو ہر وقت چہرے پر گہری سنجیدگی سجائے امور خانہ داری میں مصروف نظر آتی ہیں، پھولوں کے درمیان چہل قدمی کررہی ہیں اور میرے ساتھ مصروف گفتگو ہیں۔

"اتنا حیران کیوں ہورہے ہو؟" فرحین نے اخلاق سے پوچھا۔

"حیران کہاں، میں تو پریشان ہوں بھابی... آپ کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے تو لگا ہے کہ قربِ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہورہی ہیں۔"

"کیا اتنی خوفناک مسکراہٹ ہے میری؟"

"مسکراہٹ تو پیاری ہے لیکن اس کا نتیجہ ضرور خوفناک نکلے گا... یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بہت خوبصورت نتیجہ نکل آئے۔"

"لیکن نتیجہ نکلنا کیوں لازمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ مزاحیہ انداز میں بولا "تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ دنیا میں جب بھی کوئی اہم واقعہ ہوا وہ یا تو کسی اہم واقعے کا نتیجہ یا اہم واقعے کا سبب تھا۔"



"اخلاق! میرا خیال ہے کہ تم میری مسکراہٹ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو؟" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

ان کی سنجیدگی میں کچھ ایسا وقار تھا کہ بندے کا دل... خوامخواہ مودب ہونے کو چاہنے لگتا تھا۔

شوگران میں قیام کے دوران میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور ہمارا یہ اندیشہ غلط نکلا کہ بگڑے ہوئے رئیس زادوں کی ٹولی ہمیں تنگ کرنے کے لیے ہمارے پیچھے آئی ہے۔ نہ جانے کیوں اب میرا اپنا دل بھی اخلاق، فرحین ندیم اور گروپ کے دیگر افراد سے الگ ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اب اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے فرحین کی آنکھوں میں کہیں بہت گہرائی میں کوئی ایسی بات نظر آئی تھی جس نے زنجیر بن کر پاؤں جکڑ لیے تھے اور میرے قدموں سے لپٹے ہوئے بگولے جیسے منجمد ہوگئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ گروپ کے بیشتر ارکان مجھ سے نالاں ہیں اور دل ہی دل میں مجھے شب و روز لعن طعن کررہے ہیں۔ میں حقائق سے نظریں چرا رہا تھا اور اپنے اندر کی خودداری کو کسی کی حسین آنکھوں کی خاطر کچل رہا تھا اور ایسا میری زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ کوئی یوں میرے دل و دماغ میں سمایا تھا اور میرے رگ و پے میں گہرائی تک سرایت کرگیا تھا۔

فرحین نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا، نہ میں نے ان سے کچھ کہا تھا، نہ کوئی ایسا واقعہ ہوا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ میرے بارے میں کسی خاص انداز سے سوچ رہی ہیں پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی، میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز آرہی تھی کہ میں فرحین کو چاہتا ہوں اور اب سے نہیں، بہت مدت سے چاہتا ہوں۔ جیسے میرے اندر فرحین کے لیے بہت پہلے سے ایک خلا موجود تھا اور دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بھی آرہی تھی کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسا لمحہ بھی آئے گا جب میں فرحین کو اپنے قریب پاؤں گا۔ بے شک فی الوقت اس لمحے کا تصور محال تھا لیکن کوئی وجدانی لہجے میں میرے اندر بولتا تھا اور مجھے مجبور کررہا تھا کہ میں فرحین کے آس پاس رہوں، اپنے اندر ایک امید کو پروان چڑھاؤں اور اس امید کی شاخ پر کھلنے والے ان گنت ارمانوں کی پرورش کروں۔

جو کچھ ہورہا تھا، بڑی تیزی سے ہورہا تھا مگر مجھے اچھا لگ رہا تھا... چند روز کے اندر ہی میں بیمار بھی ہوا، عینی کے ساتھ بے تکلف بھی ہوا، انہی گنے چنے دنوں میں مجھے ایک گھٹیا الزام کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ عینی کی مجھ سے دوری بھی ہوئی اور فرحین کی آنکھوں میں مجھے وہ انوکھی کرن بھی نظر آئی جسے میں فی الحال کوئی نام نہیں دے سکتا تھا لیکن جس نے میری روح میں اتر کر میری زیست کے خاموش تاروں کو جھنجوڑ دیا تھا۔

شوگران کے دلکش نشیب و فراز میں گھومتے ہوئے، برف پوش پہاڑوں سے بہت اوپر نیلے آسمان کو تکتے ہوئے اور قراقرم کی بلندیوں کو چھو کر آنے والی عطر بیز ہوا کو سینے میں بھرتے ہوئے، میں نے بیسیوں بار سوچا کہ اگر میرے اور فرحین کے درمیان کوئی تعلق پیدا ہوا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ میری والدہ کے حوالے سے اس خاندان میں جو تعصب اور نفرت موجود تھی، میں اس سے پوری طرح آگاہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ فرحین کے ساتھ میرے کسی تعلق کو بھی اسی پس منظر میں دیکھا جائے گا اور مجھے شدت سے مطعون کیا جائے گا مگر پھر میں سوچتا کہ فرحین کی نسبت سے جو کچھ بھی میرے دل میں ہے، سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے پھر اسے کیوں چھپایا جائے کسی وقت مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری والدہ نے جو الفاظ لکھے تھے اور کہے تھے وہ جگنوؤں کی طرح میرے آس پاس ہیں اور ایک تاریک راستے پر میری رہنمائی کررہے ہیں۔

آخر ایک روز ہم شوگران سے سری پائے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمیں اپنی گاڑیاں شوگران میں چھوڑنا پڑی تھیں کیونکہ آگے راستہ بہت خراب تھا۔ قریباً ویسا ہی راستہ تھا جو ہمیں ناران سے جھیل سیف الملوک لے کر گیا تھا اور جسے ہم نے پل صراط کا نام دیا تھا۔ جھیل سیف الملوک اور سری پائے کے راستے اتنے خطرناک ہیں کہ انہیں نیکی و رشد و ہدایت کے راستے کہنا چاہیے۔ بڑے بڑے دہریے قسم کے لوگوں کو میں نے ان راستوں پر سفر کے دوران میں باقاعدہ قرآنی آیات پڑھتے دیکھا ہے اور گناہوں سے توبہ تلا کرتے سنا ہے۔ شوگران سے سری پائے کا راستہ بھی قریباً سات کلومیٹر ہے۔ یہ کچا راستہ پتھروں سے اٹا ہوا ہے۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف جان لیوا کھائیاں منہ کھولے کھڑی ہیں۔ جیپیں اچھلتی کودتی اور دہاڑتی ہوئی اس راستے کو یوں طے کرتی ہیں جیسے انہیں خود بھی اس سفر سے چھٹکارا پانے کی جلدی ہو۔ سری اور پائے کے درمیان ڈیڑھ دو کلومیٹر کا فاصلہ ہے لیکن اکثر لوگ اسے ایک ہی علاقے کے طور پر لیتے ہیں اور سری پائے ہی بولتے ہیں۔

صبح نو بجے روانہ ہوکر ہم قریباً گیارہ بجے سری پائے پہنچ گئے۔ پائے کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ بس آٹھ دس مکانات

کے چند ایک مجموعے ہیں۔ سبزہ بہت زیادہ ہے۔ بلندی کی وجہ سے اکثر یہاں دھند چھائی رہتی ہے۔

ایک نہایت سرسبز پہاڑی کے دامن میں ہم نے اپنے کیمپ لگا لیے۔ ہم سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی موجود تھی۔ خوش اخلاق لیکن محتاط لوگ تھے۔ ان کی بکریاں اور مویشی وغیرہ ہمارے خیموں کے اردگرد گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ آبادی کے بچے اپنی خوبصورت آنکھوں میں حیرت اور پیاری سی شوخی چھپائے ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور ہماری مصروفیات دیکھنے لگے، جب ہم نے اپنے کیمرے ان کی طرف سیدھے کیے تو چند بہت چھوٹی عمر کے بچوں کے سوا سب چیختے چلاتے بھاگ گئے اور پھر کافی فاصلے پر کھڑے ہو کر ہمیں شوخ نظروں سے دیکھنے لگے۔ غالباً بڑوں نے انہیں تصویر وغیرہ کھنچوانے سے منع کر رکھا تھا۔ تصویر کھنچوانے سے اس قسم کا احتراز دور دراز علاقوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ شمالی علاقوں کے دور دراز سفر میں میرے ساتھ اکثر فوٹوگرافی کے حوالے سے دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں۔ میں اخلاق اور تنویر کو ایک ایسا ہی واقعہ سنانے لگا۔ "ایک مرتبہ نانگا پربت کے بیس کیمپ کے راستے میں ایک دور افتادہ بستی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نوجوان لڑکے کی تصویر کھینچ لی۔ لڑکا رونے چلانے لگا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں قریبی کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اس کے گاؤں والے بھی آ گئے۔ وہ سب شنا زبان بولتے تھے لیکن ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم نے تصویر کھینچ کر زبردست غلطی کی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ تصویر کھنچوانے سے جسم کی اندرونی طاقت جسم سے خارج ہو کر تصویر میں چلی جاتی ہے اور تصویر اتروانے والا بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب اگر یہ لڑکا بیمار ہو گیا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر گاؤں کے ایک گھر میں بند کر دیا اور لڑکے کے بیمار پڑنے کا انتظار کرنے لگے۔"

تنویر نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟ لڑکا بیمار ہوا؟"

"ہاں۔۔۔ دوسرے روز شام تک وہ سچ مچ بیمار ہو گیا۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ ہذیان بولتا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنی نظربندی کی تیسری رات میں وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلا۔"

میری باتوں کے دوران میں ہی فرحین بھی وہاں آ بیٹھی تھیں اور دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ میں خاموش ہوا تو وہ بولیں "اس کہانی میں مجھے صرف ایک بات غیر یقینی محسوس ہوئی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ جس کی تصویر آپ نے کھینچی، وہ چیخا چلایا نہیں ہو گا بلکہ وہ "چیخی چلائی" ہو گی۔ میں نے سیاح حضرات کو اکثر و بیشتر تصویریں کھینچتے دیکھا ہے۔ ان میں شاید ہی کسی نے نوجوان لڑکے کی تصویر کھینچی ہو۔"

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ کچھ توبات بھی ہنسی کی تھی، کچھ یہ فرحین کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ وہ تو اتنی سنجیدہ تھیں کہ مسکرا کر کوئی عام بات بھی کرتی تھیں تو لگتا تھا کہ ہلال عید نظر آنے کی خوشخبری سنا رہی ہیں۔ اب انہوں نے ہلکی پھلکی بات کی تھی تو سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

میں نے کہا "وہ تصویر تو واقعی لڑکے کی تھی لیکن اب جی چاہ رہا ہے کہ ایک لڑکی کی تصویر بھی کھینچوں۔ وہ ہنستے ہوئے اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔"

"کہیں آپ کا کنایتاً یہ اشارہ فرحین باجی کی طرف تو نہیں؟" ندیم نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"اس میں گستاخی والی تو کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی جھوٹ ہے۔ فرحین صاحبہ کی مسکراہٹ سب کو اچھی لگ رہی ہے۔ دراصل وہ کبھی کبھی مسکراتی ہیں نا۔"

فرحین بولیں "اگر مسکراہٹ کی پسندیدگی کا یہی راز ہے تو پھر میں اگلی بار تین چار سال بعد ہی مسکراؤں گی۔"

سب حیرت سے فرحین کو دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کو توقع نہیں تھی کہ فرحین میری ہلکی پھلکی بات کا جواب ہلکے پھلکے انداز میں دیں گی۔ وہ واقعی بہت بدلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لباس بھی کچھ نکھرا نکھرا تھا۔ بال سلیقے سے چوٹی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور چوٹی کمر سے نیچے تک لہرا رہی تھی۔ چہرہ ہمیشہ کی طرح میک اپ سے عاری تھا لیکن آج ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا کیونکہ اس پر رقم سنجیدگی کو خوش مزاجی کی ایک لہر نے دھو ڈالا تھا۔ وہ سب نوجوان ہو فرحین کی موجودگی میں سہمے سہمے رہتے تھے، آج خود کو لیڈی محسوس کر رہے تھے۔ نوک جھوک جاری تھی اور کبھی کبھی کوئی چٹکلا بھی سنائی دے جاتا تھا۔

اس دوران میں نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ فرحین صاحبہ نے اعلان کیا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے لہٰذا سب اٹھ جائیں۔ حکم کی دیر تھی کہ سب اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جنہوں نے نماز پڑھنی تھی وہ وضو کرنے کے لیے چشمے کی طرف چلے گئے، جنہوں نے راہِ فرار اختیار کرنی تھی وہ میری طرح ان لپیٹ کروا لیں باتیں ہو گئیں۔۔۔ سری پائے میں گھومتے گھومتے مجھے ایک بار پھر شوگران یاد آنے لگا۔ شوگران کی دو خصوصیات یادگار تھیں۔ ایک تو وہ کچے پکے سیب جو پہاڑی



ڈھلوانوں پر بافراط ملتے تھے اور جنہیں لڑکیوں نے خوب آنکھیں میچ میچ کر اور چٹخارے لے لے کر کھایا۔ دوسرا وہ چھپر ہوٹل جس میں ہم نے فائیو اسٹار ہوٹل کا سا مزہ پایا۔ اس ہوٹل کا نام غالباً ڈرائیور ہوٹل تھا۔ معمولی ہونے کے باوجود یہ بہت صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ مالک خوش اخلاق، ماحول خوش گوار اور کھانے خوش ذائقہ تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بل بھی خوش کن ہوتا تھا۔ جس طرح کھانا کھا کر معدے پر بوجھ نہیں پڑتا تھا، بل ادا کر کے جیب پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ہی ایک احاطے میں بہت سی خوشنما مرغیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ کر مرغیوں کا چال چلن ملاحظہ کرتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے پانچ چھ نوٹ مرغیاں منتخب کر کے ان کا کڑاہی گوشت بنوا لیتے۔ ہزاروں فٹ گہری کھائیوں کے کنارے کھلے آسمان تلے بیٹھ کر کیے گئے وہ لنچ اور ڈنر یادگار تھے۔۔۔ اب یہاں سری پائے میں بھی دو چیزیں ناقابلِ فراموش تھیں۔ ایک تو وہ خوشنما بادل جو ہمہ وقت ہمارے اردگرد سفید دھند کی شکل میں چھائے رہتے اور ماحول کو خوابناک بناتے تھے، دوسرے وہ سبزہ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کائنات کے اس کنارے سے لے کر آخری کنارے تک ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔

ہمارے جدید طرز کے خیمے ہر قسم کے موسمی حالات کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہ خیمے بارش آندھی اور سخت سردی میں بھی گھر جیسا آرام مہیا کرتے ہیں۔ ان کی شکل الٹے پیالے جیسی ہوتی ہے۔ ان کے اندر کھڑا تو نہیں ہوا جا سکتا تاہم سیدھا ہو کر بہ آسانی بیٹھا جا سکتا ہے۔ ہم نے کل سات خیمے لگائے تھے، بعض خیموں میں دو اور بعض میں تین یا چار افراد سو سکتے تھے۔

سری پائے کے ماحول نے ہمیں اپنا اسیر کر لیا اور ہم سب کچھ بھول بھال کر اس "حسن خداداد" میں محو ہو گئے۔ دوسرے روز دوپہر کو دھوپ نکلی تو قرب و جوار کے وسیع مناظر نگاہ کو دعوتِ پرواز دینے لگے۔۔۔ ہمیں اپنے چاروں طرف نہایت حسین چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون سی چوٹی ہے۔ سلجوق کو اس معاملے میں ایکسپرٹ سمجھا جا رہا تھا۔ وہ بھی بحیثیت پارٹی لیڈر کے الٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ ایک دو چوٹیوں کے بارے میں تو اس نے صحیح بتایا، باقی کے بارے میں یونہی جھوٹ سچ سنا دیا۔

اخلاق نے مجھ سے کہا "یار تیمور! تم ہی کچھ روشنی ڈالو۔ یہ فردوسِ بریں کے پہاڑ ہیں یا ان کا تعلق ہماری اس فانی دنیا سے ہی ہے۔"

میں نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ وہی ملکہ پربت ہے جو ہم نے جھیل سیف الملوک پر دیکھی تھی، یہ اس کی دوسری سائڈ ہے اور یہ دائیں جانب جو چوٹی نظر آ رہی ہے، اسے مکڑا پیک کہا جاتا ہے۔ مکڑا پیک کیوں کہا جاتا ہے یہ آپ خود دیکھ لیں۔ چوٹی پر سے جب برف پگھلتی ہے تو وہ دودھیا لائنوں کی شکل میں چاروں طرف ڈھلک جاتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں تو یہی لگے گا جیسے مکڑے کی ٹانگیں ہیں۔"

"واہ۔۔۔ واہ سبحان اللہ" اخلاق اور ندیم پکار اٹھے "اب تو یہ واقعی مکڑا چوٹی نظر آنے لگی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ہمارے عقب میں سیول پیک ہے اور یہ بائیں طرف موسیٰ کا مصلیٰ ہے۔"

"موسیٰ کا مصلیٰ؟" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

"جی ہاں۔ اس چوٹی کو موسیٰ کا مصلیٰ کہا جاتا ہے۔"

سلجوق اصرار کرنے لگا کہ موسیٰ کا مصلیٰ یہ نہیں بلکہ ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو موسیٰ کا مصلیٰ کہا جاتا ہے۔ وہ مکڑا پیک کو بھی کوئی دوسرا نام دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میرے اور سلجوق کے درمیان اس معاملے پر بحث ہوئی۔ بحث جب باقاعدہ تکرار کی شکل اختیار کرنے لگی تو چھوٹے تایا نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا "چلو جو بھی نام ہیں، لیکن چوٹیاں بہرحال اچھی ہیں۔ باقی جس چوٹی کو تم مکڑا پیک کہہ رہے ہو، وہ مجھے مکڑا پیک نظر آ رہی ہے اور نہ چھکڑا پیک، مجھے تو لگتا ہے کہ چاکلیٹ رنگ کی کون آئس کریم پر وینلا کی سفید دھاریاں ہیں۔ اس لحاظ سے اس پیک کا نام لذیذہ پیک ہونا چاہیے۔"

"بس آپ کو تو کھانے کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں آتی" چھوٹی تائی نے تایا کو ٹوکا۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ خیال تھا کہ بات آئی گئی ہو جائے گی لیکن سلجوق بدستور بس کھول رہا تھا۔ اس نے پھر یہی موضوع چھیڑ دیا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ موسیٰ کا مصلیٰ دراصل ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو کہا جاتا ہے۔ بحث ایک بار پھر تکرار کی شکل اختیار کرنے لگی تو میں نے خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔

شام کو میں اور اخلاق آبادی پہنچے۔ ہم نے وہاں سے آٹھ دس مرغیاں اور ایک چھوٹے سائز کا بکرا خریدا۔ آبادی کے لوگ ہمارے ساتھ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ سیاحوں کی آمدورفت سے انہیں کافی فائدہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم اپنا بچا کھچا سالن یا روٹی وغیرہ اپنے کیمپ

کے نزدیک نہ پھینکیں کیونکہ پھر پرندے اور آوارہ جانور اکٹھے ہوجاتے ہیں اور کیمپنگ کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ یہی بات میں اپنے طور پر بھی گروپ کے افراد سے کہہ چکا تھا۔ اس وقت میری بات پر زیادہ کان نہیں دھرا گیا تھا لیکن اب اخلاق نے بڑے دھیان سے سنا۔ اسی دوران میں ندیم اور فرحین بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ہم کافی دیر تک بستی والوں سے گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ ایک بار پھر ارد گرد کی چوٹیوں کی بات چھڑ گئی۔ تنویر کے پوچھنے پر بستی کے ایک عمر رسیدہ شخص نے چوٹیوں کے نام گنوائے۔ سلجوق کی یہ بات غلط ثابت ہوگئی تھی کہ موسیٰ کا مصلیٰ ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو کہا جاتا ہے' اسی طرح مکڑا پیک کے بارے میں بھی اس کے ریمارکس غلط اور میرے درست ثابت ہوئے تھے۔

ندیم کا خیال تھا کہ کیمپ واپس پہنچ کر سلجوق کو شرمندہ کیا جائے لیکن میں نے منع کردیا۔ میں نے کہا "اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ وہ بستی والوں کی معلومات کو بھی ناقص قرار دے دے' ایسے میں ہم کیا کرلیں گے؟... خوامخواہ اس کے چڑچڑے پن میں اضافہ ہوگا۔"

اخلاق بولا "لیکن وہ تو اس معاملے میں پانچ ہزار کی شرط لگانے پر تلا ہوا تھا اور غالباً اب بھی تلا بیٹھا ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر ہم نے پانچ ہزار جیت کر سلجوق کا خوش گوار موڈ کھودیا تو یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ لہٰذا اس بات کو یہیں ٹھپ کردیتے ہیں۔"

اگلے دو تین روز سب لوگوں نے بہت انجوائے کیا۔ سب ٹولیوں کی شکل میں بٹ جاتے' کھاتے پیتے' گھومتے پھرتے اور میوزک سنتے۔ ندیم میوزک کا بے حد شوقین تھا۔ وہ ڈرائی سیلز کی ایک پوری پیٹی ساتھ لے کر گیا ہوا تھا۔ جب ڈرائی سیل ختم ہونے کے قریب آگئے تو اس نے خود گانا شروع کردیا اور واقعی اس کی آواز سننے کے لائق تھی... عینی بدستور مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ اس نے میری بے رخی کا سخت نوٹس لیا تھا اور دس گنا زیادہ بے رخی دکھا رہی تھی۔ شاید وہ واقعی فلرٹ کررہی تھی۔ اس قسم کے خواتین وحضرات جتنی تیزی سے تعلقات بناتے ہیں' اتنی ہی تیزی سے ختم بھی کرلیتے ہیں۔ وہ عشق پیشہ دیوانوں کی طرح کوئی بات دل سے لگاتے نہیں ہیں... میں غیر محسوس طور پر فرحین کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جارہا تھا۔ یہ ایک ایسی کشش تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات محسوس کرکے میرے رگ وپے میں ہزارہا گلستان کھل گئے تھے کہ فرحین کی آنکھوں میں گاہے گاہے مجھے ایک ایسی روشنی نظر آتی تھی جسے میں کم از کم وابستگی تو کہہ ہی سکتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے لیے وابستگی کا یہ موہوم سا احساس ہی بہت ہے اور میں اس کے سہارے ساری زندگی گزار سکتا ہوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عملاً ایسا نہیں ہوا کرتا۔ جذبے ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں' وہ کبھی ٹھہرتے نہیں' مثلاً محبت ہی کو لیں' یہ بڑھتی ہے یا پھر گھٹتی ہے... میری محبت بھی بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ شاید فرحین کی آنکھوں میں نظر آنے والی روشنی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کا وقت نکال لیتی تھیں۔ اگر چند گھنٹوں تک بات نہ ہوسکتی تو میری طرح وہ بھی بے چین نظر آتیں۔ جس طرح میری نگاہ ان کو ڈھونڈتی رہتی تھی' اسی طرح کبھی کبھی میں ان کی نگاہ کو بھی اپنے لیے سرگرداں پاتا۔

یہ کیسی کایا پلٹ تھی؟ فرحین دراصل نادان عینی کو مجھ سے دور رکھنے کے لیے میری طرف متوجہ ہوئی تھیں لیکن اسی کوشش کے دوران میں ایک خودرو جذبہ ان کے اپنے اندر پروان چڑھ گیا تھا۔ ایک ایسا جذبہ جس کی واضح شکل تو مجھے معلوم نہیں تھی لیکن جس کی جھلک گاہے گاہے میں ان کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے اخلاق کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ اس کا ویڈیو کیمرا خراب ہوگیا۔ یہ ویڈیو کیمرا وہ "انگلینڈ" سے خصوصی طور پر شمالی علاقہ جات کی منظر کشی کے لیے لے کر آیا تھا۔ ویڈیو کیمرا خراب ہوا تو اخلاق کو یوں لگا جیسے اس کی بینائی جاتی رہی ہے اور ارد گرد کی خوبصورتی اس کے لیے بے معنی ہوگئی ہے۔ اخلاق اور تنویر دو ڈھائی گھنٹے کیمرے سے سر کھپاتے رہے۔ جب وہ ٹھیک نہیں ہوا تو اخلاق نے واپس جانے کی ٹھانی۔ وہ بہرصورت کیمرا ٹھیک کرانا چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"

وہ بولا "شوگران میں ایک ویڈیو شاپ کا بورڈ پڑھا تھا۔ شاید وہاں سے کوئی "ہیلپ" مل سکے۔ نہ ہوا تو نیچے کیوائی جاؤں گا وہاں سے بالاکوٹ جاؤں گا... بلکہ ایبٹ آباد بھی جانا پڑا تو جاؤں گا لیکن کیمرا ٹھیک کرا کے لاؤں گا۔"

بڑے اور چھوٹے تایا نے بہت منع کیا' نرگس نے بھی آنکھوں' آنکھوں میں اشارے کیے لیکن کیمرے کے بغیر اخلاق کی دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ وہ دوپہر کے وقت تنویر کو ساتھ لے کر شوگران روانہ ہوگیا۔ میں بھی ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن ندیم نے مجھے روک لیا۔ اس کے ساتھ میری گاڑھی چھننے لگی تھی اور میرے بغیر وہ ایک دم بیزار سا ہوجاتا تھا۔

سہ پہر کو سب نے خیموں میں آرام کیا۔ قریباً دو گھنٹے سونے کے بعد میں اٹھا تو موسم نہایت خوش گوار تھا۔ مطلع صاف تھا اور مسحور کن ہوا چل رہی تھی۔ فرحین مجھے کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ خیموں میں تھیں اور نہ اردگرد کہیں۔ مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ انہیں ڈھونڈتا ہوا میں آبادی کی طرف چلا گیا۔ آبادی میں پہنچ کر مجھے چونکنا پڑا۔ فرحین مقامی بچوں اور عورتوں کے درمیان گھری ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں سوئیٹس اور ٹافیوں وغیرہ کے بہت سے پیکٹ تھے۔ وہ یہ چیزیں بچوں میں تقسیم کر رہی تھیں' بچے ان کی ٹانگوں سے لپٹے جا رہے تھے۔ ان کی چکاروں سے قرب و جوار گونج رہے تھے۔ وہ کسی کے سر پر ہاتھ پھیرتیں' کسی کا منہ چومتیں۔ میرے سامنے انہوں نے چند ضرورت مند عورتوں میں نقدی بھی تقسیم کی۔

میں دور کھڑا محویت سے دیکھتا رہا۔ وہ نیکی اور رحم دلی کا مجسمہ تھیں۔ مجھے لگا جیسے وہ سرتاپا ایک شیشہ ہے اور میں سرتاپا پتھر۔ اگر میں ہلکے سے اسے چھو بھی گیا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ چکنا چور ہو جائے گی پھر میں کیوں اس کے قریب جا رہا تھا؟ کیوں اس کی زندگی کو متلاطم کر رہا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں۔ رات کو جب سارے سو رہے ہوں' اپنا مختصر سامان سمیٹوں اور پاپیادہ شوگران کی طرف روانہ ہو جاؤں پھر کبھی فرحین کو اپنی صورت نہ دکھاؤں اور نہ اسے اپنے خیالوں میں گھسنے دوں۔

نہ جانے میں کتنی دیر یونہی کھڑا فرحین کو دیکھتا رہا پھر فرحین کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مسکرانے لگیں۔ بچے ان سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئے تھے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی بچہ ان کی گود میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی کندھوں پر سوار تھا۔ ایک شریر چپٹ پٹ ان کے گالوں کے بوسے لے رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھیں اور شرم سے سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ یہ ان کا بالکل نیا روپ تھا۔ اس سنجیدہ اور متین روپ سے قطعی مختلف جو میں اکثر دیکھا تھا۔ مجھے اپنے قریب پا کر فرحین نے ایک بچے کو گلے سے لگایا اور اس کے گال کا بوسہ لے کر بولیں "بڑے تیز بچے ہیں۔ ایسے بچے اپنی جگہ آپ بنا لیتے ہیں۔"

"ہاں' کچھ بچے واقعی بڑے تیز ہوتے ہیں" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے کچھ جیپیں نظر آئیں۔ ان جیپوں پر سوار ہو کر جو لوگ یہاں آئے تھے' وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ وہی غنڈا پارٹی تھی جس سے پہلے جھیل سیف الملوک اور پھر شوگران میں ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ شوخ لڑکے کا بلاوا کرتے آبادی میں پہنچے۔ جونہی گاڑیاں کھڑی ہوئیں وہ اپنے ٹینٹ اور دیگر سامان گاڑیوں سے اتارنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی ہماری طرح یہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میری طرح فرحین نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ مضطرب انداز میں میری طرف بڑھ آئیں۔ میرے پاس آ کر بولیں "یہ لوگ تو یہاں بھی پہنچ گئے؟"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہماری تفریح برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے" میں نے کہا۔

"اللہ کرے آپ کا خیال غلط ثابت ہو" فرحین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر ذرا توقف سے بولیں "ویسے ہو سکتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تشویش کا شکار ہو رہے ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ جھیل پر ہونے والے جھگڑے کے سوا اب تک خیریت ہی رہی ہے۔ شور شرابا تو یہ لوگ کافی کرتے ہیں مگر اب تک ایک حد کے اندر ہی رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نیک توقعات تو ہمیں ضرور رکھنی چاہئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ محتاط رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ ان لوگوں کو اب یہاں سری پائے میں دیکھ کر میرا یہ شک یقین میں بدلنے لگا ہے کہ شوگران میں فوزیہ سے دست درازی کرنے والا لڑکا انہی میں سے کوئی ایک تھا۔"

فرحین بولیں "بہرحال میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ اپنے دماغ بالکل ٹھنڈے رکھیں۔ معمولی باتوں کو برداشت کریں' اگر یہ لوگ ایک حد میں رہتے ہیں تو ہمیں بھی بات بڑھانے سے گریز کرنا چاہیے۔"

ابھی فرحین کی بات منہ میں ہی تھی کہ ایک ٹینس بال جس پر ٹیپ چڑھی ہوئی تھی' اڑتا ہوا فرحین کے سر پر لگا۔ ان کے منہ سے "ہائے" نکل گئی۔ گیند سر کے پچھلے حصے پر لگ کر دور لڑھک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گیند مارنے والے وہی جھیل والے لڑکے تھے جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ فرحین کو گیند لگنے میں یقیناً ان کے ارادے کو دخل تھا لیکن اب وہ یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے اتفاقاً ایسا ہو گیا ہے۔ ایک لڑکا دوسرے کو مصنوعی ڈانٹ پلا رہا تھا کہ کیا گیند پھینکتے ہوئے اسے ہم دونوں دکھائی نہیں دیے۔ گیند پھینکنے والے لڑکے کے چہرے پر تاؤ دلانے والی ہنسی تھی۔ ایسی ہنسی مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہوئی۔ ڈھٹائی اور



شرمندی میں گندھی ہوئی یہ ہنسی ہمیشہ میرا میٹر گھما دیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی میرا میٹر گھوم گیا۔ نتیجے سے بے پروا ہو کر میں مسکرانے والے لڑکے کی طرف بڑھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میرا ہاتھ اس کے گریبان پر آیا تھا پھر سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے دھندلا گیا۔ صبر و برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور میں اس حد کو پار کر گیا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر میں نے اس لڑکے کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا' اس کی پچی ہوئی قمیص میرے ہاتھوں میں تھی۔ دو لڑکے اندھا دھند میری کمر پر دو ہتڑ رسید کر رہے تھے تاہم میں سامنے والے لڑکے کو زمین بوس کر کے ہی ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کی ناک پر میری زوردار ٹکر پڑی اور دوسرے کو میں نے گھما کر ایک چپڑ رسید کر دے مارا۔ اس کے بعد غنڈا گروپ کے لڑکے کالی بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میرے ہاتھ میں کرکٹ کا بیٹ آ گیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے کیا۔ دو تین کے سر پھاڑے چند ایک کے دانت توڑے' پھر میں گر گیا۔ میرے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ مقامی لوگ بیچ میں آ گئے تھے اور مجھے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن غنڈا پارٹی شاید میری جان لینا چاہ رہی تھی۔ اس دوران میں ہمارے گروپ کے دو تین لڑکے بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ بھی مجھے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ میرا لباس تار تار ہو چکا تھا اور جسم کا ہر حصہ ضربوں کی زد میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے دو تین فائر سنائی دیے۔ یہ ہوائی فائر تھے اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' مقامی افراد میں سے ایک شخص نے کیے تھے۔

مقامی لوگوں نے کوشش کر کے مجھے منٹوں کی پارٹی سے چھڑا لیا اور میرے ساتھیوں یعنی ندیم اور رضوان وغیرہ کے حوالے کر دیا۔ میرے منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور پاؤں پر بھی سخت چوٹ آئی تھی۔ ندیم اور رضوان وغیرہ مجھے سہارا دے کر اپنے کیمپ میں واپس لے آئے۔ غنڈا پارٹی کی گالیاں اور ان کی للکاریں بہت دور تک میرے کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ مجھے فرحین کا چہرہ بار بار اپنے آس پاس نظر آ رہا تھا۔ فرحین کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فرحین کے چہرے پر نظر آنے والی اندوہ کی پرچھائیاں میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دے رہی ہیں۔ "سین" تو بے شک وہی فلموں والا تھا۔ میں نے اپنے محبوب کی خاطر مار کھائی تھی لیکن اس کیفیت میں جو لذت محسوس ہو رہی تھی' میں نے اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے خیمے میں لٹا دیا گیا۔ ساتھیوں نے میری مرہم پٹی کی۔ ابتدائی طبی امداد کا سارا سامان کیمپ میں موجود تھا۔ فرحین نے مجھے درد کش دوا کے علاوہ خواب آور دوا کا ڈوز بھی دے دیا۔ میں رات بھر اور اگلے دن دوپہر تک بے خبر سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو پہلا احساس یہی ہوا کہ میں ابھی تک خیمے میں ہوں اور خیمے سے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ یہ ہمارے کیمپ کا نسبتاً کشادہ خیمہ تھا اور یہاں چار پانچ افراد کے لیے گنجائش موجود تھی۔ کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ بڑی آہستگی کے ساتھ میری پیشانی پر حرکت کر رہا تھا۔ یہ فرحین صاحبہ تھیں۔ وہ روئی کے پھاہے سے میری پیشانی کے زخم سے رسنے والا خون صاف کر رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گئیں۔ روئی کا خون آلود پھاہا انہوں نے ایک طرف رکھ دیا اور بولیں "آپ لیٹے رہیں' میں آپ کی چوٹ پر دوا لگا دوں۔"

پیشانی پر مرہم لگا کر انہوں نے اسے چپکنے والی پٹی سے ڈھانپ دیا۔ ان کے ہاتھوں کا لمس میرے جسم میں عجیب سی سنسنی جگا رہا تھا۔ عورت میرے لیے کوئی عجوبہ نہیں تھی' نہ ہی میں صنفِ مخالف کے اولین لمس کے لیے ترسا ہوا کوئی ٹین ایجر تھا' پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ فرحین کا قرب میرے جسم و جاں کی بنیادوں تک ہلا دیتا تھا۔ "اب آپ کافی بہتر ہیں" وہ آہستگی سے بولیں "رات آپ کو بخار بھی ہو گیا تھا۔"

میں کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں سوجا ہوا تھا۔ اس پر ڈریسنگ وغیرہ لگا کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ جسم پر اور بھی کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔ خیمے سے باہر بارش زوروں میں ہو رہی تھی "باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے فرحین سے پوچھا۔

وہ بولیں "ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے وہ لوگ وادی کی طرف نکلے تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں انہیں واپس آ جانا تھا مگر ایک دم تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ بارش تھمنے کے انتظار میں وہ کہیں رک گئے ہیں۔"

"ندیم بھی ساتھ گیا ہے" میں نے پوچھا۔

"نہیں ندیم اور رضوان یہیں ہیں۔ ابھی باہر نکلے ہیں۔ تیز ہوا کی وجہ سے وہ نیلا خیمہ گر گیا تھا۔ اس خیمے کا سامان دوسرے خیمے میں رکھ رہے ہیں۔"

"لڑکے پھر تو نہیں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' دوبارہ تو نہیں آئے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب مزید رسک نہیں لینا چاہیے۔ کافی تفریح ہو گئی

ہے' اب واپس جانا بہتر ہے۔"

"باقی لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

"وہ تذبذب میں ہیں۔ اخلاق اور تنویر کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ ابھی تک شوٹ گران سے واپس نہیں آئے" پھر ذرا توقف سے بولیں "آپ کی کیا رائے ہے؟"

میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا "میری رائے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ میں تو آپ لوگوں کے درمیان ایک بن بلایا مہمان ہوں۔"

"آپ کچھ زیادہ ہی قنوطی نہیں ہیں۔"

میں نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے جانے کے بعد شاید کبھی آپ سے ملاقات نہ ہو سکے۔ لیکن۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچا کروں گا۔"

وہ چونک گئیں۔ ایک ساعت کے لیے ان کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں۔ اس ساعت میں ہم دونوں صرف دو انسان تھے جو شاید پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پوری آزادی کے ساتھ' بغیر کسی مصلحت یا اندیشے کے۔ لیکن اگلے ہی لمحے نگاہوں کی یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ وہ پھر سے فرحین صاحبہ بن گئیں۔ میں پھر سے بن بلایا مہمان ہو گیا۔ انہوں نے سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں؟ میں کوئی ایسی مشکل انسان تو نہیں ہوں۔"

"آپ آسان بھی کب ہیں" میں نے کہا "کم از کم میرے جیسا کم فہم شخص تو آپ کو سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ زمین پر پڑا ہوا کوئی کنکر چودھویں رات کے چاند سے نگاہیں ملا رہا ہو اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"ایک بات کہوں؟" وہ بولیں۔

"کہیے۔"

"آپ کے ذہن میں الجھاؤ بہت ہے۔ آپ نماز پڑھا کریں۔ آپ کو بہت سکون ملے گا۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' ندیم اور رضوان بھیگے ہوئے' لرزتے کانپتے اندر آ گئے۔ میری اور فرحین کی گفتگو کا فل اسٹاپ لگ گیا۔ اندر آتے ہی ندیم کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

اخلاق اور تنویر کی واپسی اگلے روز ہوئی۔ یہاں پیش آنے والے سنگین واقعے نے انہیں بھی آزردہ خاطر کیا۔ رات گئے تک گروپ کے ارکان میں مشورہ ہوتا رہا۔ کچھ کی رائے تھی کہ ٹور کو "پیک اَپ" کر کے واپس روانہ ہوا جائے' تاہم کچھ خواتین و حضرات مخالفت کر رہے تھے۔ اس دوران میں مقامی بستی کے دو سرکردہ افراد ملک خدا بخش اور لندو خاں بھی ہمارے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں اور اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ فرحین نے بستی کی خواتین اور بچوں سے بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ فرحین کی محبت اور خدا ترسی نے چند ہی دنوں میں ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ خدا بخش اور لندو خاں مسٹنڈوں کی ٹولی سے بات کر کے یہاں آئے تھے۔ ان دونوں نے ہمارے گروپ کو ہر طرح سے تحفظ کی یقین دہانی کرائی۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکوں کے گروپ نے یہاں شرافت سے رہنے کا وعدہ کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا' اب آئندہ ان کی طرف سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ خدا بخش اور لندو خاں کی باتوں سے پتا چلا کہ ویسے بھی سری پائے میں لڑکوں کا پروگرام مختصر ہے اور ممکن ہے کہ وہ پرسوں تک واپس چلے جائیں۔

غرض ایک رات تذبذب میں رہنے کے بعد گروپ نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اخلاق دھن کا پکا تھا۔ وہ اپنا وڈیو کیمرا ٹھیک کروا کے ہی لوٹا تھا۔ سری پائے کے خوبصورت مناظر اسے دیوانہ کر رہے تھے' وہ تنویر اور رضوان منظر کشی میں مصروف ہو گئے۔ گروپ کے باقی ارکان نے بھی اپنی دلچسپی کی مصروفیات ڈھونڈ لیں۔ یہ سب چلنے پھرنے والی مصروفیات تھیں اور میں فی الحال چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ ان دو تین دنوں میں مجھے فرحین کے پاس بیٹھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ میں اپنی چوٹ کے سبب گروپ کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا جبکہ فرحین ویسے ہی پکنک پسند نہیں کرتی تھیں۔ جب باقی خواتین و حضرات گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے تو بڑی نائی جان اور فرحین کیمپ میں ہی رہ جاتیں۔ بڑی نائی تو دھوپ میں بیٹھتے ہی اونگھنے لگتی تھیں اور تھوڑی ہی دیر بعد باقاعدہ سو جاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر فرحین میرا حال چال پوچھنے میرے پاس چلی آتیں۔ ہم ہلکی پھلکی باتیں کرتے' موسم کی باتیں' خوبصورت گرد و پیش کی باتیں اور قدرت کی باتیں۔ لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ اس رسمی گفتگو کے پس منظر میں ایک اور "گفتگو" بھی ہم دونوں میں ہوتی ہے۔ اس گفتگو میں کوئی لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ہی کوئی اشارہ کنایہ تھا مگر پھر بھی کچھ باتوں کا ابلاغ نہایت خاموشی سے ہوتا رہتا تھا اور کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ اصل گفتگو یہی ہے جو پس منظر میں ہوتی ہے۔ کسی وقت مجھے محسوس



ہوتا کہ یہ سب میرا وہم ہے' میری خام خیالی ہے۔ میں فرحین میں وہ کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں جو ان میں نہیں ہے' لیکن پھر مجھے وہ یادگار نگاہ یاد آ جاتی جو چند روز پہلے فرحین نے مجھ پر ڈالی تھی۔۔۔ ہاں وہ یادگار نگاہ تھی۔ وہی ساعت جب وہ "مسز فرحین صاحبہ" نہیں رہی تھیں' میں اس گروپ کا بن بلایا مہمان نہیں رہا تھا' ہم دونوں نے فقط دو انسانوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پوری آزادی کے ساتھ' بغیر کسی مصلحت اور اندیشے کے۔۔۔ بالکل فطری انداز میں۔

میرے پاؤں میں خاصی چوٹ آئی تھی۔ بہرحال اب میں کوشش کر کے اسٹک کے سہارے دو چار قدم اٹھانے لگا تھا۔ ایک دن ندیم کہنے لگا "تیمور بھائی! چھوڑیئے اس ٹنڈے کو۔ مجھے اس شے سے سخت نفرت ہے۔ آیئے' میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔ یہ لیجیے' میرے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھیے اور بے فکر ہو کر قدم اٹھایئے۔"

ندیم کے اصرار پر میں اس کے کندھے کا سہارا لے کر قدم اٹھانے لگا۔ اس وقت بڑی نائی اور فرحین کے سوا کیمپ میں اور کوئی نہیں تھا۔ بڑی نائی حسب معمول خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ میں نے بہت سنبھل سنبھل کر چند قدم اٹھائے۔ اچانک ڈھلوان سے پاؤں پھسل گیا لیکن یہ میرا نہیں' ندیم کا پاؤں تھا۔ یعنی جو بڑے طمطراق سے سہارا دے رہا تھا وہ خود ہی رپٹ گیا تھا۔ ندیم پشت کے بل نکیلے پتھر پر گرا' اس کی دنبی کی ہڈی پر سخت چوٹ آئی۔ بے چارے کو بیک بھی عین اسی جگہ پر چوٹ لگ چکی تھی۔ ناران میں برف پر فلم "آگ" کے سین کی نقل کرتے ہوئے وہ گر گیا تھا۔ ندیم جہاں گرا تھا وہیں پر ہائے وائے کرنے لگا۔ فرحین کو بہت کم ہمی آتی تھی لیکن اس منظر پر وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ یعنی جس نے سہارا دینا تھا وہی چاروں شانے چت پڑا تھا۔ میں ڈھلوان پر ایسی جگہ کھڑا تھا کہ نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ کسی چیز کا سہارا لے سکتا تھا۔ فرحین جلدی سے آگے آئیں اور ندیم کی ہائے وائے کو نظر انداز کر کے مجھے سہارا دیا۔ وہ غیر متوقع طور پر ایک دم میرے قریب آ گئی تھیں۔ میں نے ان کے جسم کو پوری شدت سے محسوس کیا اور سر تا پا ایک سنسناہٹ میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ندیم نے نصیب کو دہائی دی "غضب خدا کا۔۔۔ اس سنسار میں انصاف تو ہے ہی نہیں۔ ارے کوئی ہے جو مجھ آفت زدہ کو بھی اٹھائے۔"

ہنسی روکنے کی کوشش میں فرحین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک موٹی نس ان کی پیشانی پر چمکنے لگی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھے سہارا دے کر خیمے تک لے آئیں۔ ہم خیمے کے سامنے پہنچے تو ایک دم درختوں کے پیچھے سے گروپ کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں برآمد ہوئے' ان میں فوزیہ' نرگس اور شملا کے علاوہ عینی بھی تھی۔ وہ سب مسکراتی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ خاص طور سے عینی کی نگاہوں کا انداز تو باقاعدہ طنزیہ تھا۔ نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا "معاف کیجیے۔ ہم آپ کو چھپ کر نہیں دیکھ رہے تھے۔ بس اتفاقاً یہاں موجود تھے۔"

غالباً وہ لوگ کچھ اور بھی کہتے لیکن فرحین کا احترام آڑے آیا اور وہ خاموشی سے تتر بتر ہو گئے۔ میں نے فرحین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھا۔ مجھے خیمے تک پہنچا کر وہ چپ چاپ لوٹ گئیں۔ میں خیمے میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کا منظر خواب کا سا لگ رہا تھا۔ مجھے سہارا دینے کے لیے فرحین کا ایک دم میرے قریب آ جانا۔ ان کے جسم کا گداز لمس' ان کے قرب کی بھینی سی مہک' ہنسی روکنے کی کوشش میں ان کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ۔ اور پھر۔۔۔ ان حسین لمحات کے بعد اچانک فرحین کی خاموشی اور ان کے چہرے پر لرانے والا سایہ۔ جیسے بڑی روانی سے بہتا ہوا پانی اچانک کسی پتھر سے ٹکرا کر اچھل جائے اور چونک جائے۔

میرے اندیشے کافی حد تک درست ثابت ہوئے۔ اس واقعے کے بعد فرحین جیسے ایک دم کسی خول میں چھپ گئی تھیں۔ وہ سارا دن مجھ سے دور دور رہیں اور اگلے روز بھی ان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دوپٹا ان کے سر پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پیشانی کو ڈھانپتا ہوا یہ دوپٹا کانوں کے پیچھے سے اڑسا گیا تھا اور پھر گردن اور سینے پر پھیلا لیا گیا تھا۔۔۔ اس روز شام کو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ رہی ہیں اور نماز پڑھنے کا کہہ رہی ہیں۔ خود ان کے اپنے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ندیم سے پوچھا "یار' یہ فرحین صاحبہ کچھ زیادہ ہی "چپ شاہ" نظر نہیں آنے لگی ہیں۔"

وہ مخصوص لہجے میں بولا "حیرانی کی بات یہ نہیں ہے' حیرانی کی بات یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس روز میں وہ خوش گوار موڈ میں نظر آتی رہی ہیں۔"

"تو پھر اب کیا ہو گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ کل صبح والے واقعے کا انہوں نے اثر لیا ہے۔ وہ آپ کو سہارا دے کر خیمے کی طرف لا رہی

تھیں۔ اوپر سے دوسرے لوگ آگئے اور ہنسنے لگے۔ شاید فرحین باجی کو اپنے طور پر وہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔"

میرے رگ وپے میں عجیب سی بے قراری اترگئی۔ میں جانتا تھا کہ ہمارا ساتھ بہت مختصر ہے۔ سری پائے میں ہمارا ساتواں دن تھا' بمشکل دو تین روز ہمیں مزید یہاں ٹھہرنا تھا پھر واپسی کا سفر شروع ہوجانا تھا۔ اس کے بعد فرحین سے بات چیت تو دور کی بات ہے' ان کی صورت دیکھنا بھی میرے لیے محال تھا۔۔۔ میرا اگلا دن بھی اسی کشمکش میں گزرا کہ کسی طرح فرحین سے چند الفاظ کا تبادلہ ہوسکے لیکن کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ باقی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ گروپ کے ارکان سری پائے میں انجوائے کررہے تھے۔ آوارہ گرد لڑکوں کا گروپ بھی ابھی تک سری پائے میں ہی موجود تھا۔ یعنی اپنے پہلے بیان کے مطابق وہ دو روز بعد سری پائے سے واپس نہیں گئے تھے۔ بہرحال ان کی طرف سے کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ پہلے دن والے واقعے کے بعد حالات پرسکون ہی رہے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جوں جوں واپسی کا دن قریب آرہا تھا' میری اداسی بڑھتی جارہی تھی۔ میرے آس پاس پاکستان کے حسین ترین مناظر تھے لیکن فرحین کی بے رخی نے ان سارے مناظر کو یاس ونا امیدی کی دھند میں چھپادیا تھا۔ واپسی سے پہلے میں کم از کم ایک بار فرحین سے بات کرنا چاہتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ قصداً مجھے اس کا موقع نہیں دے رہی ہیں۔ وہ زیادہ وقت اپنے خیمے میں رہتی تھیں یا پھر دوسروں کے ساتھ ہی گھومنے پھرنے نکل جاتی تھیں۔ ایک دوبار میں نے انہیں بستی کی طرف بھی جاتے دیکھا۔ بستی کی عورتیں اور بچے فوراً ان کے گرد جمع ہوجاتے۔ وہ ان سے باتیں کرتیں۔ وہ اردگرد زمین پر بیٹھ کر یوں سنتے جیسے کسی عالم کا وعظ سن رہے ہوں۔ وہ ان میں کھانے پینے کی اشیا تقسیم کرتیں اور نقد امداد بھی دیتیں۔ ایسے موقعوں پر یوں لگتا جیسے ایک نورانی ہالہ سا ان کے گرد موجود ہے۔

میرا پاؤں اب کافی اچھا تھا۔ تھوڑی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ میں چل پھر لیتا تھا۔ مناسب موسم اور مناسب ٹریٹ منٹ کے سبب باقی زخم بھی ٹھیک ہورہے تھے۔ یہ ہماری واپسی سے چوبیس گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ آوارہ گردوں کی ٹولی نے پھر ایک کام دکھایا۔ ان کا کیمپ بلندی پر واقع تھا۔ ہم نشیب میں تھے۔ رات کے وقت وہ ہمارے خیموں کی طرف آئے اور بلندی سے کچھ شاپر وغیرہ ہمارے خیموں کی طرف پھینک دیے۔ ان شاپرز میں گوڑا کرکٹ ہی تھا۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے' بچا کھچا سالن' ہڈیاں اور پھلوں کے چھلکے وغیرہ۔ بلندی سے گرنے کے سبب شاپر پھٹ گئے اور یہ چیزیں بکھر گئیں۔ مقامی لوگوں نے ہمیں سختی سے منع کیا تھا کہ کھانے پینے کی بے کار اشیا کھلے میدان میں نہ پھینکیں۔ انہیں نیچے گہرائی میں ڈال آئیں یا زمین میں دبادیں۔ اس احتیاط میں جو حکمت پوشیدہ تھی' اس کا اندازہ رات کو ہوا۔ ہمارے خیموں سے باہر جانوروں کے غرانے اور چلنے پھرنے کی پُراسرار آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوارہ کتے اور جنگلی بلے وغیرہ تھے جو خوراک کی بو سونگھ کر نہ جانے کہاں کہاں سے کھنچ آئے تھے۔ وہ رات بھر ہمارے خیموں سے باہر اودھم مچاتے رہے۔ کبھی وہ لڑتے جھگڑتے ہمارے خیموں سے ٹکراتے اور ان کی غراہٹیں دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتی رہتیں۔ وہ ساری رات بدمزگی میں گزری۔ صبح سویرے میری آنکھ لگ گئی۔ نو دس بجے کے لگ بھگ میں جاگا تو سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ ندیم اور اخلاق افسردہ سے ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ ندیم کہہ رہا تھا "مگر انہیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی' کیا ہم نہیں تھے۔ وہ ہم میں سے کسی کو بھگا دیتیں۔"

اخلاق نے کہا "سب سے پہلے تو تنویر ہی سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اکیلا وہاں کیا لینے چلا گیا تھا۔"

"بس اسے تو پنگے لینے کا شوق ہے" ندیم نے کہا۔

"کیا ہوا بھائیو!" میں نے خیمے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں اخلاق نے بجھے ہوئے لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

صبح سویرے آوارہ گرد پارٹی کے دو لڑکے اوپر درختوں میں نظر آئے۔ تنویر ان کے پاس چلا گیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے ان سے کہا کہ ان کے پھینکے ہوئے شاپروں کی وجہ سے سب لوگ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ جواب میں لڑکوں نے کہا کہ انہوں نے تو شاپر درختوں میں پھینکے تھے' لڑھک کر خیموں کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ اس "تبادلۂ خیال" میں تکرار ہوگئی۔ فرحین جو صبح سویرے نماز کے لیے اٹھی تھیں' نیچے سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو وہ تنویر کو آوازیں دیتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ اس وقت تک تنویر اور دونوں لڑکوں میں خاصی گرما گرمی ہوچکی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک لڑکے نے تنویر کا گریبان پکڑلیا۔ فرحین نے بیچ میں پڑ کر دونوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ گر گئیں اور ان کی کہنی بری طرح



چھل گئی۔ پہلو سے ان کی قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ لڑکوں نے جب فرحین کے بازو سے خون بہتے دیکھا تو وہاں سے کھسک گئے۔

اب اس واقعے پر سب لہو کے گھونٹ پی رہے تھے۔ سلجوق ہنستا ہوا بستی میں گیا تھا۔ تاکہ دونوں سرکردہ افراد یعنی خدا بخش اور لندو خاں کو واقعے کے بارے میں بتائے۔ ان دونوں نے ضمانت دی تھی کہ اب لڑکے کوئی شرارت نہیں کریں گے۔۔۔ سلجوق کا بستی میں جانا بیکار ہی رہا۔ ملک خدا بخش کسی کام سے کاغان گیا ہوا تھا اور لندو خان موسمی بخار کی وجہ سے نیم بے ہوش پڑا تھا۔

گروپ میں سبھی کے چہروں پر گہری افسردگی نظر آرہی تھی' آخر ہوا ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ اس تفریح کا اختتام بڑے مایوس کن طریقے سے ہورہا تھا۔ غور سے دیکھا جاتا تو مایوسی کے علاوہ ایک طرح کی پشیمانی بھی ہر چہرے پر موجود تھی۔ میں کوئی نفسیات داں نہیں تھا مگر جانتا تھا کہ اس پشیمانی کی بنیاد کمزوری پر ہے۔ جب انسان اپنے حق کے لیے لڑ نہ سکے اور مظلوم ہوتے ہوئے بھی ظالم کے خلاف مزاحمت نہ کرسکے تو اس کے اندر ایک طرح کی فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے اور یہی فرسٹریشن پشیمانی بن کر اس کے ذہن سے چمٹ جاتی ہے۔ حساس لوگ نسبتاً زیادہ دیر تک اس سے متاثر رہتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت کا شکار ہمارے گروپ کے ارکان بھی تھے۔ چند جوشیلے ممبران مثلاً تنویر سلجوق' رضوان وغیرہ کا خیال تھا کہ لڑکوں کی طرف سے آنے والی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اگر بستی والے ساتھ نہیں دیتے تو پھر ایک دو بندے خاموشی سے شوگران جائیں اور پولیس کی مدد لے کر آئیں۔ دوسری طرف کچھ افراد خاص طور سے خواتین کا خیال تھا کہ اب اس جھگڑے کو اور زیادہ طول نہ دیا جائے۔ جتنا ہوچکا یہی بہت ہے۔ اگر وہ لوگ بے وقوفی کا مظاہرہ کررہے ہیں تو ہمیں بھی جواباً پاگل پن نہیں دکھانا چاہیے۔

بڑے تایا بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس معاملے کو ختم کیا جائے اور سامان باندھ کر یہاں سے نکلا جائے۔ سوچ بچار کے بعد گروپ نے خاموشی اختیار کرنے کے حق میں رائے دی۔ فیصلہ کیا گیا کہ جیسے تیسے آج کی رات گزاری جائے اور صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

وہ اس ٹور کی سب سے بور اور پریشان کن شام تھی۔ قریباً سارے ہی گم صم اور بیزار نظر آتے تھے اور سب سے زیادہ بیزار میں تھا۔ میری بیزاری کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہم سب اپنے گروپ کے ایک قابلِ احترام ممبر (فرحین) کی توہین برداشت کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور دوسرے یہ کہ میں کوشش کے باوجود فرحین سے بات نہیں کرسکا تھا۔ کل ہمیں واپس روانہ ہوجانا تھا اور پھر نہ جانے کب ملاقات ہوتی تھی اور ہوتی بھی تھی یا نہیں۔ میں گم صم سا خیمے سے باہر پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں یہ دعا بھی کررہا تھا کہ کل تک کوئی اور بدمزگی نہ ہوجائے۔ لڑکے ابھی تک سری پائے میں ہی موجود تھے اور کبھی کبھی ان کی کوئی ٹولی دور اوپر درختوں میں گھومتی پھرتی نظر آجاتی تھی۔

اخلاق میرے پاس آبیٹھا' کہنے لگا "پروگرام بنا ہے کہ صبح ذرا جلدی نکل چلیں۔ سلجوق جیپ والوں سے بات کرنے گیا ہے۔"

میں نے کہا "جس طرح کی سوگواری سب پر چھائی ہوئی ہے' بہتر ہے کہ ابھی نکل چلیں' اب یہاں کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا "سب سے زیادہ دکھی تو مجھے تم لگ رہے ہو۔"

"تم نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں پریشان تو سب ہی ہیں۔ دراصل جب کسی تفریحی گروپ میں کسی ایک کے ساتھ کوئی بدمزگی ہوجائے تو اس کا اثر سب پر پڑتا ہے۔" اخلاق بولا۔

"یہ بدمزگی نہیں ہے' سیدھی سیدھی ہم سب کی بے عزتی ہے" زندگی بھر جب بھی اس ٹور کو یاد کروگے' ساتھ میں یہ بے عزتی بھی یاد آئے گی۔"

"مگر اب کیا' کیا جاسکتا ہے" وہ ذرا بیزاری سے بولا "جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب بات مزید بڑھانے سے کیا فائدہ۔۔۔ یہ تو جاہلوں کے ساتھ جاہل بننے والی بات ہوگی۔"

اسی دوران میں ندیم بھی پاس آبیٹھا' کہنے لگا "باجی فرحین کے گرنے کے بعد تنویر نے بھی ایک لڑکے کو دھکا دے کر گرادیا تھا۔ اس کے علاوہ باجی فرحین نے بھی بے نقط سنائیں اس لیے تو وہ دم دبا کر بھاگے تھے۔"

میں ندیم اور اخلاق کی باتیں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ وہ خود کو طفل تسلیاں دینے کی کوشش کررہے تھے۔ اپنی شرمندگی کو کم کرنے کے لیے ڈھیلے ڈھالے جواز ڈھونڈ رہے تھے۔ اس صورتِ حال پر میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم سری پائے سے روانہ ہوگئے۔ سامان رات کو ہی پیک کرلیا گیا تھا۔ سلجوق نے جیپوں کا انتظام کرلیا تھا۔ نو بجے کے لگ بھگ وہ ہمیں لینے کے لیے

پہنچ گئیں۔ مقامی لوگوں نے بڑی محبت سے ہمیں رخصت کیا۔ خاص طور سے فرحین کے لیے ان لوگوں کی گرم جوشی بہت زیادہ تھی۔ فرحین کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ غالباً اس خیال سے کہ ساتھی افسردہ نہ ہوں' وہ خوش نظر آنے کی کوشش کررہی تھیں لیکن دیکھنے والوں کو ایسی خوشی میں افسردگی کے گہرے بادل بھی نظر آجایا کرتے ہیں۔ مقامی لوگ بھی صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم اپنا پروگرام مختصر کرکے واپس جارہے ہیں اور اس کی وجہ وہی شیطانوں کی ٹولی ہے جو حیلے بہانوں سے ہمیں پریشان کرتی رہی ہے۔ ان میں سے دو بزرگ افراد نے دبے لفظوں میں تایا جان سے کہا بھی کہ ہم لوگوں کا جانا ہی بہتر ہے۔ ہمارے ساتھ خواتین ہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ بگڑے تگڑے لڑکے کوئی اور مسئلہ کھڑا کردیں۔

جس وقت ہم جیپوں پر سوار ہورہے تھے' مخالف پارٹی کے لڑکے بھی ہمارے اردگرد موجود تھے۔ تاہم انہوں نے کسی طرح کی مستی نہیں کی۔ وہ اوپر درختوں میں نظر آرہے تھے اور ایک دوسرے سے چہلیں کررہے تھے۔ چند لڑکے نیچے ڈھلوان پر بھی موجود تھے۔ وہ بظاہر اپنے آپ میں مگن نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں انہیں دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ ان کی بظاہر خاموشی اور لاتعلقی میں بھی ایک شرارت آمیز طنز پنہاں تھا۔ ڈھلوان پر کھڑے لڑکے کسی وقت کورس کی شکل میں کوئی فلمی گیت گانے لگتے' کبھی چھینا جھپٹی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ ان میں ذرا بھی سمجھ داری ہوتی تو اس موقع پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے۔ سب لوگ جیپوں میں بیٹھ چکے تھے۔ صرف اخلاق اور تنویر جیپوں کے دروازے وغیرہ بند کررہے تھے۔ میں سب سے پہلی جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا' غم وغصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی اور وہ قوتِ برداشت جو اب دے گئی جو اب تک مجھے سنبھالے ہوئے تھی۔ مجھے لگا کہ اگر ان لڑکوں سے حساب چکائے بغیر ہم یہاں سے چلے گئے تو یہ پشیمانی ساری زندگی میرا پیچھا کرتی رہے گی' ان لمحوں میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یا غلط' دانشمندانہ ہے یا غیر دانشمندانہ۔ بس ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ ہمارا یوں چلے جانا کسی طور ٹھیک نہیں کیونکہ زیادتی کرنے والے کی زیادتی سہنا بھی زیادتی کہلاتا ہے۔ غم وغصے کی ایک بلند لہر نے جیسے مجھے اٹھایا اور بہاکر ان لڑکوں کے پاس لے گئی جو چند گز دور ڈھلوان پر موجود تھے۔ اس وقت خبر نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکلا اور انہوں نے مجھے کیا جواب دیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے شریر آنکھوں والے ایک فسادی لڑکے کو گریبان سے پکڑا اور پوری طاقت سے گھماکر چیڑ کے ایک درخت سے دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ ڈھلوان پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرے لڑکے کے گلے میں کیمرا تھا' میرے دونوں ہاتھ کیمرے کے اسٹریپ پر آئے' میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اور اس کی ناف میں گھٹنے کی ضرب لگاکر اسے زمین چٹادی۔ اس کے بعد ایک ساتھ تین لڑکے مجھ سے چمٹ گئے۔ یہ وہی صورتِ حال تھی جو آج سے پانچ چھ روز پہلے قریباً اسی مقام پر پیش آئی تھی۔ لڑکوں کے مکے اور ان کی ٹھوکریں میرے جسم پر برسنے لگیں۔ اس مرتبہ میرے جسم میں جیسے سرتاپا انگارے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان حملوں کا تابڑتوڑ جواب دیا۔ قرب وجوار میں ایک دم کہرام مچ گیا تھا۔ جیپوں میں موجود خواتین چیختی ہوئی باہر نکل آئیں۔ تنویر' سلجوق' اخلاق' رضوان اور دوسرے لڑکے چند لمحے سکتے میں رہنے کے بعد میری طرف لپکے۔ دوسری طرف مسٹنڈا پارٹی کے لڑکے بھی بلندی سے چھلانگیں لگاتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ ہمارے گروپ میں لڑکوں کی کل تعداد آٹھ تھی جبکہ مخالف گروپ کے کم وبیش پندرہ لڑکے ہمارے مقابل تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں واکنگ اسٹکس اور چمڑے کی بیلٹس بھی نظر آرہی تھیں۔ آناً فاناً زبردست مارا ماری شروع ہوگئی۔ میرے ہاتھ میں درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ آگئی۔ اس لٹھ نما شاخ نے پلک جھپکتے میں دو لڑکوں کے سر کھول دیے۔ کم تعداد میں ہونے کے باوجود جب ہمیں بے جگری سے لڑتے دیکھا تو مقامی لوگوں کو بھی جیسے جھٹکا سا لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ اس لڑائی میں تماشائی بنے رہیں گے تو یہ ناانصافی ہوگی... سب سے پہلے لندو خاں اور اس کے دو ساتھی آگے بڑھے۔ اس کے بعد کئی اور افراد بھی ہماری حمایت میں لڑکوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے لیے یہ بڑی حوصلہ افزا صورت حال تھی۔ میں نے لندو خاں کے ساتھی کو دیکھا' اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ ایک موٹے تازے لڑکے کو رائفل کے کندے سے پیٹ رہا تھا۔ بستی کے پانچ چھ نوجوان مسٹنڈا پارٹی کے لڑکوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ یہ کایا پلٹ صرف اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہم نے ازخود ہمت کی تھی۔ اگر ہم خاموشی سے کان لپیٹ کر روانہ ہوجاتے تو بستی والوں کو کیا ضرورت تھی یوں لڑائی مول لینے کی۔ میرے ہاتھ میں دو لڑکوں کے گریبان تھے۔ میں نے چند سیکنڈ میں

انہیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ ان میں سے ایک لڑکے کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ پھر میرے ہاتھ میں لنڈو خاں کے ساتھی کی رائفل آگئی۔ میرے سر میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ میں نے لوڈڈ رائفل کا رخ لڑکوں کی طرف کیا اور ان کے پاؤں میں چند فائر داغ دیے۔ دھماکوں سے وادی گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی منٹڈے چیخنے چلانے اور گرتے پڑتے تشیب کی طرف بھاگے۔ ہمارے لڑکوں نے ان کا پیچھا کیا اور پتھر پھینکتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑے۔ لڑکے اپنے کیمپ میں پہنچے، ہم سب بھی وہاں پہنچ گئے۔ تین چار لڑکوں کو پکڑ لیا گیا۔ ان کی یادگار پٹائی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نیم عریاں ہوگئے اور ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے۔ لڑکوں کے خیمے اکھاڑ دیے گئے۔ ان کا سامان اٹھا کر نیچے کھائی میں پھینک دیا گیا اور کیمروں کی فلمیں وغیرہ ہم نے قبضے میں لے لیں۔ فرار ہونے والے لڑکوں کی تلاش میں مقامی بستی کے لوگ چاروں طرف گھومنے لگے۔ وہ اب ہم سے بھی زیادہ مشتعل نظر آرہے تھے، جہاں کوئی لڑکا نظر آتا، وہ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے تباہ شدہ کیمپ میں لے آتے اور اسے زمین پر لٹا کر خوب دھنائی کرتے۔ یہاں تک کہ وہ منت سماجت کرنے لگتا۔ بستی کے چند جوشیلے نوجوانوں کا خیال تھا کہ پکڑے جانے والے سارے لڑکوں کو درختوں سے الٹا لٹکا دیا جائے اور پولیس کے پہنچنے تک ان کی چھترول جاری رکھی جائے لیکن میری اور اخلاق کی مداخلت پر یہ کارروائی نہیں کی گئی۔

اسی دوران میں ایک اور سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا۔ پکڑے جانے والے ایک لڑکے کے چہرے پر گہری خراشیں نظر آئیں۔ یہ خراشیں اس کے بائیں رخسار کے علاوہ گردن اور کان کے پچھلے حصے پر بھی تھیں۔ یہ واضح طور پر ناخنوں کی خراشیں تھیں اور ڈیڑھ دو ہفتے پرانی تھیں۔ اخلاق نے لڑکے کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "اوئے! یہ کس ماں سے ناخن لگوائے ہیں تم نے؟"

لڑکے کے خون آلود ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

اخلاق نے بڑے نایا کی طرف دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں بولا "ماموں! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہی وہ حرام زادہ ہے، جس نے فوزیہ سے بدتمیزی کی تھی۔"

تنویر، ندیم اور رضوان وغیرہ ایک دم اس لڑکے پر پل پڑے۔ اس کی جرسی پھٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہوگیا۔ وہ جاں بخشی کے لیے دہائی دے رہا تھا۔ تین چار منٹ کے اندر اندر شاہدی نام کے اس لڑکے نے اعتراف کرلیا کہ شوگران کے ہوٹل میں فوزیہ کے ساتھ اسی نے بدسلوکی کی تھی۔ اس وقت اس کے ہمراہ ایک ساتھی منیر راجہ بھی تھا۔ منیر فی الوقت مفرور لڑکوں میں شامل تھا۔ بڑے نایا نے بھی اپنے شدید غصے کے اظہار کے لیے چند ٹھڈے اس لڑکے کو رسید کیے۔

قریباً دو گھنٹے بعد کیوائی سے پولیس کی بھاری نفری جیپوں پر سری پائے پہنچ گئی۔ اتفاقاً ملاقاتے کے ڈی ایس پی صاحب بھی اس نفری میں موجود تھے۔ یہ باریش ڈی ایس پی صاحب خالص مذہبی مزاج کے تھے۔ تفریحی مقامات کا امن برباد کرنے والی ایسی منٹڈا پارٹیوں کے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بتا کر حیران کیا کہ لڑکوں کا یہ گروپ اس سے پہلے مری میں بھی دنگا فساد کر کے آیا ہے اور وہاں کے تھانے میں اس گروپ کے قریباً ایک درجن لڑکوں کے خلاف ایف آئی آر بھی درج ہو چکی ہے۔ وہاں ان لڑکوں نے ایک ہوٹل کے مالکان کے ساتھ جھگڑا مول لیا تھا اور توڑ پھوڑ کی تھی۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ وہ جاتے ہوئے ہوٹل کے کئی قیمتی ڈیکوریشن پیسز اور کچھ نقدی بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

ڈی ایس پی خورشید شاہ صاحب نے ہمیں ہر طرح سے تسلی دی اور کہا کہ ان لڑکوں کو پکڑوا کر ہم نے فی الواقع قانون کی مدد کی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ان لڑکوں کی جان اب آسانی سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ بے شک یہ بااثر والدین کے بچے تھے مگر جس ہوٹل میں انہوں نے ہنگامہ مچایا تھا اور چوری کی تھی، وہ بھی ایک وزیر کی ملکیت تھا۔ وزیر صاحب چند روز پہلے ہی بیرون ملک سے واپس آئے تھے اور اب ہاتھ دھو کر ان لڑکوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

ڈی ایس پی صاحب بہت کو آپریٹو شخص تھے۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہم اس معاملے کو مزید طول دینا نہیں چاہتے اور نہ اس حوالے سے تھانے کچہری کے چکر میں پڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہوگئے کہ ہم اس واقعے کی باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائیں۔

ہم اس دن کے بجائے اگلے دن سری پائے سے روانہ ہوئے مگر اس روانگی اور کل کی روانگی میں بہت فرق تھا۔ کل بجھے ہوئے دلوں کے ساتھ شرمندگی کا بوجھ لیے اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے ہم یہاں سے جا رہے تھے۔ آج بے شک ہمارے جسموں پر چند چوٹیں تھیں لیکن ہم ہلکے پھلکے تھے۔ ہم نے زیادتی کرنے والوں کا پنجا مروڑا تھا



اور ان کی قرارِ واقعی مزاحمت کی تھی۔ سرخروئی کا یہی احساس تھا جس نے ہمارے ذہنوں سے پژمردگی کا سارا میل چھڑا دیا تھا۔ پھر ایک اور فائدہ بھی ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ فوزیہ کے ساتھ ہونے والی دست درازی کا عقدہ کھل گیا تھا۔ شاہدی نامی لڑکے کے چہرے پر پائے جانے والے ناخنوں کے کھرونچوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ڈی ایس پی خورشید شاہ صاحب اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اگر ہم اس واقعے کی رپورٹ کریں گے تو اس میں ہماری لڑکی کا نام آئے گا۔ لہٰذا انہوں نے رپورٹ کرنے پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ بہرحال آف دی ریکارڈ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس لڑکے سے "خصوصی شفقت" کی جائے گی۔

○☆○

ہم اس روز شام کو ایبٹ آباد کے کشمیر ویو ہوٹل میں پہنچے۔ ہم اسی ہوٹل سے ناران اور جھیل سیف الملوک کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ یہیں ایک کمرے میں، میں نے گردے کے درد سے دو تین دن تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔ ایک بار پھر میرے اور ندیم کے حصے میں وہی کمرا آیا تھا۔ ندیم ایک پرمزاح ساتھی تھا۔ وہ ہر سات آٹھ گھنٹے بعد یہ فقرہ دہرا دیتا تھا "اف! اس لڑکی کے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے بھائی جان۔ میرا تو دل روتا ہے۔ اے باری تعالیٰ! اتنا بھدا شوہر۔"

ہوٹل کے اس کمرے میں پہنچ کر ٹور کے آغاز کی بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ اس مرتبہ مجھے گردے کا درد تو نہیں تھا لیکن پاؤں میں درد موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور درد تھا جو گردے کے درد ہی کی طرح مجھے بے کل کیے ہوئے تھا۔ یہ فرحین سے جدائی کا درد تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں وہ نہیں رہا جو چند ہفتے پہلے تھا۔ چند ہفتے پہلے کشمیر ویو کے کمرا نمبر ۸ میں ٹھہرنے والے تیمور اور آج کے تیمور میں کوئی بہت اہم تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اس کے سینے میں سے کچھ نکلا تھا اور ناران کے گیلشیر پر رہ گیا تھا اور جھیل کے نیلے پانیوں میں اتر گیا تھا اور سری پائے کی دھند آلود بلندیوں میں کھو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، میرے اندر ایک وسیع و عریض خلا چھوڑ گیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کو فرحین کی مسکراہٹ کے سوا دنیا کی کوئی شے پر نہیں کر سکتی اور اگر یہ مسکراہٹ نہ ہوئی تو پھر زندگی کی آخری سانس تک یہ خلا جوں کا توں رہے گا۔

کشمیر ویو ہوٹل میں ۱۸ گھنٹے کے قیام کے دوران میں صرف ایک بار فرحین سے میرا آمنا سامنا ہوا۔ دو سیکنڈ کے لیے ان سے نظریں ملیں۔ یوں لگا جیسے ان نظروں نے میرا شکریہ ادا کیا ہو۔ کس بات کا شکریہ! شاید اس بات کا شکریہ کہ میں نے سری پائے میں جمی ہوئی پشیمانی کی برف کو توڑا تھا۔ ان منٹڈوں کو دیوانہ وار للکارا تھا جو ہمارے منہ پر شرمندگی تھوپ کر ہمیں سری پائے سے رخصت کر رہے تھے۔ یا پھر ہو سکتا تھا کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ فرحین کی نظروں نے ایسی کوئی بات نہ کہی ہو۔ انہوں نے بس یونہی مجھے دیکھا ہو۔ جیسے ریل گاڑی میں چند گھنٹے ہم سفر رہنے والے کسی شخص کو وقت رخصت دیکھا جاتا ہے۔ شام کو جب فرحین صاحبہ سب کو اٹھنے اور نماز پڑھنے کے لیے کہہ رہی تھیں، نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے وضو کیا اور ہوٹل کے برآمدے میں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ بے کل دل کو عجیب طرح کا سکون محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے جلتے زخم پر ٹھنڈا اٹھار مرہم رکھ دیا ہو۔ میں نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو فرحین ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھی تھیں۔ دونوں کہنیاں جنگلے پر ٹکا رکھی تھیں۔ خالی خالی نظروں سے نیچے سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے لمبے گھنے بال اوڑھنی سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے۔ وہ بار بار اوڑھنی درست کرتی تھیں مگر خود سر لٹیں پھر آزاد ہو کر اجلے چہرے پر جھولنے لگتی تھیں۔ ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ یہ خیال جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے ذہن پر چھا گیا۔ میرا رومیٹ ندیم گھومنے پھرنے چلا گیا تھا۔ اسے فلم دیکھنی تھی، کھانا کھانا تھا اور رات گئے واپس لوٹنا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا تھا کہ میں فرحین کو اپنے اور اپنی والدہ کے بارے میں وہ تمام حقائق بتاؤں جو ابھی تک ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ یا انہیں بتائے بھی گئے تھے تو مسخ کر کے بتائے گئے تھے۔ یقیناً انہیں بتانے والوں نے ان حقائق پر ذاتی نفرت کا تیزاب پھینکا تھا اور ان کی شکلیں بگاڑی تھیں۔

میں نے اپنے دل کا بوجھ قلم کے سہارے کاغذ پر بکھیرنا شروع کیا "فرحین صاحبہ! میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں، بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ کو بتانا مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میری والدہ عطیہ شمیم کا نام تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ وہ بڑی محنتی، جفاکش اور سیلف میڈ خاتون تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد انہوں نے بیٹے کی طرح اپنی ماں یعنی میری نانی کو سہارا دیا۔ انہوں نے ٹیوشنز پڑھائیں، کشیدہ کاری کی، یہاں تک کہ کالج میں تعلیم کے

دوران میں پارٹ ٹائم کے طور پر ایک فیکٹری میں ملازمت بھی کی۔ وہ ادب سے لگاؤ بھی رکھتی تھیں۔ ایم ایس سی کے بعد انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی اور جلد ہی اس میدان میں نام پیدا کرلیا۔ انہیں سچ کی شاعرہ کہا گیا۔ انہوں نے اس گھٹے ہوئے منافق معاشرے میں بڑی دلیری کے ساتھ سچ بولنے کی جرأت کی۔ شاید آپ نے پڑھا ہی ہو۔ ان کی شاعری میں اس عورت کی احتجاجی چیخ نظر آتی ہے جو قرنوں سے اپنے دل کو اپنے جذبات کا مدفن بنانے پر مجبور ہے۔ ان کی شاعری پیار کی شاعری ہے اور اس کے سچے اظہار کی شاعری ہے۔ ان پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا، مطعون کیا گیا لیکن انہوں نے فطرت کو زبان دینے کا جو عزم کیا تھا، اسے متزلزل نہیں ہونے دیا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ پڑھی لکھی نوجوان نسل کی ہردلعزیز شاعرہ کہلائیں اور ان کی تحریروں کا ہر طبقے میں دیوانہ وار انتظار کیا گیا۔

بے شک کچھ لوگ آج بھی ان پر تنقید کرتے ہیں اور تنقید کرنا ان کا حق بھی ہے لیکن اس ساری تنقید پر عہد حاضر کے ایک نہایت سنجیدہ دانشور کا صرف ایک فقرہ بھاری ہے، اس نے لکھا تھا "عطیہ کی ہر تخلیق میں اس کی ذات کی دو بنیادی صفات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پڑھنے والا عطیہ کا کتنا بڑا مخالف کیوں نہ ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ایک بے حد سچی اور بے حد باوفا عورت کی تحریر ہے۔"

میری والدہ کالج تو ان کی تحریروں میں ہے اور ان کی وفا، ان کی ذاتی زندگی میں گینگنے کی طرح جگمگا رہی ہے۔ انہوں نے میرے والد سے محبت کی اور میرے والد نے انہیں دیوانہ وار چاہا۔ میری والدہ ایک محنت کش، متوسط خاندان سے تھیں، والد کا خاندان بلند رتبہ اور ثروت مند تھا مگر ان دونوں کی چاہت میں اتنی سچائی اور طاقت تھی کہ یہ غیر فطری دیواریں انہیں شریک زندگی بننے سے روک نہ سکیں۔ میرے والد کے خاندان نے یعنی آپ لوگوں نے اس شادی کو دل سے قبول نہیں کیا اور ہمیشہ اس تعلق کو ختم کرنے کے آرزومند رہے۔ بڑے تایا نے شادی رکوانے کے لیے آخر دم تک زور لگایا اور ستم یہ کہ شادی کے بعد بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ آخری حربے کے طور پر والد صاحب کو معاشی ضرب لگائی گئی۔ والد صاحب کو جائیداد کے بڑے حصے سے بے دخل کردیا گیا اور کاروبار میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی۔ والد صاحب حساس طبیعت کے مالک تھے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسرے شہر جا بسے اور ان کے بڑے بھائی چاہتے بھی یہی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ "عطیہ" نے ایک امیرزادے سے شادی کی ہے۔ اسے ایک تنگ دست، بے روزگار کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے گی تو سارے سہانے خواب ٹوٹ جائیں گے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس سے دس بیس گنا زیادہ مصیبتیں بھی آتیں تو ان کو متزلزل نہ کرسکتیں۔ وفا ان کی فطرت کا دوسرا نام تھا اور وفا انسان کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے اور انہیں ریزہ ریزہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ میری والدہ نے ایک معروف ادبی پرچے میں ملازمت کرلی اور اپنی شب و روز محنت سے اسے مزید مقبول بنادیا۔ جلد ہی انہیں اس پرچے کا ایڈیٹر بنادیا گیا۔ کم عمری میں یہ ایک گراں بار ذمے داری تھی جسے انہوں نے بہت خوبی سے نبھایا۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں بھی شائع ہورہی تھیں اور بک رہی تھیں۔ میری عمر اس وقت چار پانچ سال تھی، میں ان دونوں کی دلچسپیوں کا مرکز تھا اور میری ذات سے انہیں جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ والد صاحب کو معدے کی تکلیف کافی عرصے سے تھی۔ ان کے اندرونی دکھوں نے اس تکلیف کو بڑھادیا اور سال دو سال کے اندر ہی وہ بستر سے جا لگے۔ والدہ کی ذمے داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس لڑکی جس نے دس برس کی عمر میں نقیس لکھنی شروع کردی تھیں اور جس کا امیج شروع سے ایک نازک مزاج شاعرہ کا تھا، دن میں اٹھارہ گھنٹے کام کیا۔ وہ نہ صرف گھر چلا رہی تھیں بلکہ شوہر کے علاج معالجے میں بھی انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ہاں فرحین صاحبہ! میری والدہ نے کئی برس ایک روبوٹ کے مانند شب و روز کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تن من کو اپنے گھرانے پر یوں نچھاور کیا کہ دیکھنے والے بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ والد صاحب پورے سات برس بستر پر رہے اور پھر ایک روز والدہ کے زانو پر انہوں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرلیں۔ آخری وقت میں والد صاحب نے مجھے اور میری والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنا حق اپنے بھائیوں کو معاف کردیا ہے۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی گلہ شکایت بھی نہیں۔ تم دونوں بھی انہیں معاف کردینا۔"

اور میری والدہ نے زندگی کی آخری سانس تک والد کے حکم کی تعمیل کی۔ بے شمار مصیبتوں کے باوجود کبھی حرف شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا۔ یہ اس عورت کا ظرف تھا، جس کے بارے میں برسوں پہلے میرے تایا حضرات نے یہ کہا تھا کہ شعر و شاعری کرنے والی اور دوپٹا گلے میں ڈالنے والی لڑکی کبھی کامیاب بیوی نہیں ہوتی، وہ ایک دو برسوں میں آصف (میرے والد) کو زندہ درگور کردے گی اور وہ اس سے



جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچے گا۔ بے شک وہ شعر کہتی تھیں اور دوپٹا گلے میں ڈالتی تھیں مگر اس نے جس طرح باکردار زندگی گزاری اور اپنے شوہر اور اپنے گھر کے ساتھ جس طرح وفا کی، وہ آپ کے اردگرد موجود خیدہ گردنوں والی باپردہ نیک پروینیں نہیں کرسکتیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ نہیں کرسکتیں۔ نیکی اور سچائی انسان کے دل میں ہوتی ہے، اس کا تعلق اس کے باطن سے کم کم ہی ہوتا ہے۔ (میں اس موقع پر عینی کا ذکر بھی کرسکتا تھا اور فرحین کو عینی کی کارستانیوں کا حوالہ دے سکتا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے لکھے بغیر ہی یہ بات فرحین کے ذہن میں آجائے گی)

والد کے بعد والدہ کے جینے کا سہارا صرف میں تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ختم کرکے مجھے پروان چڑھایا۔ میری پرورش کی اور آخر جب میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور انہیں سکھ دینے کے قابل ہوا تو انہوں نے ایک رات مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہمیشہ کے لیے مجھے خدا حافظ کہہ چلی گئیں۔ میرے درد ہیال والے جنہوں نے میری والدہ کی زندگی میں ان کی خبر نہ لی، ان کی وفات کے بعد غیروں ہی کی طرح آئے اور دو چار گھنٹے بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے دل میں میرے والدین کی زندگی میں پتھر بنے رہے تھے، بعد میں بھی پتھر ہی رہے اور شاید ہمیشہ رہیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے اندر میرے لیے کیسا کیسا زہر جمع کر رکھا ہے۔ محبت کرکے سچ بولنا اور وفا کرنا کوئی اتنا بڑا گناہ تو نہیں جس کی ایسی سزا دی جائے اور میری والدہ نے صرف یہ دونوں گناہ کیے تھے۔ ان گناہوں کی سزا ہمیں اب تک ملتی رہی ہے اور آج بھی مل رہی ہے مگر سچ بولنے والے اور وفا کرنے والے سزا سے خوف نہیں کھایا کرتے اور ویسے بھی جب مقدر سزا ہی ہے تو پھر کیوں نہ بلا دریغ سچ بولا جائے اور وفا کی جائے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ایسا ہی کروں۔۔۔ مگر مجھے تھوڑا انتظار کرنا ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک آپ میں سچ سننے کی ہمت پیدا نہیں ہوجاتی۔۔۔ میں ایک دن آپ سے سچ بولوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔۔۔ اور ایک دن آپ میرا سچ سنیں گی، یہ میرا دعویٰ ہے۔"

رات کو خط لکھ کر میں سوگیا۔ صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ فرحین برآمدے میں بچھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ بڑی تائی اور ادھیڑ عمر کی گھریلو ملازمہ بھی تھیں۔ یہ دونوں عورتیں نماز کے بعد کمرے میں چلی گئیں۔ فرحین برآمدے میں چہل قدمی کرنے لگیں۔ میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہورہی تھی۔ طبیعت میں ایک ایسی لطافت تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وضو کیا اور برآمدے میں جاکر نماز ادا کی۔ فرحین کل شام کی طرح بالکونی میں رکھی کرسی پر بیٹھی تھیں اور دونوں کہنیاں جنگلے پر ٹکا کر نیچے سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک خوبصورت 'اجلا پن اور۔۔۔ ملکوتی سا حسن تھا ان کے چہرے پر۔ ایک عجیب سی توانائی و جرأت میرے خون میں گردش کرنے لگی۔ شاید یہ اس خلوص کی طاقت تھی جو فرحین کے حوالے سے میرے دل میں موجود تھا۔ میں کرسی پکڑ کر فرحین صاحبہ کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ذرا سا کھنکھار پھر سنبھل کر ہلکی انداز میں مسکرانے لگیں۔ میں نے ان کی کہنی کی چوٹ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور ایک کاغذ پر اپنے دونوں فون نمبرز لکھ کر فرحین کی طرف بڑھادیے۔ اپنے اندر کا سارا خلوص اپنے لہجے میں سمیٹ کر میں نے کہا "یہ میرے گھر کا فون نمبر ہے اور یہ دوسرا آفس کا۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

ان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ دوپٹا مضبوطی سے سر پر لیتے ہوئے وہ بولیں "آپ ابا جی (تایا ابو) کو دے دیں۔"

"ان کے پاس تو ہوگا ہی بلکہ پچھلے دس برس سے ہوگا۔ یہ میں آپ کو دے رہا ہوں۔" معمولی تذبذب کے بعد انہوں نے فون نمبرز والا کاغذ رکھ لیا۔

میں نے کہا "آپ فون کریں گی نا؟"

"اچھا دیکھوں گی۔" وہ ہولے سے مسکرائیں پھر ذرا توقف سے کہا "آپ دل کے بہت اچھے ہیں۔ آپ نماز پڑھا کریں، اس کے علاوہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولیں "اگر آپ کو برا نہ لگے تو کہوں گی کہ آپ اپنے ماحول میں کچھ تبدیلی لائیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ کے اندر کی خوبیاں آپ کے ماحول اور حلقۂ دوستاں کی وجہ سے دبی ہوئی ہیں اور شاید اسی وجہ سے فیملی میں آپ کا امیج بھی متاثر ہورہا ہے۔"

"میں آپ کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے فون کا انتظار بھی کروں گا اور۔۔۔ جہاں تک فیملی میں میرے امیج کا تعلق ہے، اس کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں مگر وقت کم ہے، اس لیے میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ تھوڑا سا وقت نکال کر پڑھ لیجیے گا۔"

میں نے تہ شدہ کاغذ فرحین کو دے دیا۔ ان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔ شاید وہ انکار ہی کر دیتیں مگر ان کے کسی بھی ردِعمل سے پہلے کاغذ ان کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی دوران میں چھوٹے تایا بڑی بڑی ڈکاریں لیتے ہوئے ہمارے سر پر آن کھڑے ہوئے اور اس ڈیڑھ گلو کڑاہی گوشت کی روداد سنانے لگے جو وہ ابھی ابھی بطور ناشتا اپنے معدے کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے۔

اسی روز ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ میں براستہ راولپنڈی واپس لاہور روانہ ہوگیا جبکہ گروپ کے باقی ارکان پشاور چلے گئے۔ وہاں انہیں تین چار دن رکنا تھا اور ایک شادی میں شرکت کے بعد لاہور جانا تھا۔ اخلاق، ندیم اور تنویر وغیرہ نے مجھے بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا۔ عینی نے بھی گرم جوشی دکھائی لیکن یہ منفی گرم جوشی تھی۔ اس کی نگاہ جب بھی مجھ سے ملی، اس سے شعلے لپکتے محسوس ہوئے۔ میری سماعت کو مجروح کرنے کے لیے اس نے چند کاٹ دار فقرے بھی بالواسطہ میرے کانوں تک پہنچائے۔ میں اس کی برہمی کو خاطر میں نہیں لایا۔ اس کی جھلاہٹ کا جواب خاموشی سے دے کر میں نے اس کی جھلاہٹ میں اضافہ ہی کیا ہوگا۔ بہرحال مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔۔۔ ہاں، ایک بات میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے توقع تھی کہ بڑے تایا یا چھوٹے تایا اس موقع پر مجھ سے کچھ کہیں گے۔ تجدید تعلقات کے لیے کوئی ایک آدھ رسمی فقرہ ادا کردیں گے۔ شاید بڑی تائی ہی کہہ دیں کہ بیٹا کبھی کبھار آجایا کرو وغیرہ وغیرہ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ان بزرگ خواتین و حضرات نے چند روز پہلے کے سانحے پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ سانحہ ہی تو تھا کہ فوزیہ پر ہونے والی دست درازی کا الزام براہِ راست مجھ پر لگادیا گیا تھا۔ اب یہ الزام غلط ثابت ہوچکا تھا۔ اپنے رویّے پر بڑے تایا معذرت نہ کرتے بس اتنا ہی کہہ دیتے کہ اس واقعے کی وجہ سے ہم سب کو بدمزگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا۔

○☆○

میں ایک چوٹ پاؤں اور دوسری دل پر لے کر لاہور واپس آگیا۔ تین چار روز بعد میں نے فرحین کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ جلد یا بدیر فرحین مجھے فون ضرور کریں گی اور کچھ نہیں تو میری اصلاح کی غرض سے ہی کریں گی۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ میرے اندر تبدیلی دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنے طور پر انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں تبدیل ہو سکتا ہوں۔۔۔ اور یہ کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔

میں نے بڑی بے چینی سے ان کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے، میرے انتظار میں شدت آرہی تھی اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ان دنوں مجھے انتظار کی کوفت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔ میں ہر روز اس امید کے ساتھ جاگتا تھا کہ آج فرحین صاحبہ کا فون ضرور آئے گا۔ دفتر میں پہنچتے ہی میرا دھیان کام سے ہٹ کر فون کی طرف لگ جاتا۔ ہر بار جب گھنٹی بجتی۔ میرا دل انوکھے انداز میں دھڑک اٹھتا۔ میں ریسیور اٹھاکر پُرامید انداز میں ہیلو کہتا۔ دوسری طرف سے کان میں پڑنے والی آواز میرے سہانے خواب کو چکنا چور کردیتی اور یہ ٹوٹ پھوٹ کوئی ایک بار نہیں ہوئی تھی۔ جتنی بار فون کی گھنٹی بجتی تھی، مجھے اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہر بار کی مایوسی میرے انتظار کی شدت میں تھوڑا سا اضافہ کرجاتی تھی۔ یہ تھوڑا تھوڑا اضافہ کوہ گراں بنتا جارہا تھا۔

میں آفس سے پانچ بجے اٹھ جاتا تھا۔ اس سے پہلے میں عموماً دس بجے گھر پہنچتا تھا۔ درمیان کے تین چار گھنٹے دوستوں سے ملنے ملانے میں نکل جاتے تھے۔ میری اکثر شامیں شاہراہ قائداعظم کے ایک ریسٹورنٹ میں گزرا کرتی تھیں پھر اسی ریسٹورنٹ سے یار لوگ کبھی کسی سنیما کی طرف لے جاتے یا پھر یونہی مٹرگشت شروع ہوجاتا لیکن ٹور سے واپسی کے بعد میری یہ مصروفیات مختصر تر ہوتی چلی جارہی تھیں۔ شروع کے دنوں میں، میں نے نو بجے گھر پہنچنا شروع کردیا تھا پھر مزید تبدیلی آئی اور میں آٹھ بجے گھر آنے لگا اور اب تو میں آفس سے اٹھنے کے بعد بمشکل دو گھنٹے گھر سے باہر گزارتا تھا۔ ہر لمحہ ذہن میں یہ سوچ رہتی تھی کہ شاید میرے بیڈ روم میں میرے فون کی گھنٹی بج رہی ہو اور دوسری طرف وہ آواز ہو جو میرے لیے اس دنیا کی اہم ترین آواز بنتی جارہی ہے۔ کسی ایسی سوچ کے آتے ہی میرا رخ خود بخود گھر کی طرف ہوجاتا۔ میں سب سے پہلے ملازم دین محمد اور آیا خورشید بیگم سے کسی کال کے بارے میں پوچھتا۔ اس کے بعد بیڈ روم میں گھس جاتا۔ ادھر سے ادھر آتے جاتے نگاہیں فون پر ہی لگی رہتیں۔ کسی وقت تو عجیب ہکابکا سا رویہ ہوجاتا میرا۔۔۔ میں فون سے دور ہوتا اور میرے پہنچنے سے پہلے فون کی گھنٹی بج کر خاموش ہوجاتی تو میں سٹپٹا کر رہ جاتا۔ گھنٹوں یہ سوچ پریشان رکھتی کہ معلوم نہیں دوسری طرف کون تھا؟ ملازم دین محمد ساٹھ پینسٹھ برس کا تھا۔ میں نے اپنے ہوش میں اسے کبھی نہیں ڈانٹا مگر ان دنوں ایک دو بار اسے بھی ڈانٹ پڑ گئی۔



ایک روز میں چھت پر تھا۔ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ دین محمد کچن میں تھا، میں نے سوچا کہ وہ فون اٹھالے گا لیکن اسے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ اس کے ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی فون بند ہوگیا۔ میرے کان نیچے ہی لگے ہوئے تھے۔ فون بند ہونے سے مجھے سخت تاؤ آیا۔ برداشت کے باوجود میری زبان سے دین محمد کے لیے چند تلخ ترش الفاظ نکل گئے۔ وہ ہکابکا مجھے دیکھتا رہا۔ سستی تو اس سے کئی بار پہلے بھی ہوجاتی تھی مگر مجھے اس قدر زود رنج اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بے چارہ دین محمد فون کی گھنٹی سنتے ہی دیوانہ وار فون سیٹ کی طرف لپکنے لگا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ان دنوں میں کسی کال کا بہت شدت سے انتظار کررہا ہوں۔

انہی دنوں کچھ بے تکلف دوستوں نے ہفتے اور اتوار کی درمیانی رات میرے گھر گزارنے کا پروگرام بنایا۔ ایسے پروگراموں میں اکثر وڈی سی آر اور تاش وغیرہ کے علاوہ شراب و کباب کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں اس بار میری طبیعت اس طرف نہیں آرہی تھی۔ بس ایک الجھن سی تھی جو مجھے بڑی شدت سے اس جانب پیش قدمی سے روکتی تھی۔ یوں صرف میری وجہ سے یہ پروگرام کینسل ہوگیا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ رات دس بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھاکر ہیلو کہا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ میں نے دو تین بار ہیلو کہا۔ اپنا نام بتایا مگر دوسری طرف سے جواب نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس نے پکار پکار کر مجھے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ فرحین ہی ہیں۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ میں نے ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ قریباً تیس چالیس سیکنڈ بعد سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ اس بار بھی میری ہیلو ہیلو کے جواب میں خاموشی رہی اور پانچ دس سیکنڈ بعد لائن کٹ گئی۔

فرحین کے فون کے حوالے سے میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہورہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ خاموش کال فرحین ہی کی ہو۔ ایسی کالیں اکثر آہی جاتی ہیں مگر میرا ذہن اس خوش فہمی کے حصار سے نکلنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ یہ فون فرحین نے کیا ہوگا۔ ایک خوش فہمی یہ بھی تھی کہ شاید وہ میری آواز سننا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور خیال ذہن میں آرہا تھا اور یہ خیال پہلے سے بھی زیادہ خوش آئند تھا۔ ممکن تھا کہ انہوں نے مجھے فون کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ انہوں نے بات کرنے کے لیے نمبر ڈائل کیا ہو مگر پھر ان کی ہمت نہ پڑ سکی ہو۔ ایسی صورت میں بہت زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ آج کل میں دوبارہ رنگ کریں گی۔ ان دنوں مجھ پر صحیح معنوں میں اس مقولے کی حقیقت واضح ہوئی کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بھی آتی جاتی سانسوں کے سہارے نہیں بلکہ امید کے سہارے جی رہا ہوں۔ اگلی رات دس بجے کے لگ بھگ میری بے قراری میں اضافہ ہوگیا۔ میں باقاعدہ فون کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آیا خورشید بیگم حسب معمول دودھ لے کر آئی۔ میں نے حسب معمول پوچھا "آیا! آج کوئی کال تو نہیں آئی تھی؟"

وہ بولی "کال کیا آتی بیٹا۔۔۔ دوپہر سے فون بند پڑا ہے۔"

میرے جسم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا، فون ڈیڈ پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی لاتعداد بار گھریا آفس کے فون خراب ہوئے تھے لیکن جیسی پریشانی اس رات ہوئی، کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگلے روز سب کام چھوڑ چھاڑ کر میں فون ٹھیک کرانے کے پیچھے پڑ گیا۔ دوست احباب حیران ہورہے تھے کہ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے مجھ پر! بھاگ دوڑ کرکے اسی روز میں نے فون ٹھیک کرالیا۔ ایک عجیب ساخبط سوار ہوگیا تھا مجھ پر۔ دن میں درجنوں بار میں خود سے یہ سوال کرتا تھا کہ آخر فرحین کا فون کیوں نہیں آتا ہے۔ جبکہ وہ جانتی بھی ہیں کہ اس کے سوا ہمارے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں گی فون ان کے آس پاس موجود ہوگا۔ وہ اپنی انگلی کو معمولی حرکت دے کر مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں لیکن وہ نہیں کررہی تھیں۔ تین ہفتے ہو چلے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کئی طرح کے خیال ذہن میں آرہے تھے۔ کیا وہ فون کرنا نہیں چاہتی تھیں؟ اگر وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں تو انہوں نے مجھے امید کیوں دلائی تھی؟ انتظار کی سولی پر کیوں لٹکایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ان سے میرے فون نمبرز گم ہوگئے ہوں؟ لیکن اگر ایسا تھا بھی تو یہ کوئی ناقابل حل مسئلہ نہیں تھا۔ وہ میرا نمبر اخلاق یا ندیم سے حاصل کرسکتی تھیں اور کچھ نہیں تو ڈائریکٹری میں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر وہ رابطہ کرنا چاہتی تھیں تو اس کے ایک سو ایک طریقے موجود تھے۔ ایک بات یہ بھی ہوسکتی تھی کہ مجھے انتظار کروا کر وہ میری برداشت کا امتحان لینا چاہ رہی ہوں لیکن یہ امتحان بہت طویل ہوتا جارہا تھا۔ شب و روز کی حرکت جیسے میری نگاہوں کے سامنے جم کر رہ گئی تھی۔ وہ میری زندگی کے سخت ترین دن تھے۔ چند ہفتے پہلے میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ فرحین کے لیے میری پسندیدگی اتنی تیزی سے

محبت اور پھر عشق کا رنگ اختیار کرجائے گی... اور پھر یہ عشق یوں میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا اور پیوست ہوتا چلا جائے گا۔

اس دوران میں دوبار اخلاق اور ندیم سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ تاہم یہ ملاقات میرے ہی گھر میں ہوئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے فرحین کے بارے میں بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ آج کل بڑے تایا کی سب سے چھوٹی بیٹی کو ایف ایس سی کے امتحان کی تیاری کروا رہی ہیں اور شب و روز اس کام میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تایا اور تائی جان کے ہمراہ عمرے پر جانے کی تیاری بھی کر رہی ہیں۔

اخلاق ٹور کی بہت سی تصویریں بھی میرے ملاحظے کے لیے لایا تھا۔ یہ تصویریں دیکھ کر ان شب و روز کی یاد پوری شدت سے تازہ ہوگئی۔ ایک ایک دن ایک ایک پل نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ ناران کی وادی، جھیل سیف الملوک کی حسین بلندیاں، شوگران کی رعنائی، غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر مجھے مناظر کے پس منظر میں اپنی محبت کا منظر دکھائی دیا۔ میں نے چند گروپ فوٹو اپنے پاس رکھ لیے۔ ان میں سے ہر تصویر کے اندر فرحین موجود تھیں۔

یہ تصاویر میں نے دل کو بہلانے کے لیے رکھی تھیں لیکن انہوں نے میرے اندر جدائی کے کربناک احساس کو شدید تر کردیا۔ میں نے قریباً ایک ماہ فرحین کے فون کا مزید انتظار کیا پھر ایک روز سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوگیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں برسوں برس بھی فرحین کی آواز کا انتظار کرتا رہا تو وہ میرے کانوں میں نہیں آئے گی۔ شب و روز میرے آفس اور گھر میں فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں گی لیکن وہ گھنٹی کبھی نہیں بجے گی جس کا مجھے انتظار ہے۔ میں ایک لاحاصل کرب میں مبتلا ہوں اور رہوں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ایک بار خود فرحین سے ملوں گا۔

میں نے اپنے ایک رازدار دوست طارق کے ذریعے فرحین کے معمولات کی معلومات کروائیں۔ معلوم ہوا کہ فرحین، تایا اور تائی جان کے ہمراہ عمرے پر گئی تھیں اور وہاں سے دو ہفتے پہلے واپس آئی ہیں۔ یہ بھی علم ہوا کہ فرحین کی سب سے چھوٹی نند کے ایف ایس سی کے امتحانات ہو رہے ہیں۔ فرحین اسے خود ایگزیم سینٹر لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ یہ ایک حوصلہ افزا اطلاع تھی۔ ورنہ جہاں تک مجھے معلوم ہوا تھا، فرحین شاذونادر ہی گھر سے نکلا کرتی تھیں... فرحین سے اس طرح ملنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن حالات کی مجبوری تھی۔

ایک روز میں نے اپنی سوزوکی کار میں فرحین کا پیچھا کیا۔ وہ ٹویوٹا کار میں سوار تھیں اور خود ہی ڈرائیونگ کر رہی تھیں۔ تایا کی بیٹی نازلی ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ فرحین نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ وہ خاصی پرکشش نظر آرہی تھیں۔ نازلی کو ایگزیم سینٹر پر پہنچا کر وہ واپس مڑنے لگیں تو میں ایک دم گاڑی کے قریب چلا گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اچانک آمنا سامنا ہوگیا ہے۔ مجھے دیکھ کر فرحین کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہمارے درمیان سلام دعا ہوئی۔ میں نے فرحین کو بتایا کہ میں برٹش سینٹر جارہا ہوں... برٹش سینٹر فرحین کے راستے ہی میں آتا تھا۔ وہ بولیں۔

"آپ کے پاس سواری نہیں؟"

میں نے فوراً نفی میں جواب دیا۔ ایک ذرا ہچکچانے کے بعد انہوں نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں ان کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک مدھر خوشبو نے میرے حواس کو جکڑلیا۔ معلوم نہیں کیوں فرحین کے روبرو میں خود کو ایک دم منتشر اور دبا ہوا سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا "شاید آپ یقین نہ کریں، میں پچھلے دو مہینے مسلسل فون کے سرہانے بیٹھا رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ سوال آپ خود سے پوچھیں تو بہتر ہے۔"

وہ ایک دم خاموش ہوگئیں۔ گہری سنجیدگی نے ملیح چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے آرہی ہیں اور کہاں جارہی ہیں؟"

وہ بولیں "نازلی کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ اسے امتحانی مرکز چھوڑنے آتی ہوں۔"

"اب کہاں جارہی ہیں؟"

"منگل کے روز ہماری خالہ کے گھر شادمان کالونی میں درس ہوتا ہے۔ آس پاس کی عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ وہی جارہی ہوں۔ واپسی پر نازلی کو لیتے ہوئے گھر چلی جاؤں گی۔"

میں نے کہا "وعظ تو آپ اکثر سنتی ہوں گی۔ آج ایک دو باتیں میری بھی سن لیں۔ اس کے بعد شاید کبھی آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولیں۔

"کچھ آگے بائیں ہاتھ پر ریسٹورنٹ ہے" میں نے کہا "وہاں بیٹھ جاتے ہیں، میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"لل... لیکن...!"

"پلیز فرحین! پہلی بار اور... شاید آخری بار۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی التجا تھی کہ فرحین کے ہونٹوں پر انکار آتے آتے رہ گیا۔ بہرحال ان کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا اور آنکھوں میں خوف کی کیفیت تھی۔ مجھے ان کے چہرے پر ایک شدید کشمکش نظر آئی پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے تیمور صاحب! اگر زیادہ اہم بات ہے تو میں رک جاتی ہوں مگر دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گی۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ریسٹورنٹ کی ایک پرسکون میز پر بیٹھے تھے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر جھاگ دار پانی کے فوارے خوشگوار منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے کہا "فرحین! آپ کو یاد ہے "پائے" میں آپ نے ایک روز مجھے قنوطی کہا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ میں زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کا عادی ہوں۔"

"شاید کہا ہو" وہ بولیں۔

"آپ نے کہا تھا۔۔۔ اور آج یہی بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھ سے زیادہ قنوطیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اپنے اردگرد سے لاتعلقی کی ایک دھند ہے جو آپ کی پوری زندگی پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی جینے کے لیے ہے لیکن آپ زندگی کو گزار رہی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کاٹ رہی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے حوالے سے کچھ غلط قسم کے تصور آپ کے ذہن میں موجود ہیں۔" فرحین نے کہا "میں مایوس ہوں اور نہ زندگی سے لاتعلق ہوں بلکہ میں تو کہوں گی کہ میں آپ جیسے لوگوں سے کہیں زیادہ بھرپور زندگی گزار رہی ہوں۔ اپنے اہل خانہ کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہوں' خدا نے جتنی ہمت اور توفیق دی ہے' اس کے مطابق خلق خدا کی بھلائی کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنے رب کی عبادت کرتی ہوں۔ میں ہر طرح سے مطمئن اور خوش ہوں۔"

"معاف کیجیے گا' آپ غلط کہہ رہی ہیں" میں نے بے باک لہجے میں کہا "آپ نے اپنی جتنی مصروفیات گنوائی ہیں' بے شک وہ مبارک ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک وسیع وعریض خلا بدستور موجود ہے۔ آپ خود کو کتنا بھی مصروف کرلیں' یہ خلا نہ صرف موجود رہے گا بلکہ پھیلتا چلا جائے گا۔"

"کیا آپ مجھے نفسیاتی مشورے دینے کے لیے یہاں لائے ہیں؟"

"آپ نے بھی تو مجھے اس سے ملتے جلتے مشورے دیے تھے۔ ان مشوروں کے نتیجے میں' میں نے خود کو کافی کچھ بدلا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ میرے ناچیز مشورے کے نتیجے میں آپ بھی خود کو تھوڑا بہت بدلنے کی کوشش کریں اور نہ بھی کریں مگر کم از کم سنیں تو سہی۔"

"آپ کی باتیں بہت الجھی ہوئی ہیں۔"

"مشکل مسئلوں کے بارے میں جو باتیں کی جاتی ہیں' وہ اکثر الجھی ہوئی ہی ہوتی ہیں۔"

"گویا آپ کے نزدیک میں کسی مشکل نفسیاتی مسئلے کا شکار ہوں؟" فرحین کا لہجہ قدرے خشک تھا۔

"میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔" میں نے بے باکی سے کہا "میں واقعی ایسا سمجھتا ہوں کہ آپ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں۔"

"مسٹر تیمور! آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں' ذرا صاف لفظوں میں کہیں۔"

میرے سینے میں عجیب سی بے باکی کا فوارہ بج رہا تھا اور اس کی گونج میرے پورے بدن میں تھی۔ میں نے فرحین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "فرحین! آپ شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟"

فرحین کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑیں گی لیکن پھر انہوں نے خود پر قابو پایا اور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولیں "تیمور صاحب! میں نے آپ کو اپنی نجی زندگی میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

"لیکن آپ نے ابھی گاڑی میں وعدہ کیا تھا کہ میری بات سنیں گی۔"

"مگر میں ایسی بے ہودہ گفتگو نہیں سن سکتی۔"

"یہ کس لحاظ سے بے ہودہ گفتگو ہے؟ انسانی لحاظ سے؟ سماجی یا مذہبی لحاظ سے؟ کس لحاظ سے یہ بے ہودہ ہے؟ ہمارا دین۔۔۔ دین فطرت ہے۔ ہمارے دین میں کہاں لکھا ہے کہ عورت نکاح کے بعد ساری زندگی کے لیے مرد کے پلّے سے بندھ جاتی ہے پھر وہ مرد چاہے کیسا بھی ہو' عورت ہمیشہ کے لیے اس کے ظلم اور بے وفائیاں برداشت کرنے کی پابند ہے اور اس بات کی پابند ہے کہ وہ مرد کی طرف سے دھتکارے جانے کے باوجود اس کی زندگی سے چمٹی رہے اور منافقت اور جھوٹ کے سہارے جیتی رہے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ آپ مجھے بتائیں آپ کے نزدیک لوگ اور معاشرہ زیادہ اہم ہے یا خدا کی قانون؟ بے شک ہمارے دین نے طلاق کو بہت ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے لیکن یہ حرام نہیں ہے اور جب برے حالات میں خدا نے اسے



حرام قرار نہیں دیا تو پھر معاشرے کے خوف سے ہم اسے حرام کیوں قرار دیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مذہب کے بھی بس وہی احکامات درست سمجھتے ہیں جن کی تائید معاشرہ کرتا ہے۔۔۔ کیا یہ گناہ نہیں کہ ہم مذہب پر معاشرے اور روایات کو ترجیح دیں۔۔۔ اور فطرت کے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ پابندیوں میں خود کو جکڑ لیں۔"

فرحین کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ بولیں "معاف کرنا تیمور صاحب! آپ طلاق کو موضوع بنا رہے ہیں۔ آپ کے والد اور والدہ کو بھی تو علیحدہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی تھی پھر آپ کے والد نے طلاق کیوں نہ دی اور والدہ نے کیوں نہ لی؟"

"اس کا جواب یہ ہے مسز فرحین! کہ ان لوگوں نے یہ قدم اپنی "مثالی محبت" کی خاطر نہیں اٹھایا تھا اور آپ یہ قدم صرف اس لیے نہیں اٹھا رہی ہیں کہ معاشرے کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں۔"

میرے الفاظ کافی سخت تھے۔ فرحین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ بولیں "جن باتوں کا آپ کو علم نہیں' وہ باتیں مت کریں۔ آپ اپنے طور پر عالم فاضل بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر۔۔۔"

"میری بات سنیں" میں نے فرحین کی بات کاٹی "میں عالم فاضل نہیں ہوں اور جو بات میں کہہ رہا ہوں' اسے کہنے کے لیے عالم فاضل ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ سیدھی سادی بات ہے فرحین صاحب۔۔۔ خدا نے مرد اور عورت کا تعلق اس لیے بنایا کہ دونوں ایک دوسرے کے غم گسار ہوں' ایک دوسرے کی محرومیوں' خواہشوں اور تقاضوں کا مداوا کریں تاکہ فطرت اپنے راستے پر روانی سے بہتی رہے لیکن اگر میاں بیوی میں سے ایک سات سمندر پار جاکر بیٹھ جائے' پچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ بھول جائے' اپنی نئی دنیا بسالے' نیا جیون ساتھی ڈھونڈ لے۔ پہلے ساتھی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے' برسوں برس گزر جائیں اور اس پہلے ساتھی کی صورت تک نہ دیکھے تو پھر کہاں رہ جاتی ہے فطرت کی روانی' کہاں بہتی ہے وہ مقدس معاہدہ جو زندگی کی تعمیر کرتا ہے پھر تو ایک بند جوہڑ میں ٹھہرا ہوا پانی رہ جاتا ہے' جس کے اندر مصلحت کی کائی اگ آتی ہے۔ اس میں منافقت کے کیڑے تیرتے ہیں اور فطرت اس کے کنارے بیٹھ کر رات رات بھر روتی ہے۔ اس جوہڑ سے اٹھنے والی بساند کو کبھی وظیفہ جات کی اگربتیوں میں چھپایا جاتا ہے' کبھی فلاحی کاموں کی دھونی دی جاتی ہے' کبھی صبر و برداشت کے ملمّے سے ڈھانپا جاتا ہے۔ ان کوششوں سے بے شک حس شامہ کو سکون ملتا ہے اور ماحول صاف ستھرا محسوس ہوتا ہے لیکن وہ بساند تو اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اندر ہی اندر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ میں آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوں لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ۔۔۔"

"پلیز! آپ خاموش ہوجائیں" فرحین نے میری بات قطع کی "اگر آپ نے میرے سامنے طلاق کا لفظ استعمال کیا تو میں برداشت نہیں کرسکوں گی۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں' پلیز آپ خاموش ہوجائیں۔"

"کیوں خاموش ہوجاؤں؟" میں نے بلا توقف کہا "طلاق کا لفظ میں کیوں استعمال نہ کروں' کس کتاب' کس حدیث میں لکھا ہے کہ طلاق کا لفظ زبان پر لانا گناہ ہے؟۔۔۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں فرحین صاحبہ! آپ کی باتیں مجھے دکھ پہنچا رہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں آپ کے سامنے نہیں ہندی دیومالا کی کسی ستی ساوتری ناری کے سامنے بیٹھا ہوں۔ یا پھر اس ناری کی روح' نسل در نسل بھیس بدل بدل کر انسانی خون میں سفر کرتی ہوئی آپ تک آپہنچی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اب بھی آپ کے خون میں سانس لے رہی ہے۔۔۔ وہی ستی ساوتری ہو اپنے فرسودہ عقائد کو سینے سے لگا کر اپنے پتی کی چتا میں چھلانگ لگا دیتی تھی اور زندہ جل کر اپنی وفاداری میں وابستگی کا حق ادا کردیتی تھی۔۔۔ وہ ایک کٹر تاریک عقیدے کی پیروکار تھی' آپ صحیح معنوں میں اپنے عقائد کی علمبردار ہیں۔ آپ کی زبان سے ایسی باتیں سن کر دکھ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟"

فرحین کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ان کا پروقار انداز لرزہ براندام تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں "مسٹر تیمور! آپ کو یہ باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

میرے لہجے میں ایک پرخلوص تپش برق کی طرح لہرائی' میں نے کہا "مجھے حق پہنچتا ہے فرحین! اس لیے کہ میں۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ سے پیار کرتا ہوں۔۔۔ اور مجھے حق پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ آپ۔۔۔ بھی۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ پیار کرتی ہیں۔"

جیسے ایک چھناکے سے بہت بڑا فانوس فرش پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔ فرحین پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھیں۔ ان کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا' ایک سکتے کی سی کیفیت تھی۔ ان کے دونوں سرخ و سپید ہاتھ میز پر دھرے تھے' کلائیوں میں آڑی ترچھی چوڑیاں جھلی لگ رہی تھیں مگر یہ ہاتھ جذبات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ ان لمحات میں میرے دل کے اندر یہ نہایت شدید خواہش پیدا

ہوئی کہ میں ان ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دوں اور ان کی ساری لرزش، حدت اور لطافت کو ہمیشہ کے لیے اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرلوں مگر یہ خواہش ہی رہی۔

انہوں نے نہایت غضب ناک سرگوشی میں کہا "آپ۔۔۔ آپ نہایت بے ہودہ شخص ہیں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں آپ کی بکواس پر۔"

انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آپ اس وقت غصے میں ہیں، میری باتوں پر ذرا۔۔۔"

"یو شٹ اپ!" انہوں نے تیزی سے میری بات کاٹی اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا پھر پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

اس گفتگو کا انجام میری توقع سے زیادہ تلخ ہوا تھا۔ بہرحال یہ تسلی تو مجھے تھی کہ جو کچھ میرے دل میں تھا، وہ میں نے فرحین کے سامنے کھول کر بیان کردیا ہے۔

○☆○

اگلا ایک ہفتہ میں نے سخت پریشانی میں گزارہ۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب فرحین کا خیال میرے ذہن میں نہ ہو۔ اس کے یاد آنے کے ہزار بہانے تھے اور بہانوں کا یہ سلسلہ صبح سے رات گئے تک ٹوٹتا نہیں تھا۔ ایک دو لڑکیوں سے میری عام نوعیت کی دوستی تھی۔ لیکن اب ان کی طرف سے دھیان یکسر ہٹ گیا تھا۔ نائلہ نامی لڑکی میری کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ ان دنوں وہ ماڈلنگ کے شعبے میں قسمت آزما رہی تھی۔ اس کے کئی فون آئے، ایک دو مرتبہ وہ گھر تک بھی آئی مگر اس سے میری بات چیت چند فقروں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یوں لگتا تھا کہ اب میں سرتاپا ایک بدلا ہوا شخص ہوں۔ زمین اور آسمان کے قلابے میں فرحین کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا۔ محبت کے مارے لوگوں کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی راتیں کانٹوں پر گزرتی ہیں اور وہ اختر شماری کرتے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر میرا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ سارا دن تو فرحین کی یاد دامن گیر رہتی تھی اور کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ مگر رات کو دس پندرہ منٹ کروٹیں بدلنے کے بعد نیند آجاتی تھی اور میں صبح تک سویا رہتا تھا۔ ہاں صبح جاگتے ہی جو سب سے پہلا خیال آتا تھا، وہ فرحین کا ہوتا تھا۔ دل سے ہوک سی اٹھتی تھی کہ ایک اور دن فرحین کے بغیر گزر گیا۔

آٹھویں دسویں روز کی بات ہے۔ رات کو فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا، دوسری طرف فرحین تھیں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کتنی ہی دیر میرے ہونٹوں سے آواز نہیں نکل سکی پھر میں نے کہا "زہے نصیب، آپ نے کیسے یاد فرمالیا؟"

ان کا لہجہ دھیما اور نرم تھا، بولیں "میں نے آپ سے معافی مانگنے کے لیے فون کیا ہے؟"

"کس بات کی معافی؟"

"اس روز میں نے آپ سے بڑے سخت لہجے میں بات کی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ ارد گرد لوگ موجود ہیں۔ میں اس پر شرمندہ ہوں۔"

"اس لحاظ سے مجھے تو دگنا شرمندہ ہونا چاہیے۔"

"خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں جس انداز سے سوچا، وہ صحیح نہیں ہے۔ میں آپ کے احساسات کی قدر کرتی ہوں لیکن میں ایک مختلف عورت ہوں، اس کے سوا مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"لیکن مجھے تو کچھ کہنا تھا۔"

"ضروری تو نہیں کہ انسان جو کچھ سوچے وہ کہہ بھی ڈالے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کچھ بھی نہ کہیے۔ میری فون کال سننے کا بہت شکریہ۔۔۔ مجھے توڑ تھا کہ شاید آپ میری آواز سن کر فون ہی بند کردیں۔"

ایک دو رسمی کلمات کے بعد بات ختم ہوگئی۔

یہ کوئی حوصلہ افزا کال نہیں تھی پھر بھی کسی نہ کسی طرح میں نے اس میں سے امید کا پہلو ڈھونڈ لیا۔ مجھے امید تھی کہ شاید چند دن یا چند ہفتے بعد فرحین دوبارہ رابطہ کریں گی لیکن یہ نہیں ہوا۔ انہی دنوں ایک روز اخلاق میرے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں شادی کا کارڈ تھا۔ اس کی اور نرگس کی خانہ آبادی ہو رہی تھی۔ یہ بڑی خوشی کا موقع تھا لیکن میرا دل دوبارہ ان لوگوں میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اخلاق نے بے حد اصرار کیا، میں انکار کرتا رہا، آخر نوبت ناراضگی تک پہنچ گئی۔ میں نے ہامی بھرلی۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں شاید یہ خواہش بھی پوشیدہ تھی کہ شادی کی اس تقریب میں فرحین کو دیکھنے اور ممکن ہے کہ ان سے بات کرنے کا بھی موقع ملے۔

شادی کی یہ تقریب بہت بھرپور اور زوردار تھی۔ تین چار دن مہندی، برات اور ولیمے وغیرہ کا ہنگامہ رہا۔ فرحین صاحبہ سے بس علیک سلیک کی حد تک ہی بات ہوسکی۔ حسین، چنچل اور شوخ خواتین کے ہجوم میں وہ اپنی پروقار سادگی اور سنجیدگی کے سبب سب سے جدا نظر آتی تھیں۔ میں نے انہیں گانے بجانے کے ہنگاموں سے دور دور دیکھا۔ نماز



کے اوقات میں وہ خاموشی کے ساتھ اوجھل ہوجاتی تھیں۔ چند بار ان سے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں کوشش کے باوجود ان نگاہوں میں اپنے لیے موہوم سی امید بھی نہیں ڈھونڈ سکا۔ جس روز سری پائے میں، میں اپنی زخمی ٹانگ کے باعث لڑکھڑا کر گرا تھا اور فرحین نے مجھے سہارا دیا تھا، اس دن کے بعد سے کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا تھا جب میرے سامنے ان کی سنجیدگی کی دیوار میں کوئی دراڑ پیدا ہوئی ہو۔ شاید وہ آخری مسکراہٹیں تھیں جو میں نے ان کے چہرے پر دیکھی تھیں۔

اخلاق کا ولیمہ اس کی کوٹھی کے وسیع و عریض سبزہ زار میں ہوا تھا۔ دعوت ولیمہ کے بعد لڑکیوں کے ایک گروپ نے دولھا دلھن سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ پہلے بیت بازی اور پھر گیت بازی کا مقابلہ ہونے لگا۔ میں اس ہنگامے سے اکتا کر چھت پر ٹہلنے کے لیے چلا گیا۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہاں یوں فرحین سے ملاقات ہوجائے گی۔ وہ اپنی جائے نماز تہ کرکے ایک طرف رکھ رہی تھیں، دوسرے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی تسبیح اوڑھنی کے نیچے کہیں اوجھل ہوگئی۔

میں نے "السلام علیکم" کہا۔ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر انہوں نے کہا "نیچے تو خوب رونق میلہ ہے، آپ اوپر چلے آئے۔"

میں نے کہا "مجھے تو کوئی رونق نظر نہیں آتی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس ایسے ہنگاموں میں اب دل نہیں لگتا۔"

"کیوں؟"

"اس کا تو مجھے خود بھی علم نہیں۔۔۔ بائی دی وے، آپ کو بھی تو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی بات تو نہیں۔ بس نماز کا وقت تھا اس لیے اوپر آگئی۔" چند لمحے خاموش رہی پھر انہوں نے پوچھا "طور کے دوران میں تو آپ ایسے ہلے گلے میں بہت خوش رہتے تھے۔"

"بس۔۔۔ میں خود کو کچھ بدلا ہوا محسوس کررہا ہوں۔"

"اگر یہ مثبت تبدیلی ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"اس تبدیلی میں دو مثبت باتیں ہیں۔ ایک تو یہ مثبت تبدیلی ہے، دوسرے آپ کی وجہ سے آئی ہے۔" میں نے بے باکی سے کہا۔

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں۔ سچی کھری بات تو یہ ہے کہ جو کام میری والدہ سے بھی نہ ہوسکا، وہ آپ نے کر دکھایا ہے۔ میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی برائیاں تھیں لیکن اب میں ہر روز خود کو پہلے سے کچھ بدلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

ان کے چہرے پر عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس میں خوشی کی جھلک تھی اور اس فخر کا احساس بھی کہ ان کی ذات کے حوالے سے کسی کے لیے بہتری کی کوئی صورت نکلی ہے۔

"میں آپ کو چند کتابیں بھجواؤں گی۔۔۔ وہ پڑھیے گا" جیسے ایک دم ان کے منہ سے نکل گیا۔

"ضرور بھجوایئے گا، میں انتظار کروں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

خوش گوار ہوا کے شریر جھونکے ان کی اوڑھنی سے اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ انہوں نے اوڑھنی کو مضبوطی سے تھوڑی کے نیچے تھاما اور مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے نیچے چلی گئیں۔

تین چار دن بعد مجھے گھر کے پتے پر ایک پارسل موصول ہوا۔ اس میں چند کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے موضوعات فلسفہ اور انسانی نفسیات تھے۔ دو کتابیں خالص اسلامی نوعیت کی تھیں۔ میں نے ان کتابوں کو جستہ جستہ پڑھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کتابوں سے بھی زیادہ تحریک مجھے فرحین کی ذات سے مل رہی تھی۔ میں واقعتاً خود میں تبدیلیاں محسوس کررہا تھا اور میرے دل کی گہرائی میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہورہی تھی۔

چند روز بعد فرحین کا فون ملا۔ انہوں نے مجھ سے کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ یہ جان کر ان کے لہجے میں خوشی کی جھلک محسوس ہوئی کہ میں نے کتابوں میں دلچسپی لی ہے۔ وہ مجھ سے ناصحانہ لہجے میں باتیں کرتی رہیں تاہم الفاظ کا انتخاب ایسا تھا کہ نصیحت کا بھاری پن محسوس نہیں ہورہا تھا۔ میں قائل ہوگیا کہ وہ گفتگو کرنا جانتی ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے اخلاق کا ذکر بھی کیا، کہنے لگیں "وہ آپ کا دوست ہے۔ آپ کی بات مانتا بھی ہے۔ اسے تھوڑا بہت سمجھاتے رہا کریں۔ دنیا کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ دھیان تو دین کی طرف بھی ہونا چاہیے۔ اخلاق کے مشورے سے نرگس نے بال کٹوا لیے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون بھی پہن لیتی ہے۔ رات گئے تک وی سی آر پر فلمیں دیکھتے ہیں۔ دوپہر گیارہ بارہ بجے بھی ان کے گھر پہنچو تو سوئے ہوئے ملتے ہیں۔"

میں نے کہا "شادی کے بعد وہ صرف ایک دو بار مجھ سے ملا ہے۔ اب جب بھی ملے گا اس سے بات کروں گا۔"

آٹھ دس منٹ کی گفتگو کے بعد فرحین نے خدا حافظ کہہ دیا۔ میں ان کی گفتگو پر غور کرنے لگا۔ بڑا نفسیاتی انداز تھا ان کا.... وہ مجھے اخلاق کو سمجھانے کا کہہ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کسی دوسرے کو سمجھاتا ہے تو وہ اپنے آپ پر بھی غور کرتا ہے کہ کہیں وہی خامیاں اس کے اپنے اندر بھی تو نہیں ہیں۔ یوں بالواسطہ اس کی اپنی اصلاح بھی ہوتی ہے۔

اس کے بعد کبھی کبھار فرحین کا فون آنے لگا۔ ان کی آواز میرے دل کے ویرانے کی قسمت جگا دیتی۔ بنجر کان جیسے سیراب ہونے لگتے۔ میں بہت کم بولتا' یوں انہیں زیادہ بولنے کا موقع ملتا اور میں زیادہ دیر تک ان کی آواز سن سکتا تھا۔ ان کی گفتگو کے موضوعات زیادہ تر اخلاقی ہی رہے۔ اگر اخلاقیات کے علاوہ بات ہوتی تو بھی اس کا لب لباب اخلاقیات ہی ہوتا۔ وہ الفاظ کا انتخاب اتنی احتیاط سے کرتیں کہ کسی مرحلے پر بھی یہ گمان نہ ہوتا کہ وہ سمجھانے بجھانے کا کام کر رہی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر ایک تعلق بھی ہمارے درمیان پروان چڑھ رہا تھا۔ ایک طرح کی وابستگی آپوں آپ وجود میں آ رہی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور فون کرتی تھیں۔ اگر کبھی ان کا فون نہ آتا تو میں شدت سے انتظار کرتا اور گھر کے خالی کمروں میں بے قرار پھرتا۔ ایک بار مجھے کام کے سلسلے میں تین ہفتے کے لیے فرم کے برانچ آفس سنگاپور جانا پڑ گیا۔ میری واپسی پر فرحین نے مجھے بتایا کہ وہ عادتاً ہر ہفتے مجھے رنگ کرتی رہی ہیں اور یہ حقیقت تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کی عادت سی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دو بار میں نے دل کڑا کر کے فرحین سے اس کی نجی زندگی کے بارے میں بات کرنا چاہی لیکن انہوں نے مجھے جہاں کا تہاں روک دیا۔ مجھے شدید خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ہماری بات چیت کو ہمیشہ کے لیے فل اسٹاپ نہ لگ جائے۔ وہ اس موضوع کا ذکر تک پسند نہ کرتی تھیں اور نہ مستقبل میں یہ امید نظر آتی تھی کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی کریں گی۔ کبھی کبھی ہم ایک ایک گھنٹا بھی فون پر بات کرتے رہتے لیکن مجال ہے کہ اس گفتگو میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا آتا جسے کسی بھی لحاظ اور معیار سے نامناسب قرار دیا جا سکتا۔

مگر یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ بے شک وہ مجھ سے بے حد محتاط گفتگو کرتی تھیں لیکن گفتگو کرتی تو تھیں۔ اس گفتگو کے لیے وہ مجھے ٹیلی فون کرتی تھیں۔ بے شک ہمارا تعلق ایک ہی فیملی سے تھا مگر ہم نامحرم تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اہل خانہ کو بتا کر یا ان سے اجازت لے کر تو فون نہیں کرتی تھیں.... اس پہلو پر میں غور و خوض کرتا تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی' وہ میرے ساتھ اپنی گفتگو کو صرف اور صرف میری اصلاح کے پس منظر میں دیکھتی تھیں۔ میرے ساتھ گفتگو کے لیے لاشعوری طور پر انہوں نے جو جواز ڈھونڈا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ اپنی بات چیت کے ذریعے مجھے سنوارنے کی کوشش کر رہی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں سنور رہا تھا۔ بلا ارادہ سنورتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے اندر ایک خلا بھی پیدا ہو رہا تھا اور یہ فرحین کا خلا تھا۔ اس خلا کو دنیا میں فرحین کے سوا اور کوئی پر نہیں کر سکتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ کیا فرحین اس خلا سے آگاہ ہیں پھر میں سوچتا تھا کہ کیا فرحین کے اندر بھی کوئی ایسا خلا موجود ہے۔ دل کی گہرائیوں سے پھر آواز آتی تھی کہ ہو نہ ہو ایسا خلا موجود ہے۔

ذہن سے ایک تیسرا سوال اٹھتا تھا کہ پھر ان دونوں خلاؤں کا انجام کیا ہوگا۔ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ پچھلے ایک برس میں سیکڑوں بار یہ سوال ذہن میں ابھرا تھا اور ہر بار جواب سے محروم رہا تھا۔

وہ گرما کی ایک چاندنی رات تھی۔ فرحین کا فون آیا۔ مجھ پر عجیب سا موڈ طاری تھا۔ قریباً ایک برس سے دل میں جو باتیں مچل رہی تھیں' وہ لب پر آنے کے لیے بے قرار تھیں۔ پیمانۂ صبر چھلک رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں' میں نے کہا۔

"فرحین! کبھی کامران صاحب کی امریکا سے کوئی خیر خبر آئی ہے؟"

"نہیں" مختصر جواب ملا۔

"کبھی آپ نے کوشش کی رابطہ کرنے کی؟"

"اوں ہوں۔"

"کبھی دل میں خیال نہیں آیا کہ ایسا کروں؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر فرحین کی سپاٹ آواز ابھری "تیمور صاحب! آپ پھر وہی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"فرحین!" میں نے بڑی التجا سے کہا "ہماری گفتگو میں کیا یہ حد بندیاں بہت ضروری ہیں؟"

"ہاں' بہت ضروری ہیں" انہوں نے غالباً مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو؟"

"ضروری تو نہیں کہ ہر بات کہی جائے۔ کچھ باتیں بن کہے اچھی لگتی ہیں۔"

"لیکن اگر کچھ باتیں دل کا بوجھ بن جائیں تو؟"

"ایسی باتوں کو دل سے نکال دینا چاہیے یا پھر خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس بوجھ کو سہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"کیا محبت کا مقدر صرف قربانی ہے؟"

"محبت تو قربانی ہی کا دوسرا نام ہے۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو خدا صرف "قربانی" پیدا کرتا' اس نے محبت کیوں پیدا کی۔ کیوں انسان کے سینے میں تمنا چاہنے اور کچھ پانے کی خواہش اس کے سینے میں "نصب" کی؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ محبت میں ہم جو قربانی دیتے ہیں' وہ قربانی نہیں ہوتی' وہ اکثر و بیشتر ہماری کم ہمتی اور سہل پسندی کی سزا ہوتی ہے۔ یہ سزا پیار کرنے والوں کو جدا کر کے ان کی گردنوں میں جھوٹ اور منافقت کا طوق ڈال دیتی ہے اور تمام عمر انہیں دہری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کا روئے سخن میری طرف ہے۔" فرحین کے لہجے میں خفگی تھی۔

"ہرگز نہیں۔"

"تیمور صاحب!" فرحین بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اب اپنی باتوں سے آپ کو بہت بور کرنے لگی ہوں۔"

"ایسا آپ نے کیوں سوچا؟"

"آپ جب بھی اس متنازع موضوع کو چھیڑتے ہیں' مجھے ایسے ہی لگتا ہے۔"

"لیکن اس موضوع سے آپ کو اتنی چڑ کیوں ہے فرحین۔۔۔ کیا اپنی زندگی کے اہم ترین مسئلے پر بات کرنا گناہ ہے۔"

"بس آپ یہی سمجھ لیں کہ یہ میرے لیے بہت بڑا گناہ ہے۔"

"آپ بھول رہی ہیں کہ آپ مجھے دلیل سے بات کرنے کی تلقین کیا کرتی ہیں۔"

"گناہ کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی تیمور صاحب!" حسب توقع فرحین کے لہجے میں غیریت عود کر آئی تھی۔

اس روز ہماری گفتگو کا اختتام بڑے مایوس کن انداز میں ہوا۔ خدا حافظ کہتے ہوئے فرحین کے لہجے میں جو بھاری پن تھا' وہ میں نے صاف محسوس کیا۔

میرا اپنا دل بھی فرحین کی مسلسل بے اعتنائی سے بھر سا آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں سالہا سال سے ایک دیوار کے ساتھ سر پھوڑ رہا ہوں۔ میرے قدم خود بخود اپنی خواب گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ یہاں ایک الماری کے خفیہ خانے میں میرا چھوٹا سا بار روم موجود تھا۔ کبھی یہاں ہر قسم کی قیمتی شرابیں بھی رہتی تھیں مگر اب اس خفیہ خانے کی رونق' نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ وہسکی کی دو بوتلیں اور بیئر کے چند ٹن موجود تھے۔ سینے میں جلتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے لیے میں نے ملازم دین محمد کو بلایا اور کہا کہ وہ سوڈا اور برف لائے۔ وہ حیرت اور قدرے دکھ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اس امر کی خوشی تھی کہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شراب تو دور کی بات تھی' سگریٹ بھی اب کم کم ہی میرے ہاتھ میں نظر آتا تھا۔ جمعے کی نماز میں باقاعدگی سے ادا کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے میرے لیے پینے کے لوازمات رکھ دیے۔ وہ بہت غم زدہ تھا لیکن جلد ہی اس کا یہ غم مسرت و شادمانی میں بدل گیا۔ میں نے نہ صرف پینے پلانے کے لوازمات اٹھوا دیے بلکہ دین محمد کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ الماری میں موجود تمام شراب گٹر میں بہادے اور بوتلیں توڑ پھوڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دے۔

اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب کسی برائی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم فرحین کے نیک تصور نے روک لیے تھے۔ وہ اپنی شخصیت کی تمام تر خوبصورت توانائی کے ساتھ میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی اور مجھے واپس لوٹا دیا تھا۔

پورے چاند کی وہ ساری رات میں نے اپنی کوٹھی کی چھت پر ٹہلتے اور فرحین کے بارے میں سوچتے گزار دی۔

یہ یقین کسی الہام کی طرح میرے سینے میں اترا ہوا تھا کہ فرحین کے دل میں میرے لیے جگہ موجود ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے دل کے راز کو زبان تک لانا تو درکنار آنکھوں تک بھی نہیں آنے دیں گی۔ وہی خود کو قربان کرنے اور اپنے جذبات کا گلا گھونٹنے والا جذبہ' جس سے اب مجھے چڑ ہو گئی تھی' یہی خود اذیتی کا رویہ تو تھا جس کے چنگل سے میں فرحین کو چھڑانا چاہتا تھا مگر وہ اس میں مزید گرفتار ہو رہی تھیں۔ اپنے مشرقی ادب اور شاعری کی روتی بسورتی اور "قربانیاں" دیتی ہیروئن سے مجھے ہمیشہ الرجی رہی تھی۔ مجھے تو وہ فلمیں اور ڈرامے بھی زہر لگتے تھے جن میں نوجوان خواتین و حضرات عشق پیچے کیں اور لگاتے ہیں اور شادیاں کہیں اور کرتے ہیں پھر منافقت اور بددیانتی کا ایک طویل دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں چھپ چھپ کر رویا جاتا ہے۔ المیہ غزلیں اور گیت سنے جاتے ہیں' چپکے چپکے ان مواقع کا انتظار کیا جاتا ہے' جب اپنے ممدوح کا دیدار نصیب ہو یا اس کی آواز کانوں میں پڑے۔ محبت جیسے عظیم جذبے کے بارے میں



میرے خیالات وہی تھے جو شاید کبھی میری والدہ کے رہے تھے۔ ان کے نزدیک محبت ایک سچ تھا اور سچ چھپانے والی یا ضائع کرنے والی چیز نہیں ہوتا۔ سچ کو پانے کی کوشش کرنی چاہیے' اپنی پوری جسمانی اور روحانی توانائیوں کے ساتھ۔ اس کو پالینا چاہیے یا پھر خود مٹ جانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص سچ یعنی محبت کو پا نہ سکے اور اس سے محروم ہو کر خود کو مٹا بھی نہ سکے تو پھر وہ یقین کر لے کہ جسے وہ سچ سمجھتا تھا' وہ سچ نہیں تھا پھر اسے بھول جائے۔ دل کی کتاب سے اس ورق کو یوں پھاڑے کہ اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ اپنے اور اپنے اس ممدوح کے درمیان اتنا ہی فاصلہ پیدا کر لے جتنا ایک زندہ اور مردہ شخص میں ہوتا ہے۔

میرے اندیشے کے عین مطابق اس گفتگو کے بعد کئی ہفتے تک فرحین کا فون نہیں آیا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ جب بھی رابطہ کرنا ہو گا فرحین ہی فون کریں گی۔ میرے پاس ان کا نمبر موجود تھا لیکن میں معاہدے کی رو سے انہیں فون نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کافی انتظار کے بعد ایک روز میں نے رات کو انہیں رنگ کیا۔ دوسری طرف سے بڑی تائی کی آواز آئی' میں نے فون بند کر دیا۔ رات گئے دوبارہ رنگ کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب فرحین مجھے فون کیا کرتی تھیں' مجھے امید تھی کہ وہ فون اٹھائیں گی لیکن اس مرتبہ بھی تائی ہی کی خوابیدہ آواز سنائی دی تھی۔ اگلے روز بھی میں نے دو تین بار کوشش کی۔ ایک دفعہ عینی اور دو دفعہ تائی نے فون اٹھایا۔ مجھے یوں لگا جیسے فرحین نے فون اٹھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔

میرے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں فرحین کو اس کے خول سے نکالنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ذرا سی بھی کوشش نہیں کر رہی تھیں بلکہ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ مزید خول اپنے اوپر چڑھا رہی ہیں۔ ایک روز میں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دو دن تک وقفے وقفے سے انہیں کئی بار فون کیا۔ آخر ایک بار فرحین نے فون اٹھا ہی لیا۔

"کہیں فون تو بند نہیں کر دیں گی؟" میں نے ہیلو کہنے کے بعد فوراً جملہ بول دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر ان کی جلترنگ سی آواز ابھری "نہیں' ایسی بات تو نہیں۔"

"کیا ناراض ہیں مجھ سے؟"

"نہیں۔ بس یونہی پچھلے دنوں کچھ مصروف رہی۔ دونوں ملازمائیں بھی چھٹی پر چلی گئی تھیں۔ گھر کا کام کاج بھی خود کرنا پڑ رہا تھا۔۔۔ آپ سنائیں' کیسے ہیں؟"

"کیسا ہو سکتا ہوں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ میرے فون نہ کرنے سے آپ کو پریشانی ہوئی ہو گی۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب یہ فون ہماری عادت بنتا جا رہا تھا اور یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔"

"آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب آپ یہ معمولی سا رابطہ بھی ختم کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"نہیں' ایسی بات تو نہیں۔ کبھی کبھی کیا کروں گی فون۔"

"چھ مہینے بعد یا سال بعد؟"

"ہنہ' اتنا لمبا وقفہ تو نہیں ہو گا۔۔۔ اور اگر ہو بھی جائے تو آپ یہی سمجھیے گا کہ کوئی مجبوری رہی ہو گی۔"

فرحین کے لہجے میں اجنبیت کی لہر میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا "آپ نے یہ نہیں پوچھا' میں نے فون کیوں کیا؟"

"اب پوچھ لیتی ہوں۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور فرحین سے ملنے کے لیے کوئی معقول جواز ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا "دیکھیں' آپ مجھے یوں راہ میں نہیں چھوڑ سکتیں۔ آپ کی وجہ سے میری زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ کم از کم تبدیلیوں کا یہ عمل تو مکمل ہو لینے دیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ یہ عمل خود سے بھی مکمل کر سکتے ہیں۔"

"مگر رہنما کے بغیر تو راستہ ہاتھ نہیں آتا" میں نے کہا۔

"آپ نے جو کتابیں مجھے بھیجی تھیں' وہ میں نے دوبارہ پوری تفصیل سے پڑھی ہیں۔ کچھ سوال ہیں جو میرے ذہن میں بار بار ابھر رہے ہیں۔ میں نے انہیں علیحدہ سے نوٹ کیا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ایک بار آپ سے ان سوالوں پر تھوڑی سی بات کروں۔"

میں نے فرحین کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری کوئی اور بات سنجیدگی سے سنیں' نہ سنیں' وہ بات ضرور سنیں گی جو میری اصلاح کے حوالے سے ہو گی۔ لائن پر دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر فرحین کی آواز آئی "اچھا۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کو رات میں فون کروں گی۔"

"فون پر نہیں۔۔۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے۔ اپنے مصروف وقت میں سے ایک آدھ گھنٹا مجھے بھی عنایت کر دیں۔ آپ نازلی کو گاڑی پر کالج سے لینے جاتی ہیں۔ راستے میں ہی وہ ریسٹورنٹ ہے جہاں ہم پہلے بھی بیٹھے تھے۔ کل دوپہر ایک آدھ گھنٹا پہلے نکل آیئے گا۔ چائے پی لیں گے اور

چند باتیں کرلیں گے۔"

"نہیں تیمور صاحب!" فرحین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں سمجھتی ہوں کہ پہلے بھی اس طرح آپ سے مل کر میں نے غلطی کی تھی' یہ کسی طور مناسب نہیں ہے۔"

میرے اصرار کے باوجود فرحین ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ آخر میں نے کہا "فرحین! اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے چند نہایت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کروں کہ اس کے بعد آئندہ کبھی بھی آپ کو ایسی زحمت نہیں دوں گا تو پھر۔؟" دوسری جانب سے فوری جواب نہیں ملا۔ میں نے کہا "فرحین' اگر آپ مجھ پر ذرا سا بھی بھروسا رکھتی ہیں تو انکار نہ کریں۔ سمجھیں یہ میری آخری خواہش ہے۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ غالباً وہ تذبذب میں تھیں۔ ایک جاں گسل انتظار کے بعد ان کی آواز آئی "اچھا' میں پھر فون کروں گی۔"

"پلیز فرحین! مجھے انتظار کی سولی پر مت لٹکائیں۔ آپ نے کسی سے مشورہ تو نہیں کرنا۔ آپ نے جو کہنا ہے ابھی کہہ سکتی ہیں۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے کہا "اگر آپ مجھے دوبارہ مجبور نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں تو میں آجاؤں گی۔"

○☆○

ہم شیزان ریسٹورنٹ کے ہال میں ایک پرسکون میز کے گرد بیٹھے تھے۔ فرحین ہمیشہ کی طرح سادہ لیکن حسین اور پروقار دکھائی دے رہی تھیں۔ دوپٹا مضبوطی سے ان کے سر پر جما ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے فرحین کو یہ بتایا کہ کتابوں سے اٹھنے والے سوالات کے بارے میں' میں نے جو بات کہی تھی' وہ غلط تھی۔ ایسا میں نے صرف فرحین سے ملاقات کے لیے کہا تھا۔

فرحین کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نظر آئی مگر میرے اندازے کے مطابق وہ اس بات پر خوش بھی تھیں کہ میں نے اپنے جھوٹ کو طول نہیں دیا۔

میں نے کہا "فرحین صاحبہ! سب سے پہلی بات تو آپ کو یہ سننا پڑے گی کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کا رویہ آئندہ چاہے کچھ بھی ہو' میرا رویہ تبدیل نہیں ہوگا۔ کیا آپ سن رہی ہیں؟"

فرحین میز کی سطح کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "فرحین صاحبہ! ممکن ہے کہ آپ میری اس بات کو رسمی سمجھیں یا پھر خوشامد کے طور پر لیں لیکن یہ سو فیصد حقیقت ہے کہ آپ کو چاہنے کے بعد میرے اندر بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس روز ہم دونوں نے راولپنڈی میں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا' ہم دو انتہاؤں پر تھے' دو بالکل مختلف شخصیات تھیں ہماری۔ آپ میں نرمی تھی' تہذیب تھی' خدا ترسی اور محبت تھی' سب سے بڑھ کر یہ کہ سماجی روایات کی پاسداری تھی۔ مجھ میں کرختگی تھی' آوارگی تھی' پھکڑپن تھا اور وہ جو عرف عام میں کہا جاتا ہے چاروں شرعی عیب موجود تھے۔ ہم دو انتہاؤں پر تھے اور میں آپ کے قریب آنا چاہتا تھا۔ شاید یہی وہ خواہش تھی جس نے لاشعوری طور پر مجھے تبدیل کرنا شروع کیا۔ میں اپنی انتہا سے ہٹ کر آہستہ آہستہ لیکن بتدریج آپ کی طرف کھنچتا چلا گیا اور یہ سب کچھ ایسے خودکار طریقے سے ہوا کہ مجھے خود بھی علم نہیں ہوسکا۔ مگر دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ آپ نے اپنی جگہ سے ایک ملی میٹر بھی جنبش نہیں کی۔ ایک معمولی سی گنجائش بھی آپ میرے لیے نہیں نکال سکیں۔ حالانکہ آپ اپنے اچھے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ایسا کر بھی سکتی تھیں اور آپ کو کرنا بھی چاہیے تھا۔ ایک شخص جو برائی کی دلدل سے نکل رہا ہو اور سہارے کے لیے آپ کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو تو کیا آپ اس کی مدد پر قادر ہونے کے باوجود اپنی جگہ ساکت کھڑے رہیں گے۔ میرے خیال میں آپ جیسا مہربان اور ہمدرد شخص تو ایسا نہیں کرسکتا لیکن آپ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی کررہی ہیں۔ آپ اپنی انتہا سے معمولی سی بھی حرکت کریں تو ہم باہم مل سکتے ہیں لیکن آپ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ اپنے آپ سے جنگ لڑنے والا ایک ہانپتا کانپتا شخص لڑائی کے آخری مرحلے میں مدد طلب نظروں سے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور آپ اپنی جگہ پتھر کا بت بنی کھڑی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب آپ اسے واپس دلدل میں دھکیلنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

فرحین نے کہا "انسان کو اپنے حالات سے نکلنے کے لیے خود ہی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ کوئی دوسرا تحریک تو دے سکتا ہے لیکن اصل ارادہ تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ باقی میں نے آپ سے کبھی بھی کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"وعدہ زبان سے کرنا ضروری نہیں ہوتا" میں نے بے باک لہجے میں کہا "اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ نے وعدے کیے ہیں۔"



"میں خواب میں بھی کوئی ایسی بات نہیں سوچ سکتی تیمور صاحب! آپ نے اپنے دماغ میں میرے متعلق غلط فہمیاں پال رکھی ہیں۔"

"اچھا' آپ یہ بتائیں آپ خواب میں بھی کوئی ایسی بات کیوں نہیں سوچ سکتیں؟"

"آپ پھر ذاتیات پر آرہے ہیں۔"

"دیکھیں فرحین صاحبہ! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آج آخری بار آپ مجھ سے سب کچھ سنیں گی۔ پلیز! مجھے اپنی بات کا جواب چاہیے۔ اپنے دل کی گہرائی میں جھانک کر بتائیں' آپ ایسا کیوں نہیں سوچ سکتیں؟"

"آپ۔۔۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں۔۔۔ شادی شدہ ہوں۔"

"شادی کا لفظی مطلب سمجھتی ہیں آپ؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ مجھے بتائیں' پچھلے آٹھ سالوں میں اس ناتے سے کتنی خوشی ملی ہے آپ کو۔۔۔ کتنی مسرتیں سمیٹی ہیں آپ نے؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"لیکن میرے بھی کچھ ذاتی معاملات ہیں اور میں ان پر بات کرسکتا ہوں۔"

"میرے معاملے سے آپ کے معاملے کا کوئی تعلق نہیں۔"

"ہے فرحین! اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج کی ملاقات ہماری آخری ملاقات ثابت ہو لہٰذا آج میں آپ کو ناراض کرنے کا خطرہ بھی مول لے لوں گا۔ گستاخی معاف' جسے آپ شادی کہہ رہی ہیں وہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کا ایک سرا آپ کے پاؤں میں ہے لیکن دوسرا سرا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ آپ اس دوسرے سرے کو خود ہی مختلف چیزوں کے ساتھ باندھتی پھر رہی ہیں۔ کبھی سسر کے ساتھ' کبھی ساس کے ساتھ' کبھی نندوں اور دیوروں کے ساتھ۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آپ حماقت کررہی ہیں لیکن وہ آپ کو منع کیوں کریں گے؟ اس میں ان کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ آپ ان کے بچے کو پڑھا دیتی ہیں' ان کا کچن سنبھال لیتی ہیں۔ ان کی مفت چاپی کردیتی ہیں۔ اپنے زعم میں آپ بڑا تیر چلا رہی ہیں مگر آپ کچھ نہیں کررہیں' صرف ضائع کررہی ہیں خود کو۔ جو کچھ آپ اس گھر میں کررہی ہیں وہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار لینے والی ایک آیا بھی بخوبی کرسکتی ہے۔ بچے کے لیے ٹیوٹر بھی ہزار دو ہزار میں مل جاتا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ اس زنجیر کو کیوں جگہ جگہ باندھتی پھر رہی ہیں؟ کیوں اسے اتار کر پھینک نہیں دیتیں۔ آپ کا مذہب' آپ کے حالات' آپ کے اپنے لوگ' سب اس کو اتار پھینکنے کے حق میں ہیں۔"

فرحین کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا' انہوں نے کہا "مسٹر تیمور! برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"آج میں یہ حد دیکھ لینا چاہتا ہوں" میں نے بلا توقف کہا "آپ کے شوہر نے کئی برس سے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ صاف الفاظ میں کہہ چکا ہے کہ وہ آپ کو DIVORCE کرنا چاہتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق پچھلے آٹھ برس میں اس نے کوئی ایک اشارہ ایسا نہیں دیا جس سے آپ کو یہ خوش فہمی ہوسکے کہ وہ آپ کو دوبارہ بسالے گا پھر آپ اپنا حق کیوں استعمال نہیں کرتی ہیں۔ کیوں اس شخص کی زندگی سے نہیں نکل جاتیں جس نے آپ کو اپنی زندگی سے مکھن کے بال کی طرح نکال پھینکا ہے؟"

"مسٹر تیمور' آپ۔۔۔"

"آپ مجھے کہنے دیجیے" میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی "لیجیے' آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیوں اس گھر کی دہلیز پر پڑی ہوئی ہیں۔ آپ نے بہت نفسیات اور عمرانیات پڑھی ہے۔ فارغ بیٹھ کر بڑا غور کیا ہے زندگی کے فلسفوں پر۔۔۔ لیکن تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ اور آپ جیسی ہزاروں لاکھوں دوسری پابہ زنجیر خواتین کا اصل مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ آپ کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آپ کم حوصلہ اور سہل پسند ہیں اور ان کمزوریوں کے سبب آپ خود انحصاری سے دور ہیں۔ چونکہ آپ خود انحصار نہیں ہیں اس لیے معاشرہ ایک خوف بن کر آپ کے حواس پر مسلط ہوچکا ہے۔ آپ ایک معمولی سا قدم اٹھانے سے پہلے بھی خوف زدہ نظروں سے معاشرے کی طرف دیکھنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے' ڈگریاں لی ہیں لیکن بے عملی اور سہل پسندی کا گھن آپ کی صلاحیتوں کو چاٹ گیا ہے۔ معاف کیجیے گا' میرے لفظ بڑے سخت ہیں لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے پاؤں میں جو زنجیر ہے اس کا لوہا آپ کی آرام طلبی اور کم ہمتی کے کیمیائی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اپنی نندوں کو ہوم ورک کرا لینے' ہانڈی میں ڈوئی پھیر لینے اور کسی وقت چند روٹیاں اتار لینے کو آپ نے اپنا مصرف سمجھ لیا ہے حالانکہ آپ کا مصرف یہ نہیں ہے اور اپنے مصرف اور مقصد کو نہ پہچاننے کی سزا یہ ہے کہ حالات نے آپ کی آنکھوں میں ایک خوف زدہ ہرنی کی چتائیاں فٹ کردی ہیں اور آپ مظلوم ہونے کے باوجود مجرم کی طرح جدی

پھرتی ہیں۔"

"مسٹر تیمور۔۔۔!"

فرحین کا سراپا کانپ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ فرطِ غضب سے مجھ پر برس پڑیں گی لیکن پھر انہوں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور چند گہرے سانس لے کر بولیں "تیمور صاحب! شاید آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ چار دیواری کے اندر رہ کر گھر سنبھالنا اور دیگر گھریلو ذمے داریاں پوری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"بالکل معنی رکھتا ہے لیکن ہر فرد کو اپنی خداداد قابلیت کے مطابق کام کرنا چاہیے اور وہ آپ نہیں کر رہیں اور میرا خیال ہے کہ اب آپ کر بھی نہیں سکتیں۔ آپ نے اپنے چاروں طرف آسانیوں کی دیواریں کھڑی کرلی ہیں اور اس قفس کو ہی زندگی سمجھ لیا ہے' اب آپ اڑنے کی کوشش بھی کریں گی تو نہیں اڑ سکیں گی۔ زمین پر ہی پڑی پھڑپھڑاتی رہ جائیں گی۔"

میرا لہجہ تلخ سے تلخ ہو رہا تھا اور میں نے اس تلخی پر قابو پانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ آج جو کچھ بھی میرے دل میں ہے' سچے کھرے انداز میں فرحین کے کانوں تک پہنچ جائے۔

"آپ یہ باتیں اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ مرد ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ جب ایک عورت گھر کی چار دیواری سے نکلتی ہے تو اسے کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاشرہ اسے کس آزمائش سے دوچار کرتا ہے۔"

"اور یہ وہی عقل کا اندھا معاشرہ ہے نا' جس کی ناراضگی کے خوف سے بے شمار مشرقی عورتیں ساری زندگی زانی شرابی شوہر کے پاؤں کی جوتی بنی رہتی ہیں۔ اس کے مخدوش مستقبل والے بچے پیدا کرنا قبول کرلیتی ہیں مگر اس سے علیحدگی کے بارے میں سوچتی بھی نہیں۔ یا اس ظالم معاشرے کو ناقابلِ قبول کہیں یا اس سے خوف نہ کھائیں۔۔۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ چار دیواری سے باہر عورت کے لیے مسئلے ہیں مگر باہمت اور باحیا عورت کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اس قدر سطحی انداز میں سوچتے ہیں۔۔۔"

"آپ کے سوچنے کا جو غیر سطحی انداز ہے' اسے بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ فرحین صاحبہ' آپ اپنے زعم میں قربانیاں دیتی ہیں۔ جسے میں نے سہل پسندی کہا ہے اسے آپ ایثار قرار دیں گی اور کہیں گی کہ ایک گھر کو بنانے کے لیے آپ نے اپنی صلاحیتوں کو طاق پر رکھا ہے۔ اس طرح کا دوسرا ایثار آپ اپنے شوہر کے لیے کر رہی ہیں اور اس کے حق میں بیٹھی ہوئی ہیں بلکہ لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔ اسی طرح کی ایک سو ایک قربانیاں آپ نے تمغوں کی طرح سینے پر سجا رکھی ہیں۔۔۔ اور ان میں سے ایک قربانی وہ دم توڑتا تعلق بھی ہے جو میرے اور آپ کے درمیان موجود ہے۔"

"کون سا تعلق۔۔۔ کیسا تعلق؟"

"انجان مت بنیے آپ" میں نے بدستور تیز لہجے میں کہا "آپ پوری طرح آگاہ ہیں۔ اب پچھلے کچھ عرصے سے آپ نے اس معصوم تعلق کو بھی قربان گاہ پر لٹایا ہوا ہے اور کند چھری سے اسے ذبح کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بے چارے نے ذبح ہی ہونا ہے۔ اس کے ذبح ہونے کے بعد آپ اپنے سینے پر نیکی اور قربانی کا ایک اور تمغا سجالیں گی لیکن یہ تمغا بھی درحقیقت اسی منحوس زنجیر کے لوہے سے ڈھلا ہوگا جو آپ کی بے عملی اور سہل پسندی کے باعث آپ کے پاؤں میں پڑی ہے۔"

"آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں مسٹر تیمور!" فرحین غرائیں "میں جا رہی ہوں اور آئندہ آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہوں گی" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں نے بے خوفی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ نہیں جاسکتیں۔ آپ کو میری پوری بات سننا ہوگی۔۔۔ بیٹھ جایئے" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نظر آئی۔ ہاتھ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ شدید تذبذب میں انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور دھم سے بیٹھ گئیں۔

"اِٹ از ٹُو مچ مسٹر تیمور!" انہوں نے غضب ناک سرگوشی کی "میرا ہاتھ چھوڑیے ورنہ میں بلند آواز میں بولوں گی۔"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا "آپ کچھ نہیں کرسکتیں مسز فرحین! کیونکہ یہاں بھی آپ کی سہل پسندی اور کم ہمتی آڑے آئے گی۔ ویسے میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں لیکن آپ کو میری پوری بات سن کر جانا ہوگا" میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

انہوں نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا اور اوڑھنی کو مضبوطی سے سر پر جمالیا۔ میں نے کہا "مسز فرحین! آپ نے مجھے بہت سے مشورے دیے تھے۔ آج میں بھی آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں۔ اپنے آپ کو ٹٹولیے اور کچھ نہیں تو اپنے مذہب ہی کے حوالے سے دیکھیے' ہمارا دین ہمیں

عمل اور جدوجہد کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ اپنی جان کو سختی کرنے کے لیے ہم خود پر خود ساختہ پابندیاں لگائیں اور تارک الدنیا ہو کر بیٹھ جائیں۔ اپنی زندگی کو رکے ہوئے پانی کا جوہڑ بنالیں۔ پھر اسی جمود اور ٹھہراؤ کو اپنی قربانی اور ایثار سے تعبیر کرتے پھریں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں' آپ نے کوئی قربانی نہیں دی اور نہ دے رہی ہیں۔ آپ صرف۔۔۔ معاف کیجیے گا۔۔۔ اپنی کاہلی اور کم کوشی کو قربانیوں کا نام دے رہی ہیں۔ فطرت کے بہتے گنگناتے' شفاف پانی جیسے دھارے کو جوہڑ میں بدل کر زندگی کی ناقدری کررہی ہیں اور کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی ہیں۔"

میرا لہجہ بے رحم ہوتا چلا جارہا تھا۔ الفاظ کے نشتر تیز تر ہوگئے تھے۔ فرحین بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ آخر وہ چیخ پڑیں "مسٹر تیمور! آپ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ کوئی نفسیات دان ہیں آپ؟ یا بہت بڑے عالم دین ہیں یا کسی شعبے میں کوئی بہت سنہری کارنامہ انجام دیا ہے آپ نے؟ کیا ہیں آپ؟ کیا کرائے ٹیرپا ہے آپ کا؟ اور آپ مجھے سبق پڑھا رہے ہیں' مجھے اسکول کی بچی سمجھ رکھا ہے آپ نے؟ جسے آپ کے بزرگانہ لیکچر کی ضرورت ہے۔؟ کس ہوا میں ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوا میں ہوں۔"

"آپ کا۔۔۔ دماغ چل گیا ہے" وہ ایک بار پھر جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے اس مرتبہ انہیں نہیں روکا۔

اطمینان بھرے لہجے میں' میں نے کہا "اگر میرا دماغ چل گیا ہے تو آج جو باتیں میں نے کی ہیں' ان میں سے کسی ایک بات کو ہی غلط ثابت کرکے دکھا دیجیے گا اور اگر نہ دکھا سکیں تو پھر اکیلے میں بیٹھ کر ندامت کا تھوڑا سا پسینہ ضرور بہا لیجیے گا۔"

وہ سر تاپا کانپ رہی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا۔ انہوں نے جھٹکے سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔

○☆○

کئی ہفتے گزر گئے۔ مجھے فرحین کی خیر لی اور نہ ان تک میری خبر پہنچی۔ روز و شب میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ وہی گلی بند گی ہزار کن مصروفیات تھیں۔ صبح آفس پہنچنا' پانچ بجے چھٹی کرنا' اکثر بغیر کسی دوست کے شاہراہ قائداعظم پر گھومتے رہنا یا کسی باغیچے میں بیٹھ جانا اور نومبر کی یخ بستہ تاریکی کو دم بدم سبزے پر اترتے دیکھنا "کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں۔" والا معاملہ تھا۔ رات نو دس بجے کے لگ بھگ میں گھر پہنچتا تھا۔ ہرگز امید نہیں تھی کہ فرحین کا فون آئے گا پھر بھی میں متوقع نظروں سے ملازم دین محمد اور آیا کی صورت تکتا' یہ تمنا رکھتا کہ شاید ان کے ہونٹ اس انداز میں جنبش کریں کہ میرے کانوں کی قسمت جاگ جائے۔ کھانے کے بعد میں خالی خالی کمروں میں اداس پھرتا۔ وہ کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتا جس کا رخ فرحین کے گھر کی طرف تھا۔ ہوا کی سرگوشیاں سنتا' اگر کبھی فون کی گھنٹی بجتی تو سر سے پاؤں تک ہل جاتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فرحین کا فون نہیں ہوگا۔ اسی امید پر فون اٹھاتا کہ یہ فرحین کا فون ہوگا۔ کسی وقت کمرا بند کرکے بیٹھ جاتا اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ میں ان کم نصیب لوگوں میں سے ہوں جو عشق میں چوٹ کھاتے ہیں اور پھر ساری زندگی کراہتے رہتے ہیں۔ ذہن میں سوال اٹھتا۔ مجھ سے ایسا کیوں ہوا؟ کیا میرے گرد لڑکیوں اور رشتوں کی کمی تھی؟ میری نظر انتخاب فرحین پر کیوں پڑی؟ ایسا راستہ کیوں چنا میں نے جس پر خار ہی خار تھے اور منزل کا دور تک سراغ نہ تھا۔ زندگی میں ایسی کیا غلطی ہوئی تھی مجھ سے جس کی ایسی جان لیوا سزا مل رہی ہے مجھے۔ ان سوالوں کا ایک ہی جواب تھا بقول غالب۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے پھر ایک روز مجھے ایک عجیب خبر ملی۔ اخلاق اور نرگس میرے گھر آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فرحین نے لاہور کی سب سے بہترین کمپیوٹر یونیورسٹی بطور ٹیچر جوائن کرلی ہے۔ اب وہ ہر روز باقاعدگی سے اپنی گاڑی پر آفس جاتی ہیں۔

یہ حیران کن اطلاع تھی۔ اخلاق اور نرگس بھی حیران نظر آرہے تھے۔ میں بھی حیران تھا لیکن میری حیرانی کے پیچھے خوشی کی ایک بلند و بالا لہر بھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اس ناقابل شکست خول کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہوں جو فرحین نے برسوں سے اپنی ذات پر چڑھا رکھا تھا۔ اس خول کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا ہی تھا جو فرحین اپنی صلاحیتوں کو آزمانے نکلی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ پودوں کو پانی دینے' ہانڈی میں ڈوئی چلانے اور نیڈوں کو ہوم ورک کرانے سے آگے کچھ سوچ ہی نہ پاتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اس روز اپنے دل پر پتھر رکھ کر میں نے فرحین کے ساتھ جس لب و لہجے میں بات کی تھی اور تند و تیز رویہ اپنایا تھا' وہ رائیگاں نہیں گیا تھا۔ میرے تابڑ توڑ پھینکے ہوئے کنکروں نے فرحین کی ذات کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہلچل پیدا کردی تھی اور یہی میں چاہتا تھا۔۔۔ یہی میری خواہش تھی۔



میرے دل کے کوہند سے ایک آواز گونج بن کر ابھری۔ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ کچھ۔۔۔ ایسا ہونے والا ہے جو گرد و پیش کے ہر منظر کو بدل ڈالے گا۔ مگر یہ کیا ہوگا؟ کب اور کیسے ہوگا؟ اس کا کچھ علم نہیں تھا۔۔۔ پھر پانچ چھ ہفتے بعد مجھے اخلاق ہی کی زبانی پتا چلا کہ بطور ٹیچر فرحین کی ترقی ہوگئی ہے۔۔۔ اور انہیں ادارے کی طرف سے رہائش کی سہولت بھی ملی ہے۔ فرحین کے والدین گجرات میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے پاس مقیم تھے۔ فرحین نے اپنے بھائی اور والدین کو لاہور بلالیا تھا۔ ادارے کی طرف سے جو رہائش گاہ فرحین کو ملی تھی' وہ لوگ اس میں رہنے لگے تھے۔ تاہم فرحین اپنے سسرال میں ہی قیام پذیر تھیں۔

○☆○

تین چار ماہ مزید گزر گئے۔ میں فرحین کی طرف سے کسی رابطے کا منتظر رہا۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اب رابطہ نہیں کریں گی۔ انا کی غیر مرئی لیکن بڑی مضبوط دیوار ہمارے درمیان حائل ہوچکی تھی۔ اس دیوار کو توڑنا ہم دونوں کے لیے مشکل تھا اور میرے خیال میں فرحین کے لیے زیادہ مشکل تھا لیکن محبت تو کسی مشکل کو نہیں مانتی اور دل کے اپنے ہی موسم ہوتے ہیں۔ ان موسموں میں انتظار کا موسم سب سے پائدار اور طویل ہوتا ہے۔ میرے دل میں بھی یہ موسم اپنے جوبن پر تھا۔ ہر صبح امید بندھتی اور ہر شام آس ٹوٹ جاتی تھی۔ بے چین راتوں میں میں پہروں فون سیٹ کو گھورتا رہتا یا بالکنی میں ٹہلتا رہتا۔۔۔ ایک بار پھر موسم گرما شروع ہوچکا تھا۔ میں اپنے دل کی بے کلی کو لے کر انہی محبوب وادیوں میں چلا گیا جنہوں نے ہمیشہ مجھے گلے لگایا تھا۔ میرے پیارے شمالی علاقہ جات۔۔۔ جن کے کوہ و دمن میں میری تنہائی ہواؤں میں تحلیل ہوجاتی تھی۔ وہ خوبصورت نظارے میرے ہمراز تھے۔ ہم خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے' ایک دوسرے کے دکھ بانٹتے تھے۔۔۔ اور اس مرتبہ تو ان نظاروں میں میرے لیے غیر معمولی کشش موجود تھی۔ یہی حسین نشیب و فراز تھے جہاں میرے دل کے اندر سچی محبت کی کلی کھلی تھی اور پھر خوشبوؤں اور رنگوں کا ایک جہاں آباد ہوا تھا۔ یہیں پر ناران سے جھیل سیف الملوک کی طرف جاتے ہوئے ایک خطرناک موڑ پر فرحین کی آنکھوں سے میری آنکھیں ملی تھیں اور ان لمحوں میں ہم دونوں ابن آدم اور بنت حوا کے سوا اور کچھ نہیں رہے تھے اور کائنات ہمارے لیے پھر سے تخلیق ہوئی تھی۔

میں ناران کی وادی میں گھومتا رہا اور ہر ہر قدم پر اپنی یادوں کو تازہ کرتا رہا۔ اس وقت کو آواز دیتا رہا جو ایک سال پہلے اس گلیشیر پر شوخ قہقہے بکھیرتا ہوا اور تیزی سے پھسلتا ہوا دیودار کے جنگل میں گم ہوگیا تھا۔ ایک روز ناران میں دریائے کنہار کے کنارے گھومتے گھومتے اچانک میری نگاہ ساکت ہوکر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے برسوں پہلے بالاکوٹ کی ایک مسجد کے وضو خانے میں رہ جانے والا نیٹس بال مجھے دوبارہ نظر آگیا ہو یا وہ خوش رنگ چپل دوبارہ مل گئی ہو جو ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ کر دریائے کنہار میں چلی گئی تھی۔۔۔ میں نے خود سے چند میٹر کے فاصلے پر تین چار لڑکیوں کو دیکھا تھا اور ان میں سے ایک فوزیہ تھی۔ وہی فوزیہ جو ایک سال پہلے ہمارے گروپ میں شامل تھی اور ان وادیوں میں ہماری ہم سفر تھی۔ اس سفر کے حوالے سے میری کچھ تلخ یادوں کا تعلق فوزیہ سے تھا۔ شوگران کی وہ خوبصورت مگر تکلیف دہ رات مجھے بھولی نہیں تھی جب فوزیہ سے ٹھنڈا گروپ کے لڑکوں نے دست درازی کی تھی اور اس دست درازی کا الزام کھٹاک سے مجھ پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ ایک "یادگار" بے عزتی تھی جو میں نے فرحین اور اخلاق کی وجہ سے نہ جانے کیسے برداشت کرلی تھی۔ تاہم اس زخم کے نشان ابھی تک دل پر موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فوزیہ کو دیکھنے کے باوجود میں نے انجان ہی نظر آنے کی کوشش کی۔ وہ لڑکیوں کے گروپ سے علیحدہ ہوکر تیزی سے میری طرف چلی آئی "السلام علیکم بھائی جان!" اس نے غیر متوقع طور پر بڑی اپنائیت سے کہا۔

"وعلیکم السلام' تم یہاں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی "میں یہاں اپنی یونیورسٹی کے گروپ کے ساتھ آئی ہوں۔ تیس چالیس لڑکیاں ہیں۔ آپ نے شاید ہماری بس پوسٹ آفس کے قریب کھڑی دیکھی ہو۔ ہم پچھلے دو روز سے یہاں ہیں' ابھی چار ایک دن مزید رہیں گے' پھر واپس لاہور روانہ ہوجائیں گے۔۔۔ ویسے آپ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اچھی خبر اور میرے لیے؟" میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیوں' آپ کے لیے کوئی اچھی خبر کیوں نہیں ہوسکتی؟"

"اچھا' کیا خبر ہے؟"

"ایسے نہیں بتاؤں گی بھائی جان۔۔۔ ویسے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا۔۔۔ وہ چہک کر بولی "ہم بھی تو

آپ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ چڑھائی کے بعد پہلے موڑ پر، وہ نیا دو منزلہ ہوٹل۔"

"بہت اچھی بات ہے لیکن۔۔۔"

"آپ اکیلے ہی ٹھہرے ہوئے ہیں؟" اس نے بات کاٹی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "ٹھیک ہے بھائی جان! میں آج شام آؤں گی آپ کی طرف۔ کمرا نمبر کیا ہے آپ کا؟" میں نے کمرا نمبر بتایا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی پھر ساتھی لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس وقت یہ چہلیں ساتھ ہیں۔ میں شام کو چھ سوا چھ بجے آؤں گی آپ کی طرف۔۔۔ آپ ہوٹل میں ہی ہوں گے نا؟"

میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔ وہ کافی بدلی بدلی نظر آتی تھی، پہلے سے کچھ اسمارٹ بھی ہو گئی تھی۔

شام ٹھیک چھ بجے فوزیہ میرے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہم نے کمرے کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈال لیں۔ سامنے سبزہ زار تھا اور اس سے آگے دور ایک گلیشیر ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ناران کے جنریٹر آن ہو چکے تھے اور جگہ جگہ برقی قمقمے روشنی بکھیرنے لگے تھے۔ بڑا دلفریب منظر تھا۔ فوزیہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اب قدرے سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور چہرے پر شرمندگی سی جھلک رہی تھی۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"بھائی جان! سب سے پہلے تو میں اس واقعے پر آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں جو ایک سال پہلے شوگران میں پیش آیا تھا۔ یقین کریں جو کچھ میرے منہ سے نکلا اس میں میری کس بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ میں اتنی حواس باختہ اور خوف زدہ تھی کہ جو کچھ ذہن میں آیا میں نے بول دیا۔ بعد میں میں اپنی حماقت پر کتنا پچھتائی ہوں اور روئی ہوں میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔ آپ نے۔۔۔"

"پلیز فوزی! اب گزری باتوں کو رہنے دو۔ میں وہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ کوئی شکایت نہیں ہے میرے دل میں۔ پلیز، تم بھی بھول جاؤ۔"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے میں نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کیا۔ فوزیہ بھی نارمل نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پھر ہلکی سی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔ وہ بولی۔ "بھائی جان! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ فرحین باجی سے جتنی بے تکلف میں ہوں اور کوئی نہیں۔"

ایک سنسناہٹ سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ لیکن میں نے اپنے تاثرات نارمل رکھے "فرحین صاحبہ کا ذکر یہاں کیسے آگیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے آگیا کہ اسے آنا چاہیے" فوزیہ نے آنکھیں نچائیں۔ اس کا لب و لہجہ چونکا دینے والا تھا۔

"تم پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"ہے تو واقعی پہیلی!" وہ شوخ لہجے میں بولی "جو کام برسوں میں نہ ہو سکا تھا، وہ چند ہفتوں میں ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں، جادو کا سر چڑھ کر بولنا۔"

"تمہارا اشارہ کس کام کی طرف ہے؟"

"فرحین باجی کی کایا پلٹ کی طرف۔ وہ اب باقاعدہ ایک ورکنگ وومن ہیں، بلکہ ورکنگ گرل کہنا چاہیے۔ لاہور میں کمپیوٹر میں بی ایس سی کرانے والے سب سے اچھے اور سب سے مہنگے ادارے میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے کام کو انجوائے کر رہی ہیں اور تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ حال میں ان کی "آؤٹ آف ٹرن" ترقی ہوئی ہے۔"

"بھئی یہ تو اچھی بات ہے۔"

فوزیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر شوخی مچلی "اس اچھی بات کی، اچھی سی وجہ بھی میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"بتاؤں؟"

"ہاں بتاؤ۔"

"آپ ماریں گے تو نہیں؟"

"نہیں مارتا۔"

"یقین نہیں آتا۔"

"تم پریشان کر رہی ہو اب۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "اس کی وجہ۔۔۔ صرف آپ ہیں بھائی جان۔۔۔ اور یہ بات میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کے انکار سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ آپ ہی ہیں جن کے اکسانے پر فرحین باجی میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک طرح سے فرحین باجی نے آپ کے کہے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہی یہ سب کچھ شروع کیا تھا۔ آپ میں اور ان کے درمیان چند ماہ پہلے شیزان ریسٹورنٹ میں جو باتیں ہوئی تھیں، انہوں نے باجی کو غم و غصے سے بھر دیا تھا۔ وہ دن رات پریشان و بے قرار رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے تایا جان سے مشورہ کیا تھا اور چند دن بعد سروس جوائن کر لی تھی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری عام سی باتوں کا وہ ایسا منہ توڑ جواب دیں گی۔"

"اب آپ نے خود ہی درست لفظ استعمال کر دیا ہے بھائی جان۔۔۔ سچ بات یہی ہے کہ وہ آپ کو منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں اور انہوں نے دیا ہے۔۔۔ لیکن اب۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"اب کیا؟"

وہ تذبذب میں مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "بندے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس کام کا کیا نتیجہ برآمد ہو جائے گا اور کون سا راستہ آگے جا کر کون سی منزل کی طرف جا نکلے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ۔۔۔ باجی فرحین کے ساتھ بھی۔۔۔ کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں پھر شوخی چمک گئی، بولی "کورس کی ایک انگریزی نظم میں میں نے پڑھا تھا کہ پنجرے میں جوان ہونے والا پرندہ پنجرے کو ہی سارا جہان سمجھتا ہے، کسی اتفاق کے تحت جب وہ پنجرے سے نکلتا ہے تو اپنے سامنے زمین و آسمان کی وسعت دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور اس کا دل اڑنے کو مچل جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر یہ پر کیوں ہیں۔۔۔ شاید باجی فرحین بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزری ہیں۔۔۔ تیمور بھائی جان! میں ان کے بہت قریب ہوں۔ باجی وہ باتیں بھی مجھ سے کہہ لیتی ہیں جو کسی اور سے نہیں کہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ پچھلے چند ماہ میں باجی کی سوچ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ وہ اب اس انداز میں سوچنے لگی ہیں جس انداز میں انہیں سوچنا چاہیے تھا۔"

"کس انداز میں؟"

وہ سنجیدگی سے بولی "شاید آپ کو معلوم نہیں۔ تین ماہ سے باجی اب علیحدہ گھر میں رہ رہی ہیں۔ یہ رہائش ان کو اپنے ادارے کی طرف سے ملی ہے۔۔۔ باجی کی امی ابو اور چھوٹا بھائی پہلے اس گھر میں رہ رہے تھے اب باجی بھی وہاں شفٹ ہو گئی ہیں اور ایک دوسری اہم اطلاع یہ ہے کہ باجی نے اپنے شوہر نامدار کا دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا ہے۔۔۔ انہوں نے DIVORCE لے لی ہے اور بھائی جان! سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری فیملی میں جو بھی باجی کے ساتھ مخلص تھا، وہ اس فیصلے سے خوش ہی ہوا ہے۔"

میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ دل سینے میں بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ فوزی کہہ رہی تھی "فیملی میں سب جانتے تھے کہ باجی ایک لاحاصل انتظار کی تکلیف برداشت کر رہی ہیں۔ تایا کا فرمان بیتا نافرمان ہی رہے گا۔ وہ اب کبھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا اور اگر کرے گا بھی تو


فیرو پائرین (رجسٹرڈ)

قائم شدہ 1956

T.M. Reg. 7635

فیرو پائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کر دیتی ہے۔

فیرو پائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈ اور گرمی پانی لگنا بند کر دیتی ہے۔

فیرو پائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔

فیرو پائرین مسوڑوں سے گندہ و بدبودار پانی خارج کر کے درد اور سوزش اتار تا ہے۔

فیرو پائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کر کے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔

فیرو پائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا لگانے کا سبب بنتے ہیں۔

فیرو پائرین منہ میں گندگی کو اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔

فیرو پائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب چھوٹی بڑی بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔

فیرو پائرین جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جا سکتی ہے۔

Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

تیار کردہ: فیر لیبارٹریز O/1084، نازی روڈ، راولپنڈی۔ فون (051-451631)

...ں کو مزید زخمی کر کے چلا جائے گا۔ وہ سب جانتے ہیں کہ ...اب ایک نسبتاً کامیاب اور پر مسرت زندگی گزار رہی ...اور۔"

"اور کیا؟"

"اور ان سب سے زیادہ میں یہ بات جانتی ہوں" فوزیہ ...آنکھیں پھر شوخ ہو گئیں۔ میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا ...

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

چند لمحے قیامت خیز خاموشی میں گزرے پھر فوزیہ نے ...گہری سنجیدہ سانس لی "تیمور بھائی!" وہ عجیب لہجے میں ...باجی' آپ کو بہت مس کرتی ہیں۔ شاید آپ سوچ بھی ...سکتے کہ وہ کتنا مس کرتی ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ فوزیہ بھی چپ رہی۔ مگر سناٹا ...مت کا شور برپا کر رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے ...

"میں سب جانتی ہوں تیمور بھائی۔۔!"

"مثلاً کیا؟"

"باقی باتیں باجی ہی سے پوچھ لیجیے گا۔ وہ ہمارے ساتھ ...یہاں موجود ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی "یہ ایک خوبصورت اتفاق ہے۔ جو تین ٹیچرز ...رے ساتھ آئی ہیں' ان میں ہماری نئی اور ہر دلعزیز "ٹیچر" ...ں فرحین شامل ہیں اور یہی وہ خوش خبری تھی جناب عالی جو ...آپ کو سنانا چاہ رہی تھی۔"

میں اپنی جگہ سُن بیٹھا رہ گیا۔

○☆○

وہ بڑی خوبصورت شام تھی۔ ہوٹل کی بالکونی میں سے ...ر وہ فلک بوس پہاڑ نظر آ رہے تھے جن کے اندر دنیا کا ...بصورت ترین پانی جھیل سیف الملوک کی شکل میں موجود ...۔ سرخ کناروں والے بادلوں کے ٹکڑے اس پانی پر جھکے ...' جیسے وہ بھی حیرت سے اس منظر کو تک رہے ہوں۔ ...ں طرف دریائے کنہار کا اچھلتا کودتا پانی چمک رہا تھا۔ ...ں کی لہریں چنچل بچوں جیسی تھیں۔ جیسی خوبصورت ماں ...جیل) ویسے خوبرو بچے۔

میں اس حسین گردوپیش میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ ...یہ نے کل جو گفتگو کی تھی' اس کے کچھ حصے بار بار میرے ...وں میں گونج رہے تھے۔ فوزیہ نے کہا تھا۔ بندے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس کام کا کون سا نتیجہ برآمد ہو جائے گا اور کون سا راستہ آگے جا کر کون سی منزل کی طرف جا نکلے گا۔ وہ یہ بات فرحین کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ فرحین کے حوالے سے میرا اندازہ بالکل درست نکلا ہے۔

چند ماہ پہلے میں نے شیزان ریسٹورنٹ میں فرحین سے نہایت تلخ ترش باتیں کی تھیں۔ اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ اگر فرحین نے میری اس تلخ ترشی کے نتیجے میں عملی زندگی میں قدم رکھ لیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق اپنا مصرف تلاش کر لیا تو پھر بات یہیں تک نہیں رہے گی۔ سوچ کا ایک وسیع و عریض آسمان فرحین کے سامنے کھلے گا اور انہیں احساس ہو گا کہ وہ زندگی جیسی عظیم نعمت کو کتنی بے رحمی سے ضائع کر رہی ہیں اور ایسا ہی ہوا تھا۔ فوزی کی گفتگو سے آشکار ہو گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔

ناران کے مسکین صورت بچے میرے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ یہ لوگ حسن فطرت کے ایک عظیم خزانے کے مالک تھے' مگر روٹی کے ٹکڑوں کے لیے ترستے تھے۔ ایک عام سیاح کے لیے یہ لوگ حسین و جمیل پھولوں کے درمیان اگے ہوئے کانٹے تھے۔ سیاح ان کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر پھول توڑتا تھا' خوشبو لیتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ میں نے ان بچوں میں کچھ ڈبل روٹی اور بسکٹ وغیرہ تقسیم کیے پھر میں نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور انہیں تعلیم اور محنت کی عظمت کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ ایک معصوم محویت کے ساتھ سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے تو میں نے چائے منگوائی اور سڑک کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ دل کی دھڑکن باربار زیر و زبر ہو جاتی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے سامنے دیکھا تو آنکھوں کے نصیب جاگ اٹھے۔ فرحین اور فوزیہ میری طرف چلی آ رہی تھیں۔ فوزیہ نے کھلتے رنگوں والے کپڑے پہن رکھے تھے' اوپر ایک شوخ سا سویٹر تھا۔ جبکہ فرحین ہمیشہ کی طرح چادر پوش نظر آ رہی تھیں۔ کریم رنگ کی لیس دار چادر نے کندھوں سے نیچے نیچے انہیں لپیٹ رکھا تھا۔ سر پر سبز دوپٹا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر دونوں کا استقبال کیا۔ ہم میز کے گرد بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد رسمی کلمات ادا کیے گئے پھر کافی آگئی۔ سبز دوپٹے کے گھیرے میں فرحین کا اجلا چہرہ ایسے ہی تھا جیسے سبز پتوں کے درمیان سرخ و سپید پھول۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں نزاکت کا ایسا تاثر لیے ہوئے تھیں جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے اس بدبخت شخص کا خیال آیا جس نے فرحین کو پایا تھا اور



کھو دیا تھا۔ یقیناً وہ شخص بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم تھا۔

اچانک فوزیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی "او مائی گاڈ!" اس کے ہونٹوں سے نکلا "کمرے کی چابیاں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دروازہ کھلا ہی چھوڑ آئی ہوں۔"

"پھر؟" فرحین نے کہا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ فرحین کچھ کہتی' فوزیہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

یقیناً اس نے ہمیں تنہائی فراہم کی تھی۔ کچھ دیر میں اور فرحین آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ خاموشی نقارے کی طرح ہمارے درمیان گونج رہی تھی اور ایسا ہی ایک نقارہ میرے دل میں بھی بج رہا تھا۔ وہ چند دن پہلے جو الہام سا ہوا تھا کہ زندگی میں کچھ "خوبصورت" ہونے والا ہے۔ درست ثابت ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کی یہ خاموشی بڑی ہی معنی خیز اور حوصلہ افزا تھی۔

میں نے کہا "فرحین!۔۔ مجھے۔۔ لگتا ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

ان کی حیا آلود نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ وہ بولی "تیمور صاحب! چند ماہ پہلے ہم ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ اس وقت مجھے آپ کی باتیں بے حد ناگوار گزری تھیں۔ لیکن اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ باتیں بہت تلخ ہونے کے باوجود بہت سچی تھیں۔ اس وقت میں اندھیرے میں تھی' آج مجھے لگتا ہے کہ میں اجالے میں ہوں۔ میں نے خود کو پا لیا ہے۔"

"تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دی تھی۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے مجھے بہت بڑا سنبھالا دیا ہے۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"نہیں تیمور صاحب! ایسا ہی ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالا دیا ہے۔ میں بھی تو اندھیروں میں تھا' آپ نے مجھے روشنی کی راہ دکھائی ہے۔ آپ سے ملنے سے پہلے کون سی برائی مجھ میں نہیں تھی۔ آپ کی نصیحت نے بڑی خاموشی اور محبت سے میرے اندر تبدیلی کو راہ دی۔"

وہ مسکرائیں "تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دلائی تھی۔" انہوں نے میرا ہی جملہ دہرا کر مجھے خاموش کرا دیا پھر کہنے لگیں "میں سمجھتی تھی کہ میں آپ کی اصلاح کر رہی ہوں۔۔ مگر۔۔ آپ نے تو الٹا میری اصلاح کر دی۔"

"میں پھر وہی کہوں گا۔ اگر اصلاح کی بات ہے تو پھر شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کی تھوڑی تھوڑی اصلاح کی ہے۔"

ان کے ہاتھ میز پر دھرے تھے۔ نازک و سپید' معصوم کبوتروں جیسے ہاتھ۔۔ ایسے ہاتھ جنہیں بے ساختہ چھونے اور پیار کرنے کو دل چاہتا تھا۔ کلائیوں میں رنگین چوڑیاں آڑی ترچھی تھیں۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی شیزان ریسٹورنٹ میں نظر آیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں خواہش مچلی تھی کہ میں ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لوں اور ان کی لطافت کو اپنی ہتھیلیوں میں ہمیشہ کے لیے قید کر لوں۔۔ آج بھی مجھے ایسی ہی خواہش کا سامنا تھا۔ لیکن آج میں نے اپنی خواہش کو دبایا نہیں۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور فرحین کے نرم ہاتھ پر رکھ دیا۔ یوں لگا جیسے میں نے زندگی کو چھو لیا ہے اور میرے زندہ ہونے کے ساتھ ہی پوری کائنات زندہ ہو کر گردش میں آ گئی ہے۔ فرحین کے ہاتھ میں کپکپی سی نمودار ہوئی۔ انہوں نے میرے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کمزور سی کوشش کی۔ میں نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا "پلیز فرحین! اسے میرے ہاتھ میں رہنے دو۔"


بذریعہ ڈاک خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| انگلش لینگویج کورس | سیکرٹریل فلپینٹ اسٹیوارڈ | بیوٹی پارلر کورس | |
| بوٹینک فیشن | سوئنگ | ڈرافٹسمین | ایئر ہوسٹنگ |
| ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ | ریڈیو ٹی وی آپریٹنگ | الیکٹریشن | ڈریس میکنگ |
| ٹیچنگ | اسکول ٹیچنگ میتھڈ | انٹیریئر ڈیکوریشن | فوٹوگرافی |
| صحافت | ایکسپورٹ امپورٹ | تواناتی | شیمی |
| سلیمنگ | بیوٹی | کمپیوٹر | حکمت کورس |
| کوکنگ سیکنگ | موٹر سائیکل مرمت | آئل پینٹنگ | میڈیکل ایڈ |
| ڈینٹل ٹیکنیشن | لیڈیز ٹیلرنگ | الیکٹریشن کمپیوٹرائزڈ | پبلک ریلیشن آفیسر |
| نیوز رپورٹر | مہر سازی | شارٹ ہینڈ | |

اسلام آباد اکیڈمی

پوسٹ بکس 1237 جی پی او، اسلام آباد

باجی کو مزید زخمی کر کے چلا جائے گا۔ وہ سب جانتے ہیں کہ باجی اب ایک نسبتاً کامیاب اور پر مسرت زندگی گزاریں گی۔ اور۔"

"اور کیا؟"

"اور ان سب سے زیادہ میں یہ بات جانتی ہوں" فوزیہ کی آنکھیں پھر شوخ ہو گئیں۔ میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

چند لمحے قیامت خیز خاموشی میں گزرے پھر فوزیہ نے ایک گہری سنجیدہ سانس لی "تیمور بھائی!" وہ عجیب لہجے میں بولی "باجی" آپ کو بہت مس کرتی ہیں۔ شاید آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنا مس کرتی ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ فوزیہ بھی چپ رہی۔ مگر سناٹا قیامت کا شور برپا کر رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے کہا۔

"میں سب جانتی ہوں تیمور بھائی۔!"

"مثلاً کیا؟"

"باقی باتیں باجی ہی سے پوچھ لیجیے گا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں موجود ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی "یہ ایک خوبصورت اتفاق ہے۔ جو تین ٹیچرز ہمارے ساتھ آئی ہیں' ان میں ہماری نئی اور ہر دلعزیز "ٹیچر" مس فرحین شامل ہیں اور یہی وہ خوش خبری تھی جناب عالی جو میں آپ کو سنانا چاہ رہی تھی۔"

میں اپنی جگہ سن بیٹھا رہ گیا۔

○☆○

وہ بڑی خوبصورت شام تھی۔ ہوٹل کی بالکونی میں سے دور وہ فلک بوس پہاڑ نظر آ رہے تھے جن کے اندر دنیا کا خوبصورت ترین پانی جھیل سیف الملوک کی شکل میں موجود تھا۔ سرخ کناروں والے بادلوں کے ٹکڑے اس پانی پر جھکے تھے' جیسے وہ بھی حیرت سے اس منظر کو تک رہے ہوں۔ دائیں طرف دریائے کنہار کا اچھلتا کودتا پانی چمک رہا تھا۔ اس کی لہریں چنچل بچوں جیسی تھیں۔ جیسی خوبصورت ماں (جھیل) ویسے خوبرو بچے۔

میں اس حسین گردوپیش میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ فوزیہ نے کل جو گفتگو کی تھی' اس کے کچھ حصے بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ فوزیہ نے کہا تھا۔ بندے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس کام کا کون سا نتیجہ برآمد ہو جائے گا اور کون سا راستہ آگے جا کر کون سی منزل کی طرف جا نکلے گا۔ وہ یہ بات فرحین کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ فرحین کے حوالے سے میرا اندازہ بالکل درست نکلا ہے۔

چند ماہ پہلے میں نے شیزان ریسٹورنٹ میں فرحین سے نہایت شگفتہ ترش باتیں کی تھیں۔ اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ اگر فرحین نے میری اس تلخی ترشی کے نتیجے میں عملی زندگی میں قدم رکھ لیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق اپنا مصرف تلاش کر لیا تو پھر بات یہیں تک نہیں رہے گی۔ سوچ کا ایک دبیز و عریض آسمان فرحین کے سامنے کھلے گا اور انہیں احساس ہو گا کہ وہ زندگی جیسی عظیم نعمت کو کتنی بے رحمی سے ضائع کر رہی ہیں اور ایسا ہی ہوا تھا۔ فوزی کی گفتگو سے آشکار ہو گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔

ناران کے مسکین صورت بچے میرے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ یہ لوگ حسن فطرت کے ایک عظیم خزانے کے مالک تھے' مگر روٹی کے ٹکڑوں کے لیے ترستے تھے۔ ایک عام سیاح کے لیے یہ لوگ حسین و جمیل پھولوں کے درمیان اگے ہوئے کانٹے تھے۔ سیاح ان کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر پھول توڑتا تھا' خوشبو لیتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ میں نے ان بچوں میں کچھ ڈبل روٹی اور بسکٹ وغیرہ تقسیم کیے پھر میں نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور انہیں تعلیم اور محنت کی عظمت کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ ایک معصوم محویت کے ساتھ سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے تو میں نے چائے منگوائی اور سڑک کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ دل کی دھڑکن بار بار زیر و زبر ہو جاتی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے سامنے دیکھا تو آنکھوں کے نصیب جاگ اٹھے۔ فرحین اور فوزیہ میری طرف چلی آ رہی تھیں۔ فوزیہ نے کھلتے رنگوں والے کپڑے پہن رکھے تھے' اور ایک شوخ سا سویٹر تھا۔ جبکہ فرحین ہمیشہ کی طرح چادر پوش نظر آ رہی تھیں۔ کریم رنگ کی لیس دار چادر نے کندھوں سے نیچے نیچے انہیں لپیٹ رکھا تھا۔ سر پر سبز دوپٹا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر دونوں کا استقبال کیا۔ ہم میز کے گرد بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد رسمی کلمات ادا کیے گئے پھر کافی آئی۔ سبز دوپٹے کے گھیرے میں فرحین کا اجلا چہرہ ایسے ہی تھا جیسے سبز پتیوں کے درمیان سرخ و سپید پھول۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں نزاکت کا ایسا تاثر لیے ہوئے تھیں جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے اس بدبخت شخص کا خیال آیا جس نے فرحین کو پایا تھا اور



کھو دیا تھا۔ یقیناً وہ شخص بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم تھا۔

اچانک فوزیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی "او مائی گاڈ!" اس کے ہونٹوں سے نکلا "کرے کی چابیاں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دروازہ کھلا ہی چھوڑ آئی ہوں۔"

"پھر؟" فرحین نے کہا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ فرحین کچھ کہتی' فوزیہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

یقیناً اس نے ہمیں تنہائی فراہم کی تھی۔ کچھ دیر میں اور فرحین آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ خاموشی فقارے کی طرح ہمارے درمیان گونج رہی تھی اور ایسا ہی ایک فقارہ میرے دل میں بھی بج رہا تھا۔ وہ چند دن پہلے جو الہام سا ہوا تھا کہ زندگی میں کچھ "خوبصورت" ہونے والا ہے۔ درست ثابت ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کی یہ خاموشی بڑی ہی معنی خیز اور حوصلہ افزا تھی۔

میں نے کہا "فرحین!۔۔۔ مجھے۔۔۔ لگتا ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

ان کی حیا آلود نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ وہ بولی "تیمور صاحب! چند ماہ پہلے ہم ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ اس وقت مجھے آپ کی باتیں بے حد ناگوار گزری تھیں۔ لیکن اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ باتیں بہت تلخ ہونے کے باوجود بہت سچی تھیں۔ اس وقت میں اندھیرے میں تھی' آج مجھے لگتا ہے کہ میں اجالے میں ہوں۔ میں نے خود کو پالیا ہے۔"

"تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دی تھی۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے مجھے بہت بڑا سنبھالا دیا ہے۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"نہیں تیمور صاحب! ایسا ہی ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالا دیا ہے۔ میں بھی تو اندھیروں میں تھا' آپ نے مجھے روشنی کی راہ دکھائی ہے۔ آپ سے ملنے سے پہلے کون سی برائی مجھ میں نہیں تھی۔ آپ کی شخصیت نے بڑی خاموشی اور محبت سے میرے اندر تبدیلیوں کو راہ دی۔"

وہ مسکرائیں "تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دی تھی۔" انہوں نے میرا ہی جملہ دہرا کر مجھے خاموش کرا دیا پھر کہنے لگیں "میں سمجھتی تھی کہ میں آپ کی اصلاح کر رہی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔ آپ نے تو الٹا میری اصلاح کر دی۔"

"میں پھر وہی کہوں گا۔ اگر اصلاح کی بات ہے تو پھر شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کی تھوڑی تھوڑی اصلاح کی ہے۔"

ان کے ہاتھ میز پر دھرے تھے۔ نازک و سپید' معصوم کبوتروں جیسے ہاتھ۔۔۔ ایسے ہاتھ جنہیں بے ساختہ چھونے اور پیار کرنے کو دل چاہتا تھا۔ کلائیوں میں رنگین چوڑیاں آڑی ترچھی تھیں۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی شیزان ریسٹورنٹ میں نظر آیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں خواہش مچلی تھی کہ میں ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لوں اور ان کی لطافت کو اپنی ہتھیلیوں میں ہمیشہ کے لیے قید کر لوں۔۔۔ آج بھی مجھے ایسی ہی خواہش کا سامنا تھا۔۔۔ لیکن آج میں نے اپنی خواہش کو دبایا نہیں۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور فرحین کے نرم ہاتھ پر رکھ دیا۔ یوں لگا جیسے میں نے زندگی کو چھو لیا ہے اور میرے زندہ ہونے کے ساتھ ہی پوری کائنات زندہ ہو کر گردش میں آ گئی ہے۔ فرحین کے ہاتھ میں کپکپی سی نمودار ہوئی۔ انہوں نے میرے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کمزور سی کوشش کی۔ میں نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا "پلیز فرحین! اسے میرے ہاتھ میں رہنے دو۔"


بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ | بیوٹی پارلر کورس | |
| پوینک فیشن | سوئنگ آفو | ڈرائنگ ایئر ہوسٹنگ | ایئر ٹیکٹ ریشن ایئر کنڈیشننگ |
| ریڈیو ٹی وی آرٹیکلز | ایکٹریشن | فوٹو گرافی فوٹو گرافی | اسکول ٹیچنگ میتھڈ |
| انٹیریئر ڈیکوریشن | فوٹو گرافی | صحافت | ایئر پورٹ ایئر پورٹ ٹورازم |
| سلائی بیوٹی | کمپیوٹر | حکمت کورس | کوکنگ بیکنگ |
| آئل پینٹنگ | میڈیکل ایڈ | ڈینٹل ٹیکنیشن | لیڈیز ٹیلرنگ |
| ایئر کنڈیشنڈ مکینک | پبلک ریلیشن آفیسر | نیوز ریڈر ٹرسٹ | مہر سازی |

یہ تمام کورسز دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل تصاویر اور خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ پرنٹیڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک گھر بیٹھے آپ کو ملیں گے۔ ہر کورس کے دو دن اور سو روپے لینے کے بعد آپ کو مکمل کورس بھیجا جائے گا۔ ہر کورس میں ایک کورس بک اور داخلہ فارم ہوتا ہے۔ جو اپنی خط و کتابت مکمل طور پر بھیجنا چاہ

ان کے ہاتھ کا لرزیدہ تناؤ ایک دم ختم ہوگیا۔ یہ تبدیلی ایک جاں آفریں خودسپردگی کی علامت تھی۔ فرحین کی آنکھوں پر گھنیری پلکوں کا سایہ تھا۔ مجھے لگا جیسے دور جھیل سیف الملوک پر جھکے ہوئے بادل ہمیں دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔

○☆○

میری اور فرحین کی شادی کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔۔۔ ہماری شادی لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ اس "شادی" کو بخیروخوبی منعقد کرنے میں میرے پیارے دوست اخلاق اور ندیم نے بھرپور حصہ لیا۔ اس کے علاوہ فوزیہ کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فوزیہ کے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ ندامت موجود تھی کہ ٹور کے دوران میں شوگران میں اس کی وجہ سے میرے لیے رسوائی اور ذہنی اذیت کا سامان ہوا تھا۔ اس دکھ کا مداوا کرنے کے لیے اس نے میری شادی کے راستے میں موجود چھوٹی موٹی کئی رکاوٹوں کو ملیامیٹ کیا اور اس کام میں میرے یارِغار اخلاق نے بھی قرار واقعی ساتھ دیا۔ چھوٹے بڑے تایا سمیت ہماری فیملی میں سے کئی گھرانوں نے اس شادی میں شرکت نہیں کی لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ نہ ہی اب تک کوئی پچھتاوا ہے۔ میری والدہ کا ذرا صوفیانہ رنگ میں کہا گیا ایک شعر تھا۔ یہ شعر والدہ اور والد کو مشترکہ طور پر پسند تھا۔ شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ سچ چھپانے والا روگی نہیں ہے۔ اپنے اس روگ پر شرمندہ ہونا یا پچھتانا اس کو چھپانے ہی کی طرح گناہ ہے۔ اب کچھ عرصے سے بڑے تایا نے ہم سے ملنا شروع کردیا ہے اور اس تبدیلی کا سب سے زیادہ کریڈٹ اخلاق کو ہی جاتا ہے۔ بڑے تایا کا نافرمان بیٹا کامران امریکا کا ہی ہوکر رہ گیا ہے۔ مہینے گزر جاتے ہیں لیکن وہ گھر میں فون نہیں کرتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری اور فرحین کی شادی کو تین برس گزر چکے ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ ایک کامیاب ترین شادی ہے۔ ہمارے آنگن میں تین خوبصورت پھول مسکراتے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔ جن دنوں فرحین مجھ سے دور تھی اور میں شب و روز دیوانوں کی طرح اس کی فون کال کا انتظار کیا کرتا تھا، میں اکثر سوچتا تھا۔ یاخدا، مجھ سے زندگی میں کون سی غلطی ہوئی جس کے بدلے مسلسل انتظار کی اس قدر کڑی سزا مجھے مل رہی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں، یاخدا! میں نے کون سی ایسی نیکی کی تھی جس کے بدلے میں تو نے مجھے ایسی پیاری شریکِ حیات اور اتنا پیارا گھر انعام کیا ہے۔ یقیناً یہ اس خدا کا فضل و کرم اور احسان ہی ہے۔ فرحین کو اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے اور وہ کام میں خوش بھی بہت رہتی ہے۔ وہ ابھی کمپیوٹر کی اسی پرائیویٹ یونیورسٹی سے منسلک ہے۔

میری طرف سے اسے کام کرنے یا نہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ میں اتنا کمالیتا ہوں کہ زندگی کی گاڑی آسانی سے رواں رہ سکے۔ میرا مزاج بالکل تبدیل ہوچکا ہے۔ ماضی کی کمزوریاں اب قصۂ پارینہ ہیں۔ دو تین برس سے خدا نے توفیق دی ہے کہ میں باقاعدگی سے نماز ادا کرنے لگا ہوں۔ خدا سے توفیق مانگتا ہوں کہ دیگر دینی فرائض بھی پابندی سے ادا کروں۔

شادی کے اتنے عرصے بعد بھی ہم دونوں ایک دوسرے کو آپ کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی ہم دونوں خوش گوار موڈ میں ہوتے ہیں تو میں فرحین سے کہتا ہوں "فرحین! آپ اپنی تمام تر نیکیوں سمیت میرے اندر حلول کرگئی ہیں۔ آپ نے بے شمار تبدیلیاں پیدا کی ہیں میرے اندر۔"

وہ مسکراتی ہے "آپ کی پیدا کی ہوئی ایک تبدیلی ان تمام تبدیلیوں پر بھاری ہے۔"

"کیسی تبدیلی؟"

"میری زندگی ایک ٹھہرے ہوئے مردہ پانی جیسی تھی۔ آپ نے اس پانی کو روانی دی اور ایک جیتی جاگتی ندی جیسا بنادیا۔"

کسی وقت تنہائی میں، میں سوچتا ہوں۔ ہمارا دین، فطرت کا دین ہے پھر ہم معاشرے کے خوف سے فطرت کو مسخ کیوں کرتے ہیں۔ کیوں خود کو ایسی ناروا پابندیوں میں جکڑتے ہیں جن کی بنیاد صرف اور صرف سماج ہے۔ کبھی کبھی تو صاف یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنے دین کو اپنے کہنہ سماج کے تابع کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور یہ دین کی روح سے بغاوت ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بغاوت ہے اور فطرت سے بغاوت کرکے کون سکھی رہ سکتا ہے۔ خدائی احکامات کے مطابق فطرت کا رواں دواں رہنا ہی زندگی کا حسن ہے۔

کل میرا بڑا بیٹا ابوبکر پوچھ رہا تھا "ابو نیچر کیا ہے؟"

میں نے اس سے کہا "بیٹا! نیچر کا مطلب ہے فطرت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی۔"

ابوبکر چھوٹا ہے، وہ بڑا ہوتا تو میں اسے ذرا تفصیل سے سمجھاتا۔۔۔ میں اسے بتاتا "بیٹا، فطرت ایک خوبصورت پیارے سے گھر کا نام ہے۔۔۔ فطرت تین ہنستے کھیلتے اور چہکارتے بچوں کا نام ہے۔۔۔ اور فطرت پسینے کے ان قطروں کا نام ہے جو حصولِ رزق کے لیے پیشانی سے گرائے جاتے ہیں۔۔۔ اور فطرت اپنے بچوں کے درمیان فراغت کی ایک رنگین شام کا نام ہے۔۔۔ اور ہاں مائی چائلڈ! فطرت اس "تلخ فیصلے" کا نام بھی ہے جو معاشرے کا خوف کھائے بغیر مردہ زندگیوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔